جامع اور معیاری شرح

اُردو نصاب

لازمی

گیارہویں و بارہویں جماعتوں کے لیے

FEDERAL COLLEGE
BOOK SHOP & CANTEEN
Dr. Daud Pota Road.
Karachi-4no07

پروفیسر ہاشمی

پبلشرز:
مرکزی کتب خانہ ○ کبیر سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

۱	۲۰
۱۰	۲۴

جامع اور معیاری شرح

اُردو نصاب

لازمی

گیارھویں، بارھویں جماعتوں کے لیے

پروفیسر ہاشمی

کتابخانہ تخصصی ادبیات

پبلشرز:
مرکزی کتب خانہ ○ کبیر سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

پبلشرز محمد شفیق
برائے
مرکزی کتب خانہ
اردو بازار: لاہور

قیمت: 16 روپے صرف

پرنٹرز: چوہدری منظور احمد
منظور پرنٹنگ پریس: لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نصابی کتابوں کی شرحوں (خلاصوں اور گائیڈوں وغیرہ) کی مخالفت میں آئے دن کہیں نہ کہیں سے صدائے احتجاج بلند ہوتی رہتی ہے۔ کبھی کبھار یہ خبر بھی سننے میں آتی ہے کہ عنقریب امدادی کتابوں پر پابندی لگا دی جائے گی۔ — احتجاج کی یہ آوازیں اور بندش کی یہ خبریں اس اعتبار سے کچھ بے جا نہیں کہ اکثر و بیشتر شرحوں اور دیگر امدادی کتابوں کے مصنفین و ناشرین کے پیش نظر بالعموم مادی اور کاروباری منفعت کے سوا کچھ نہیں ہوتا — ایسی کتابیں عموماً احساسِ ذمہ داری کو بالائے طاق رکھ کر لکھی جاتی ہیں — چنانچہ اکثر کتابیں اور شرحیں اغلاط سے پُر ہوتی ہیں — ایسی کتابیں ایک طالب علم کو کوئی فائدہ پہنچانے کے بجائے اکثر اوقات اُسے الجھا دیتی ہیں۔ لیکن ان تمام خرابیوں کے باوجود صورت حال ایسی ہے کہ موجودہ نظامِ تعلیم میں "شرح" طلبہ کی ایک ناگزیر ضرورت بن چکی ہے۔

ترقی یافتہ ممالک میں ہر سطح کی نصابی کتابوں کی شرحیں بکثرت لکھی اور شائع کی جاتی ہیں چونکہ وہ NOTES AND EXPLAINATIONS کے نام سے چھپتی ہیں، اس لئے ہمیں قابلِ اعتراض محسوس نہیں ہوتیں — یہی چیز اردو میں شرح کے نام سے سامنے آتی ہے تو نشانۂ اعتراض اور ہدفِ ملامت بن جاتی ہے

حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو "شرح" بذاتِ خود کوئی بُری چیز نہیں۔ البتہ غیر معیاری شرحوں کی بھرمار نے اسے "گمراہ کن" اور "لائقِ مذمت" بنا دیا ہے

"شرح" معیاری ہو تو اُن بے شمار پرائیویٹ طلبہ کے لئے باعث افادیت ہو سکتی ہے، جو اپنی گوناگوں مجبوریوں کے باعث کالج میں داخلہ نہیں لے سکتے اور اساتذۂ کرام کے فاضلانہ لیکچرز سے محروم رہتے ہیں یا کالج کے باقاعدہ طالب علم ہونے کے باوجود کلاس میں بوجوہ حاضر نہیں ہو سکتے ——— کچھ ایسے ہی تاثرات و احساسات اور تقاضوں کے پیش نظر ہم نے انٹرمیڈیٹ کے لیے "اردو نصاب لازمی" کی یہ شرح لکھی ہے ———

عام طلبہ کو امتحان کی تیاری کے سلسلے میں جو مشکلات پیش آتی ہیں، ہم نے انہیں بطور خاص پیش نظر رکھا ہے۔ سب سے پہلے ہر سبق کا تعارف اور پس منظر دیا گیا ہے۔ پھر مشکل الفاظ و محاورات کے معانی اور تشریح۔ اس کے بعد سبق کی تلخیص (خلاصہ) تاکہ اصل سبق کے مطالعے سے پہلے مضمون یا کہانی کا خاکہ طالب علم کے ذہن میں موجود ہو اور وہ بہتر طریقے سے اصل سبق کو سمجھ سکے۔ امتحان میں ایک سوال مصنفین یا شعرا کے حالات زندگی اور ان کے اسلوب نثر یا شاعری پر تنقیدی نوٹ کے متعلق پوچھا جاتا ہے۔ ہم نے تمام اہم مصنفین اور شعرا کے ضروری سوانح اور ان پر تنقیدی نوٹ کتاب میں شامل کر دیے ہیں۔ اسی طرح ایک سوال نثری اقتباس کی تشریح سے متعلق ہوتا ہے، اس سلسلے میں بھی ہم نے متعدد اسباق کے آخر میں حوالۂ متن اور سیاق و سباق کے ساتھ بعض اہم اقتباسات کی تشریح کر دی ہے۔ جو طلبہ کے لیے نمونے کا کام دے گی۔ مجموعی طور پر ہم نے زیر نظر شرح کو بہتر اور جامع تر بنانے کی کوشش کی ہے۔

خدائے برتر کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں اس کتاب کی تحریر و تکمیل کی توفیق عطا فرمائی ——— ہم اسے اساتذہ و طلبہ کی خدمت میں بڑے عجز و انکسار کے ساتھ پیش کر رہے ہیں ——— ہم ایک انسان ہونے کی حیثیت سے ہمیں اپنی کم علمی کا اعتراف ہے اور ہمیں غلطیوں کو تسلیم کرنے میں بھی کوئی تامل نہیں ——— قارئین سے درخواست ہے کہ انہیں جہاں کوئی غلطی نظر آئے، ہمیں آگاہ کریں ——— اس کے لئے ہم آپ کے ممنون ہوں گے۔

مؤلفین

فہرست مضامین

حصّہ اول ـــــ حصّۂ نثر

علمی مقالات

۱	خواجہ الطاف حسین حالی	سرسید کا بچپن	۱۱
۲	محمد حسین آزاد	اورنگزیب کی فوجی تیاریاں	۱۹
۳	علامہ شبلی نعمانی	اورنگزیب عالمگیر پر ایک نظر	۲۴
۴	مولانا عبدالحلیم شرر	مبحثِ برہم	۳۲
۵	نسیم حجازی	پانی پت کی تیسری جنگ	۴۱
۶	آفتاب حسن	پٹرولیم	۴۵

مختصر افسانے

۷	منشی پریم چند	نادان دوست	۴۹
۸	سجاد حیدر یلدرم	سیلِ زمانہ	۵۵

طنز و مزاح

۹	احمد شاہ بخاری پطرس	میبل اور میں	۵۹
۱۰	مرزا فرحت اللہ بیگ	کل کا گھوڑا	۶۵
۱۱	چراغ حسن حسرت	شفاء الملک مرحوم	۷۰
۱۲	رشید احمد صدیقی	الیکشن	۷۴

ادبی مضامین و مقالات

۱۳	مرزا اسد اللہ خاں غالب	خطوط غالب	۷۸
۱۴	سرسید احمد خاں	اپنی مدد آپ	۸۴
۱۵	نذیر احمد دہلوی	سوکن کا داؤ	۹۱
۱۶	ڈاکٹر مولوی عبدالحق	گدڑی کا لال، نور خان	۹۷

جزو اوّل ـــــ حصّہ نظم

غزلیات

۱ -	میر تقی میر		۱۰۷
۲ -	خواجہ میر درد		۱۱۸
۳ -	مرزا اسد اللہ خاں غالب		۱۲۶
۴ -	خواجہ الطاف حسین حالی		۱۳۵
۵ -	جگر مراد آبادی		۱۴۱

منظومات

۶ -	تظیر اکبر آبادی	آدمی نامہ	۱۴۷
۷	خواجہ الطاف حسین حالی	حُبِّ وطن	۱۵۷
۸	علامہ شبلی نعمانی	شہدائے قوم	۱۶۰
۹	اکبر الہ آبادی	مشرق و مغرب	۱۶۴
۱۰	مولانا ظفر علی خاں	مستقبل کی جھلک	۱۷۰
۱۱	ڈاکٹر محمد اقبال	خطاب بہ جوانانِ اسلام	۱۷۶
		طارق کی دُعا	۱۸۵
		طلوعِ اسلام	۱۹۱
۱۲	اختر شیرانی	برسات	۱۹۹
۱۳	حفیظ جالندھری	شہسوارِ کربلا	۲۱۰
۱۴	احسان دانش	دیہات کی شام	۲۱۶

مثنوی

۱۷	میر حسن	داستان باغ کی تیاری میں	۲۲۳

جزو دوم - حصّہ نثر

مختصر کہانیاں

۱	میر امن دہلوی	خواجہ سگ پرست کی کہانی	۲۳۹
۲	حیدر بخش حیدری	حمام باد گرد	۲۴۵

۳	رجب علی بیگ سرور	شہزادہ جان عالم کی سواری	۲۵۰
۴	ڈپٹی نذیر احمد	نصوح اور سلیم کی گفتگو	۲۵۷
۵	خواجہ حسن نظامی	شہزادی کی بپتا	۲۶۲
۶	چودھری افضل حق	ایک خادم مخلق کی کہانی	۲۶۴
۷	غلام عباس	کتبہ	۲۶۷
	مختصر ڈرامے		
۸	آغا حشر	رستم و سہراب (ایک سین)	۲۷۳
۹	سید امتیاز علی تاج	آرام و سکون	۲۸۰
۱۰	میرزا ادیب	فن کار	۲۸۳

جزو دوم - حصۂ نظم

۱	میر تقی میر	۲۸۸
۲	میر درد	۲۹۹
۳	غلام ہمدانی مصحفی	۳۱۶
۴	خواجہ حیدر علی آتش	۳۲۲
۵	مرزا اسد اللہ خاں غالب	۳۲۴
۶	مومن خاں مومن دہلوی	۳۴۳
۷	بہادر شاہ ظفر	۳۵۶
۸	خواجہ الطاف حسین حالی	۳۶۴
۹	نواب مرزا خاں داغ دہلوی	۳۷۷
۱۰	امیر مینائی	۳۸۳
۱۱	مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی	۳۹۲
۱۲	شوکت علی فانی بدایونی	۴۰۱
۱۳	اصغر حسین اصغر گونڈوی	۴۰۵
۱۴	جگر مراد آبادی	۴۱۲
۱۵	ڈاکٹر سر محمد اقبال	۴۱۸
۱۶	رضا علی وحشت کلکتوی	۴۳۳

۱۷	ابوالاثر حفیظ جالندھری	۴۳۷
۱۸	**مرثیہ**	
۱۸	میر انیس	۴۴۲
	نمودِ صبح	۴۴۳
	کربلا میں گرمی کی شدت	۴۴۵
	تلوار کی تعریف	۴۴۹

جزو اوّل

خواجہ الطاف حسین حالی

حالاتِ زندگی

خواجہ الطاف حسین نام اور حالی تخلص تھا۔ والد کا نام خواجہ ایزد بخش تھا۔ حالی کے خاندان کے ایک بزرگ خواجہ ملک علی غیاث الدین بلبن کے زمانے میں ہرات سے ہجرت کر کے ہندوستان پہنچے۔ بلبن نے انہیں پانی پت شہر کا قاضی مقرر کیا۔ حالی کا سلسلہ نسب مشہور صحابی حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے ملتا ہے۔

وہ ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ایک معمولی سے ملازم تھے۔ حالی نو برس کے تھے کہ والد فوت ہو گئے۔ چنانچہ ان کی پرورش بڑے بھائی اور بہنوں نے کی۔ سب سے پہلے قرآن حفظ کیا۔ پھر فارسی عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ گھریلو حالات کے سبب سترہ سال کی عمر میں ان کے ماموں میر باقر علی کی بیٹی اسلام النساء سے ان کی شادی کر دی گئی مگر تحصیل علم کا شوق ایسا تھا کہ گھر والوں کو اطلاع دیئے بغیر دہلی چلے گئے اور مولوی نوازش علی سے عربی کی بعض کتابیں پڑھنا شروع کیں۔ قیام دہلی کے زمانے میں مرزا غالب سے ملاقات ہوئی ان سے اکثر نشست رہتی۔ انہوں نے حالی کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے انہیں شعر کہنے کی ترغیب دی۔ ڈیڑھ سال بعد گھر والوں کو پتہ چلا تو وہ واپس پانی پت لے آئے۔ حالی نے گھر رہ کر اپنے طور پر مطالعہ جاری رکھا۔

۱۸۵۶ء میں حالی کی ملازمت کا آغاز ہوا۔ پہلا تقرر کلکٹر ضلع حصار کے دفتر میں ہوا۔ تنخواہ معمولی تھی۔ اگلے سال جنگ آزادی شروع ہو گئی۔ ہر طرف خونریزی پھیل گئی۔ نوکری کا سلسلہ منقطع ہوا تو حالی پانی پت چلے آئے۔ اور بعض علماء سے مذہبی علوم کا درس لیتے رہے۔

جب حالات ذرا بہتر ہوئے تو ۱۸۶۱ء میں وہ نواب مصطفےٰ خان شیفتہ کے مصاحب اور ان کے بچوں کے اتالیق ہو کر بہا نگیر آباد (ضلع بلند شہر) چلے گئے۔ ۱۸۶۹ء میں شیفتہ کی وفات پر لاہور آ گئے۔ اور گورنمنٹ بک ڈپو میں نائب مترجم کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ قیام لاہور کے زمانے میں حالی نے جدید اردو شاعری کی ترویج

میں بڑی سرگرمی کے ساتھ حصّہ لیا۔ چند مہینوں کے لئے اینگلو عربیک کالج کی ملازمت بھی کی۔ پھر لاہور کو چھوڑ کر دلّی آئے اور اینگلو عربیک کالج ہی میں مدرس مقرر ہوئے۔ حیدر آباد سے وظیفہ جاری ہوا تو ۱۸۸۹ء میں ملازمت کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہا اور پانی پت میں مقیم ہو گئے۔

اب وہ پوری توجہ کے ساتھ علمی کاموں میں مشغول ہو گئے۔ اون کی صحت اچھی نہ تھی اس کے باوجود قومی اور تعلیمی جلسوں میں شرکت کے لئے انہوں نے علی گڑھ، بمبئی، لاہور اور کراچی کے سفر اختیار کیے۔ ۱۹۰۴ء میں حکومت کی طرف سے "شمس العلماء" کا خطاب دیا گیا۔ آخری عمر میں ان کی نظر خراب ہو گئی اور لکھنے پڑھنے سے معذور ہو گئے۔

یکم جنوری ۱۹۱۵ء کو صبح دو بجے پانی پت میں انتقال کر گئے۔

اہم تصانیف :-

ا۔ سوانح :- حیاتِ جاوید۔ حیاتِ سعدی۔ یادگارِ غالب۔
ب۔ تنقید :- مقدمہ شعر و شاعری۔
ج۔ شاعری :- کلیاتِ نظم حالی (دو حصے)
د۔ نثر :- کلیاتِ نثرِ حالی (دو حصے)۔ مکاتیبِ حالی

حالی کا اسلوب بیان

حالی اردو کے اہم نثر نگار ہیں۔ وہ علی گڑھ تحریک میں سرسید کے دست راست مانے جاتے تھے۔ اس اعتبار سے وہ سرسید کی ادبی تحریک سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کی تحریر پر سرسید کا بڑا اثر ہے۔ مگر حالی نے سرسید کے اثرات کو جوں کا توں قبول نہیں کیا بلکہ انہیں اپنے مزاج کے مطابق ڈھال لیا۔ چنانچہ نثر میں ان کا اپنا اور منفرد رنگ ہے جو یقیناً سرسید سے مختلف ہے۔

حالی کی ابتدائی نثر قدیم انداز سے محفوظ نہیں ہے۔ انہوں نے ابتدائی زمانے میں قدیم طرز کے مذہبی رسالے لکھے۔ ان رسالوں کی تحریر میں واعظانہ اور مناظرانہ رنگ غالب ہے ان میں سلاست اور سادگی کا وہ انداز مفقود ہے جو بعد میں حالی کے اسلوب کی بنیاد بنا۔ البتہ جب ان کے خیالات میں

میں وسعت پیدا ہوئی، سرسید تحریک نے بھی انہیں متاثر کیا اور شعر و ادب کی طرف ان کی توجہ زیادہ ہوئی تو ان کے طرز نگارش نے ایک نیا رنگ اختیار کیا۔ حتیٰ کہ ان کی سوانح عمریوں میں ہمیں ان کا پختہ اور حقیقی اسلوب ملتا ہے۔ ان کے اسلوب کی اہم خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ سادگی و صفائی سلاست، سادگی اور صفائی حالی کی تحریروں کا بڑا وصف ہے۔ وہ سرسید کی سادگی زبان کی تحریک سے متاثر تھے، ان کا خیال تھا کہ "خیال کتنا ہی بلند و دقیق ہو مگر پیچیدہ و دشوار نہ ہو اور الفاظ جہاں تک ممکن ہوں، محاورے اور روزمرہ کی بول چال کے قریب ہوں۔" انہوں نے شاعری کے علاوہ نثر میں بھی اپنے اس اصول پر کاربند رہنے کی کوشش کی ہے۔ وہ عام فہم زبان استعمال کرتے ہیں جس میں پیچیدگی یا ابہام نہیں ہوتا۔

۲۔ دھیما پن حالی بڑی متوازن، معتدل اور دھیمی طبیعت رکھتے تھے۔ ان کی نثر کا بھی یہی رنگ ہے۔ جوش بیان سے ان کی تحریریں عاری ہیں۔ ان کے ہاں نہ تیزی ہے اور نہ شدت۔ اگر عبارت میں کہیں جوش پیدا کرنا چاہیں تو تشبیہات و استعارات استعمال کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں کم ہی ایسے مواقع آتے ہیں جہاں تموج یا گرم جوشی کی کیفیت نظر آئے۔ بالعموم ان کی نثر میں بھی ان کی شخصیت جیسا خلوص، دھیما پن اور انکسار نظر آتا ہے۔

۳۔ غیر جذباتی انداز چونکہ حالی کی شخصیت پر اعتدال کا رنگ غالب تھا اس لئے لکھتے ہوئے بھی وہ غیر جذباتی اور غیر شخصی رنگ اختیار کرتے ہیں۔ وہ ایک بے لاگ اور غیر جانبدار قسم کے مصنف ہیں البتہ کہیں کہیں دلسوزی اور جذبے کی دھیمی آنچ محسوس ہوتی ہے۔

۴۔ انگریزی الفاظ کا بے جا استعمال سرسید کی طرح حالی نے بھی بلا ضرورت انگریزی الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ مثلاً ان کی تحریروں میں "میلف ہیلپ"، "فارن گورنمنٹ" اور "ہر ایکسیلنسی جنٹس" جیسے نامانوس الفاظ ذوق سلیم پر گراں گذرتے ہیں۔ یہ عیب دور سرسید کے اکثر مصنفین کے ہاں پایا جاتا

ہے۔

۵۔ مدعا نگاری | حالی نے سرسید کے مدعا نگاری کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے سادہ اور آسان الفاظ میں مفہوم اور مقصد کے بے تکلفانہ اظہار پر زور دیا ہے۔ انہیں مبالغہ آمیز ادبیت یا شعریت سے کوئی سروکار نہیں۔ مگر ان کی مدعا نگاری، سرسید سے بہتر ہے کیونکہ وہ عبارت کے حسن کا خیال رکھتے ہیں۔

ان خصوصیات کی بنا پر حالی کا اسلوب منفرد ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے بقول "ہم حالی کو اردو کا اوّلین حقیقت پسند مدعا نگار اور صاحبِ طرز انشا پرداز کہہ سکتے ہیں۔"

الطاف حسین حالی

سرسید کا بچپن

تعارف اور پس منظر

سرسید احمد خاں کی شخصیت، مسلمانانِ ہند کی تعلیمی، ادبی اور سیاسی تاریخ میں نمایاں اہمیت رکھتی ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سرسید کی تعلیمی تحریک کا عملی نمونہ ہے۔ معروف ادیب خواجہ الطاف حسین حالی نے سرسید احمد خاں کی شخصیت کا نہایت قریب سے مطالعہ کیا اور حیاتِ جاوید کے نام سے ان کی سوانح عمری لکھی۔ جس میں سرسید کے ذاتی اور نجی حالات و واقعات اور عادات و اطوار کے علاوہ ان کے مختلف کارناموں کا نہایت تفصیل سے جائزہ لیا۔ "سرسید کا بچپن" کے عنوان سے جو سبق، اِس وقت ہمارے زیرِ مطالعہ ہے۔ وہ "حیاتِ جاوید" کے ابتدائی حصے سے لیا گیا ہے۔

سبق کا خلاصہ

سرسید عمر کے اعتبار سے اپنی بہن صفیۃ النسا بیگم اور بھائی سید محمد خاں دونوں سے چھوٹے تھے۔ چونکہ وہ اپنے بھائی کی ولادت کے کچھ سال بعد پیدا ہوئے اس لیے سرسید کی ولادت ان کے والدین کے لیے غیر معمولی خوشی کا باعث ہوئی۔ سرسید دوسرے بچوں کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ مضبوط اور صحت مند تھے اس لیے

اُن کے نانا نے انہیں "حاجی" کا لقب دیا۔

اُن کے اپنے بیان سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اوائل عمر میں جسمانی لحاظ سے وہ بہت توانا تھے۔ تاہم اس کے علاوہ اُن کے اندر کوئی امتیازی خوبی نہ تھی جس سے یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ان کی ذہنی صلاحیتیں مسلسل تفکر و تدبر کے نتیجے میں عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئیں۔

شاہ غلام علی صاحب نے ان کا نام "احمد" رکھا وہ سرسید اور ان کے بھائیوں سے از حد محبت کرتے تھے۔ پانچ برس کی عمر تک اُن کے گھرانے کی ایک قدیم ملازمہ مان بی بی نے سرسید کو پالا اور وہ بھی اس سے بہت مانوس ہو گئے تھے کہ مان بی بی کی وفات پر بہت افسردہ ہوئے۔ مان نے انہیں بہلایا کہ وہ اللہ میاں کے پاس گئی ہے اور آسائش کی زندگی بسر کرتی ہے، وہ اپنا زیور سرسید کے نام کر گئی تھی۔ سرسید کی والدہ نے اُن سے پوچھا کہ یہ زیور مان بی بی کے پاس بھیجدوں؟ سرسید راضی ہو گئے۔ چنانچہ زیور خیرات کر دیا گیا۔ وہ چھوٹے تھے اس لیے سمجھتے تھے کہ سب چیزیں مان بی بی کو پہنچ جاتی ہیں۔

بچپن میں سرسید کو کھیل کود کی خاصی آزادی تھی۔ وہ ہم عمر شرفا زادوں کے ساتھ کھیلتے۔ مگر آوارہ لڑکوں سے میل جول کی اجازت نہ تھی۔ بزرگوں نے کہہ رکھا تھا کہ جو چاہو کھیلو مگر کوئی کھیل چھپا کر مت کھیلو۔ سرسید اور اُن کے ہم جولی خواجہ فرید کی حویلی میں گیند بلا، کبڈی، آنکھ مچولی وغیرہ کھیلتے کبھی کھیل میں جھگڑا ہوتا تو بزرگ صلح کرا دیتے۔ سرسید کا بیان ہے کہ اُنھیں تنہا باہر جانے کی اجازت نہ تھی اس لیے عام صحبتوں میں بیٹھنے یا آوارگی کا اتفاق نہیں ہوا۔ بچپن میں سرسید بہت شوخ اور چالاک تھے۔ اپنے ساتھیوں سے اکثر شوخی کیا کرتے، انہیں دق کرتے، لڑائی بھڑائی ہوتی لیکن پھر صلح ہو جاتی۔

سرسید خود لکھتے ہیں کہ اُن کے نانا تمام بچوں اور چھوٹوں کو اپنے ساتھ دسترخوان پر کھانا کھلاتے وہ بچوں کی طبع اور صفائی پسند تھے۔ کھانے کے دوران میں بھی صفائی کا خیال رکھا جاتا۔ اگر کسی کے کپڑوں پر کوئی دھبہ ہوتا تو ناخوش ہوتے۔ تمام کو بچوں سے سبق سنتے اور جسے سبق اچھی طرح یاد ہوتا، اُسے مٹھائی ملتی تھی۔

بچپن میں سرسید گرمی اور برسات میں جمنا کے کنارے جاتے۔ پیراکی انہوں نے وہیں اپنے والد سے سیکھی۔ اُن کے لڑکپن میں تیراکی کے دلچسپ جلسے ہوتے جن میں معروف تیراک مولوی علیم اللہ، ان کے شاگرد اور بہت سے دیگر تیراک حصہ لیتے۔ سرسید کے والد بھی اپنے سو، سوا سو شاگردوں کے ساتھ تیراکی کا مظاہرہ کرتے۔ بالعموم

یہ سب لوگ مغرب تک تیر اکی کرتے، پھر مغرب کی نماز زینت المساجد میں ادا کر کے گھروں کو جاتے ـــــ اسی طرح سرسید کے لڑکپن میں تیر اندازی کی صحبتیں اُن کے ماموں نواب زین العابدین کے مکان پر ہوتی تھیں جن میں متعدد نامور رؤسا شریک ہوتے، ان جلسوں میں سرسید نے بھی تیر اندازی کی اچھی خاصی مشق بہم پہنچالی تھی۔

سرسید اپنے والد کے ساتھ اکثر شاہ غلام علی صاحب کے ہاں جایا کرتے۔ اس سے بزرگوں کی عظمت ان کے دل پر بچپن ہی میں پختہ ہو گئی۔ عُرس کے موقع پر نذر کا روپیہ سرسید یا اُن کے والد ہی کو ملتا ـــــ انہیں کبھی کبھی اپنے والد کے ساتھ مغل پور جانے کا موقع ملتا تھا۔ اس طرح وہ دیہات کی زندگی سے آشنا ہوتے اور وہاں کی کھلی فضا اور خالص غذا سے فائدہ اُٹھایا۔ آٹھ نو سال کے تھے کہ شاہی دربار میں جانے لگے۔ اُن کے والد کو اکبر شاہ سے ہر سال شاہی خلعت ملتا تھا۔ ایک دفعہ والد تو علی الصبح دربار میں چلے گئے مگر سرسید سوتے رہے۔ دیر سے بیدار ہوتے اور دربار میں گئے تو بادشاہ اُٹھ کر جا رہے تھے، پھر وہ رُک گئے اور سرسید کے حسب قاعدہ جواہرات عطا کیے۔ اس امتیازی سلوک پر لوگوں نے سرسید کے والد کو مبارکباد دی۔

سرسید کی بسم اللہ کی تقریب میں شاہ غلام علی صاحب تشریف لاتے تھے اس روز تقریب میں بہت سے لوگ جمع تھے جنہیں دیکھ کر سرسید حیران رہ گئے۔ بہر حال حضرت شاہ غلام علی نے انہیں اپنی گود میں بٹھا کر بسم اللہ اور قرآن پاک کی چند آیات پڑھوائیں۔ یہ شاہ صاحب کی خاص عنایت تھی کہ وہ سرسید کے ہاں تشریف لاتے ورنہ اور کسی کے ہاں نہیں جاتے تھے۔ سرسید نے قرآن شریف ایک پردہ نشین بی بی سے پڑھا۔ ختم قرآن پر زنانے میں ایک دلچسپ اور یادگار مجلس منعقد ہوئی۔ اس کے بعد باہر مکتب میں مولوی حمید الدین صاحب سے کریما، خالق باری اور آمدنامہ وغیرہ پڑھیں۔ بعد میں دوسرے لوگوں سے فارسی اور عربی کی مروج کتابیں پڑھیں اور پھر ریاضی کا شوق پیدا ہوا۔

مشکل الفاظ و محاورات ـــــــ معانی اور تشریح

صفحہ ۱۳۔ ولادت: پیدائش، مفہوم ہونا: مطلب نکلنا۔ قوی اور توانا: مضبوط، فزیکل: جسمانی، فوقیت: برتری، ذکی: ذہین۔ طباع: تیز فہم۔ ذہین۔ ہم جولی: ساتھی، صریح: واضح،

قوائے ذہنیہ۔ ذہنی صلاحیتیں، ریاضت، محنت، حکما: دانا لوگ۔

صفحہ ۴:۔ قضا کرنا: رخصت ہونا، فوت ہونا۔ تاہل: اہل وعیال والا ہونا۔

صفحہ ۶:۔ بندی: بندش۔ پابندی۔ اجلافوں: کمینے لوگ۔ اشراف: شریف لوگ۔ گیڑیاں کھیلنا: ایک کھیل جس میں ایک لڑکا لکیر کھینچ کر اس سے تھوڑے سے فاصلے پر لکڑی رکھتا ہے اور دوسرا اس پر اپنی لکڑی کی چوٹ لگا کر لکیر سے ہٹا دینے کی کوشش کرتا ہے۔ چیل چلو: بچوں کا ایک کھیل معیوب: بُری بات۔ جس میں کوئی خرابی ہو۔ مفت قتہ: قباحت۔ حرج تصفیہ: صلح صفائی، چغلیہ: بے ایمانی۔ ہٹ دھرمی۔

صفحہ ۶:۔ مستعد: چست وچالاک۔ چت کرنا: پیٹھ کے بل گرا دینا۔ پیچ بچاؤ کرنا: جھگڑا چکانا۔

صفحہ ۷:۔ غول: ہجوم۔ دیوان خانہ: بیٹھک۔ نشست گاہ۔ گھر کرنا: ڈاٹنا۔ جلسے ہونا: اجتماع ہونا۔ سربرآوردہ: نمایاں، سردار۔ نامی: معروف۔ مشہور۔ مجنوں کا ٹیلہ: دلی کا ایک مشہور مقام۔ شیخ محمد کی باتیں: دلی کا ایک مشہور کنواں، مچھلی کے جانے کو کون تیرنا سکھاتے: ہر کوئی اپنے آبائی کام میں ماہر ہوتا ہے۔

صفحہ ۸:۔ موقوف: ختم۔ معطل۔ ٹوہ: مٹی کا ٹیلہ۔

صفحہ ۹:۔ ملک: ملکیت، جائیداد، پارچہ: ٹکڑا۔ جاٹنیوں: جاٹ عورتوں۔ صغیر سنی: چھوٹی عمر کا۔ ملک بطور معافی: وہ زمین جس کا معاملہ سرکار سے معاف ہو۔ تین رقوم: تین زیور۔ برخاست ہونا: ختم ہونا۔

صفحہ ۱۰:۔ ہوادار: قدیم سواری جسے کہار اٹھاتے تھے۔ خانہ زاد: گھر کا پیدا شدہ۔ غلام بچہ: قصور، غلطی۔ کشتی: جواہر: قیمتی موتیوں کی کشتی (ٹرے) داروغہ: محافظ، نگران، مہتمم۔ برہمو سماج: ہندوؤں کا ایک فرقہ۔

صفحہ ۱۱:۔ بسم اللہ کی تقریب: بچوں کو بسم اللہ اور چند آیات پڑھوانے کی تقریب پھر مکتب میں بٹھا دیتے ہیں۔ ہکا بکا ہونا: حیران رہ جانا۔ اقرا: آخری پارے کی سورۃ علق کی پہلی آیت۔ اموختم: میں نے سیکھا۔ اسرار یزوانی۔ خدائی۔ رموز۔ غایت: زیادہ۔ قدم رنجہ فرمانا: تشریف لانا۔ اشراف: شریف کی جمع۔

صفحہ ۱۲:۔ کریما، خالق باری، آمدنامہ، گلستان، بوستان، شرح ملا، شرح تہذیب، مختصر معانی، مطول ــ فارسی اور عربی کی قدیم کتابوں کے نام ــــ مثل: ثانی۔

پیراگراف کی تشریح

ں: مندرجہ ذیل پیراگراف کی تشریح کیجیے۔ حوالہ متن اور سیاق وسباق بھی لکھیے۔

"میرے سامنے تختی رکھی گئی اور غالباً شاہ صاحب ہی نے فرمایا کہ پڑھو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" مگر میں کچھ نہ بولا اور حضرت صاحب کی طرف دیکھتا رہا۔ انہوں نے اُٹھا کر مجھے اپنی گود میں بٹھا لیا اور فرمایا کہ ہمارے پاس بیٹھ کر پڑھیں گے اور بسم اللہ پڑھ کر اقرأ کی اول کی آیتیں مَالَمْ یَعْلَمْ تک پڑھیں۔ میں بھی ان کے ساتھ پڑھیں۔ میں بھی ان کے ساتھ پڑھتا گیا۔"

جواب: حوالہ متن | یہ عبارت خواجہ الطاف حسین حالی کے مضمون "سرسید کا بچپن" سے لی گئی ہے جو ان کی تصنیف "حیات جاوید" کا ایک حصہ ہے۔

سیاق وسباق | حالی سرسید احمد خان کے قریبی ساتھی تھے اور اُن کی تعلیمی اور ادبی تحریک میں ان کے معاون۔ "حیات جاوید" میں حالی نے سرسید کی شخصیت اور ان کے کارناموں کا مفصل جائزہ پیش کیا۔ "سرسید کا بچپن" عنوان کے تحت انہوں نے سرسید کے گھریلو کاموں، بچپن کے واقعات، کھیل کود، ان کی جسمانی مضبوطی، شاہی دربار سے تعلق اور تیراکی کے جلسوں میں شرکت کے حالات بیان کیے ہیں۔ اس کے بعد حالی نے سرسید کی رسم بسم اللہ کے بارے میں خود سرسید کی ایک تحریر نقل کی ہے ــــ تشریح طلب عبارت دراصل سرسید کی اپنی تحریر ہے۔ انہوں نے بتلایا ہے کہ بسم اللہ کی تقریب پر اُن کے گھر بہت سے لوگ جمع تھے۔ حضرت شاہ غلام علی بھی تشریف لائے تھے۔ سرسید کو شاہ صاحب کے سامنے بٹھایا گیا اس موقع پر یہ عبارت آئی ہے۔

تشریح ــــ سرسید بتاتے ہیں کہ سب سے پہلے میرے سامنے تختی رکھی گئی۔ پھر غالباً شاہ صاحب نے بسم اللہ پڑھنے کو کہا ــــ یہ سرسید کے بچپن کا واقعہ ہے جب اُنہیں پورا شعور نہ تھا اس لیے غالباً کہا ہے۔ سرسید اتنے لوگوں کو دیکھ حیران تھے اس لیے کچھ بول نہ سکے اور شاہ صاحب کو حیرانی سے دیکھنے لگے۔ انہوں نے پیار سے اپنی گود میں بٹھا لیا اور فرمایا کہ اب پڑھے گا۔ پھر انہوں نے بسم اللہ کے ساتھ آخری پارے کی سورۃ علق کی ابتدائی آیات پڑھیں اور سرسید بھی ساتھ ساتھ پڑھتے گئے۔ خیال ہے کہ انہی آیات سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا آغاز ہوا تھا۔ جبریلؑ، سب سے پہلے آپؐ کے پاس غارِ حرا میں تو یہی آیات آپ کو سکھائیں ــــ غالباً اسی مناسبت سے رسم بسم اللہ کے موقع پر حضرت شاہ صاحب نے سرسید کو مذکورہ آیات پڑھوائیں۔

محمد حسین آزاد

حالاتِ زندگی

نام: محمد حسین تخلص: آزاد۔ ولادت: ۱۰ جون ۱۸۳۰ء (دہلی) آزاد کے والد مولوی محمد باقر دہلی کی ممتاز شخصیتوں میں شمار ہوتے تھے پیشے کے اعتبار سے صحافی تھے۔ آزاد نے دہلی کالج میں تعلیم حاصل کی۔ شاعری میں شیخ ابراہیم ذوق سے اصلاح لیتے تھے۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں آزاد کے والد مولوی محمد باقر انگریزوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ آزاد کے وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے مگر وہ چھپتے چھپاتے لکھنؤ پہنچے۔ ۱۸۶۴ء میں لاہور آئے اور محکمہ تعلیم میں پندرہ روپے کی ملازمت اختیار کی۔ لاہور میں قیام کے زمانے میں پنجاب یونیورسٹی کے ڈاکٹر لائٹنر نے آزاد کی بڑی سرپرستی کی۔ انہیں انجمنِ پنجاب کا سیکرٹری مقرر کیا گیا۔ انہوں نے انجمن کے مشاعروں میں سرگرمی میں حصہ لیا اور متعدد نظمیں لکھ کر جدید شاعری کی تحریک کو پروان چڑھایا۔ ۶۶-۱۸۶۵ء میں انگریزوں کے ایما پر ترکستان گئے۔ سیر و سیاحت کے سلسلے میں ایران کا سفر بھی کیا۔ کچھ عرصے گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی اور فارسی کے پروفیسر رہے۔ حکومت کی طرف سے "شمس العلماء" کا خطاب ملا۔ ۱۸۸۵ء میں آزاد کی اکلوتی بیٹی جیل بی اس کے صدمے سے ذہنی توازن بگڑ گیا۔ بیس سال کی طویل علالت اور دماغی عدم توازن کے بعد ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔

تصانیف:۔ آبِ حیات۔ نیرنگِ خیال۔ دربارِ اکبری۔ قصص ہند۔ سخندانِ فارس۔ مجموعہ نظم آزاد۔ وغیرہ۔

آزاد کا اسلوب

محمد حسین آزاد اردو کے صاحبِ طرز ادیب اور بلند پایہ انشا پرداز ہیں۔ اپنے حسین و جمیل، دلکش اور شاعرانہ اندازِ نگارش کی بدولت اردو ادب میں انہیں ایک بلند مقام حاصل ہے۔ انہوں نے مختلف اصناف نثر، مضمون نویسی، تذکرہ نگاری

اور تاریخ نویسی میں طبع آزمائی کی اور اپنے منفرد اسلوب کی بدولت اپنی ممتاز حیثیت منوائی - ان کی طرزِ تحریر کی نمایاں خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں -

۱- شعریت اور رنگینی آزاد سادگی اور سلاست کے بجائے رنگینی اور شعریت کے قائل ہیں - ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ نثر لکھتے ہوئے بھی شاعری کرتے ہیں - "آبِ حیات" کے متعدد بیانات غیر مستند ہیں - مگر قاری ان کے رنگیں اسلوب کی دلکشی اور رنگینی میں کھو جاتا ہے - غالباً اسی لئے شبلی نے کہا ہے "گپ بھی ہانکتا ہے تو وحی معلوم ہوتی ہے"

۲- مرصع کاری ان کی رنگینی بیان کا بڑا سبب صنائع بدائع کا استعمال اور مرصع کاری ہے - الفاظ و تراکیب کے چناؤ اور صنعتوں کے برمحل استعمال میں انہیں خداداد ملکہ حاصل ہے - بندش الفاظ میں مہارت نے انہیں ایک کامیاب مرصع کار بنا دیا ہے - مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں: "تمام دربار چاپ اٹھا اور میاں جگنو مدھم ہو کر رہ گئے"

۳- مرقع نگاری آزاد کا مشاہدہ گہرا اور نظر تیز ہے - وہ کسی شے کی لفظی تصویر اس عمدگی سے پیش کرتے ہیں کہ وہ مجسم اور اصل رنگ و روپ میں ہمارے سامنے آجاتی ہے - سخندانِ فارس میں چشم دید واقعات یا اشیاء کی عمدہ تصوری ملتی ہے - کہ جو کچھ آزاد نے لکھا، ہم بھی وہی دیکھتے ہیں اور جس طرح وہ ان واقعات سے متاثر ہوئے، ہم بھی اسی طرح متاثر ہوتے ہیں -

۴ ڈرامائیت ان کے اسلوب کی ایک نمایاں خوبی ڈرامائیت ہے - ڈرامائیت پیدا کرنے کے لیے وہ خود کلامی اور مکالمے کے حربوں سے کام لیتے ہیں ڈرامائیت پیدا کرنے کے لیے بعض اوقات واقعات اور حقائق کو مسخ بھی کرتے ہیں - مگر بحیثیتِ ادیب و انشا پرداز وہ بے حد کامیاب ہیں اس ڈرامائیت کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہ بے جان چیزوں کو اشخاص و کردار بنا کر پیش کرتے ہیں - تشخص (PERSONIFICATION) کی مثال ملاحظہ ہو - اردو زبان کے بارے میں کہتے ہیں "خدا کی قدرت دیکھو کہ ایک بچہ شاہجہان کے گھر میں پیدا ہوا - اور انگریزی اقبال کے ساتھ اس کا ستارہ چمکا"

۵- لطافت و ظرافت مرصع کاری اور شعریت و ادبیت کے باوجود آزاد کی تحریریں کی بجائے لطافت و ظرافت کی حامل ہیں ان کی تشبیہیں اور استعارے بڑے لطف انگیز اور خوبصورت ہیں - مثلاً "زبان ایک جادوگر ہے جو طلسمات کے کارخانے الفاظ کے منتروں سے تیار کر دیتا ہے - ایک نادر مرصع کار ہے جس کی

دستکاری کے نمونے کبھی شاہوں کے سروں کے تاج اور کبھی شاہزادیوں کے نو لکھے ہار ہوتے ہیں۔

۱۔ مغربی انداز کی پیروی آزاد نے "نیرنگ خیال" کے اکثر مضامین انگریزی سے آزادانہ ترجمہ کیے ہیں لاہور میں قیام کے دوران میں انہیں انگریزی اسلوب اور طرز تحریر سے واقف ہونے کا موقع ملا، اس کے اثرات ان کی تحریروں میں کثرت سے ملتے ہیں۔

مندرجہ بالا خصوصیات کی بنا پر آزاد کا اردو نثر میں ایک خاص طرز تحریر اور منفرد اسلوب کے موجد ہیں ان کے جاندار اسلوب کی نقل آسان نہیں۔

محمد حسین آزاد

اورنگ زیب کی فوجی تیاریاں

تعارف پس منظر

مولانا محمد حسین آزاد کی اس تحریر سے حضرت اورنگ زیبؒ کی ان جنگی تیاریوں کا محض ایک رُخ سامنے آتا ہے جو انہوں نے دکن پر حملے کے سلسلے میں کی تھیں۔

مضمون کا خلاصہ

اس میں بتایا گیا ہے کہ امیر تیمور اور بابر کے زمانے میں فوجوں میں جو بدنظمی کا سا عالم تھا وہ اب ختم ہو گیا تھا اور اکبر، جہانگیر اور شاہجہان نے فوج میں جو نظم و نسق پیدا کیا تھا اور اُسے جو شان و شوکت عطا کی تھی، اورنگ زیبؒ کے عہد میں آکر اُس نے عجیب دلکشی اور رعنائی اختیار کر لی تھی۔

اس اقتباس میں فوج کی اسی شان و شوکت، فوجیوں کی سج دھج، لباس کا حسن، ہتھیاروں کی چمک دمک اور سواریوں کا کروفر بیان کیا گیا ہے مختلف قسم کے دستے اپنے اپنے علم اٹھائے ہوئے چل رہے تھے۔ پہلے ہاتھیوں کا دستہ تھا، اس کے بعد گھوڑوں کا رسالہ جس پر قد آور طاقتور جوان بیٹھے تھے۔ اس کے بعد سانڈنی سواروں کی فوج تھی۔ اس کے بعد بادشاہ کے خاص خادموں اور محافظوں کے دستے تھے جن کے پیچھے مستے چھڑکاؤ کرتے جاتے تھے۔ اس کے بعد بادشاہ اپنے خاص درباریوں کے جلو میں

پالکی پر بیٹھا تھا ——— بادشاہ کی سواری کے پیچھے سیاہ رنگ کے ہاتھیوں کا بہت بڑا ہجوم چلا آرہا تھا۔ ان کے عقب میں چیتوں کے چھکڑے تھے اور شکاری اور محافظ کتے بھی۔ ان کے بعد شاہزادوں، امیروں اور راجوں مہاراجوں کی سواریاں اور دستے تھے اور یوں اورنگ زیب عالمگیر کی افواج جانب دکن چل رہی تھیں (تاکہ وہاں کے باغی اور گمراہ حکمرانوں کو سبق سکھائیں)

مشکل الفاظ و محاورات۔ معانی اور تشریح

صفحہ ۱۴: آئین: دستور، قانون، خوش نصیبی، عیش و عشرت، مراد غرور۔ بگٹٹ یلغاروں: اندھا دھند حملوں
ہزاری سواروں سے ہرے: ایک ایک ہزار سوار سپاہیوں کے دستے
سرائے گائے: برفانی پہاڑی علاقوں کی گائے۔ جریب: زمین کی پیمائش کا خاص پیمانہ

صفحہ ۱۵: نشان چڑھایا: جھنڈا اُٹھایا۔ علم اژدھا پیکر: اژدہے (بہت بڑے سانپ) کی شکل کا جھنڈا یا نشان۔ ماہی مراتب: اعزازی نشان جو بادشاہوں کی سواری کے آگے لے کر چلتے تھے۔ ولایت: سلطنت۔ طرح: فوج کا نشان، جھنڈا۔ برنجی: پیتل کے بنے ہوئے۔ دمامے: نوبت، وہ خاص ڈھول جو جنگ میں بجایا جاتا ہے۔ ہودج: اُونٹ کا کجاوہ یا ہودا پالکی جو اُونٹ یا ہاتھی پر رکھی جاتی ہے۔ عماری: ہاتھی کا ہودہ۔ ہیکلیں: تعویذ یا حمائل شام شفق کی طرح رنگین: ایسی سُرخ یا رنگدار جیسی مغرب آفتاب کے وقت شام ہوتی ہے۔ روپہلی چاندی کے رنگ کی سفید۔ زربفت: سنہرے رنگ کا قیمتی ریشمی کپڑا۔ کلابتونی: ایسا ریشمی کپڑا جس میں چاندی یا سونے کے تار بُنے جاتے ہیں۔ مہاوت: ہاتھی کا محافظ، نگران۔ جوڑے دار پگڑیاں ایسی پگڑیاں جن کے اُوپر طرے ہوں۔ کٹار: تیز دھار چوڑا خنجر۔ گجبگ: ہاتھی کی باگ۔ آنکس لوہے کی نُکیلی سلاخ جس سے ہاتھی کو چلاتے اور مارتے ہیں۔ چرکے: ہاتھی کا چارہ لانے والا سائیس۔ مانہ۔ ہانکنے والا، جس کے پاس سانٹا یعنی چابک ہو۔ برچھیت: برچھی بردار سپاہی۔ باندار قتیلے۔ ان کی بنی ہوئی بتیاں جنہیں آگ لگا کر دشمن پر پھینکا جاتا تھا یا روشنی کے لیے کام آتا پرسے: دستے، ہجوم۔ سرسے پاؤں تک لوہے میں ڈوبے: لوہے کے کوٹ یا زرہ پہنے ہوئے فولادی خود: لوہے کا ٹوپ۔ قرولی: ایک قسم کی چھری، شکاری چاقو۔ چار آئینہ: ایک قسم کی زرہ یا لوہے کا کوٹ جس میں فولاد کی چار تختیاں سُرخ ریشمی کپڑوں (بانات یا مخمل) میں منڈھ کر سینہ اور پُشت کی حفاظت کے خاطر لگاتے ہیں۔ سو سو کوس کے دم: جو سو سو کوس دوڑنے کے بعد بھی تھکتے نہ تھے۔ جنہیں دم نہ چڑھتا تھا۔ انگرکھے: اچکن کی قسم کا لباس۔ آبی بانات: ہلکے نیلے رنگ کا ریشمی کپڑا۔ جڑاؤ زین: ایسا زین جس میں ہیرے جواہرات جڑے ہوں، یا خوب سجا ہو۔ چارجامہ: زین

کی طرح کی پوشش جو گھوڑے پر ڈالی جاتی ہے۔ جھولیاں: پاکھریں، ہاتھی کے پیٹھوں اور کندھوں پر چڑھائی ہوئی زرہیں جو خوبصورتی کا کام بھی دیتی ہیں۔ قاقم: نیولے کی قسم کا ایک جانور جس کی کھال سے بہت قیمتی پوستین بنتا ہے۔ سمور: نہایت باریک ریشم والا پہاڑی جانور۔ چُرا: گائے کی پہاڑی گائے جس کی دم پر خوبصورت بال ہوتے ہیں۔

صفحہ: ۱۶ نقرئی: چاندی کے رنگ کی سفید۔ طلائی: سونے کے رنگ کی، سنہری۔ اُلیل کرتے: اچھل کود کرتے ہوئے۔ چوکڑیاں بھرنا: چھلانگیں لگانا۔ نقیب: بادشاہ کی سواری کے آگے آگے آواز دینے والے۔ چوبدار: لاٹھی بردار، پہریدار، محافظ۔ کرکیتری: ایک ساز جس پر نقیب چوٹ لگا کر اعلان کرتا یا کوئی جنگی گیت بجاتا ہے۔ کرناکوں: خوفناک مہیب آواز۔ خیال بندھا ہوا: تسلسل بندھا ہوا۔ لہو جوش مارنے لگے (محاورہ): دلوں میں جوش پیدا ہو جائے۔ احدی: اکبر بادشاہ کے عہد میں تیر اندازوں کی ایک فوج جن سے خاص موقعوں پر کام لیا جاتا تھا۔ اور وہ براہِ راست بادشاہ کے ماتحت ہوتے تھے۔ خاصہیوں: بادشاہ کے خاص الخاص خادم، اُبنہ: ہجوم، گروہ۔ بانات: ایک قسم کا ملائم اونی کپڑا۔ خاص بردار: وہ سپاہی یا خدمتگار جو بندوق لے کر بادشاہ کی سواری کے آگے آگے چلتے تھے۔ غول: ہجوم۔ کمخواب: ایک قسم کا ریشمی کپڑا۔ مشروع: ایک قسم کا کپڑا جو ریشم اور روئی کے سوت کو ملا کر بنایا جاتا ہے۔ تلواریں سونتنا: تلوار نیام سے نکال کر بلند کرنا۔ ترمچ: سیسے جیسے سفوف کا غول، پانی کا چھڑکاؤ کرنے والوں کی جماعت۔ خواجہ سرا: بادشاہوں اور امیروں کے محلات کا دربان جو عموماً ہیجڑا ہوتا تھا۔ عود سوز: وہ برتن جس میں ایک خوشبودار لکڑی کو جلایا جاتا ہے۔ شاہ خور شید کلاہ: سورج کی طرح کا تاج یا ٹوپی پہنے ہوئے بادشاہ۔ پھادار: ایک قسم کی سواری جسے کہار اُٹھاتے ہیں۔ خاصے کا گھوڑا: بادشاہ کی سواری کا گھوڑا۔ جروب کا پیمانہ: ایک خاص پیمانہ جس سے زمین ناپی جاتی ہے۔ عصا: بادشاہی جلوس میں ہاتھی کے پیچھے پڑی ہوئی ریشم کی ڈوری جسے ایک ملازم اپنے ہاتھ پر لپیٹتا جاتا تھا۔ جب کوس پورا ہو جاتا تو جھنڈی لے کر سامنے آجاتا اور بادشاہ کو سلام کرتا جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ ایک کوس کا فاصلہ طے ہو گیا ہے۔ کوس کا پیالہ پڑتا چلا جاتا تھا: فاصلے طے ہوتا چلا جاتا تھا۔ منگ: ہاتھی کا ہاتھا۔ نرد دوزی: سیمے سنارے کا کام۔ زری کا کام۔ دیدہ بند: وہ غلاف جو سواری کے جانوروں کی آنکھوں پر چڑھا دیتے ہیں تاکہ وہ صرف سامنے دیکھ سکیں۔ تازی: شکاری کتے۔ ولایتی بوکار: ایسی نسل کے کتے جو دوسرے جانور کو منہ میں لیتے ہیں۔ بل ڈوگ۔ (BULL DOG) بڑے قد کا خونخوار محافظ کتا۔ پلنگ: چیتا۔ پھریرے: نشان۔ جھنڈے۔ بہیر بنگاہ: فوج کے ساتھ کے شاگرد پیشہ۔ خدمت گار۔ تاتا: مسلسل ہجوم، تسلسل۔

علامہ شبلی نعمانی

حالاتِ زندگی

نام: محمد شبلی۔ تخلص: نعمانی۔ ولادت: ۱۸۵۷ء بندول، ضلع اعظم گڑھ یو۔پی)
نسلی اعتبار سے راجپوت تھے۔ والد شیخ حبیب اللہ ایک نامور وکیل اور کامیاب تاجر تھے۔
ابتدائی تعلیم اپنے قصبے سے حاصل کی۔ پھر مزید تعلیم کے لیے اعظم گڑھ، جونپور، غازی پور، لکھنؤ، رام پور، لاہور اور دیوبند وغیرہ کا سفر اختیار کیا۔ غازی پور کے مولانا محمد فاروق چریا کوٹی نے شبلی کو بڑی محنت اور محبت سے پڑھایا۔ مولانا فیض الحسن سہارنپوری بھی شبلی کے اساتذہ میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

شیخ حبیب اللہ اپنے بیٹے کو وکیل بنانا چاہتے تھے۔ شبلی نے وکالت یکھی مگر اس پیشے کو رجحانِ طبع کے خلاف پا کر وکالت چھوڑ دی۔ نوکری اور تجارت میں بھی دل نہ لگا۔ آخر کار فروری ۱۸۸۳ء میں چالیس روپے ماہوار پر عربی و فارسی کے استاد مقرر ہوئے ان کی زندگی میں علی گڑھ کا یہ سولہ سالہ قیام بہت اہمیت رکھتا ہے۔ انہیں سرسید احمد اور پروفیسر آرنلڈ کی علمی صحبتوں سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ انہوں نے سرسید کے کتب خانے سے خاصا استفادہ کیا اور آرنلڈ سے فرانسیسی سیکھی۔ مئی ۱۸۹۲ء میں بلادِ اسلامیہ کی سیاحت پر گئے۔ ۱۸۹۴ء میں حکومت کی طرف سے "شمس العلماء" کا خطاب ملا۔ ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ کالج سے مستعفی ہو گئے۔ ۱۹۰۱ء میں حیدر آباد دکن کے محکمہ تعلیم سے وابستہ ہوئے ۱۹۰۵ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ کے معتمد مقرر ہوئے۔ مگر ۶، ۷ برس بعد اختلافات کے سبب الگ ہو گئے۔ اعظم گڑھ میں ایک علمی ادارہ "دار المصنفین" قائم کیا۔ اپنی جائداد اور قیمتی کتب خانہ ادارے کے لیے وقف کر دیا۔ ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو اعظم گڑھ میں انتقال کیا۔

تصانیف: (ا) سیرت و سوانح: المامون، الغزالی، سیرۃ النعمان۔ سوانح مولانا روم۔ سیرۃ النبیؐ۔
(ب) تنقید: موازنہ انیس و دبیر۔ شعر العجم (پانچ جلدیں)
(ج) شاعری: کلیاتِ شبلی (فارسی)، مجموعہ کلام اُردو، کلیاتِ اُردو۔ قصائد۔
(د) متفرق: مقالاتِ شبلی (آٹھ جلدیں)، مکاتیبِ شبلی، سفر نامہ روم و شام۔ علم الکلام۔ الکلام۔

شبلی کا اسلوب

شبلی نعمانی عربی و فارسی کے ماہر اور تمام قدیم علوم کے جامع تھے۔ ان کا ذوق شعر بہت پختہ اور بلند پایہ تھا۔ ان کی تنقیدی صلاحیتوں کی عظمت بھی مسلم ہے۔ جدید علوم کی تحصیل اور ذاتی مطالعے نے ان کی علمی، ادبی اور تنقیدی صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ پھر ان کی خاندانی وجاہت اور نسلی برتری کا احساس، ان سب چیزوں نے مل کر شبلی کے اسلوب کو تشکیل دیا۔ چنانچہ ان کی تحریروں میں ان سب عناصر کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

شبلی کے اسلوب کی نمایاں خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ جوش بیان شبلی نے بڑی پُرجوش طبیعت پائی تھی۔ اس کا سبب غالباً راجپوتوں سے ان کا نسلی تعلق تھا۔ چنانچہ طبیعت کا یہ رجحان تحریروں میں بھی موجود ہے۔ مسلمانوں کی گذشتہ عظمت، اکابر کے کارناموں اور مسلمانوں کو ترقی پر ابھارنے کے تذکرے کے جوش میں اور بھی اضافے کا موجب بنے۔ ان کی بیشتر تحریریں جوش بیان سے لبریز ہیں۔

۲۔ احساس برتری راجپوت ہونے کے ناطے سے شبلی کے اندر ایک گونہ احساس برتری و تفاخر پایا جاتا تھا۔ شخصی انا نے اس احساس کو کو مزید تیز کر دیا۔ عام لوگوں کی نسبت وہ بہر حال زیادہ تعلیم یافتہ، ذہین اور باشعور تھے۔ لہٰذا ان کے اندر احساس کمال کا پیدا ہونا فطرتی امر تھا۔ ان کے اسلوب میں ایک طرح کا احساس فخر، آن بان اور برتری موجود ہے۔ وہ عام قارئین کو ایک بلند مقام سے "تم" کہہ کر خطاب کرتے ہیں۔ دوسروں پر اپنے تفوق کا احساس اور شخصی عنصر کی دخل اندازی کبھی کبھی شبلی کی تحریروں کا عیب بھی بن جاتا ہے۔

۳۔ شعریت شبلی فارسی اور اردو کے بہترین شاعر تھے۔ ان کے ذوق شعر میں کسی کو کلام نہیں۔ تحریر میں بھی رنگینی اور شعریت نمایاں ہے۔ الفاظ و تراکیب کا انتخاب اور ان کا استعمال ان کی خوش ذوقی کا مظہر ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کا کہنا ہے کہ محمد حسین آزاد کے برعکس شبلی کی شعریت، غزل کے عناصر مثلاً ایجاز، ایمائیت اور جمال سے لبریز ہے۔ وہ لفاظی نہیں کرتے۔ بلکہ لطیف، خوش آواز، چٹیلی اور نرم الفاظ کو سلیقہ مندی اور خوش مذاقی کے ساتھ اپنی نثر میں کھپا دیتے ہیں۔

۴۔ ایجاز و اختصار شبلی کا انتخاب الفاظ قابل داد ہے۔ وہ تفصیل اور پھیلاؤ سے بچتے ہیں۔ مقصد اور مفہوم کو مختصر مگر منتخب الفاظ

میں ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ استعارہ اور کنایہ سے بھی کام لیتے ہیں۔

۵۔ بے ساختگی شاعرانہ طبیعت کے باوجود شبلی کی تحریریں تصنع اور تکلف سے پاک ہیں۔ ان کا اسلوب قدرتی اور بے ساختہ ہوتا ہے۔ مگر یہ بے ساختگی سرسید اور حالی کی بے ساختگی سے مختلف ہے۔ سرسید بے ساختگی میں قواعدِ زبان کی پروا نہیں کرتے اور بعض اوقات ان کے ہاں پیچیدگی اور کبھی عامیانہ پن پیدا ہو جاتا ہے۔ حالی کی بے ساختگی نسبتاً بہتر ہوتی ہے مگر بے جان سی۔ جبکہ شبلی کی بے ساختہ عبارت بڑی چست اور جاندار ہوتی ہے۔ پھر سانچہ بھی حسین ہوتا ہے۔

۶۔ طنزیہ انداز طنز، شبلی کے اسلوب کا خاص وصف ہے۔ انہوں نے جمود کا شکار علماء، جدید تعلیم یافتہ لوگوں اور متعصب مستشرقین پر طنزیں کی ہیں بلکہ کہیں کہیں سرسید پر بھی حملے کئے ہیں۔ ان کے طنزیہ حملے خفیف مگر نوکدار ہوتے ہیں۔ کبھی وہ فارسی یا اردو کے ایک آدھ برمحل شعر کی صورت میں طنز کر جاتے ہیں۔ شبلی کی طنزوں سے ان کی طبعی شوخی اور نکتہ آفرینی کا اظہار ہوتا ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے انہیں طنزیات کا "امام" کہا ہے۔

غرض شبلی اپنی نثر کے آئینے میں ایک بہت بڑے ادیب اور انشاء پرداز نظر آتے ہیں۔ ان کا سنجیدہ و جمیل اسلوب منفرد ہے اور عظیم بھی۔ ان کی نثر نے اردو ادب کو بڑی وسعت اور ترقی بخشی۔ ان کا اسلوبِ بیان ناقابلِ اتباع ہے۔

شبلی کی اَدبی خدمات

سوال ۱۔ شبلی نعمانی کی ادبی خدمات پر ایک تنقیدی نوٹ لکھئے۔؟

جواب ۱۔ شبلی نعمانی ایک اچھے ادیب، بلند پایہ نقاد، خوش گو شاعر اور جید عالم تھے۔ قدرت نے انہیں ذہانت اور طباعی کی صلاحیت وافر مقدار میں عطا کی تھی۔ انہوں نے اپنی جملہ صلاحیتوں کو مذہبی، دینی اور علمی و ادبی خدمات کے لئے وقف کر دیا۔ ان کی شخصیت کی طرح ان کے قلمی سرمائے میں بھی انفرادیت کی ایک شان پائی جاتی ہے۔

انہوں نے اپنی ادبی صلاحیتوں کو ملی اور ملکی اصلاحِ احوال کے لئے استعمال

کیا۔ اگرچہ وہ سرسید سے کچھ اختلافات بھی رکھتے تھے۔ تاہم علی گڑھ کی اصلاحی تحریک میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ ان کے علمی کاموں نے علی گڑھ تحریک کو آگے بڑھایا اور اس کے مقاصد میں مفید مدد بہم پہنچائی۔

سیرت و سوانح پر بلند پایہ تصانیف، شبلی کی ادبی خدمات کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ ان کی آخری تصنیف "سیرۃ النبیؐ" اردو میں رسول پاکؐ کی سوانح پر پہلی مفصل، جامع اور مستند تحقیقی تالیف ہے جس کا مقصد شبلی کے نزدیک اخلاق کی اصلاح و تربیت تھا۔ اسی طرح "الفاروق" بھی ان کا بڑا ادبی کارنامہ ہے۔

شبلی کی ادبی خدمات کا ایک پہلو یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تصانیف کے ذریعے مسلمانوں کے دلوں میں ان کے شاندار ماضی اور اکابر شخصیتوں کی عظمت کا نقش بٹھایا۔ اس سلسلے میں "سیرۃ النعمان" اور "المامون" وغیرہ خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کی مذکورہ ادبی تصانیف کا مقصد یہ تھا کہ گذشتہ عظمت کے واقعات پڑھ کر مسلمانوں کے دلوں میں ترقی کے لئے نیا ولولہ اور جوش پیدا ہو۔

شبلی نے اپنی تصانیف کے ذریعے ایک جدید قسم کی علمی و ادبی تحریک کی بنیاد رکھی۔ جس کے نتیجے میں ۲۰ ویں صدی کے اوائل میں متعدد علمی اور تالیفی و تصنیفی ادارے قائم ہوئے۔ اردو علم و ادب کی ترویج و ترقی میں انہوں نے ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔ شبلی نے ندوۃ العلماء کے معتمد کی حیثیت سے مفید خدمات انجام دیں۔ پھر عمر کے آخری دور میں اعظم گڑھ میں دارالمصنفین قائم کیا اور اس کے لیے اپنی ساری جائداد، باغ اور کتب خانہ وقف کر دیا۔ یہ ادارہ اب تک علمی و ادبی خدمات انجام دے رہا ہے۔

انہوں نے سوانح نگاری اور تاریخ نویسی کے جدید اصول متعین کئے اور الفاروق، سیرۃ النعمان اور المامون وغیرہ کے ذریعے مؤرخین اور سوانح نگاروں کو ایسی شاہراہ دکھائی جس کے واسطے سے اردو میں تاریخ و سوانح کا ایک عظیم علمی سرمایہ وجود میں آیا۔ ان کا نظریۂ سوانح و تاریخ سرسید کے دبستان سے الگ ہے۔ وہ مغرب سے مرعوب نہیں۔ وہ مغربی مؤرخوں کے افکار پر تنقیدی نگاہ ڈالتے اور ان کی غلط بیانیوں کو اجاگر کرتے ہیں۔

ادبی تنقید میں بھی شبلی کی خدمات کم اہم نہیں۔ انہوں نے مغربی تنقید سے استفادہ کیا۔ مشرقی ادبوں سے وہ بخوبی واقف تھے۔ ان کا تنقیدی ذوق بہت پختہ اور مکمل ہے۔ اس لئے اردو تنقید کے ابتدائی نقاد خال متعین کرنے

ہیں ان کی تنقیدی تحریروں کو بڑا دخل ہے۔
غرض شبلی کی ادبی خدمات بہت وسیع اور متنوع ہیں۔ سوانح نگاری، تاریخ نویسی، ادبی تنقید، تبصرہ نگاری اور نظم نگاری کی تاریخ میں ان کی خدمات سے انکار ممکن نہیں۔

علامہ شبلی نعمانی

اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر

تعارف اور پس منظر

زیر نظر مضمون علامہ شبلی نعمانی کے ایک طویل مضمون کا حصہ ہے جو اسی عنوان کے تحت ایک کتابچے کی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ اس میں انہوں نے متعصب اور تنگ نظر ہندو اور انگریز مورخین کے ان سارے الزامات کا ٹھوس دلائل کے ساتھ رد کیا ہے جو انہوں نے حضرت اورنگ زیب عالمگیر پر لگائے تھے اور ثابت کیا ہے کہ موصوف بے مدالنصاف پرور، غیر متعصب، فراخدل حکمران تھے اور بہترین منتظم بھی، جنہوں نے اپنی ساری رعایا سے بلا تمیز مذہب ہمیشہ انصاف کیا اور عوام کی فلاح و بہبود کا ہمیشہ خیال رکھا۔

سبق کا خلاصہ

اورنگ عالمگیر کو بے بنیاد الزامات کے تحت بدنام کیا گیا۔ اب وقت آگیا ہے کہ اس کی حقیقی خوبیوں کو واشگاف کیا جائے۔

اورنگ زیب کے عہد میں مغلیہ سلطنت جس قدر وسیع ہوئی اس کی مثال پورے تیموری خاندان کی تاریخ میں نہیں ملتی، لیکن اس کے باوجود انہوں نے انتظامی نقطۂ نظر سے کامیابیاں بھی ایسی حاصل کیں جن کی اس سے پہلے نظیر نہیں ملتی۔ مثال کے طور پر:۔

- اس سے قبل حرام پر کوئی اسّی (۸۰) قسم کے ٹیکس عائد تھے اورنگ زیب نے وہ سب منسوخ کر دیئے۔
- عالمگیر نے زمین اور مالگزاری کا اتنا اچھا بندوبست کرایا کہ رعایا خوشحال ہوگئی اور سرکاری خزانے میں اضافہ ہوا۔
- اس سے قبل جب کوئی سرکاری عہدیدار فوت ہو جاتا تو اس کی جائداد بحق سرکار ضبط کرلی جاتی تھی، اورنگ زیب نے یہ بے رحمانہ روایت ختم کر دی۔
- خلافتِ راشدہ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے بعد انصاف کی یہ مثال صرف اورنگ زیب عالمگیر کے دور میں ملتی ہے کہ ہر آدمی کو بادشاہ کے خلاف انصاف طلب کرنے کی اعلانیہ دعوت دی گئی۔
- ملک اور عوام کے حالات معلوم کرنے کے لیے پرچہ نویسی اور واقعہ نگاری کا محکمہ قائم کیا۔ پرچہ نویسوں کو بددیانتی سے بچانے کے لیے خاص احتیاط کی جاتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے حالات سے جتنا عالمگیر واقف تھے اور عوام کے آرام و آسائش کے لیے جس قدر انہوں نے کوشش کی، اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔
- اورنگ زیب سلطنت کے ایک ایک ٹکے، شعبے اور فوج کشی کے مصروفیوں سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ اور ان معاملات میں خود ہدایات جاری کرتے تھے۔
- بادشاہ امراء سے نذرانے وصول کرتے تھے جن کی تلافی کے لیے امراء رعیت سے رشوت وصول کرتے یا جبری وصولی کرتے تھے اورنگ زیب نے نذرانے قبول کرنے کی رسم ختم کر دی۔ جس سے عام لوگوں کو فائدہ ہوا۔
- اورنگ زیب کے عہد کا سب سے روشن پہلو اُن کا عدل و انصاف ہے۔ کوئی شخص اپنی دولت یا منصب کی وجہ سے بچ نہیں سکتا تھا اور کوئی شخص اپنی غریبی کے سبب سے نظر انداز نہیں کیا جاتا تھا۔ وہ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کی بات اتنی ہی توجہ سے سنتے تھے جتنی بڑے سے بڑے افسر کی۔ اس کے پچاس سالہ طویل عہد حکومت میں کسی غیر مسلم سے بھی بے انصافی نہ ہوئی۔ عوام سے انہیں بے پناہ محبت تھی۔ اٹھتر سال کی عمر میں بھی وہ اپنے ہاتھ سے عرضیاں وصول کرتے اور خود پڑھ کر اپنے ہاتھ سے احکام صادر کرتے تھے۔ اس کے لیے دن میں دو تین مرتبہ دربار عام منعقد ہوتا تھا اور ہر شخص کو اس میں بلا روک ٹوک آنے اور فریاد کرنے کی اجازت تھی۔ انصاف کا یہ عالم تھا کہ ان کے لاڈلے

کام بخش کے رضاعی بھائی نے جب کسی کو قتل کر دیا اور کام بخش نے اس کی حمایت کی تو اورنگ زیب نے دونوں کو گرفتار کرا کے جیل میں بند کر دیا۔

مشکل الفاظ کے معانی اور تشریح

صفحہ ۱۸ عیب جملہ بگفتی، ہنرش نیز بگو۔ تم نے اس کے عیبوں کے بارے میں سب کچھ کہہ دیا ہے۔ اب اس کی خوبیوں کو بھی بیان کرو۔ یہ ضرب المثل ایسے موقعوں پر بولتے ہیں جب کسی کی خامیاں ہی خامیاں بیان کی جا رہی ہوں۔ حاصل۔ خلاصہ، نتیجہ۔ تحسین۔ تعریف۔

ص ۱۹ نفرین۔ لعنت۔ معائب۔ عیب۔ خامیاں۔ محاسن۔ اچھائیاں۔ خوبیاں۔ صور پھونکنا (محاورہ) چرچا کرنا۔ شہرت دینا۔ بلند آہنگی۔ زور شور سے۔ لفظی معنی بلند آواز سے۔ تیرہ و تار۔ سخت تاریک۔ مطلع۔ طلوع ہونے کی جگہ مراد فضا۔ مسخر کرنا۔ فتح کرنا۔ کشور کشا۔ سلطنت فتح کرنے والا۔ موقوفی۔ منسوخی۔ ختم کرنا۔ مالگذاری۔ زمین کے لگان کا قانون۔ خافی خان۔ محمد اورنگ زیب کا ایک مورخ جو دل سے اورنگ زیب کا مخالف تھا۔ اس نے ہندوستان کے تیموری خاندان کی تاریخ لکھی تھی۔ محاصل۔ واحد محصول۔ ٹیکس۔ یک قلم۔ یک لخت۔ فوراً۔ موقوف کر دیئے۔ ختم کر دیئے۔ سرشماری، برشماری، طوفانہ، شکرانہ: مختلف اقسام کے ٹیکس۔

ص ۲۰ دستور العمل۔ قانون۔ قاعدہ۔ تجدید۔ جدید بنانا۔ نئے سرے سے مرتب کرانا۔ ترمیم۔ تبدیلی۔ جرنل۔ علمی و تحقیقی رسالہ۔ تطویل۔ طوالت۔ طویل ہونا۔ لمبا ہونا۔ منسوب کرنا، نسبت قائم کرنا۔

مصالح۔ واحد مصلحت۔ خوبی۔ بھلائی۔ سرچشمہ۔ منبع۔ مقام آغاز۔

ص ۲۱ لین پول۔ ایک انگریز مورخ۔ ناظرین۔ دیکھنے والے یعنی اس کتاب کو پڑھنے والے۔ دادرسی۔ انصاف۔ پرچہ نویسی۔ خبریں لکھنے کا کام۔ صیغہ۔ محکمہ۔ مرتشی۔ رشوت کھانے والا۔ جزئی۔ چھوٹے سے چھوٹا۔

فارسی عبارت کا ترجمہ: سوانح نگار اپنی نفسانی اغراض کے تحت ملازمین کے بارے میں باتیں بڑھا چڑھا کر مرتب کرتے ہیں حالانکہ انہیں چاہئے کہ وہ پوری تحقیق کے بعد ساری تفصیل رجسٹر پر لکھا کریں اور ہمارے حضور میں پیش کریں۔

فارسی عبارت کا ترجمہ: اگر وہ مناسب سمجھے تو واقعہ نگاری کے کام کے لیے کسی

دوسرے کو مقرر کر دے کہ موجودہ واقعہ نگار اس منصب پر کام کرنے کا اہل نہیں۔
سطر ۱۲، ۱۳ فارسی عبارت کا ترجمہ: واقعہ نگاروں اور قابل اعتماد و محتاط ہرکاروں کو خوب تحقیق کرنی چاہیے اور روزمرہ کاموں کے بارے میں احکام پڑھنے چاہئیں۔

نظیر۔ مثال۔ فروگزاشت۔ غلطیاں۔ خامیاں۔ عامل۔ حاکم۔ گورنر۔ بازپرس۔ پوچھ گچھ کرنا۔ کلیات۔ واحد۔ کلی۔ ہر قسم کے معاملات۔ جزئیات۔ ایک ایک جزء۔

ص ۲۳ آگہی۔ خبر۔ علم۔ خبرسی۔ پوری توجہ سے۔ کارگزاری۔ کام۔ سرگرمی۔ باتیں۔ مقصود۔ اس مقصد کے تحت۔ مندرج۔ لکھی ہوئی ہونا۔ باربرداری۔ سامان لے جانے کے ذرائع۔ رسد۔ کھانے کا سامان۔ فراہمی۔ بدول۔ بغیر۔ ہیٹ کر۔ محرر۔ منشی۔ کلرک۔ فہمائش۔ جھڑک۔ ناراضگی۔ خفگی۔ ملنفت۔ توجہ دینا۔ بیدار مغزی۔ دانش مندی۔ سوجھ بوجھ۔ اجرائے کار۔ کام کا جاری کرنا۔

اجرائے کار۔ کام کا جاری کرنا ص ۲۴ عمال واحد۔ عامل۔ گورنر۔ حاکم۔ مفاسد۔ بری باتیں۔ افتتے۔

ص ۲۵ چنداں کچھ زیادہ۔ اخذ کرنا۔ حاصل کرنا۔ پاس داری نہ تھی۔ لحاظ نہ تھا۔ امارت۔ امیری منصب عہدہ۔ مسندی۔ توجہ سے۔ تیزی سے۔ کلماتِ تحسین۔ تعریف کی باتیں۔ تکلیف رسانی۔ تکلیف پہنچانا۔ تازونعم۔ عیش وعشرت۔ راحت رسانی۔ آرام پہنچانا۔ انتہائے پیری۔ بڑھاپے کے آخر تک۔

ص ۲۶ عنفوانِ پیری۔ بڑھاپے کی چھڑی۔ دادخواہ۔ انصاف طلب کرنے والے۔ مظلوم۔ ہمنشیں بیٹھنے والے۔ بہت خوش۔ ہنستا ہوا۔ مترشح۔ ظاہر۔ شادان و فرحاں۔ خوش وخرم۔ مطلق۔ ہرگز۔ کوکہ۔ رضاعی بھائی۔ جس کی ماں کا دودھ پیا ہو تعمیل ہوئی۔ عمل ہوا۔

پیراگراف کی تشریح

سوال: مندرجہ ذیل اقتباس کی تشریح، حوالہ، متن اور سیاق وسباق کے ساتھ کیجیے۔

"ایشیائی سلطنتیں اس بات میں ہمیشہ بدنام رہیں کہ عمال اور عہدیدار اکثر رشوت خور ہوتے تھے۔ اس رشوت خوری کے اسباب میں سب سے بڑا سبب پیشکش اور نذرانہ کی رسم تھی۔ یعنی تمام وزرا، امرا، عمال سالانہ جشن میں بادشاہ کو نہایت گراں قیمت نذرانے پیش کرتے تھے۔ یہ نذرانے اکثر ان لوگوں کی سالانہ تنخواہ کے قریب قریب برابر پڑ جاتے تھے۔ اس بنا پر ان لوگوں کو اس تلافی کے لیے خواہ مخواہ رعایا سے رشوت لینی پڑتی

تھی۔ جہانگیر اپنی توزک میں ان نذرانوں کا ذکر بڑے تعلق اور مسرت کے لہجے سے کرتا ہے اور ایک ایک چیز کی تفصیل بتاتا ہے۔

جواب: حوالۂ متن یہ عبارت مولانا شبلی نعمانی کے مضمون "اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر" سے لیا گیا ہے۔

سیاق و سباق علامہ شبلی نعمانی نے اس مضمون میں ان الزامات کو غلط ثابت کیا ہے جو مختلف مورخوں نے اورنگ زیب عالمگیر پر لگائے تھے اور ثابت کیا ہے کہ ظلم و بے انصافی تو دور کی بات ہے۔ عالمگیر نے تو انصاف پروری اور عوامی بہبود کے لیے بہت سے ایسے قدم اٹھائے تھے جن کی پہلے مثال نہیں ملتی۔ تشریح طلب عبارت مضمون کے جس حصے سے لی گئی ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ اورنگ زیب سے پہلے بادشاہ اپنے درباریوں اور عہدے داروں سے بھاری نذرانے لیتے تھے جس کی تلافی میں یہ لوگ عوام کو لوٹتے اور ان سے جبراً رشوت وصول کرتے تھے لیکن اورنگ زیب نے نذرانے وصول کرنے کی روایت ہی ختم کر دی اور یوں عوام ایک مستقل مصیبت سے نجات پا گئے۔

تشریح ایشیا کی سلطنتیں ہمیشہ اس تباہت کا شکار رہیں کہ ان کے گورنر اور عہدیدار رشوت خور ہوتے تھے۔ صورت یہ ہوتی تھی کہ سالانہ جشن میں تمام وزیروں، گورنروں اور دیگر عہدیداروں کو بادشاہ کے حضور میں بھاری نذرانے دینے پڑتے تھے۔ یہ نذرانے قیمت کے اعتبار سے اس رقم کے برابر یا زیادہ ہوتے تھے جو انہیں سالانہ تنخواہ کے طور پر ملتی تھی۔ چنانچہ تلافی کی خاطر انہیں نہ چاہتے ہوئے بھی عوام سے جبراً رشوت لینی پڑتی تھی۔ نذرانوں کی یہ روایت اتنی پرانی اور حکم تھی کہ ہر بادشاہ بہر حال اس کی توقع کرتا تھا اور جہانگیر نے تو اپنی خود نوشت "توزک جہانگیری" میں ان کا ذکر مزے لے لے کر کیا ہے اور نذرانوں کی ایک ایک تفصیل بیان کی ہے۔

اس کے بعد مصنف نے بتایا ہے کہ اورنگ زیب نے نذرانے کی یہ رسم ہی ختم کر دی جس سے امراء نے بھی سکھ کا سانس لیا اور عوام نے بھی رشوت کی فراہمی سے نجات پائی۔

مولانا عبدالحلیم شرر

حالات زندگی عبدالحلیم شرر ۱۰ جنوری ۱۸۶۶ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد

محمد تغلق کے عہد میں ترکستان سے ہندوستان آئے تھے۔ پہلے دہلی اور پھر جونپور میں قیام رہا۔ اس کے بعد لکھنؤ میں مقیم ہو گئے۔ شرر کے والد مولوی تفضل حسین ٹیاگ، کلکتہ میں بادشاہ کے محرر کی حیثیت سے ملازم تھے اور بیس روپے ماہوار تنخواہ پاتے تھے۔ شرر نے ابتدائی تعلیم پہلے اپنے والد سے اور پھر بعض علماء سے حاصل کی۔ انہیں ایک طرف تو دین داری کا ماحول ملا اور دوسری طرف شہزادوں کی رندانہ صحبتیں میسر آئیں۔ یہاں انہیں بٹیر بازوں اور داستان گوؤں کی محفلوں میں بھی شریک ہونے کا موقع ملا۔ کلکتے میں قیام کے زمانے میں وہ "اودھ اخبار" لکھنؤ کے نامہ نگار مقرر ہوئے۔

انیس سال کی عمر میں لکھنؤ آئے۔ عربی کی مزید تعلیم شروع کی۔ اگلے برس شادی ہو گئی۔ پھر دہلی جا کر علم حدیث کی تکمیل کی۔ کلکتے میں انہوں نے ابتدائی انگریزی سیکھی تھی۔ بعد میں ذاتی مطالعے سے انگریزی میں مزید لیاقت پیدا کی۔ ۱۸۸۰ء میں "اودھ اخبار" کے ادارتی عملے میں شامل ہو گئے۔ اگلے سال انہوں نے ایک دوست کے نام سے ہفتہ وار "محشر" جاری کیا۔ ۱۸۸۲ء میں "اودھ اخبار" کی ملازمت چھوڑ کر ناول نگاری شروع کی۔ شرر کا پہلا ناول "دلچسپ" کے نام سے شائع ہوا۔ ۱۸۸۸ء میں انہوں نے اپنے رسالے "دلگداز" میں تاریخی ناولوں کا سلسلہ شروع کیا جو کئی سال تک جاری رہا۔ دو سال بعد اخبار "مہذب" نکالا۔

۱۸۹۱ء میں حیدر آباد میں ملازمت مل گئی۔ پھر انگلستان جانے کا موقع ملا۔ وہاں شرر نے فرانسیسی زبان سیکھی، تاریخ کا مطالعہ کیا اور کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ ساتھ لے آئے۔

انگلستان سے واپسی پر کئی بار حیدر آباد جانے کا موقع ملا۔ وہاں ملازمت بھی کی۔ ایک بار نظام حیدر آباد نے اپنی سوانح عمری لکھنے کے لئے بلایا۔ نیز تاریخ اسلام لکھنے پر مامور کیا۔ پھر کسی سبب سے حیدر آباد میں شرر کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا۔ جس کا انہیں بہت قلق تھا۔ اس عرصے میں شرر کا اخبار "دلگداز" کئی بار جاری ہو کر بند ہوا۔ اس دوران میں تصنیف و تالیف کا کام جاری رہا۔

آخری دو برس ان کی صحت خراب رہی۔ مگر اس کے باوجود انہوں نے لکھنے پڑھنے کا کام بند نہ کیا۔ وفات سے دو ایک روز پہلے انہوں نے "دلگداز" کا شمارہ مرتب کیا۔ ۲۴ دسمبر ۱۹۲۶ء کو لکھنؤ میں انتقال کیا۔

فردوس بریں، ملک العزیز ورجینا، منصور موہنا، دلچسپ، حسن انجلینا وغیرہ

ناولوں کے علاوہ تاریخ و سوانح و دیگر موضوعات پر انہوں نے ایک سو سے اوپر کتابیں لکھیں۔

شررؔ کا اسلوب

اردو ادب کی تاریخ میں شررؔ کی شخصیت بڑی اہمیت رکھتی ہے وہ بیک وقت ناول نگار، مؤرخ، انشائیہ نگار، نقاد، صحافی، ڈرامہ نگار، مسلم اور عالم تھے مگر جن چیزوں نے ادب میں انہیں اہمیت بخشی وہ ان کے ناول، تاریخیں اور انشائیے ہیں۔ ان کا صحافتی کارنامہ بھی کم نہیں۔

بحیثیت مجموعی ان کے اسلوب پر نظر ڈالی جائے تو مندرجہ ذیل خوبیاں خصوصیات سامنے آتی ہیں۔

۱۔ تفصیل پسندی شررؔ ایک بسیار نویس ادیب تھے۔ انہوں نے چالیس سے اوپر تو صرف ناول لکھے، انشائیے، مضامین، تاریخی کتابیں اور صحافتی تحریریں ان کے علاوہ ہیں۔ کثرت نویسی کا سبب یہ تھا کہ وہ ہر شے کو شبلی کے برعکس تفصیل سے بیان کرنے کے عادی تھے۔ ان کے جملے اور پیراگراف اکثر طویل ہوتے ہیں۔ انہوں نے اس قدر جزئیات سے کام لیا ہے کہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کی خصوصیات اور ان کے فوائد و نقصانات کو بھی نظر انداز نہیں کیا وہ معمولی باتوں کو بھی پھیلا کر وضاحت کے ساتھ لکھتے ہیں۔

۲۔ افسانوی انداز بنیادی طور پر وہ ایک کہانی نویس تھے۔ ان کی کتابوں کی سب سے زیادہ تعداد ناولوں کی ہے۔ دوسری تاریخی کتابوں اور مضامین میں بھی شررؔ کی تحریر پر افسانوی انداز غالب ہے۔ وہ اپنے قصہ گوئی کے شوق میں معمولی باتوں کو بھی کہانی و افسانہ کے دلچسپ پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ افسانوی انداز کی وجہ سے ان کی تحریروں میں بڑی کثرت سے مکالمے ملتے ہیں۔

۳۔ رنگینی اور تکلف لکھنؤ، شررؔ کا وطن تھا۔ ان کی عمر کا بڑا حصہ بھی یہیں گذرا۔ ان کی شخصیت پر لکھنوی مزاج اور روایات کی گہری چھاپ تھی۔ چنانچہ ان کی تحریروں میں بھی مخصوص لکھنوی انداز تحریر کے مختلف عناصر مثلاً رنگینی، تکلف، تصنع، لفاظیت وغیرہ کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ناولوں کے مکالمے بعض اوقات بڑے مامیانہ، بازاری اور بھونڈے ہو جاتے ہیں۔

۴۔ سلاست اور شستگی اوپر جس لکھنوی انداز کا ذکر ہوا، وہ شرر کے اسلوب کا مستقل رنگ نہیں ہے۔ ان کے ہاں سلیس، رواں اور شستہ عبارتوں کے نمونے بھی کثرت سے ملتے ہیں۔ درحقیقت شرر کا زمانہ ایسا تھا کہ باوجود لکھنوی اثرات کے کسی ادیب کے لئے سرسید کی ادبی تحریک سے دامن بچا کر کامیابی حاصل کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ سرسید کی ادبی تحریک کی بنیاد ہی سادہ نویسی اور سلاست پر تھی چنانچہ شرر نے بھی اس سے گہرا اثر قبول کیا جس کی جھلکیاں ان کے ہاں بکثرت ملتی ہیں۔

۵۔ عربی و فارسی کا ذوق شرر عربی و فارسی کے عالم تھے۔ کچھ لکھنوی تصنع کے اثرات بھی تھے پھر تفصیل اور وضاحت کے وہ بہت شائق تھے۔ اس لئے انہوں نے عربی و فارسی کی مشکل ترکیبیں، آیات و احادیث، مقولات و اشعار اور ضرب الامثال کا بہت استعمال کیا ہے۔ اس سے بلاشبہ ان کے علم و فضل کا ثبوت ملتا ہے اور ان کے مذاق اور معلومات کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے مگر تحریر بہت بوجھل اور گراں ہو جاتی ہے۔

۶۔ غیر محتاط انداز شرر زود نویس تھے۔ اس لئے ان کی تحریروں میں جا بجا ایسی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں جنہیں احتیاط کی کمی کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس غیر محتاط رویے نے ان کی بعض عبارتوں کو ناہموار بنا دیا ہے۔ غالباً سرسید سے متاثر ہو کر شرر نے انگریزی الفاظ کا بکثرت استعمال کیا مگر وہ اجنبی اور بے جوڑ دکھائی دیتے ہیں۔ پھر جس طرح سرسید نے جوش بیان میں کہیں کہیں زبان کی صحت اور قواعد کا خیال نہیں رکھا۔ اس طرح شرر نے بھی یہ کوتاہی کی ہے۔ کہیں محاورہ غلط ہے، کہیں گرامر کی غلطی رہ گئی کہیں جملہ بے ڈھنگا اور بدنما ہے۔ اگرچہ ایسی مثالیں کم ہیں تاہم اس سے شرر کی غیر محتاط روش کا اندازہ ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ باوجود متعدد خامیوں کے شرر ایک بلند پایہ ادیب اور انشاپرداز تھے۔ ان کی تحریروں نے اردو نثر نگاری کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا اور ان کی اہمیت نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔

مولوی عبدالحلیم شررؔ

صحبتِ برہم

تعارف و پس منظر

عبدالحلیم شررؔ اردو کے معروف ناول نگار اور ادیب ہیں۔ اردو میں تاریخی ناولوں کا آغاز سب سے پہلے انہوں نے کیا۔ متعدد ناولوں کے علاوہ ان کی تصنیف "گزشتہ لکھنؤ" لکھنوی تہذیب و تمدن کا ایک دل نشین مرقع ہے۔ شررؔ کو تاریخ اور زمانۂ گزشتہ سے طبعی لگاؤ تھا۔ ان کی جملہ تصانیف ماضی کے ساتھ ان کی وابستگی کا ثبوت ہیں۔ انہوں نے اپنے رسالے "دل گداز" میں مختلف موضوعات پر وقتاً فوقتاً بہت سے مضامین لکھے۔ کئی مضامین میں تو انشائیے کا رنگ جھلکتا ہے۔ ان کی متفرق تحریریں "مضامینِ شررؔ" کے نام سے کئی جلدوں میں شائع ہو چکی ہیں۔

زیرِ مطالعہ مضمون "صحبتِ برہم" میں ایک شخص جو قبر میں لیٹا آخرت کا منتظر ہے، عالمِ تصور میں اپنی زندگی کے مختلف ادوار کی سیر کرتا ہے اور ایامِ گزشتہ کو یاد کر کے افسوس کرتا ہے۔ اس کے دل میں رہ رہ کر یہ ارمان پیدا ہوتا ہے کاش: ایک بار زندگی کے بھولے بسرے دن لوٹ آئیں۔

سبق کا خلاصہ

ہمیشہ سے انسان کی فطرت رہی ہے کہ وہ ایامِ گزشتہ کو یاد کر کے کفِ افسوس ملتا ہے۔ اگر ہم گردن جھکا کر بیٹھ جائیں اور یادِ ماضی کے دریچے وا کر دیں تو گزری ہوئی زندگی، اس کی صحبتیں اور دوستوں کی دلچسپ محفلیں ایک فلم کی طرح ذہن کے پردۂ سکرین پر نمودار ہونا شروع ہوں گی۔ یا اگر ہم اپنے ماضی کے البم کے اوراق الٹنا شروع کر دیں تو ہر ورق کچھ ایسا دلکش منظر پیش کرے گا کہ ہم وہاں رُکنا چاہیں گے

اس ایام کا پہلا صفحہ بچپن ہے۔ سادگی، بھولپن اور معصومیت۔ چھوٹی چھوٹی آرزوئیں مختصر سا دائرۂ کار، محبت اور شفقت کرنے والے لوگ۔ مگر معصومیت اور پاکیزگی کا یہ مختصر دور بہت جلد گزر گیا۔ اور ہم بچپن سے لڑکپن کی حدود میں داخل ہو گئے۔ زندگی کے اس دوسرے دور میں مدرسہ، اساتذہ اور حصولِ تعلیم کا مرحلہ یاد آتا ہے۔ ہم جماعتوں اور ہم عمروں کی پُرخلوص دوستی۔ ان کے ساتھ گپ بازی اور دل لگی کے مناظر یاد آتے ہیں۔ ہم انہیں ملنا چاہتے ہیں مگر یہ تصوراتی صحبت بھی پلک جھپکنے میں برہم ہو گئی۔ تیسرا دور جوانی کا تھا۔ اس دور میں جذبات انتہائی عروج پر تھے۔ دوستوں سے مذاق، لطیفہ گوئی۔ جذبۂ عشق بھی اپنی جولانیاں دکھاتا۔ محبوب کے فراق میں بے چین رہتے اور جب وہ ملتا تو اس سے ہنسی مذاق، ٹھٹھا اور چھیڑ چھاڑ ہوتی۔ محبوب کے ساتھ گزارے ہوئے یہ لمحات آج ہمیں اس قدر رنگین معلوم ہوتے ہیں کہ آج بھی دل سے ایک ہوک سی اٹھتی ہے۔ کاش! محبوب کی یہ صحبت پھر نصیب ہوتی۔

ایامِ جوانی میں کبھی کبھار ہماری مذہبی عقیدت ہمیں حضرت شیخ کی مجلسوں میں لے جاتی اگرچہ ہمیں نیکی و پاکبازی سے کچھ تعلق نہ تھا تاہم زاہد خشک اپنی مجلسوں میں ہماری شمولیت پر خوش ہوتے اور ہماری بے حد قدر افزائی کرتے۔ غرض ایامِ گزشتہ کی یہ روداد رنگین ہونے کے ساتھ متنوع کیفیات کی حامل ہے۔ ہم کبھی میلوں اور تماشوں میں شریک ہوتے، کبھی موسیقی کی دھنوں اور گیتوں کی تانوں پر بے قرار ہوتے کبھی کوچۂ محبوب میں آوارگی۔ یہ صحبتیں گزر گئیں تو دل بجھ کر رہ گیا۔

اب بڑھاپے نے آ لیا تھا، لوگ ہمیں بزرگ سمجھ کر ہماری عزت کرنے لگے ہم تجربہ کار اور معاملہ فہم ہو گئے۔ چھوٹے ہم سے عقیدت کا اظہار کرنے لگے۔ اور تو اور وہ پری جمال، دورِ جوانی میں ہم جن کی ناز برداری کیا کرتے تھے، اب ہمارے سامنے بچھے جاتے تھے مگر افسوس کہ اب ہمارے جذبات مُردہ ہو چکے تھے۔ غور سے دیکھیے تو زندگی کا یہ دور بھی غنیمت تھا مگر افسوس کہ موت نے اس صحبت کو بھی برہم کر دیا۔ اب ہم قبر میں لیٹے لیٹے ان گزشتہ صحبت ہائے برہم کو یاد کرتے ہیں، یا پھر آخرت کی فکر ہے۔ جو مجلس میدانِ حشر میں جمے گی اس میں ہم سے اعمالِ گزشتہ کا حساب کتاب لیا جائے گا اس وقت ہمارا کیا حال ہوگا۔ خدا کے حضور جواب دہی یہ مرحلہ یقیناً بڑا مشکل مرحلہ ہوگا۔

پھر بھی، جب کبھی نظر پلٹ کر ماضی کی طرف جاتی ہے تو دل کو کسی گوشے سے

یہ چھپی ہوئی خواہش حسرت بھرے انداز میں کہتی ہے : ماضی کی صحبتوں سے ایک بار لطف اٹھایا۔ دوبارہ اس لطف اندوزی کی ہوس ہے۔

مشکل الفاظ و محاورات ۔ معانی اور تشریح

ص ۲۸ برہم ہونا : اکٹ پلٹ ہونا۔ منتشر ہونا۔ دھن : خیال۔ تصور۔ تصورِ جاناں : محبوب کا خیال ۔ قندیل : چراغ ۔ مشعل۔ فانوس : ایک قسم کا شمع دان۔

ص ۲۹ تردد : شک ۔ ہچکچاہٹ ۔ بے تاب : بے چین ۔ نسیان : بھول جانے کا مرض ۔ ہوش ربا : ہوش اُڑانے والا ۔ جگر خراش : جگر کو زخمی کرنے والا ۔ سخت تکلیف دہ ۔ کرشمہ سازی : انوکھی بات یا عجیب کام کرنا ۔ الہم : تصور پر دل کی کتاب کرشمہ دامن دل مے کشد کہ جا اینجا است : کرشمہ دامن دل کھینچتا ہے کہ یہ مقام قابل توجہ ہے ۔ یعنی ہر ہر قدم پر انوکھی باتیں پیش آتی ہیں ۔ حسرت : افسوس پشیمانی ۔ اندوہ : غم ۔ یاس و حرماں : مایوسی اور محرومی ۔ نفع و ضرر : فائدہ اور نقصان ۔

ص ۳۰ مکلف : پابند ۔ تکلیف اٹھانے والا ۔ خاطر داشت : خاطر داری ۔ خیال رکھنا ۔ ناز بردار : ناز اٹھانے والے ۔ جان کاہی : سخت محنت و مشقت ۔ شیر خوارگی : دودھ پینے کا زمانہ ۔ مکتب : مدرسہ جہاں تعلیم پاتے ہیں ۔

ص : ۳۱ ہم سبق : ایک ہی سبق پڑھنے والے ۔ متانت : سنجیدگی ۔ بھرمٹ : ہجوم ۔ بذلہ سنجی : لطیفہ گوئی ۔ ہنسی مذاق کی باتیں کرنا ۔ فوقیت لے جانا : بڑھ جانا ۔ بشاش : خوش ۔ پژمردہ : افسردہ ۔ بجھا ہوا ۔ ناہنجار : نالائق ۔ نکما ۔

ص ۳۲ تعلیم : موٹی ۔ عہد پیری : بڑھاپے کا زمانہ ۔ امنگ : جوش ۔ پیری وش : پیری کی مانند یعنی خوبصورت ۔ بذلہ سنج : پُر لطف باتیں کرنے والا شخص

ص ۳۳ چین نہ پڑتا تھا : آرام نہ آتا تھا ۔ چلبلا پن : شوخ مزاجی بے آرام شوخ طبعی : دل لگی ، بے باکی دست درازی : ہاتھ بڑھانا ۔ ہاتھا پائی ۔ ناز آفرین : لاڈ پیدا کرنا ناز برداری : لاڈ برداشت کرنا منہ پھلانا : ناراضی ظاہر کرنے کے لیے منہ پھلانا ۔ لپکا : بری عادت ۔ ایک بار دیکھا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ : یہ سوال ان سات سوالوں میں سے ایک ہے جن کے جواب شہزادہ منیر شامی کو تلاش کرنے تھے جب حسن بانو کے ساتھ اس کی شادی ممکن تھی ۔ حسن اتفاق سے حاتم طائی کو منیر شامی کی پریشانی کا علم ہوا تو وہ اس کی مدد کے لیے سوالوں کے جواب تلاش

کرنے نکل کھڑا ہوا اور کامیاب لوٹا۔ مزید تفصیل کے لیے اسی کتاب کے حصہ دوم میں "حمام باد گرد" کی کہانی دیکھیں۔ نکتہ سنج: ہوشیار، عقل مند

پری جمال دلربا: خوبصورت محبوب۔ مقتدا: جس کی پیروی کی جائے۔ راہنما۔ زاہد خشک: وہ پرہیزگار انسان جس کی طبیعت میں ایک طرح کی سختی ہو۔ "زاہد" کو بطور طنز بھی "خشک" کہا جاتا ہے۔ اس لیے بھی کہ نیکی کا راستہ بظاہر خشک ہوتا ہے اور اس میں معصیت کی رنگینی نہیں ہوتی۔ مرجعیت: زیادہ رجوع کرنے اور توجہ دینے کی صفت۔ التفات: توجہ۔ ابجد خواں: معمولی لکھا پڑھا شخص۔

ص ۳۴: محویت: مگن ہونا۔ گم ہونا۔ دلکش تانوں: کسی گیت کی دل موہ لینے والی آواز اور سُر۔ تاک جھانک: چوری چھپے دیکھنے کی کوشش۔ دائمی: مستقل ہمیشہ کی۔ متین: سنجیدہ۔ مرثیہ خوانی: مرثیہ پڑھنا۔ افسوس کرنا۔ خردوں: چھوٹوں

پختہ مغز: کافی تجربہ کار۔ ذی فہم۔ ارباب حل و عقد: اہل اختیار۔ جن لوگوں کے ہاتھ میں اختیار ہو۔

ص ۳۵: ناصح مشفق: نصیحت کرنے والا بزرگ۔ ارادت مندی: عقیدت

بور و علم نازنین پری جمال: خوبصورت اور نازک عورت۔ ٹھکانا۔ جائے قیام۔ علاقہ، تعلق، سرمایہ

نشاط: خوشی کا سبب۔ جفا: ظلم۔ زود پشیمانی: جلد نادم ہونے والا۔

؎ کی مرے قتل کے بعد ..... : یہ شعر مرزا غالب کا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ میرے محبوب نے مجھے قتل کرنے کے بعد ظلم و جفاکاری سے توبہ کر لی اور پرہیزگار بن گیا۔ مگر اب اس کی ندامت سے کیا فائدہ۔ شاید میرا قتل ہی اس کے لیے باعث ندامت ہو۔ اسی "زود پشیمانی" پر قربان جاؤں۔ یہ بھی میرے محبوب کی ایک ادا ہے۔ یہاں مرزا غالب اپنے محبوب پر طنز کر رہے ہیں۔ فرشتۂ اجل: موت کا فرشتہ۔ خلق الطبع: بے تکلف۔ آزاد

ص ۳۶: سیہ کاریاں: گناہ۔ بُرے اعمال۔ دھڑکا: خطرہ۔ خدشہ: مسکن، ٹھکانہ، جائے قیام۔ لوسیدہ: پرانی۔ علاقہ: تعلق۔ خلوت: تنہائی۔ اکیلا ہونا۔

نفس طبع: مراد مذاق، شگفتہ مزاجی۔ عدم آباد: دوسری دنیا، آخرت

ص ۳۷: مستسقی: وہ شخص جس کی پیاس پانی پی پی کر بھی ختم نہ ہو۔

پیراگراف کی تشریح

ال: مندرجہ ذیل اقتباس کی تشریح، حوالہ، متن اور سیاق و سباق کے ساتھ کیجیے

اپنے اچھے کاموں کے صلے اور اپنی سیہ کاریوں کی باداش کا انتظار کر رہے ہیں، قیامت آتی نہیں مگر اس کے دھڑکے مارے ڈالتے ہیں۔ تنہائی میں معمول ہے کہ نظر کے سامنے جب واقعات اور معاملات نہیں آتے تو خیالات کا ہجوم ہوتا ہے۔ لہٰذا اسی طرح ہم ایک خیال بن کے اپنے دوستوں اور اپنے سے بچھڑے ہوؤں کے دل میں آتے اور سما جاتے ہوں گے اسی طرح خود بھی شب و روز خیال ہی کے عالم میں رہا کرتے ہیں۔"

جواب: حوالۂ متن یہ عبارت عبدالحلیم شرر کے مضمون "صحبتِ برہم" سے ماخوذ ہے۔

سیاق و سباق انسان کی فطرت ہے کہ اسے اپنا ماضی ہمیشہ حسین و رنگین نظر آتا ہے۔ مقرر نے زیرِ مطالعہ سبق میں یادِ ماضی کا ایک تصوراتی نقشہ پیش کیا ہے۔ ایک شخص موت کے بعد قبر میں لیٹے ہوئے اپنی زندگی کی اُن صحبتوں کو یاد کر رہا ہے جو منتشر ہو گئیں۔ پہلے وہ بچپن کے دور کو یاد کرتا ہے پھر اُسے لڑکپن کا زمانہ یاد آتا ہے۔ اس کے بعد جوانی کی رنگین صحبتیں ایک جھلک دکھاتی ہیں۔ جب جوانی کا غرور اور جوش و خروش اُسے ہر محفل میں لے جاتا تھا اور زندگی ایک دلچسپ خواب تھی۔ پھر بڑھاپا آیا اور بڑھاپے کے بعد موت نے آ لیا۔ اب وہ شخص قبر میں پڑا سوچ رہا ہے۔ تشریح طلب سطریں اسی موقع پر آئی ہیں۔

تشریح میں نے زندگی میں کچھ اچھے کام کیے اور بہت سے گناہ بھی مجھ سے سرزد ہوئے ہیں۔ اب میں قیامت کا منتظر ہوں جب خدا کے حضور پیش کیا جائے گا اور مجھے اپنی طویل زندگی کے اعمال کی جوابدہی کرنی ہوگی۔ نیکیوں کے بدلے میں بارگاہِ ایزدی سے اجر کی توقع رکھتا ہوں مگر گناہوں کی سزا سے خوفزدہ ہوں۔ میں اپنے نامۂ اعمال کا سامنا کیونکر کر سکوں گا۔ مستقبل کے اس خوف سے قطع نظر کر کے، ماضی کے دریچوں میں جھانکتا ہوں تو بچپن، لڑکپن اور جوانی کے دوست اور رفیق یاد آتے ہیں۔ بالکل اسی طرح، جیسے میرے دوست، احباب اور پس ماندگان اس وقت دنیا میں مجھے یاد کر کر کے افسردہ ہو رہے ہوں گے۔

نسیم حجازی

حالاتِ زندگی

نام: محمد شریف۔ قلمی نام: نسیم حجازی۔ آبائی وطن: گورداسپور (بھارت)۔ ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ بی۔ اے اسلامیہ کالج لاہور سے کیا۔ پاکستان قائم ہوا تو ہجرت کر کے مستقلاً ایبٹ آباد میں مقیم ہو گئے۔

ابتداء میں انہوں نے بعض دوستوں کے ساتھ مل کر راولپنڈی سے "تعمیر" اور بعد ازاں "کوہستان" جاری کیا۔ اس اخبار نے پاکستان کی صحافت میں قابلِ قدر روایات قائم کیں۔ نسیم حجازی عملی طور پر صحافت سے زیادہ دیر وابستہ نہ رہے البتہ اخبار کی پیشانی پر ان کا نام مدیرِ اعلیٰ کے طور پر طویل عرصے تک چھپتا رہا۔ اب وہ صحافت سے علیحدگی اختیار کر چکے ہیں۔

اہم تصانیف ناول: داستان مجاہد، انسان اور دیوتا، خاک و خون، محمد بن قاسم شاہین، یوسف بن تاشفین، آخری چٹان، معظم علی، اور تلوار ٹوٹ گئی، قیصر و کسریٰ، اندھیری رات کے مسافر۔ طنز و مزاح: سو سال بعد، سفید جزیرہ، ثقافت کی تلاش میں، سفر نامہ پاکستان سے دیارِ حرم تک۔

نسیم حجازی بطور مصنف و ناول نگار

نسیم حجازی دورِ جدید کے معروف اور مقبول ترین ناول نگار ہیں ان کی ناول نگاری کا آغاز ۱۹۴۲ء میں ہوا تھا۔ جب انہوں نے "داستان مجاہد" لکھا یہ ان کا پہلا ناول تھا اس کے بعد دیگرے ان کے کئی شہرہ آفاق ناول منظرِ عام پر آئے ان میں "انسان اور دیوتا" "محمد بن قاسم" "یوسف بن تاشفین" "آخری چٹان" "خاک و خون" "شاہین" "آخری معرکہ" "معظم علی" اور "تلوار ٹوٹ گئی" "قیصر و کسریٰ" اور "اندھیری رات کے مسافر" وغیرہ شامل ہیں۔ نسیم حجازی کے ناولوں کا موضوع تاریخ اسلام ہے۔ "قیصر و کسریٰ" اور "قافلہ حجاز" کا پس منظر قرنِ اوّل سے متعلق ہے "شاہین" "اندھیری رات کے مسافر" اور "یوسف بن تاشفین" میں اسپین پر مسلمانوں کے دورِ حکومت کے وسطی اور آخری سالوں کی کہانی بیان کی گئی ہے "خاک و خون" کا موضوع تقسیم ہند اور پاکستان کا قیام ہے۔ جبکہ "معظم علی" اور "اور تلوار ٹوٹ گئی" میں ہندوستان کے اس دور کا عبرتناک نقشہ کھینچا گیا ہے جب سلطان ٹیپو کی شہادت سے ہندوستانی مسلمانوں کے ترکش کا آخری تیر بھی ٹوٹ گیا اور پھر انہیں کوئی چیز ذلت و غلامی کے گڑھے میں

گرنے سے نہ روک سکی۔

نسیم حجازی ناول نگاری میں عبدالحلیم شررؔ کی روایت سے تعلق رکھتے ہیں انہوں نے تاریخ اسلام کے مختلف ادوار کو اپنے ناولوں کے پس منظر کے طور استعمال کیا ہے مقصدی اعتبار سے وہ ڈپٹی نذیر احمد کی طرح مسلمانوں کی اصلاح چاہتے ہیں۔ وہ ان کے سامنے اسلاف کے کارنامے بیان کر کے ان کے اندر مذہبی، ملی اور قومی جوش و ولولہ پیدا کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ اکابر کی عظمتوں اور رفعتوں کے امین بن سکیں۔ ان کے ناول مقصدیت، جوش، تخیل اور رومانیت سے بھرپور ہیں۔ یہ قارئین کو اسلام سے محبت، عشق رسولؐ، دین کی سربلندی، اکابر اسلام کی تقلید، مذہبی حمیت اور روایات و اقدار سے جذباتی وابستگی پر ابھارتے ہیں نسیم حجازی نے اپنے ناولوں میں مسلمانوں کے اسلامی جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ ان کے کردار مسلمانوں کے ہیرو ہیں ان ہیروؤں کے کارنامے مسلم عوام کے دلوں کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہیں۔ نسیم حجازی کے ناولوں کے کردار تاریخ اسلام کے مانوس کردار ہیں ہم ان کے ساتھ ایک گونہ جذباتی لگاؤ رکھتے ہیں۔

نسیم حجازی پاکستان کے سب سے زیادہ مقبول ناول نگار ہیں۔ فنی نقطہ نظر سے دیکھیں تو انہوں نے اپنے ناولوں کی تعمیر و ساخت میں بڑی فن کاری اور مہارت سے کام لیا ہے "آخری چٹان" میں ناول کے واقعات بتدریج آگے بڑھتے اور نقطہ عروج تک پہنچتے ہیں۔ قاری واقعات کی رفتار میں کھو جاتا ہے بعض اوقات صورت حال کی ڈرامائیت بھی دلکشی پیدا کرتی ہے۔ ان کے کرداروں کی گفتگو میں اختصار و ایجاز اور معنوی گہرائی ہے۔ نسیم حجازی کے ناولوں کی پسندیدگی کا ایک بڑا سبب ان کا ادبی اور شاعرانہ اسلوب ہے۔ الفاظ کی ترتیب اور جملوں کی ساخت میں وہ بڑی سلیقہ مندی سے کام لیتے ہیں۔ کہیں کہیں مبالغہ کی رنگ آمیزی اور جوش و خروش کے چھینٹے بھی ہیں مگر اکثر اوقات وہ حقیقت پسندی توازن اور اعتدال کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے، ان کے ناولوں میں مزاح کی شوخی، طنز اور تیکھے پن کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ ان کی شوخی اور طنز کے کامیاب نمونے "سو سال بعد" اور "سفید جزیرہ" میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان کے مکالمے بعض اوقات پرجوش تقریروں کا روپ دھار لیتے ہیں جو قاری کو اپنے جذبات میں اپنے ساتھ بہالے جاتی ہیں۔ نسیم حجازی کے ہاں مقصد اور فن کا امتزاج ملتا ہے البتہ کہیں کہیں مقصد کا پہلو غالب نظر آتا ہے جو بعض لوگوں کی نظر میں قابل اعتراض ہے۔ دلچسپی، دلکشی اور فنی انفرادیت کے نقطہ نظر سے ان کے ابتدائی ناول زیادہ اہمیت رکھتے ہیں آخری دور کے ناولوں میں وہ بات پیدا نہیں ہو سکی ان سب باتوں کے علاوہ نسیم حجازی اس وجہ سے بھی ایک اہم ناول نگار ہیں کہ ان کے ناولوں کو پڑھ کر دل میں جرأت، شجاعت، صداقت اور حق پرستی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں ان کے

ناول اصلاحت سے عقیدت بڑھائے اور مشرقی و اسلامی اقدار و روایات سے محبت پیدا کرتے ہیں اس دور میں جبکہ عام ناول نگار جنسیت اور لذت پرستی، بد اخلاقی اور بے راہروی، الحاد اور مذہب بیزاری، کمیونزم اور دین سے برگشتگی، مایوسی اور ذہنی کجروی کی تبلیغ کرتے ہیں۔ نسیم حجازی کے ناول ملی اور قومی نقطہ نظر سے بہت مفید اور بہتر ہیں افسوس کہ بعض سیاسی وجوہ کی بنا پر اردو ناول نگاری کی تاریخ میں نسیم حجازی کی خدمات کو بھی ناقابل التفات ٹھہرایا گیا بلکہ انہیں ناول نگار ماننے ہی سے انکار کیا گیا مگر صداقت زیادہ دیر تک چھپی نہیں رہ سکتی ایک وقت آئے گا جب ادب میں ان کے حقیقی مقام کا اعتراف کیا جائے گا۔

نسیم حجازی

پانی پت کی تیسری لڑائی

تعارف و پس منظر

نسیم حجازی، دور حاضر کے تمام ناول نگاروں میں، اپنے حلقہ قارئین کی وسعت کے اعتبار سے سرفہرست ہیں انہوں نے تاریخ اسلام اور مختلف مسلمان اکابر و جرنیلوں کو اپنے ناولوں کی بنیاد بنایا ہے ان کا مقصد مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ ہے اور اسی لئے ادب کے سکہ بند نقاد ان کے ناولوں کو در خور اعتنا نہیں سمجھتے۔ اردو کے عام قارئین میں نسیم حجازی کی مقبولیت انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتی۔

زیر مطالعہ مضمون "پانی پت کی تیسری جنگ" نسیم حجازی کے ناول "معظم علی" سے اخذ کیا گیا ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد، مغلیہ سلطنت کی شکست و ریخت کا عمل تیز ہو گیا اور مرکزی حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے علاقائی سردار اور حکمران خود مختار بن بیٹھے۔ مختلف قوتوں نے زور پکڑا ان سب میں مرہٹے مغلوں خصوصاً مسلمانوں کے لئے ایک زبردست چیلنج بن کر ابھرے قریب تھا کہ وہ مسلمانوں کو نیست و نابود کر کے رکھ دیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی دور رس نگاہوں نے خطرے کو بھانپ لیا اور احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان آکر مرہٹوں سے نبرد آزما ہونے کی دعوت دی چنانچہ ابدالی اپنے لشکر جرار کے ساتھ ہندوستان آیا ہندوستان کے متعدد مسلمان سردار بھی اس کے ساتھ مل کر مرہٹوں کے خلاف صف آرا ہوئے۔ اگرچہ مرہٹوں کی قوت بہت زیادہ تھی۔ مگر

تائید ایزدی سے مسلمان ان پر غالب رہے۔ اس سے انہیں کچھ سنبھلنے کا موقع مل گیا خدانخواستہ اگر ابدالی کو شکست ہو جاتی تو ممکن ہے آج ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ مختلف ہوتی۔

مشکل الفاظ و محاورات ۔ معانی اور تشریح

ص: ۳۸ میسرہ: فوج کے وہ دستے جو بائیں جانب سے لڑتے ہیں۔
گاردی: ابراہیم گاردی، ایک مسلمان فوجی جرنیل جو غداری کرکے مرہٹوں کی طرف سے لڑا اگر کیفر کردار کو پہنچ گیا ص: ۳۹ گنیکواڑ ایک مرہٹہ سردار کا نام
میمنہ: فوج کے وہ دستے جو دائیں جانب سے لڑتے ہیں، قلب: میدان جنگ کا درمیانی حصہ۔ ہودج: ہودہ اونٹ یا ہاتھی کا کجاوہ، آزمودہ کار: تجربہ کار، داد شجاعت دینا بہادری دکھانا + عقابی نگاہیں: دور رس اور دور بین نگاہیں + جھنکار: آواز + نہیب خوفناک + ہر ہر دیو: ہندوؤں کا نعرہ۔ ہر کے معنی ہیں بھگوان، خدا ص: ۴۰ ہوایاں، آتش بازیاں۔ پانسہ: پلڑا + افراتفری: انتشار، بدنظمی۔ نصف النہار، دن کا نصف۔ ہنگامۂ محشر: میدان قیامت کا سا ہنگامہ، بشارت۔ خوشخبری + ترکش: تیر رکھنے کا خول جس میں تیر رکھے جاتے ہیں میدان جنگ میں اس خول کو پیٹھ پیچھے لٹکا لیتے ہیں۔
ص: ۴۱ دل برداشتہ: بد دل + حوصلے پست ہونا، دل چھوڑ دینا، واپسیں نگاہیں: آخری نگاہیں + یلغار: اچانک حملہ، تعاقب: پیچھا کرنا + قرب و جوار: قریبی، نزدیک
ص: ۴۲ خاک میں ملنا: ختم ہونا، نیست و نابود ہونا۔

مضمون کا خلاصہ

۱۳ جنوری ۱۷۶۱ء کو پانی پت کے وسیع و عریض میدان میں ایک تاریخی معرکہ برپا تھا۔ ایک طرف مرہٹے اپنی صفیں درست کر رہے تھے۔ ابراہیم گاردی کے تربیت یافتہ دستے اور گنیکواڑ کی فوجیں بالترتیب میدان جنگ کی بائیں طرف، ہلکر اور سندھیا کے سپاہی دائیں طرف اور درمیانی حصے میں مرہٹہ سردار بھاؤ اور وشواس راؤ ایک جنگی ہاتھی پر بیٹھے حملہ کے لئے پر تول رہے تھے۔ مسلم فوج کے وسط میں احمد شاہ ابدالی کا وزیر اعظم شاہ ولی خاں تھا۔ بائیں جانب شاہ پسند خاں اور نجیب الدولہ اور دائیں جانب برخوردار خاں کے ساتھ روہیلوں، مغلوں اور بلوچوں کے دستے بھی شامل تھے شجاع الدولہ کی فوجیں بھی مدد کے لئے موجود تھیں۔
مسلمانوں کا سالار احمد شاہ ابدالی ایک سفید گھوڑے پر سوار برابر میدان جنگ

کا جائزہ لے رہا تھا۔ مرہٹوں کی گولہ باری سے لڑائی کا آغاز ہوا۔ پہلے ہلے میں افغانوں کی اگلی تین صفیں درہم برہم ہو گئیں۔ گھمسان کی جنگ ہوئی، قیامت کا سا منظر تھا۔ مرہٹوں کا پلہ بھاری معلوم ہوتا تھا مگر نجیب الدولہ کے زوردار حملے اور روہیلوں کے جوابی حملوں نے مرہٹوں کو پیچھے ہٹا دیا۔

سورج سر پہ آگیا مگر لڑائی زوروں پر تھی۔ کسی بھی لمحے کوئی فریق میدان سے بھاگ سکتا تھا مگر ابدالی مطمئن تھا۔ جیسے اُسے اپنی فتح کا یقین ہو۔ عین اس وقت اس نے چودہ ہزار فوجیوں پہ مشتمل اپنا محفوظ (ریزرو) دستہ جنگ میں جھونک دیا۔ اس تازہ دم فوج نے مرہٹوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ مرہٹہ سردار بٹواش لاڈ گولی لگنے سے زخمی ہو گیا۔ بھاؤ مارا گیا۔ مرہٹے بھاگ نکلے۔ مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا۔ یہ تعاقب ساری شام کو اور پھر ساری چاندنی رات میں صبح تک جاری رہا۔ قریبی علاقوں کے دیہاتی بھی مرہٹوں کے ظلم سے تنگ تھے انہوں نے بھی موقع غنیمت جان کر تلواروں، برچھیوں اور لاٹھیوں سے مرہٹوں کو بے دریغ موت کے گھاٹ اتار دیا۔ فاتح افواج کو مال غنیمت میں بے شمار جواہرات، بیل گاڑیاں، لاکھوں مویشی، اونٹ، گھوڑے اور ہاتھی ہاتھ لگے۔ ابدالی کی فوج یہ سب کچھ لے کر چند روز بعد دلی لوٹ گئی۔

آفتاب حسن

پٹرولیم

تعارف اور پس منظر

میجر آفتاب حسن، ادب اور سائنس کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ سائنس کے مختلف موضوعات پر انہوں نے متعدد کتابیں تالیف اور ترجمہ کی ہیں سائنسی مضامین کی اردو تدریس کے ضمن میں، ان کی خدمات قابل قدر ہیں پٹرولیم دور جدید میں زبردست اہمیت حاصل کر چکا ہے آفتاب حسن نے زیر مطالعہ میں عام فہم انداز اور آسان زبان میں پٹرولیم کی اصلیت وماہیت اور اس کی مختصر تاریخ پر روشنی ڈالی ہے۔

(۲)

مضمون کا خلاصہ

زمین کے اندر جتنے قیمتی خزانے پوشیدہ ہیں ان میں پٹرولیم غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے موجودہ مشینی دور میں یوں تو بجلی اور کوئلے سے بھی قوت حاصل کی جا سکتی ہے مگر حصولِ قوت

کا آسان ترین ذریعہ پٹرولیم ہی ہے۔ مشینوں کے جسم میں پٹرول کی حیثیت خون کی سی ہے اس سے تیز رفتار مشینیں، ہوائی جہاز، موٹریں اور مختلف النوع گاڑیاں چلتی ہیں۔ بعض مشینوں میں چکنائی کی حیثیت سے بھی پٹرولیم کا استعمال ہوتا ہے۔ چکنائی پودوں سے بھی حاصل ہوتی ہے۔ اسے نباتاتی تیل کہتے ہیں پٹرولیم معدنی تیل کہلاتا ہے۔

قدیم زمانے میں بھی لوگ پٹرولیم سے واقف تھے۔ انجیل میں اس کا ذکر آیا ہے۔ قدیم مورخ ہیرو ڈوٹس اور معروف سیاح مارکوپولو کے علاوہ کئی مصنفین کے ہاں بھی پٹرول کا بیان ملتا ہے۔ قدیم دور میں یہ بطور دوا بھی استعمال ہوتا تھا چین اور برما میں بھی زمین سے نکالا جاتا تھا۔

پٹرولیم کاربن اور ہائیڈروجن سے مل کر بنا ہے مگر زمین کے اندر یہ عناصر کہاں سے آئے اس کا حتمی جواب ابھی تک دریافت نہیں ہو سکا۔ بعض لوگ کہتے ہیں زمین کی اندرونی حرارت کے اثر سے ہائیڈروکاربن تیار ہو گیا۔ یہ غیر نامیاتی نظریہ ہے۔ اور اس کی صحت ناقابل قبول نہیں ہے۔ کچھ لوگوں کے خیال میں کاربن اور ہائیڈروجن کا ماخذ ننھے ننھے حیوانی اور نباتاتی جاندار ہیں۔

زمین اپنی موجودہ شکل میں لاکھوں سال کے مسلسل عمل کا نتیجہ ہے ریت اور مٹی سمندر کی تہ میں جم جاتی ہے اس پر مزید مٹی جمتی ہے تو بوجھ سے وہ تہ سخت ہو کر پتھر بن جاتی ہے پھر کسی وقت سمندر کے اندر کی یہ چٹانیں خشک زمین کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور خشک زمین سمندر میں غرق ہو جاتی ہے۔ دریائی مٹی کے ساتھ بیشمار ننھے جاندار سمندر میں چلے جاتے ہیں ان پر ایک اور تہ آنے سے یہ باہر کی ہوا سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ پھر اندرونی حرارت اور زبردست دباؤ کے تحت وہ تحلیل ہونا شروع ہوتے ہیں اور لاکھوں برس کے بعد پٹرولیم بن جاتا ہے۔ بعد ازاں پٹرولیم زمین کے مسام دار حصوں کی طرف جمع ہو جاتا ہے۔

تیل وہاں پایا جاتا ہے جہاں زمین کے اندر مسامدار چٹانیں ہوں مگر ضروری ہے کہ ان مسامدار چٹانوں کے اوپر ایک غیر مسام دار چٹان ہو جو تیل کو محفوظ رکھ سکے۔ پھر زمین کی بناوٹ ایسی ہو کہ تیل دور دور سے سمٹ کر ایک جگہ جمع ہو جائے۔ مزید برآں کوئی ایسا ماخذ ہونا چاہیئے جہاں سے تیل نکل سکے۔

سطح زمین کا تقریباً آدھا حصہ ایسی سخت چٹانوں پر مشتمل ہے جو آتش فشاں چٹانوں سے بنی ہیں ایسی جگہ پٹرول نہیں مل سکتا پٹرول ایسی جگہ دستیاب ہوتا جہاں آتش فشانی چٹانیں نہ ہوں اور ریت پتھر، چونے کا پتھر اور اسی طرح کی دوسری ایسی نہ موجود ہو۔ جہاں تیل جمع رہ سکے۔ وہاں زمین کی بناوٹ ایسی ہو کہ تیل دور دور سے آکر ایک محدود علاقے میں جمع ہو سکے۔ اگر ایسا ہو تو یقیناً تیل جاتا ہے۔

زمین کے اندر جہاں تیل جمع ہو وہاں سے وہ اوپر اٹھ کر کوہان اور گنبد کی شکل میں بھرتا

آتا ہے ایسی ہی جگہیں تیل کا ماخذ ہوتی ہیں۔ تیل کے ساتھ بالعموم گیس بھی موجود ہوتی ہے گرچہ فاضل نہیں گیس ہلکی ہونے کی وجہ سے اوپر ہوتی ہے۔ پھر تیل اور اس کے نیچے پانی ہوتا ہے کیونکہ وہ تینوں میں زیادہ بھاری ہے ۔۔۔ تیل کی تلاش کرتے ہوئے حسن اتفاق سے بلوچستان میں سوئی گیس دریافت ہوگئی۔

خیال رہے زمین کے اندر تیل کے تالاب نہیں ہوتے بلکہ تیل مسام دار چٹانوں یا ریت کے اندر موجود ہوتا ہے۔

مشکل الفاظ و محاورات معانی اور تشریح

ص ۴۴ حمل و نقل: اشیاء کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا، منتقل کرنا + سر دست فی الحال + بل پر: اُدھار پر۔ ذریعے۔ مزاحمت۔ رکاوٹ +

ص ۴۵ حنظلیہ: جزیرہ سسلی جو براعظم یورپ سے وابستہ ہے۔ بحر روم میں واقع ہے۔

ص ۴۶ یونان: سوداگر کرنے کے آلے + آمیزہ: مرکب: ملکر بنی ہوئی چیز + مرتبین: جنہیں آراستہ کیا گیا

ص ۴۷ ناپیمائی: جس کا تعلق نشو و نما پانے سے ہو

ٹھاٹھیں مارنا: جوش مارنا۔ لہروں کا اندر سے اٹھنا

ص ۴۸ تحلیل: گھل ہونا۔ پگھل جانا + مسام دار: باریک سوراخوں والا۔

ص ۴۹ ماخذ: جہاں سے اخذ کیا جائے۔ جہاں سے کوئی چیز لی جائے، نکالی جائے۔

ص ۵۰ سنگ خارا: ایک سخت قسم کا پتھر + ارضیات: زمین کی بناوٹ اور ساہیت کا علم

ص ۵۱ کوہان: اونٹ کی پیٹھ کی بلندی + کثافت: بھاری پن۔ آزو: بازو: ادھر ادھر سے دائیں بائیں سے۔

اہم عبارت کی تشریح

سوال: مندرجہ ذیل عبارت کی تشریح کیجئے: حوالہ، متن اور سیاق و سباق بھی لکھئے۔

"ارضیاتی تبدیلیوں اور زمین کی سطحی حرکات کے سبب اس کی تہوں میں شکنیں پڑ جاتی ہیں اور جگہ جگہ تہ بہ تہ اٹھ کر کہان اور گنبد بنا جاتی ہیں اور یہی حصے آئندہ تیل کے ماخذ بن جاتے ہیں تیل نیچے سے اٹھتا ہوا غیر مسامدار سطح تک پہنچ جاتا ہے اور پھر اس کے نیچے نیچے چلتا گنبدوں تک پہنچ جاتا ہے نیچے کا پانی اس کو ڈھکیل کر گنبد کے اندر داخل کر دیتا ہے گنبد کے اندر تیل محفوظ ہو جاتا ہے۔"

جواب: متن یہ عبارت مضمون "پٹرولیم" سے لی گئی ہے اس کے مصنف میجر

سیاق و سباق | مجرّ آفتاب حسن نے سائنسی موضوعات پر مختلف مضامین لکھے ہیں، زیرِ نظر مضمون میں انہوں نے "پٹرولیم" کی اصلیت و ماہیت، اس کی بناوٹ اور اس کی دریافت پر روشنی ڈالی ہے۔ تشریح طلب عبارت مضمون کے جس حصّے سے لی گئی ہے، اس میں بتایا گیا ہے کہ زمین کے اندر تیل کس طرح تیار ہو کر کسی خاص جگہ جمع ہوتا ہے۔

تشریح | زمین کی سطح پر لاکھوں سال سے تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ جہاں اب سمندر ہیں، وہاں لاکھوں سال پہلے پہاڑ اور گھنے جنگل تھے۔ اسی طرح موجودہ خشکی کی جگہ کبھی سمندر ٹھاٹھیں مارتا تھا۔ اس طرح کی تبدیلیوں کی وجہ سے زمین کی تہوں میں شکنیں پڑ جاتی ہیں اور کہیں جگہ زمین درمیان سے اٹھ کر گنبد کی طرح ہو جاتی ہے۔

جب نیچے سے اوپر کو اٹھتا ہے تو یہ مسام دار تہیں اس کے راستے میں رکاوٹ بنتی ہیں وہ ادھر ادھر سفر کرتا ہوا، مذکورہ گنبدوں میں جمع ہو جاتا ہے۔ یہاں وہ نچلی طرف سے پانی کے دباؤ کی وجہ سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اب یہی گنبد نما جگہ، تیل کا ذخیرہ بن جاتی ہے۔ یہی تیل کا سرچشمہ ہے اور یہیں سے ہم تیل نکالتے ہیں۔

منشی پریم چند

حالات زندگی

منشی پریم چند کا اصل نام دھنپت رائے تھا۔ ۱۸۸۰ء میں بنارس کے قریب ایک گاؤں لمہی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد منشی عجائب لال بیس روپے ماہوار پر ڈاک خانے میں ملازم تھے۔ سات برس کے تھے جب والدہ وفات پاگئیں۔ اس صدمے کو وہ تمام عمر نہ بھلا سکے۔ سوتیلی ماں نے بے رحمی اور بدسلوکی کا انداز اختیار کیا۔

پریم چند کی شادی نوعمری ہی میں ہو گئی اور ابھی انہوں نے میٹرک بھی نہیں کیا تھا کہ والد بھی انتقال کر گئے۔ سارے گھر کی کفالت ان کے کندھوں پر آ گئی۔ جوں توں کر کے میٹرک کیا اور ایک سکول میں اٹھارہ روپے ماہوار پر استاد مقرر ہو گئے۔ انٹر اور بی اے کے امتحان پرائیویٹ پاس کئے اور ٹریننگ کالج کا امتحان پاس کر کے ماڈل سکول کے ہیڈ ماسٹر ہو گئے۔

پہلی بیوی سے پریم چند کے تعلقات اچھے نہ رہے اس سے قطع تعلق کر لیا اور ایک خاتون شورانی دیوی سے شادی کر لی۔ یہ ان کی مثالی (آئیڈیل) بیوی ثابت ہوئیں ان سے تین بچے ہوئے۔ دو لڑکے ایک لڑکی۔

انہوں نے افسانہ نگاری نوجوانی ہی میں شروع کر دی تھی جب شہرت حاصل ہوئی۔ تو انہوں نے ملازمت ترک کر کے اپنا سارا وقت ملک و قوم اور ادب کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔ بنارس میں اپنا پریس لگایا اور ماہنامہ "ہنس" اور ہفتہ وار "جاگرتی" کا اجرا کیا۔

پریم چند اچھی غذا نہ ملنے کی وجہ سے لڑکپن میں پیٹ کے امراض میں مبتلا ہو گئے تھے۔ آخری عمر میں یہ مرض بہت بڑھ گیا۔ جون ۱۹۳۶ء میں ایسے بیمار پڑے کہ پھر اٹھ نہ سکے اور وفات پا گئے۔ شدید بیماری کی حالت میں بھی لکھنے کا کام ترک نہ کیا۔ لگ بھگ تین سو کہانیاں اور تقریباً ایک درجن ناول یادگار چھوڑے ہیں۔

پریم چند بہت سادہ طبیعت، منکسر المزاج انسان تھے۔ تصنع اور بناوٹ سے بہت دور تھے۔ انسان دوست تھے اور بلا امتیاز مذہب و ملت ہر انسان کا احترام کرتے تھے بچوں سے بڑی محبت تھی۔ ان سے گھنٹوں کھیلتے رہتے اور روحانی

تسکین حاصل کرتے۔ بچوں کی معصوم حرکتوں پر مبنی کہانیاں بھی لکھیں۔ "نادان دوست" اسی کی مثال ہے۔

پریم چند کی افسانہ نگاری

پریم چند اردو کے سب سے پہلے افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے جدید افسانے کی ابتدا کی اور اسے کمال تک پہنچا دیا چنانچہ اُردو افسانہ نگاری میں انہیں منفرد اور عظیم مقام حاصل ہے۔

پریم چند کے ابتدائی افسانوں میں فنی اور تکنیکی نقطۂ نظر سے بڑی خامیاں ہیں یہ جدید افسانے کے بجائے داستانی ادب کے زیادہ قریب ہیں مافوق الفطرت حالات اور بادشاہوں کے احوال ان کے موضوع ہیں۔ تاہم بعد کے ادوار میں یہ خامیاں بالکل نہیں رہیں اور پریم چند کا ہر قدم ارتقا کی جانب بڑھتا رہا۔ ان کے افسانوں کی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں۔

دیہاتی زندگی کی عکاسی پریم چند نے خود گاؤں میں پرورش پائی تھی اس لئے وہ دیہاتی زندگی کے ایک ایک پہلو اور ایک ایک خوبی و خامی سے واقف تھے۔ نتیجتاً انہوں نے اپنے افسانوں میں دیہاتی زندگی کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ دیہاتوں میں کسانوں اور عام غریب لوگوں کی مشکلات و مسائل، ان کی بے بسی، مفلوک حالی، زمینداروں کی اجارہ داری، پولیس والوں کی ستم ظریفی، مزدور پیشہ کسانوں کی آہ و فغاں، غریبوں کا نالہ و فریاد اور جھک منگوں کی صدائیں۔ سب انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی اور کانوں سے سنی تھیں۔ اور ان کے حساس دل نے ان سے اثر بھی قبول کیا تھا۔ اس لئے ان کا ذکر بھی بڑے ہی موثر انداز میں کیا ہے۔ جو دل و دماغ پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے انہوں نے دیہاتی زندگی کی اتنی صحیح اور مکمل عکاسی کی ہے کہ پوری تصویر آنکھوں تلے پھر جاتی ہے۔ علی عباس حسینی نے بالکل درست لکھا ہے کہ "پریم چند دیہاتی زندگی کی اس قدر صحیح تصویر کشی کرتے ہیں کہ ان کے افسانوں سے گوبر کی بو آنے لگتی ہے"

آزادی کی لگن پریم چند انگریزی سامراج اور اس کی پیدا کی ہوئی سیاسی و سماجی قباحتوں کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ وہ غلامی سے شدید نفرت کرتے اور آزادی کے پرستار تھے۔ اسی جذبے نے انہیں ایسے افسانے لکھنے پر مجبور کیا جن میں ہندوستانیوں کی سیاسی غلامی، اقتصادی تباہی اور سماجی و تہذیبی مغلوبیت کے حالات بیان کئے گئے ہیں اور جن میں آزادی اور وطن پرستانہ جذبات کا اظہار کیا گیا ہے

ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "سوز وطن" ۱۹۰۹ء میں چھپا تو ہندوستان کی ادبی و سیاسی زندگی میں تہلکہ مچ گیا۔ ان افسانوں نے دلوں میں آزادی کی آگ بھر دی۔

اصلاح کا جذبہ پریم چند کے بیشتر افسانوں میں فرد، معاشرہ اور قوم کی اصلاح کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ انہوں نے غریبوں، مزدوروں اور محبوب طبقوں کی نفسیات کا خاص مطالعہ و مشاہدہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ غریبی ایک دیانتدار انسان کو بے ایمان بنا دیتی ہے مگر نیک طینت لوگ اپنے ضمیر کی آواز پر کان دھرتے اور آخر کار غلط راستے کو چھوڑ دیتے ہیں۔ "زیور کا ڈبہ" اس سلسلے کی خوبصورت مثال ہے۔

پریم چند اتحاد و اتفاق کے پرچارک ہیں۔ وہ یہ سبق دیتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ جب تک ہندوستان کی قوموں میں اتحاد نہیں ہوگا۔ آزادی حاصل نہیں ہو سکے گی۔ ان کا افسانہ "دو بیل" مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

ہندو معاشرے کی ترجمانی پریم چند نے اگرچہ ایسے افسانے بھی لکھے ہیں جن کے کردار مسلمان ہیں اور مسلمان گھرانوں کی عکاسی کرتے ہیں، مگر وہ بنیادی طور پر ہندو قوم اور معاشرت کی ترجمانی کرتے ہیں ان کے بیشتر افسانوں کے کردار ہندو ہیں اور ہندو روایات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ انہوں نے قدیم ہندو، راجپوتوں کی بہادری اور کارناموں کا ذکر خوب مزے لے لے کر کیا ہے۔

پریم چند کا فن پریم چند فنی اعتبار سے پختگی کے حامل ہیں، پلاٹ کو پھیلانا اور سمیٹنا خوب جانتے ہیں۔ خصوصاً جذبات کے اتار چڑھاؤ اور واقعے کی منظر کشی میں انہیں کمال حاصل ہے۔ زبان بھی صاف ستھری اور آسان ہے اور معمولی پڑھا لکھا شخص بھی ان کے افسانوں سے پوری طرح محظوظ ہو سکتا ہے

منشی پریم چند

نادان دوست (افسانہ)

تعارف اور پس منظر منشی پریم چند صفِ اوّل کے افسانہ نگار ہیں جو سیاسی و سماجی موضوعات کے ساتھ ساتھ اخلاقی موضوعات پر بھی لکھتے ہیں۔ اس افسانے میں انہوں نے دو بچوں کے حوالے سے بتایا ہے کہ اگرچہ ننھے بہن، بھائی دونوں چڑیوں سے گہری ہمدردی رکھتے تھے

اسی جذبے کے تحت انہوں نے انڈوں کو دھوپ سے بچانے کی کوشش کی اور اسی نیک نیتی سے انہوں نے انڈوں کو کھردرے تنکوں سے اٹھا کر کپڑے کی نرم گدی پر رکھا۔ لیکن یہ ہمدردی چڑیا کے خاندان کو بڑی مہنگی پڑی۔ وہ انڈے ان کے کام کے نہ رہے اور انہوں نے وہ نیچے گرا کر توڑ دیئے۔

افسانے میں دو ننھے بہن بھائیوں کی معصوم حرکتوں کا بے حد خوبصورتی سے نقشہ کھینچا گیا ہے۔ جن کے نتیجے میں اگرچہ چڑیا کے انڈے ٹوٹ گئے اور وہ نقصان دہ ثابت ہوئیں۔ لیکن اندازِ بیان میں اتنی دلکشی اور جاذبیت ہے کہ پھر بھی ان کے لئے دل میں محبت اور شفقت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

افسانے کا خلاصہ

کیشو اور شیاما دو بھائی بہن ہیں۔ ان کے گھر میں ایک طاق پر چڑیا انڈے دیتی ہے۔ تین چار دن کے بعد ہی وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اب انڈوں سے بچے نکل آئے ہوں گے۔ پھر وہ سوچتے ہیں کہ بچے کھائیں گے اور پئیں گے کیا اور یہ کہ انہیں دھوپ بھی لگتی ہوگی۔ یہ سوچ کر کیشو ایک چوکی کے اوپر سٹول رکھتا ہے۔ شیاما سٹول کو تھامے رکھتی ہے اور وہ اوپر چڑھ کر بچوں کا "معائنہ" کرنے لگتا ہے لیکن وہاں دیکھتا ہے تو انڈے پڑے ہوتے ہیں۔ اسے بڑا صدمہ ہوتا ہے کہ انڈے چند تنکوں پر پڑے ہیں۔ اور جگہ سخت ہے جو ظاہر ہے بچوں کے لئے تکلیف دہ ثابت ہوگی۔ چنانچہ شیاما اندر سے ایک پرانا کپڑا لاتی ہے، کیشو اس کی گدی بنا کر انڈوں کو ان کے اوپر رکھ دیتا ہے۔ دھوپ سے بچاؤ کی خاطر طاق پر ٹوکری کا سایہ کر دیتا ہے اور انڈوں کے پاس چاول اور پانی رکھ دیتا ہے تاکہ سایہ رہے اور بچوں کو انڈوں سے نکلتے ہی کھانے پینے کی پریشانی نہ رہے۔

شیاما بھی انڈے دیکھنے کی بے حد مشتاق ہوتی ہے۔ لیکن ہزار منت سماجت کے باوجود کیشو اس کی خواہش کی تکمیل نہیں ہونے دیتا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ سٹول پر سے گر جائے گی جس کے نتیجے میں امی اسے پیٹیں گی۔

یہ سارا عمل دوپہر کے وقت ہوتا ہے جب کہ بچوں کی ماں کوٹھڑی میں سو رہی ہوتی ہیں۔ چار بجتے ہیں، کیشو اور ماتا دوبارہ سو جاتے ہیں، تو شیاما باہر نکلتی ہے اور یہ دیکھ کر سخت پریشان ہوتی ہے کہ انڈے فرش پر گر کر ٹوٹ گئے ہیں۔ وہ جلدی سے بھائی کو بلاتی ہے اور کہتی ہے کہ "بھیا! انڈے تو نیچے

پڑے ہیں، بچے تو اڑ گئے" مگر کیشو اسے بتاتا ہے کہ بچے اڑے نہیں، بلکہ انڈے ٹوٹ کر ضائع ہوتے ہیں اور جب ان کی ماں اندر سے نکل کر انہیں ڈانٹتی ہے کہ انڈوں کو ہاتھ لگائیں تو پھر چڑیا ان میں سے بچے نہیں نکالتی اور انہیں پھینک کر توڑ دیتی ہے تو کیشو کو انتہائی صدمہ ہوتا ہے اور وہ بہت دنوں تک پریشان اور غم زدہ رہتا ہے کہ اس نے تو کمال ہمدردی سے انڈوں کو گدی پر رکھا تھا اور انہیں دھوپ سے بچانے کی کوشش کی تھی۔

مشکل الفاظ و محاورات کے معانی اور تشریح

ص ۔ ۵۴۔ کارنس۔ طاق، اینٹوں کا ردا جو چھت کے پاس منڈیر سے نیچے باہر کو نکال دیتے ہیں۔ سدھ۔ خبر، ہوش

ص ۔ ۵۵۔ عالمانہ غرور۔ ایسی سنجیدگی جو عالموں میں ہوتی ہے۔ عالموں کا سا وقار۔ ماتا۔ ماں، والدہ۔

ص ۔ ۵۶۔ چاندنی۔ سایہ، ادھیڑ بن۔ سوچ بچار۔ غور و فکر۔ جھنجلا کر کہا بگڑ کر، ناراض ہو کر بولا، حکمت۔ طریقہ۔ تدبیر۔

ص ۔ ۵۷۔ دم روکے۔ سانس روکے ہوئے۔ بہت خاموش ہو کر۔

ص ۔ ۵۸۔ گڑگڑا کر۔ منت کر کے۔ عاجزی سے۔ چٹنی کر ڈالیں۔ مرمت کر دیں۔ پٹائی کر دیں۔ چار سر نہ ہوتے۔ سر چار ٹکڑوں میں بٹ جاتا۔ سر پھٹ جاتا۔

ص ۔ ۵۹۔ ڈانٹ ڈپٹ کر۔ جھڑک کر۔ مجبور کر کے۔ لُو۔ گرم ہوا۔ چہرے کا رنگ اڑنا (محاورہ) گھبرانا۔ پریشان ہونا۔

ص ۔ ۶۰۔ بھیگی بلی بنا کھڑا رہا۔ (محاورہ) مسکین اور عاجز بن گیا۔ خوف سے سہم گیا۔ نہیں سیتی۔ انڈوں سے بچے نہیں نکالتی۔ پاپ۔ گناہ۔ ڈشٹ۔ کم بخت، نامراد

ص ۔ ۶۱۔ رونی صورت بنا کر۔ بہت افسوس اور رنج کے ساتھ۔ زعم۔ خیال

اہم سوال

سوال :۔ افسانہ "نادان دوست" سے زندگی کے کونسے سبق حاصل ہوتے ہیں مفصل بیان کیجئے؟

جواب :۔ اس خوبصورت کہانی سے پہلا سبق یہ حاصل ہوتا ہے کہ اگر ماں باپ اپنی مصروفیات میں سے کچھ وقت فارغ کر کے بچوں کی مناسب رہنمائی کریں تو ان

کے جذبۂ تجسس کی تسکین بھی ہو جاتی ہے اور وہ بہت سی پریشانیوں سے بھی محفوظ رہ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب گھر کے کارنس پر چڑیا نے انڈے دیئے۔ تو کیٹو اور شیاما کے ننھے ذہنوں میں بہت سے سوال پیدا ہوئے کہ گھونسلا کیسا ہے، بچے کس طرح نکلیں گے۔ ان کے پر کیسے ہوں گے؟ وغیرہ۔ گران سوالوں کا جواب دینے والا کوئی نہ تھا۔ اور جیسا کہ پریم چند بتاتے ہیں۔ "نہ اماں کو گھر کے کام دھندوں سے فرصت تھی نہ بابو جی کو پڑھنے لکھنے سے" دونوں بچے آپس ہی میں سوال جواب کر کے اپنے دل کو تسلی دے لیا کرتے تھے۔"

اگر ماں باپ اپنی سوجھ بوجھ سے بچوں کے جذبۂ تجسس کو پہچان لیتے تو بچے از خود کارنس تک پہنچنے کی شاید مہم نہ چلاتے۔ جس کا انجام افسوس ناک ہوا۔

دوسرا سبق اس افسانے سے یہ ملتا ہے کہ بچوں کی حرکتیں بڑی معصومیت اور شرارت پر مبنی ہوتی ہیں۔ انہوں نے کمال خلوص کے ساتھ چڑیا کے انڈوں کی حفاظت کی۔ انہیں دھوپ سے بچایا اور کھردرے ٹکڑوں سے اٹھا کر کپڑے کی نرم گدی پر رکھ دیا۔ لیکن ان کا یہ خلوص اور ہمدردی چڑیوں کو بہت مہنگی پڑی اور ان کے انڈے بیکار ہو گئے۔ بالکل اسی قسم کی حرکت بسا اوقات بڑی عمر کے لوگ بھی کرتے ہیں۔ وہ بظاہر اپنے دوست کی ہمدردی کرتے ہیں۔ لیکن بھری محفل میں کوئی ایسا راز افشا کرتے ہیں۔ یا ایسا مالی نقصان پہنچاتے ہیں جس کی تلافی ممکن نہیں ہوتی۔ ایسے ہی موقعوں پر وہ ضرب المثل بولی جاتی ہے کہ "نادان دوست سے دانا دشمن بہتر ہوتا ہے۔"

سجاد حیدر یلدرم

حالاتِ زندگی

یلدرم کے آباؤ اجداد وسطِ ایشیا کے علاقے ترمذ کے رہنے والے تھے۔ یہ علاقہ اب سوویٹ ترکستان کہلاتا ہے۔ اس روس کا قبضہ ہے۔ یلدرم کے ایک بزرگ سید حسن ترمذی ہجرت کر کے ہندوستان آئے۔ ۱۸۵۷ء میں جنگِ آزادی میں یلدرم کے دادا امیر احمد علی نے زور شور کے ساتھ حصہ لیا جس کے نتیجے میں ان کی جاگیریں ضبط ہو گئیں۔

یلدرم ۱۸۸۰ء میں ضلع بجنور (یو۔پی) کے ایک قصبے نہٹور میں پیدا ہوئے۔ والد خان بہادر سید جلال الدین حیدر شہر بنارس کے حاکم تھے۔ چچا خان بہادر ڈاکٹر کرار حیدر یو۔پی میں سول سرجن تھے۔ سکول کی تعلیم کے بعد یلدرم نے علیگڑھ کالج میں داخلہ لیا۔ کالج میں مولانا محمد علی جوہر اور مولانا حسرت موہانی اُن کے ہم جماعت تھے۔ یلدرم بہت اچھے مقرر تھے۔ وہ مولانا شبلی کے اچھے شاگردوں میں سے تھے۔ ان کے ذوقِ شعر و ادب میں شبلی کا بڑا دخل ہے۔ ۱۹۰۱ء میں بی۔اے کرنے کے بعد انہوں نے قانون میں داخلہ لیا۔ اسی اثنا میں بغداد کے برطانوی قونصل خانے میں ترکی زبان کے ایک ترجمان کی جگہ نکلی۔ یلدرم حاجی محمد اسماعیل خاں سے ترکی سیکھ چکے تھے۔ چنانچہ اُن کا تقرر ہو گیا۔ پھر بغداد سے قسطنطنیہ تبادلہ ہو گیا۔ جنگِ عظیم (اوّل) شروع ہوئی تو وہ کابل کے معزول امیر یعقوب علی خاں کے اسسٹنٹ پولٹیکل ایجنٹ کی حیثیت سے مسوری آ گئے۔ امیر یعقوب کو انگریزوں نے مسوری میں نظر بند کر رکھا تھا۔

امیر کے انتقال کے بعد وہ راجہ صاحب محمود آباد کے سیکرٹری مقرر ہو گئے۔ پھر یو۔پی میں ڈپٹی کلکٹر بنے۔ ۱۹۲۰ء میں علیگڑھ کالج کو یونیورسٹی کا درجہ ملا تو مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے ان کی خدمات حکومت سے مستعار لی گئیں۔ ۱۹۲۹ء میں اپنی صوبائی ملازمت پر واپس چلے گئے۔ اب ان کا تقرر جزائر انڈمان و نکوبار میں بحیثیت ریونیو کمشنر ہوا ہندوستان واپس آ کر وہ غازی پور اور اوڈاوہ کے ضلعوں میں تعینات رہے۔ ۱۹۳۵ء میں خرابیٔ صحت کی بنا پر ریٹائر ہو گئے۔ اسی سال انہوں نے حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔

یلدرم ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ڈیرہ دون میں رہنے لگے۔ وہاں انہوں نے

"آشیانہ" کے نام سے ایک خوبصورت کوٹھی بنالی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد لکھنؤ آکر مختلف کاموں میں مشغول ہوگئے۔

۱۱ اپریل ۱۹۴۳ء میں لکھنؤ میں انتقال کیا اور عیش باغ کے قبرستان میں دفن کئے گئے۔

اُردو کی معروف افسانہ نگار قرۃ العین حیدر یلدرم کی صاحبزادی ہیں۔

یلدرم کی افسانہ نگاری

"خیالستان" سجاد حیدر یلدرم کی نمائندہ اردو کے جدید افسانوی ادب میں بیسویں صدی کی ایک اہم تصنیف ہے۔ پطرس بخاری کے بقول یہ مجموعہ اپنی اشاعت کے چند ہفتوں کے اندر اردو کی ایسی مقبول تصنیف بن گیا۔ جو بڑی رغبت سے بار بار پڑھی گئی۔ ۱۹۳۲ء تک اس کے آٹھ ایڈیشن نکل چکے تھے۔

"خیالستان" میں شامل یلدرم کے کل تیرہ نثر پاروں میں افسانوں کی تعداد سب سے زیادہ یعنی آٹھ ہے۔ یہ افسانے اس سے پہلے مختلف رسالوں میں چھپ چکے تھے۔ بیشتر مخزن میں شائع ہوئے تھے۔

یلدرم کی افسانہ نگاری کے بعض نمایاں پہلو حسب ذیل ہیں۔

۱۔ اردو کے سب سے پہلے افسانہ نگار اب تک پریم چند کو اردو ادب کا سب سے پہلا مختصر افسانہ نویس مانا جاتا ہے مگر جدید تحقیق کی رو سے یہ بات درست نہیں۔ پریم چند کا پہلا افسانہ "دنیا کا سب سے پہلا انمول رتن" ۱۹۰۷ء میں رسالہ "زمانہ" میں چھپا تھا۔ جب کہ یلدرم کا پہلا افسانہ "نشہ کی پہلی ترنگ" رسالہ "معارف" اعظم گڑھ کے شمارہ اکتوبر ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا۔ اور وحشت تاثر، کردار کے ذہنی و نفسیاتی مطالعے، کشمکش ابتداء، عروج اور انجام کے واضح تصور یا بالفاظ دیگر اپنی "افسانویت" کے اعتبار سے بڑا موثر اور بھرپور ہے۔ یہ افسانہ "خیالستان" میں شامل نہیں لیکن بلاشبہ اب تک کے مطالعے کے مطابق اسے اردو کا اوّلین افسانہ کہا جاسکتا ہے"۔ اس تحقیق و دریافت کا سہرا ڈاکٹر سید معین الرحمان کے سر ہے جن کے بقول جس طرح دنیائے مغرب میں پو (POE) کو مختصر افسانہ نویسی کا موجد کہا گیا ہے۔ سجاد حیدر یلدرم اردو زبان میں طرز جدید کے مختصر افسانے لکھنے والے پہلے شخص ہیں"۔ اور دنیائے ادب میں یہ یلدرم کا بہت بڑا اعزاز ہے۔

۲۔ رومانویت پسندی یلدرم اردو ادب کی رومانوی تحریک سے وابستہ تھے۔ ان کے افسانوں میں رومانویت کی واضح جھلک ملتی ہے۔ انہوں نے

محبت، عورت اور اس کے مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ درحقیقت یہ رومانویت علیگڑھ تحریک کی عقلیت پرستی کا ردِ عمل تھا۔ مگر یلدرم کے متوازن ذہن کا کمال ہے کہ انہوں نے افراط و تفریط سے کام نہیں لیا اور نہ وہ سستی جذباتیت کا شکار ہوئے۔

۳- ندرت اور اچھوتا پن نئی صنف افسانہ کے لئے یلدرم کا موضوع انتخاب بھی نادر و جدید اور اچھوتا تھا۔ "مخزن" میں ان کا ایک افسانہ شائع کرتے ہوئے سر عبدالقادر نے توضیحی نوٹ میں لکھا تھا: "سجاد حیدر یلدرم بی۔ اے کی تحریر میں جو بات ہمیں سب سے زیادہ پسند ہے وہ اس کی جدت اور اچھوتا پن ہے۔ جب کبھی وہ کچھ لکھتے ہیں نظم ہو یا نثر اس میں ایک خاص انداز ہوتا ہے جس کا لطف جاننے والے ہی پا سکتے ہیں یہ محبت و الفت کا افسانہ..... نرالے ڈھنگ کا ہے تخیل کا جو کمال اس میں دکھایا گیا ہے بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔"

۴- فنی مہارت سب سے پہلے یلدرم نے اردو میں مختصر افسانہ لکھنے کی طرح ڈالی۔ اردو میں ان کے سامنے مختصر افسانے کا کوئی نمونہ نہ تھا مگر اپنی خداداد صلاحیت کی بدولت انہوں نے مختصر افسانے لکھنے میں بڑی فنی مہارت، سلیقے اور رکھ رکھاؤ کا ثبوت دیا ہے۔ ان کے افسانے وحدت تاثر کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا آغاز، ارتقاء اور انجام فنی اعتبار سے بہت موزوں اور مناسب ہوتا ہے۔ سیرت کشی اور مکالمہ نگاری میں انہوں نے خوش ذوقی کے ساتھ فنی تقاضوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔

۵- افادیت و مقصدیت یلدرم کی رومانویت، عقلیت پسندی اور نیچر پرستی کے خلاف تھا تو ایک ردِ عمل مگر یہ بڑا لطیف اور متوازن ردِ عمل تھا۔ درحقیقت اپنی تمام تر رومانویت پسندی کے باوجود ان کے افسانوں کا زندگی اور اس کے مختلف مسائل و مظاہر سے گہرا تعلق ہے۔ وہ معاشرتی زندگی کی اصلاح پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ اُن کے افسانے "صحبتِ ناجنس" "نکاحِ ثانی" اور "ازدواجِ محبت" خاص طور پر مقصدی اور اصلاحی افسانے ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے عورتوں کے حقوق کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی، وہ زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ تعمیرِ حیات اور تہذیبِ اخلاق کا فریضہ بھی انجام دیتے ہیں۔ مگر واعظ یا خطیب بننا انہیں پسند نہیں۔

۶- لطافتِ بیان موضوع کی جدت کے ساتھ ساتھ یلدرم نے اسلوب کی لطافت اور ندرت کا بھی اہتمام کیا۔ ان کا طرزِ نگارش شعریت کے عناصر سے تشکیل پانے کے باوجود عام فہم اور دلکش ہے۔ وہ مشکل پسندی سے اجتناب کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کی تحریروں میں بعض فارسی تراکیب نامانوس اور اجنبی لگتی ہیں۔ مگر ان میں بھی ایک طرح کی موسیقیت اور رنگینی ہے۔ ان کے الفاظ کا انتخاب قابلِ داد ہوتا ہے۔ یلدرم کے فقروں

کی موسیقی مطالب و معانی سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ منتخب الفاظ کا صوتی تاثر قاری کے ذہن پر مخصوص مفہوم منتقل کرتا ہے۔ اُن کے حسین و جمیل اور دلکش اسلوب میں بڑی انفرادیت ہے۔

یلدرم اردو کے پہلے افسانہ نگار کی حیثیت سے اُردو افسانے کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ان کے افسانے دورِ جدید کے افسانوی معیار پر پورے نہیں اترتے۔ تاہم یلدرم کی قبل از مختصر افسانہ کی بنا رکھنا اور بعض فنی نقوش قائم کرنا ان کا ناقابلِ فراموش کارنامہ ہے۔

سجاد حیدر یلدرم

سیلِ زمانہ

تعارف و مرکزی خیال

یہ مختصر انشائیہ تھوڑے وقت کی اس سوچ پر مبنی ہے جو زمانے کی تندی و تیزی کے بارے میں انسان کے دل میں پیدا ہوتی اور ختم ہو جاتی ہے۔ اس میں انسان بے اختیار سوچتا ہے کہ وہ کیا ہے؟ زمانہ اسے اپنے ساتھ کیوں بہائے لئے جاتا ہے اور اس کا بالآخر انجام کیا ہے؟ بڑے بڑے بادشاہ اور جابر فاتح اپنی شان و شوکت کا ڈنکا بجا کر کہاں چلے گئے۔ اور عظیم الشان تہذیبیں کیوں مٹ گئیں۔ یہ سارے خیالات اس کے ذہن میں آتے ہیں اور وہ زمانے کو ایک طوفانی دریا سے تشبیہ دے کر یہ باتیں سوچتا اور اس کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے۔

انشائیے کا خلاصہ

سید سجاد حیدر یلدرم زمانے کو ایک دریا سے تشبیہ دیتے ہیں جس وہ بہتے ہوئے چلے جا رہے ہیں اور اس بات پر کہ یہ دریا ہر شخص کو اس کی مرضی کے برعکس اپنی رو میں بہائے لئے جاتا ہے۔ پیٹھ کر اور کچھ گھبرا کر سوال کرتے ہیں کہ یہ دریا ہمیں کہاں بہائے لئے جاتا ہے۔ یعنی عمر گزرتی جاتی ہے، بڑھاپا طاری ہوتا جاتا ہے اور زندگی کی خوبصورت دلکش اور دلفریب اشیا اسے اپنی طرف بلاتی رہ جاتی ہے۔ لیکن زمانہ انسان کو ہمیشہ کے لئے ان سے لطف اندوز ہونے کی اجازت نہیں دیتا اور اپنے ساتھ فنا کی منزل کی طرف بہائے لئے جاتا ہے۔ زمانے کی تیزی کے ساتھ بہتے ہوئے ادیب (یعنی یلدرم) سوچتے ہیں کہ مجھے ہی نہیں زمانہ تو سکندر، نوشیرواں اور دارا جیسی عظیم فاتح شخصیتوں اور بابل و نینوا اور مصر و ہند جیسی شاندار اور پرشکوہ تہذیبوں کو بھی روند چکا ہے اور آج ان کے نام و نشان تک نظر نہیں آتے۔ اس لئے اس کی ہمت جواب دے دیتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو زمانے کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ٹھیک

ہے دوسروں کی مانند تم مجھے بھی اپنے ساتھ آخرت کے سمندر میں غرق کردو۔

مشکل الفاظ و محاورات کے معانی اور تشریح

ص ۶۳ سیل۔ طوفان۔ سیل زمانہ۔ زمانے کا طوفان۔ سلامتی۔ امن راحت۔ غواصوں۔ غوطہ خوروں۔ مالامال۔ بھرپور، بھرا ہوا۔ لذائذ۔ واحد لذت مزہ، لطف۔ حسین۔ خوبصورت، سحرکار۔ جادو اثر۔ جادو کرنے والی۔ امنگیں، خواہش۔

ص ۶۴ بھنور۔ پانی کا چکر۔ متجسس۔ جستجو کرنے والا۔ تلاش کرنے والا۔ دزدیدہ نظروں سے۔ کن انکھیوں سے دیکھنا۔ چوری چوری دیکھنا۔ شہرت رفتگاں: دنیا سے رخصت ہو جانے والوں کی شہرت باطل۔ جھوٹ، گمراہی۔ رفتگاں: گزرے ہوئے۔ سابقہ۔ ماضی، گزرا ہوا زمانہ۔ خس و خاشاک، گھاس پھوس، کوڑا کرکٹ، بحر ناپیدا کنار۔ ایسا سمندر جس کا کنارا نہ ہو۔ بہت وسیع۔ عمان۔ مستقل اقامت کی جگہ، یعنی آخرت۔ اوقیانوس: دنیا کا ایک بہت بڑا سمندر۔ یہاں مراد ہے سمندر

احمد شاہ بخاری پطرس

حالات زندگی

نام: سید احمد شاہ قلمی نام: پطرس بخاری

پطرس کے آباؤ اجداد کشمیر سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور پشاور میں سکونت اختیار کی۔ اُن کے والد سید اسد اللہ شاہ، پشاور کے وکیل اور معروف مبلغ اسلام خواجہ کمال الدین کے منشی تھے۔

پطرس یکم اکتوبر ۱۸۹۸ء کو پشاور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پشاور میں پائی۔ انہیں شروع سے ہی شعر و ادب سے دلچسپی تھی۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے زمانہ طالب علمی میں وہ کالج میگزین "راوی" کے ایڈیٹر تھے اس دور میں وہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ" میں بھی لکھتے رہے۔ پطرس انگریزی کے بڑے ذہین طالب علم تھے اور ان کی تحریر میں بڑی پختگی تھی۔ اس لئے اُن کے مضامین بڑے وقیع سمجھے جاتے تھے۔ انگریزی مضامین وہ اپنے استاد ڈاکٹس سے عقیدت کی بنا پر ڈاکٹس کے قلمی نام سے لکھا کرتے تھے۔

انگریزی میں ایم اے کرنے کے بعد پطرس انگلستان گئے اور اماونیل کالج کیمبرج سے انگریزی ادب کا امتحان پاس کیا۔ واپسی پر پہلے سنٹرل ٹریننگ کالج اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اس دور میں انہوں نے علمی و ادبی مذاکروں، مباحثوں، ڈراموں اور دیگر ثقافتی و تہذیبی سرگرمیوں میں بڑی سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا۔ انہوں نے کئی انگریزی ڈراموں کے تراجم بھی کئے۔ اس دور میں پطرس پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی سے وابستہ رہے۔

۱۹۳۷ء میں آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہو گئے۔ ۱۹۴۰ء میں کنٹرولر جنرل بن گئے۔ ریڈیو کی ملازمت کے دوران انہیں نشر و اشاعت اور پروپیگنڈے کے بعض دوسرے کام بھی انجام دینے پڑے۔

پاکستان بننے سے کچھ پہلے وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ انہوں نے تقسیم ملک کے موقع پر ہونے والے فسادات سے متعلق مختلف موضوعات پر بعض رپورٹیں مرتب کیں۔ انڈیا آفس لائبریری کی املاک کی تقسیم کے سلسلے میں ہونے والے مذاکرات میں شرکت کے لئے لندن گئے میکسیکو اور بعض دوسرے ممالک میں بھی جانے کا موقع ملا۔ ۱۹۵۰ء میں خان لیاقت علی خاں کے دورہ امریکہ میں پطرس بھی ان کے ساتھ گئے۔ پھر آپ کو اقوام متحدہ میں پاکستان کا مستقل مندوب مقرر کیا گیا۔ ۱۹۵۵ء میں پطرس اقوام متحدہ کے شعبہ اطلاعات کے ڈپٹی سیکرٹری مقرر ہوئے کئی سال تک اس عہدے پر کام کرنے کے بعد انہوں نے کولمبیا یونیورسٹی میں انگریزی ادب کے پروفیسر کی حیثیت سے کام کرنے کی پیش کش قبول کر لی تھی اور چند ماہ بعد اس ذمہ داری کو سنبھالنے والے تھے کہ ۵ دسمبر ۱۹۵۸ء کو نیویارک میں حرکت قلب بند ہونے سے انتقال کر گئے۔

پطرس کی مزاح نگاری

سید احمد شاہ بخاری کو قدرت نے ذہانت، طباعی، بذلہ سنجی اور شگفتہ مزاجی سے وافر مقدار میں نوازا تھا۔ وہ اپنی گفتگوؤں میں جس قدر حاضر جواب، بے ساختہ اور پُرمزاح انسان تھے تحریر میں بھی اسی قدر شگفتہ بیان نظر آتے ہیں۔ ان کی مزاحیہ تحریریں اور مضامین تعداد و مقدار کی کمی کے باوجود کیفیت و معیار کے اعتبار سے بہت بلند پایہ ہیں ایک مختصر سی کتاب "پطرس کے مضامین" ان کی مزاحیہ تخلیقات کا مجموعہ ہے ان کے علاوہ کچھ متفرق مزاحیہ مضامین وغیرہ "نقوش" کے "پطرس نمبر" میں بھی یکجا کر کے شائع کئے گئے ہیں۔

پطرس کی مزاح نگاری کے نمایاں پہلو اور اہم خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ خالص مزاح نگار

پطرس اردو ادب میں خالص مزاح نگاری کے سب سے بڑے نمائندے ہیں۔ اُن کا ذوق مزاح نہایت بلند

ہے۔ ان کی تحریروں میں طنز بھی موجود ہے مگر اس کا رنگ بہت مدھم اور ہلکا ہے اسے محض لطافت ہی طنز کا نام دیا جاتا ہے۔ انہوں نے مزاح پیدا کرنے کے لئے کسی خارجی سہارے مثلاً مزاحیہ کردار یا لفظی قلابازیوں وغیرہ سے کام نہیں لیا۔ اُن کا مزاح ہر طرح کے تکلف اور ملاوٹ سے پاک وصاف بے لوث مزاح ہے۔

۲۔ صحت مندانہ کیفیت پطرس کا مزاح بڑا مثبت اور صحت مند ہے۔ اس میں چھچھورا پن یا ابتذال نہیں۔ انہوں نے زندگی کی مضحکہ خیزیوں کو بے نقاب کرتے وقت صحت مندانہ نقطۂ نظر اختیار کیا ہے۔ مزاح نگاری میں ان کے ہاں نہ تو تلخی پیدا ہوئی ہے اور نہ تحقیر آمیز رویہ اُبھرتا ہے وہ ہمیشہ معتدل اور متوازن انداز اختیار کرتے ہیں۔

۳۔ تحریف نگاری تحریف نگاری، پطرس کے مزاح کی بڑی خوبی ہے۔ شاعری میں اس سے پہلے تحریف (پیروڈی) کے نمونے ملتے ہیں۔ مگر نثر اس سے تقریباً خالی ہے۔ پطرس اس اعتبار سے اردو نثر کے پہلے تحریف نگار ہیں۔ انہوں نے اُردو کی آخری کتاب "اور لاہور کا جغرافیہ" کی صورت میں تحریف کے بلند پایہ نمونے پیش کئے ہیں۔ ان کی تحریفوں میں خوش مزاجی کی کیفیت نمایاں ہے۔ طنز و ظرافت کی تاریخ میں پطرس کی تحریف نگاری کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

۴۔ مغربی اثرات پطرس کی مزاح نگاری پر مغربی ادب کا کافی اثر ہے۔ مزاح نگاری میں ان کے سوچنے کا انداز اور مزاح کے حربوں مثلاً موازنہ، مبالغہ تحریف، بذلہ سنجی وغیرہ کا استعمال انگریزی اثرات کی نشاندہی کرتا ہے۔ مگر انہوں نے مغربی اثرات کو غالب نہیں ہونے دیا۔ مقامی معاشرتی پس منظر اور فضا ہر جگہ نمایاں ہے مزاح نگاری میں یہ چیز ان کی مہارت اور فنی بصیرت و انفرادیت کا ثبوت ہے۔

۵۔ واقعہ نگاری سے مزاح ڈاکٹر وزیر آغا کے بقول پطرس نے سب سے بڑا کمال واقعے سے مزاح پیدا کرنے میں حاصل کیا ہے۔ وہ واقعے کا تار و پود کچھ ایسے فطری انداز میں تیار کرتے ہیں اور اس واقعے کے تناظر اتنے غیر متوقع ہوتے ہیں کہ ناظر کے لئے ہنسی ضبط کرنا محال ہو جاتا ہے وہ مزاح کے باقی تمام حربے بھی واقعے کے اُبھارنے اور پیش کرنے میں صرف کر دیتے ہیں چنانچہ واقعہ نگاری ہی ان کے مزاح کی بنیادی خصوصیت ہے۔ پطرس نے اپنے مضامین مرید پور کا پیر" مرحوم کی یاد میں اور "سویرے جو کل میری آنکھ کھلی" میں واقعہ نگاری سے ہی مزاح پیدا کیا ہے۔ رشید احمد صدیقی کے الفاظ میں پطرس کی ظرافت کا آدھا لفظ میں نہیں، واقعات میں ہوتا ہے۔

۶۔ ہمدردانہ انداز نظر پطرس کے مزاح میں طنز کے عناصر بہت کم ہیں۔ جہاں کہیں انہوں نے طنز کا استعمال کیا ہے وہاں

ان کا انداز نظر ہمدردانہ رہا ہے ان کی تحریروں میں بھی طنز کی نشتریت بہت کم پیدا ہوئی ہے۔ ان کا مزاج فراخدلی، وسیع القلبی اور ذہنی کشادگی کا آئینہ دار ہے وہ اپنے ماحول اور اپنے کرداروں سے محبت کرتے ہیں وہ زندگی کی ناہمواریوں کو بہت عزیز جانتے ہیں۔

۷۔ بے ساختہ پن پطرس کے مزاح میں بڑی بے ساختگی پائی جاتی ہے وہ عملی مذاق یا مسخرہ پن سے گریز کر کے انسان کی فطری ناہمواریوں کو ابھارتے ہیں بلکہ واقعات کے ذریعے از خود ابھرتی چلی آتی ہیں جس سے روانی اور بہاؤ کی کیفیت قائم رہتی ہے۔ پطرس کے ہاں کسی بناوٹ یا تردد کے بغیر مزاح پیدا ہوتا ہے۔ ان کا مزاح کسی تصنع کی کاوش کا نتیجہ معلوم نہیں ہوتا۔ بلکہ بے ساختہ پن کا خوبصورت منظر ہے۔

۸۔ تازگی اور ندرت پطرس بڑے ذہین اور طباع شخص تھے وہ ہر بار ایک نئی بات، نئے انداز اور نئے پیرائے میں لکھتے ہیں رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں "ممکن ہے بخاری سے کبھی کسی کو تکلیف پہنچی ہو لیکن اتنا یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اُن سے ایک ہی لطیفہ دوسری بار یا کئی بار سننے کی کوفت شاید ہی کسی شخص کو ہوئی ہو۔ چنانچہ ان کی ظرافت بندھے ٹکے تفریحی موضوعات، روایتی کرداروں اور لفظی ہیر پھیر سے بے نیاز ہوتی ہے"۔ ان کے موضوعات میں بڑی اُپج ہے "پطرس کے مضامین" کے دیباچہ میں بڑی ندرت اور تازگی ہے۔ ان کے مزاح کو پڑھتے ہوئے تازہ ہوا کے لطیف اور خوشگوار جھونکوں کا احساس ہوتا ہے۔

غرض پطرس کی مزاح نگاری کا انداز بڑا منفرد ہے اردو کے نثری مزاحیہ ادب کی سطح بڑی پست اور عامیانہ تھی اس میں مزاح کے بجائے پھکڑ پن زیادہ تھا۔ پطرس کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اس پس منظر میں مزاح کا ایک معیاری نمونہ پیش کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے الفاظ میں "پطرس نے اردو مزاح نگاری میں جو نیا اسلوب اور جو نیا انداز اختیار کیا ہے وہ مزاح نگاری میں ایک نئے اسکول کے سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے"۔ بقول پروفیسر حمید احمد خاں "احمد شاہ بخاری اردو مزاح نگاری کی دنیا میں ایک مجتہد کا درجہ رکھتے ہیں"۔

پطرس بخاری

میبل اور میں

تعارف اور پس منظر پطرس بخاری اردو ادب میں خالص مزاح نگاری کے سب سے بڑے نمائندے ہیں۔ ان کے مضامین تعداد میں بہت

کم ہیں۔ مگر فنی اعتبار سے بہت بلند پایہ ہیں۔ ان کا ایک ہی مجموعہ مضامین ہے جو مضامین پطرس" کے نام سے شائع ہوا مگر یہ مختصر مجموعہ اردو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کا ایسا شاہکار ہے جو پطرس کو زندہ جاوید رکھنے کے لئے کافی ہے۔ اس کے علاوہ بھی انہوں نے متعدد مضامین و خطوط لکھے ہیں۔ پطرس بعض تراجم بھی کیے ہیں۔

ان کا مضمون "میبل اور میں" ہمارے نصاب میں شامل ہے جو "مضامین پطرس" سے لیا گیا ہے اس میں انہوں نے اعلیٰ درجہ کے طلبا و طالبات کی کم نظری اور کم علمی پر طنز کی ہے۔ جو کتابوں کا مطالعہ کیے بغیر ہی ان کتابوں پر نظریاتی تبصرہ کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔

مشکل الفاظ و محاورات ـــــ معانی اور تشریح

صفحہ ۶۶

ہمہ دانی: سب کچھ جاننا۔ علمیت۔ گیرائی: وہ مقام جہاں آرٹ کی گیرائی ہو۔ کنسرٹ: محفل موسیقی۔ باہم: آپس میں۔ یک جہتی: اتفاق۔ ہم خیالی۔ ہم آہنگی: اتفاق رائے۔ ہم آواز ہونا۔ قائل: ماننے والے۔ تسلیم کرنے والے۔ تکذیب: تردید۔ جھٹلانا۔ صنف ضعیف: کمزور جنس۔ عورت۔ حکم: حکم کرنا۔ زبردستی۔ آبا و اجداد: باپ دادا۔ مورثان اعلیٰ۔ آبا: جمع اب کی بمعنی باپ اور اجداد جمع جد کی بمعنی دادا۔ اشرف المخلوقات: تمام مخلوقات سے اعلیٰ

صفحہ ۶۷

حشرات الارض: کیڑے مکوڑے۔ نظر انداز کرنا: دیکھنے سے چھوڑنا۔ توجہ نہ کرنا۔ لاج رکھنا: عزت بچانا۔ شرم رکھنا۔ راتوں کی نیند حرام کرنا: بے چینی کرنا۔ سونے نہ دینا۔ جانفشانی: قربانی۔ محنت۔ کھپانا: شرمندہ۔ حق نسوانیت: عورتوں کا حق۔ ندامت: نادم ہونا۔ خمسار ہونا۔ بتدریج: درجہ وار۔ آہستہ آہستہ۔ ایثار: قربانی سہل: آسان۔ اخلاقی پستی: اخلاقی گراوٹ۔ تیار ہو جانا: رائے زنی: رائے دینا۔

صفحہ ۶۸

جدت: نیا پن۔ اوالعزمانہ: بے پروائی سے۔ نبھ نہ سکا: ٹھیک نہ ہو سکا۔ ٹھیک بیان نہ ہو سکا۔ کنکھیوں سے دیکھنا: ترچھی نگاہ سے دیکھنا۔ نظریں چرا کر دیکھنا۔ آن: عزت۔ بار: بوجھ۔ ذمہ داری۔ ناخواندہ کتاب: وہ کتاب جسے پڑھا گیا نہ ہو آسودگی۔ تسکین۔ سکون۔ نقاد: جو شخص کسی تحریر یا شعر کو جانچتا اور پرکھتا ہے اور اس کا مرتبہ متعین کرتا ہے۔

صفحہ ۶۹

دبنا: مغلوب ہونا۔ رعب میں آنا۔ معترف ہونا: مان جانا۔ تسلیم کر لینا۔ بالیدگی: پیدائش۔ نمو۔ نشوونما۔ عظمت: بڑائی۔ برتری: بڑھ کر ہونا۔ توانمند: توانا: صحت مند۔ صراط مستقیم: سیدھا راستہ۔ فریب: دھوکا۔ سراہنا: تعریف کرنا۔ داد چاہنا: تعریف کی خواہش رکھنا۔ تفوق: فوقیت۔ برتری۔ اطمینان قلب: دل کی تسکین۔ مفقود ہونا: غائب ہونا۔ ختم ہونا۔ حقیر: گھٹیا۔ ذی علم: صاحب علم۔ علم والا۔ راست بازی: سچائی۔ صداقت

علالت: بیماری۔

صفحہ ۷ | بازاری ناول: گھٹیا ناول۔ تصنیف: معمولی۔ ہلکا۔ گناہ کبیرہ: بڑا گناہ۔ بھاری گناہ۔ پیچ و تاب کھانا: تڑپنا۔ دل ہی دل میں غصہ کھانا۔ پول کھلنا: راز ظاہر ہونا۔ بھید کھلنا بن گھڑت: مصنوعی۔ پلاٹ کہانی کا خاکہ۔ کیریکٹروں: ناول کے کردار۔ اشخاص

صفحہ ۱۷ | تائب: توبہ کرنے والا۔

سبق کا خلاصہ

مصنف کہتا ہے "اگرچہ میبل لڑکیوں کے کالج میں پڑھتی تھی۔ تاہم کیمرج یونیورسٹی میں میرا اور اس کا مضمون ایک ہی تھا۔ لیکچروں میں ملاقات ہو جاتی تھی۔ ہماری دوستی بھی تھی۔ وہ تصاویر اور موسیقی کا شوق رکھتی تھی اور میں اپنی عظمت کا گھمنڈ رکھتا تھا۔ کتابوں پر ہماری تنقیدی بحث اکثر رہتی تھی۔ اس احساس سے میرے مردانہ وقار کو صدمہ پہنچتا کہ وہ مجھ سے وسیع مطالعہ رکھتی ہے وہ مرد اور عورت کے مساوی حقوق کی قائل تھی جب کہ میں مردانہ تفوق پر ایمان رکھتا تھا۔

میبل دس بارہ کتابیں خرید کر ہفتہ بھر کے مطالعہ کے بعد میرے کمرے میں پھینک جاتی۔ میرے لئے دس بارہ کتابوں کا ایک ہفتہ میں مطالعہ کر لینا ناممکن تھا۔ چنانچہ مجھے اعترافِ شکست کرنا پڑتا اور وہ احساس تفوق میں مجھے شاگرد سمجھنے لگ جاتی۔ آخر میں نے ایک ناجائز ذریعہ اختیار کیا۔ کتابیں پڑھے بغیر میں سنبھل سنبھل کر اس کے سامنے تبصرہ شروع کر دیتا وہ میری ہاں میں ہاں ملاتی۔ حتیٰ کہ میں خود حیران رہ جاتا تھا کہ خواندہ کتابوں پر کس عمدگی سے میں تبصرہ کر سکتا ہوں۔ تاہم اس ناجائز ذریعہ سے اب میرا مردانہ تفوق بحال ہو گیا تھا۔

ایک بار میں انفلوئنزا میں مبتلا ہوا۔ بیماری میں مجھ پر رقتِ قلب طاری ہو جاتی ہے اور میں معمولی کتابوں پر بھی بے حد نادم ہو جاتا ہوں۔ بخار کے عالم میں مبتلا تھا کہ میبل میرے پاس آئی۔ میں نے رقت کے عالم میں اس سے معافی مانگی کہ میں اب تک ناخواندہ کتابوں پر تبصرہ کر کے تجھے دھوکا دیتا رہا ہوں۔ وہ کہنے لگی کہ آپ کا تبصرہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا۔ میرے اعترافِ گناہ پر ہم ہنستے رہے۔ جاتے وقت وہ کتابیں ساتھ لے جانے لگی میں نے کہا ابھی رہنے دو۔ آپ تو ان کا مطالعہ کر چکی ہیں۔ میں اب ایک بار ان کا مطالعہ کر کے آپ سے بحث کروں گا۔ وہ کتابیں چھوڑ کر چلی گئی۔ میں نے کتابوں کو پہلی بار کھولا ان میں سے کسی کتاب کے ورق نہیں کاٹے گئے تھے یعنی میبل نے ان کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔"

اہم اقتباس کی تشریح

سوال: متن اور سیاق و سباق کے حوالے سے مندرجہ ذیل عبارت کی تشریح کریں۔

"علالت کے دوران میرا دل زیادہ نرم ہو جاتا ہے۔ بخار کی حالت میں کوئی بازاری سا ناول پڑھتے وقت بھی بعض اوقات میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ صحت یاب ہو کر مجھے اپنی اس کمزوری پر ہنسی آتی ہے۔ لیکن اس وقت اپنی کمزوری کا احساس نہیں ہوتا۔"

جواب: متن کا حوالہ یہ عبارت "میبل اور میں" سے لی گئی ہے جس کے مصنف پطرس بخاری ہیں۔

سیاق و سباق مصنف کو میبل کی وسعت مطالعہ کے سامنے اپنی کم علمی پر بے چینی محسوس ہوتی ہے وہ ناخواندہ ہی کتابوں پر تبصرہ کر کے میبل کو مرعوب کر لیتا ہے۔ مگر اسے یہ احساس ہے کہ وہ فریب اور مکاری سے کام لے رہا ہے مگر انفلوئنزا میں مبتلا ہو کر بخار کے عالم میں وہ میبل کے سامنے اعتراف گناہ کر کے معافی مانگتا ہے یہ عبارت اس کے اعتراف گناہ سے پہلے آئی ہے جس میں اعتراف گناہ کا سبب بیان ہوا ہے۔

تشریح مجھ میں ایک کمزوری ہے کہ جب بیمار پڑتا ہوں تو دل بہت ہی نرم پڑ جاتا ہے اور معمولی سی محرک پر رونا آ جاتا ہے۔ حتیٰ کہ کسی گھٹیا قسم کا مطالعہ کرتے وقت بھی رقت قلب سے رونا آ جاتا ہے۔ حالانکہ ایسے گھٹیا ناول عموماً حالت صحت میں میرے جذبات پر کبھی اثر انداز نہیں ہوتے۔ ان کی تاثیر کا سبب یہ نہیں کہ ناول نگار نے درد دل سے کوئی واقعہ یا حادثہ یا کیفیت بیان کی ہے بلکہ اس کا سبب میری اپنی نرم دل ہوئی ہے جو بیماری کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ صحت یاب ہونے پر میں خود اپنی اس کمزوری کا خیال کر کے ہنستا ہوں کہ میں ایسی عاقبت آمیز حرکت کا کیوں مرتکب ہوا مگر بیماری کے عالم میں مجھے اپنی اس کمزوری کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ میں اس قدر بے خبر ہوتا ہوں کہ میرے اعصاب کمزور پڑ گئے ہیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ

حالات زندگی

مرزا فرحت اللہ بیگ کے آباؤ اجداد بدخشاں سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے آپکے

داد کو مغل فرمانروا اکبر شاہ ثانی نے گورنر جنرل کے دربار میں اپنا بااختیار نمائندہ مقرر کیا تھا۔ اس اعتبار سے اُن کا خاندان دہلی کے معزز اور اہم گھرانوں میں شمار ہوتا تھا۔

فرحت اللہ بیگ ۱۸۸۴ء میں دہلی میں پیدا ہوئے تو دس برس کے تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ ابتدائی تعلیم گورنمنٹ ہائی سکول دہلی میں پائی۔ سکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی میں داخل ہوئے۔ اسی زمانے میں انہوں نے اپنے طور پر مولوی نذیر احمد سے عربی پڑھی۔ ۱۹۰۵ء میں بی اے کے بعد ملازمت کی تلاش شروع ہوئی۔ تلاش معاش کے سلسلے میں پہلے رامپور گئے پھر الٰہ آباد اور آگرہ سے ہوتے حیدرآباد دکن چلے گئے۔ کیونکہ فرحت اللہ بیگ کا سارا خاندان وہیں مقیم تھا۔ ۱۷ دسمبر ۱۹۱۰ء کو چادر گھاٹ ہائی سکول میں انگریزی استاد کی حیثیت سے تقرر ہوگیا۔

محکمہ تعلیم میں ان کی مدت ملازمت بہت مختصر تھی۔ ۲۹ اپریل ۱۹۰۸ء کو ہائی کورٹ کے مترجم کی حیثیت سے نیا تقرر ہوا۔ ان کی باقی زندگی حیدرآباد کی ملازمت میں گذری وہ ترقی کرتے کرتے اسسٹنٹ ہوم سیکرٹری کے عہدے تک پہنچے اور اسی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔

۱۹۴۷ء میں حیدرآباد دکن میں فوت ہوئے۔

فرحت اللہ بیگ کا اسلوب

۱۔ شگفتگی و ظرافت

فرحت اللہ بیگ ایک خوش طبع اور خوش مذاق استاد نذیر احمد کے شاگرد تھے۔ بات بات پر مزاح پیدا کرنا اور شگفتگی کے پھول کھلانا غالباً انہوں نے اپنے استاد سے ہی سیکھا تھا۔ ان کی تحریروں میں ایک مخصوص طرز کی شگفتگی ملتی ہے جو ان کے استاد کے اثر اور مرزا صاحب کی ذاتی رجحانات سے خوشگوار امتزاج سے پیدا ہوئی ہے۔ ان کی شگفتہ بیانی کا اہم سبب ان کی بے ارادہ ظرافت ہے حتیٰ کہ اُن کی تنقید بھی شگفتگی سے خالی نہیں ہوتی۔

۲۔ سنجیدگی اور ظرافت کا امتزاج

بیشتر نقادوں کے نزدیک فرحت اللہ بیگ کے اسلوب کی نمایاں خصوصیت، سنجیدگی اور ظرافت کا خوشگوار امتزاج ہے۔ ان کا مقصد سنجیدہ ہوتا ہے مگر اندازِ بیان شگفتہ اور ظریفانہ اختیار کرتے ہیں۔

۳۔ زبان کی چاشنی

فرحت اللہ بیگ کی ابتدائی تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی باقی عمر دکن میں گذری۔ دونوں اردو کے مرکز تھے

چنانچہ مرزا صاحب کی زبان میں ایک مخصوص چٹخارا اور ایک خاص چاشنی ہوتی ہے اور ہمیں اس مطالعے سے وہ مسرت محسوس ہوتی ہے جو اعلیٰ پایہ کی زبان سے ہونی چاہیئے۔ عبدالقادر سروری کا خیال ہے کہ "مرزا فرحت اللہ بیگ کی: بیانی کی بڑی خامیں ان کی دلکش زبان ہے۔ صاف ستھری اور با محاورہ زبان لکھنے پر انہیں بڑی قدرت حاصل تھی"!

۴۔ مشرقیت

وہ ہندوستان کی قدیم تہذیبی، مجلسی اور ثقافتی زندگی کے بڑے دلدادہ تھے چنانچہ ان کے مضامین دلی کا یادگار مشاعرہ پھول والوں کی سیر، نئی اور پرانی تہذیب کی ٹکر اور ایک وصیت کی تعمیل وغیرہ مشرقیت سے ان کی محبت کا واضح ثبوت ہیں۔

۵۔ قدامت پسندی

ویسے تو مرزا فرحت اللہ بیگ بڑے جدت پسند تھے۔ مگر انہیں قدیم افراد مقامات اور چیزوں سے بڑی محبت تھی مولوی نذیر احمد، وحیدالدین سلیم اور عظمت اللہ خاں وغیرہ کے شخصی خاکے نیز یادگار مشاعرہ اور پھول والوں کی سیر وغیرہ میں انہوں نے قدامت پسندی بلکہ قدامت پرستی کا ثبوت دیا ہے وہ قدیم چیزوں سے محبت کرتے ہیں۔ اس کے برعکس انہوں نے "صاحب بہادر" میں جدید تہذیب کا مذاق اڑایا ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ ایک خوش مذاق، مزاح نگار تھے وہ طنز نگار نہیں بلکہ مزاح نگار تھے کیونکہ ان کا نقطۂ نظر ہمیشہ ہمدردانہ ہوتا ہے۔

فرحت اللہ بیگ

کل کا گھوڑا

تعارف اور پس منظر

مرزا فرحت اللہ بیگ اردو کے نامور مزاح نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے مضامین اب "مضامین فرحت" کے نام سے کئی جلدوں میں ملتے ہیں۔ مرزا کا اسلوب دلکش اور زبان شیریں اور شگفتہ ہے۔ ان کے کئی مضامین انشائیہ کے فن پر اور کئی مضامین افسانے کے معیار پر پورا اترتے ہیں۔ ہمارے نصاب میں ان کا مضمون "کل کا گھوڑا" شامل ہے جو مضامین فرحت "حصہ اول" سے لیا گیا ہے۔ اصل مضمون بہت طویل ہے۔ ہمارے نصاب میں اس کا پہلا تہائی حصہ شامل ہے۔ اس مضمون کا خاکہ جون ۱۹۰۹ء کے رسالہ پیرسنز سے اڑایا گیا ہے۔ لیکن مصنف نے اس رسالے کے اصل مضمون میں یوں اضافہ کیا ہے کہ "کل کا گھوڑا" اصل مضمون لگتا

ہے۔ ماخوذ ہیں لگتا۔

مشکل الفاظ و محاورات ـــــ معانی اور تشریح

صفحہ ۲، موجد: ایجاد کرنے والا۔ واسطہ: تعلق۔ دارالتجربہ: تجربہ گاہ۔ لیبارٹری
بساط: ہمت۔ طاقت۔ عامۂ خلائق: عوام۔ عام مخلوقات۔ روپے کھرے کرنا:
روپے کمانا۔ روپے وصول کرنا۔ ہر جگے کا دعویٰ: ہر جانے کا دعویٰ۔ نقصان کا دعویٰ۔

صفحہ ۴، یکے بعد دیگرے: ایک کے بعد دوسری۔ ایک ایک کر کے۔ متمتع: فائدہ اٹھانے
والا۔ نصیب دشمناں: دشمنوں کے نصیب میں۔ دشمنوں کے حصے میں۔
کھلنا: ظاہر ہونا۔ اب پچھتائے کیا ہوت ... : بعد از وقت افسوس کرنا بے کار ہے
صادق آنا: درست ہونا۔ کاروبار کا سندا: کاروبار کا دیوالیہ۔ اندھان ہونا
خسارہ ہونا۔ نادہندی: رقم واپس نہ کرنا۔ کھگ: کھوکھلا۔ کھکو: مفلس۔ نادار۔ بے اعتنائی:
بے توجہی۔ بے پروائی۔ واہی تباہی بکنا: بے ہودہ اور فضول باتیں کرنا۔ ہوا خوری: سیر
بے تکی: بے جوڑ۔ نامعقول۔ چہرے پہ سرخی دوڑنا: خوش ہونا۔ جوش میں ہونا۔ آنکھوں کا چمکنا:
خوش ہونا۔ جوش میں آنا۔

صفحہ ۵، مضحکہ خیز: ہنسی مذاق پیدا کرنے والی۔ چراغ ہدایت: راستہ دکھانے والا چراغ۔
دم بخود ہونا: حیران ہونا۔ چپ ہونا۔ ششدر ہونا۔ گھر سدھارنا: گھر کو
چلے جانا۔ کوفت: دکھ۔ صدمہ۔ اکھڑی اکھڑی باتیں: رنجیدہ اور دل برداشتہ ہو کر بولنا۔
صلواتیں سنانا: برا بھلا کہنا۔ گالیاں دینا۔ مشکی: کالے رنگ کا۔ خرچ: نقصان۔ خسارہ
بھونریاں: ایک چکر یا دائرے میں اگے ہوئے بال۔ (واحد: بھونری)

صفحہ ۶، بیڑیاں: برقی خانوں کے سلسلے یا مورچے۔

صفحہ ۷، ٹکے پیدا کرنا: روپیہ کمانا۔ دلدر دور ہونا: نحوست کا جاتے رہنا۔ خوش
حال ہونا۔ اچار ڈالنا: بے ضرورت کسی چیز کو زیادہ دیر تک اپنے پاس
رکھ لینا۔

صفحہ ۸، اندھا کیا چاہے دو آنکھیں: ضرورت مند ہمیشہ حاجت روائی چاہتا ہے۔ تھان:
اصطبل۔ ضابطہ: قاعدہ۔ قانون۔ مہتمم: منتظم: اہتمام کرنے والا۔
ٹیڑھی کھیر ہونا: مشکل کام۔ جو نہ ہو سکے۔ پشت: نسل۔ پیڑھی۔ ڈربی: آپسم (انگلستان) کے
مقام پر ایرل آف ڈربی کی ۱۸۸۰ء میں جاری کردہ گھوڑ دوڑ۔

سبق کا خلاصہ

میرے دوست مسٹر مُور نہایت ہی غیر معمولی موجد ہیں۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر ہر وقت کل پرزوں کو جوڑ توڑ رہے ہوتے ہیں۔ میں نے کہا کہ جگ میں بلجیم نے بڑی ہمت دکھائی۔ تو کہنے لگے کہ مسٹر بلجیم کون ہیں؟ انہیں ایجادات کے سوا دنیا کی کسی بات سے غرض نہیں ہے مگر انہوں نے اپنی کسی ایجاد سے فائدہ نہ اٹھایا۔ یار لوگ ان کی ایجادات کو رجسٹری کروا کر لاکھوں کما گئے۔ اگر باپ دادا کی جائیداد نہ ہوتی تو مُور بھوکے مرتے۔

ایک دن ان کے دارالتجربہ میں گیا۔ میرے ہاتھ میں کتاب دیکھ کر کہا یہ کیا ہے۔ میں نے کہا میر حسن کی مثنوی کا انگریزی ترجمہ۔ جس میں کل کا ایک گھوڑا ہے جو اڑتا ہے۔ یہ سن کر وہ چونک پڑے اور مجھ سے قصہ سنا۔ پھر کہا کہ کتاب میرے پاس رکھ جاؤ۔ اس کا مصنف تو کوئی بڑا سائنس دان تھا۔ چند روز کے بعد میں نے دارالتجربہ میں ایک گھوڑا دیکھا میں سمجھا اصلی ہے مگر وہ کل کا گھوڑا تھا۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ اس کی رفتار ۳۰۰ میل فی گھنٹہ ہے۔ میرے دل میں خیال آیا کہ یہ گھوڑا جو اصلی معلوم ہوتا ہے۔ ڈربی کی دوڑ میں بہت کام آئے گا۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے گھوڑا ان سے مانگ لیا۔ انہوں نے بخوشی گھوڑا دے دیا۔ میں نے ان سے گھوڑا چلانے اور روکنے کی پوری ترکیب اچھی طرح سیکھ لی۔ ایک دو دن کے بعد ان کے پاس گیا تو وہ گھوڑے کی ایجاد سے بھول چکے تھے اور کسی دیگر ایجاد میں مشغول تھے۔

میں نے گھوڑا دوڑ کے مہتمم کے پاس گھوڑے کا نام رجسٹر کرایا۔ پہلے تو آدم نام بتایا مگر انہوں نے اس کے ماں باپ کا نام پوچھا تو مجھے اس کا نام بدلنا پڑا۔ چنانچہ گھوڑے کا نام "ایجاد" ماں کا نام "ضرورت" باپ کا نام "تجربہ" اور دادا پر دادا کا نام ترقی ابن ترقی لکھوایا۔ اس طرح "ایجاد" کے نام سے میرے گھوڑے کی رجسٹری ہو گئی۔

اہم اقتباس کی تشریح

سوال: متن اور سیاق و سباق کے حوالے سے مندرجہ ذیل عبارت کی تشریح کریں۔

"رجسٹر میں گھوڑے کا اندراج کرنے کے لئے گھوڑ دوڑ کے مہتمم نے اس کا نام دریافت کیا۔ یہ ٹیڑھی کھیر تھی۔ اور میں اس کے لئے تیار نہ تھا۔ لیکن میری تیز طبع نے اس مشکل کو بآسانی رفع کر دیا۔ پہلے اس کا نام آدم بتایا۔ مہتمم نے ماں اور باپ کا نام پوچھا۔ میں نے کہا آدم کو پیدا ہونے کے لئے ماں باپ کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر جب انہوں نے ضابطے کی دفعہ بتائی تو لاچار مجھے نام تبدیل کرنا پڑا۔"

جواب: متن کا حوالہ یہ عبارت "کل کا گھوڑا" سے لی گئی ہے جس کے مصنف مرزا فرحت اللہ بیگ ہیں۔

سیاق و سباق مصنف نے جب مسٹر موٹر کی ایجاد کل کا گھوڑا حاصل کر لیا تو اُسے خیال آیا کہ ڈربی کی دوڑ کے لیے اس کا نام گھوڑ دوڑ کے مہتمم کے پاس رجسٹر کرانا چاہیے۔ مہتمم کے ہاں نام کی رجسٹری کے لیے جاتے ہیں تو وہاں جو صورت حال پیش آتی ہے۔ اس کا ذکر اس عبارت میں کیا گیا ہے۔

تشریح گھوڑ دوڑ کے رجسٹر میں اس گھوڑے کا اندراج کرانے کے لیے جب میں مہتمم کے پیش ہوا۔ تو انہوں نے گھوڑے کے کوائف پوچھے۔ پہلے نام پوچھا۔ یہ بڑا مشکل مسئلہ تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ گھوڑے کا نام بھی رکھنا ہوگا۔ مگر میں بھی ذہین آدمی ہوں۔ فوراً ہی میرے دماغ نے اس مشکل کو حل کر لیا اور گھوڑے کا ایک نام فوراً ہی میرے ذہن میں آگیا۔ چنانچہ میں نے مہتمم کو کہا کہ اس کا نام لکھیے "آدم"۔ مگر مہتمم نے مزید کوائف پوچھے کہ ماں کا نام کیا ہے اور باپ کا نام کیا ہے؟ یہ تمام کوائف رجسٹر میں درج ہوں تو رجسٹر مکمل ہو۔ مگر میں اُن کوائف کا اندازہ پہلے سے نہیں لگایا تھا۔ اس لئے میں نے کہا کہ آدم تو بغیر ماں باپ کے پیدا ہوا۔ اس کے ماں باپ کا نام کیا ہو سکتا ہے؟ میرے اس جواب پر مہتمم صاحب مطمئن نہ ہوئے اور انہوں نے رجسٹریشن کے قواعد کی متعلقہ دفعہ کا حوالہ دے کر کہا کہ جب تک آپ اس کے ماں باپ دادا وغیرہ کا نام نہیں بتائیں گے اس کی رجسٹری نہیں ہو سکتی چنانچہ مجبوراً مجھے گھوڑے کا نام بدلنا پڑا۔

چراغ حسن حسرت

شفاء الملک مرحوم

تعارف اور پس منظر:

چراغ حسن حسرت ایک نامور صحافی تھے۔ انہوں نے تقریباً بیس برس تک اردو صحافت کی ترقی اور فروغ کے لیے کام کیا۔ طنز و مزاح سے انہیں فطری مناسبت تھی۔ "سندباد جہازی" کے قلمی نام سے انہوں نے جو یادگار فکاہی کالم لکھے ان کا انتخاب "حرف حکایت" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ طنز و مزاح سے متعلق متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔

ہمارے نصاب میں اُن کا ایک شخصی خاکہ "شفاء الملک مرحوم" کے نام سے شامل ہے یہ خاکہ ان کی کتاب "مردم دیدہ" سے لیا گیا ہے جو لاہور سے ۱۹۳۹ء میں

شائع ہوئی۔ اس میں آغا حشر، علامہ اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خان اور بعض دوسری شخصیتوں کے مرقعے بھی شامل ہیں۔

مشکل الفاظ و محاورات ـــــ معانی اور تشریح

سن و سال: عمر۔ قد و قامت: ڈیل ڈول۔ جسامت۔ طبیب: علم طب کا ماہر۔

صفحہ ۸۰

معالج۔ ادیب: علم ادب جاننے والا۔ موقوف: منحصر۔ روگی: روگ میں مبتلا۔ دائمی بیمار۔ تردید کرنا: جھٹلانا۔ دھان پان: دُبلا پتلا۔ نازک اندام۔ ہم رنگ: ایک طرح کا۔ امراض: جمع مرض کی۔ بیماریاں۔ بُوعلی سینا: مشہور مسلمان طبیب اور منطقی۔ طبابت: علاج معالجہ۔ طب کا کام حذاقت: طب میں مہارت۔ ایمان لانا: تسلیم کرنا۔ سید احمد شاہ: مشہور مزاح نگار پطرس بخاری کا نام جو مضمون لکھتے وقت زندہ تھے۔

صفحہ ۸۱

شمائل: شمیلہ کی جمع۔ عادتیں۔ خصلتیں۔ شکل و شمائل: صورت و سیرت، بیباق: وہ رقم جو سودے کو پکا کرکے پوری قیمت ادا کرنے سے پہلے بیچنے والے کو دی جائے اور حساب بیباق کرتے وقت وضع کر لی جائے۔ سائی، رونق دوبالا ہونا: رونق بڑھ جانا۔ مالوف: اُلفت کیا گیا۔ پیارا۔ وطن مالوف: پیارا وطن۔ مطب: علاج گاہ۔ سونے پر سُہاگا ہونا: خوبی پر خوبی ہونا۔ نازک اندام: نازک بدن والی، خوب صورت۔ ہم درس: ہم سبق۔ پڑھنے والا ساتھی۔ خمیرہ گاؤزبان: ایک مشہور بوٹی گاؤزبان سے تیار کی ہوئی میٹھی دوا جس کا رنگ زرد اکبر گندمی ہوتا ہے۔ ورقِ نقرہ: چاندی کا ورق۔ خمیرہ گاؤزبان بہ ورقِ نقرہ پیچیدہ: یہ تو خمیرہ گاؤزبان ہے جسے چاندی کے ورق میں لپیٹ دیا گیا ہے۔ عورت کی خوش رنگ شکل کو خمیرہ گاؤزبان سے اور گوٹے میں لپٹے ہوئے دوپٹے کو چاندی کے ورق سے تشبیہ دی ہے۔ جو مطب کی نسبت سے بہت برجستہ اور حسبِ حال ہے۔

شاہ نصیر: اُردو کے مشہور شاعر شاہ نصیر دہلوی جو ذوق کے ہم عصر تھے۔ اودی: سیاہ سُرخی مائل رنگ کی۔ وسمہ: نیل کے پتے سے تیار کردہ خضاب۔ سیاہ رنگ۔ تہذیب نسواں: عورتوں کے لیے ایک مشہور اُردو رسالہ۔

صفحہ ۸۲

سی پی: متحدہ ہندوستان کا صوبہ جسے سنٹرل پراونس کہتے تھے۔ مگرا سے سیپی کی

کی طرح سے بولا جاتا ہے۔ جس میں سے موتی نکلتے ہیں۔ یہ لفظی رعایت ہے اہلِ ہنر: اہلِ فن۔ قدر شناس: قدر دان پھبتی: ہنسی مذاق کی تشبیہ یا بات داد دینا: تعریف کرنا یار لوگ: دوست، ڈھاٹا: کپڑے کی پٹی جو ڈاڑھی بٹھانے کے لیے چہرے پر باندھی جائے۔ گِل حکمت: یہ طب کی اصطلاح ہے۔ بعض ادویہ تیار کرنے کے لیے مٹی اور کپڑے سے برتن کا منہ بند کرنا تاکہ بھاپ باہر نہ نکل سکے۔ اچھل پڑنا: خوشی کا بے اختیار اظہار کرنا۔ نوک جھوک: طعن آمیز باتیں تکرار سالک صاحب: عبدالمجید سالک ایک معروف اخبار نویس چل جانے: نوک جھونک شروع ہو جانے طرح دینا: ٹالی جانا پی جانا: برداشت کر جانا۔ خاموشی اختیار کر لینا۔

سبق کا خلاصہ

یہ لاہور کے مشہور طبیب فقیر محمد چشتی کا خاکہ ہے۔ جو شکل شباہت سے طبیب یا ادیب نہیں لگتے تھے۔ گو دونوں صفات سے متصف تھے۔ قد چھ فٹ کے قریب، سینہ چوڑا، بڑے بڑے ہاتھ پاؤں، چھیاسٹھ برس کی عمر میں کچاس سے زیادہ کے نہ لگتے تھے۔ ناواقف لوگ انہیں کوئی صوبیدار میجر ہی سمجھتے۔ اُن کا وطن جگراواں ضلع لدھیانہ تھا۔ حکیم عبدالمجید دہلوی سے طب کی تعلیم حاصل کی۔ پھر ان کے مطب میں عملی تربیت حاصل کی۔ طبیعت فطری طور پر شوخ تھی۔ دہلی کے ماحول نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ برجستہ بات کرنے میں بڑے ماہر تھے۔ ایک دن مطب میں ایک نازنین ہندو عورت آئی۔ سر پر گوٹے کا دوپٹہ تھا۔ انہوں نے فوراً فقرہ چست کیا کہ "خمیرہ گاؤزبان بر ورقِ نقرہ پیچیدہ" ایک بار میں نے مظفر حسین شمیم کا تعارف کرایا۔ اُن سے پوچھا وطن مالوف! جواب ملا رائے پور۔ پوچھا صوبہ؟ جواب ملا سی پی انہوں نے سی پی کی لفظی رعایت سے برجستہ کہا کہ پھر تخلص موتی رکھیے۔

جب کبھی کسی کی اچھی نظم یا اچھا مضمون پڑھتے یا سنتے یا شوخ فقرہ اور پھبتی سنتے داد دینے میں کبھی بخل نہ کرتے، خود اُن پر یار لوگ اکثر پھبتی کستے۔ وہ پھر بھی برابر محظوظ ہو کر داد دیتے۔ ایک بار خضاب لگا کے ڈھاٹا باندھے بیٹھے تھے۔ میں نے کہا، حضور نے آج چہرے کو گِل حکمت کر رکھا ہے۔ پھبتی سُن کر اچھل پڑے۔ اخبار نویسوں کی نوک جھوک سے بہت محظوظ ہوتے۔ سالک صاحب کو اور مجھے ایک دوسرے کے خلاف اکساتے۔ مگر ہماری نوک جھوک کا سلسلہ نہ چل سکا۔

اہم اقتباس کی تشریح

سوال: متن اور سیاق و سباق کے حوالے سے مندرجہ ذیل عبارت کی تشریح کریں۔

"ایک مرتبہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تو میرے ساتھ مظفر حسین صاحب شمیم بھی تھے۔ میں نے حکیم صاحب سے اُن کا تعارف کرایا۔ تو پوچھا "وطن مالوف؟" شمیم صاحب نے کہا "رائے پور" کہنے لگے "رائے پور کہاں ہے؟" وہ بولے۔ سی پی میں۔" "اچھا یوں کہئے آپ سیپی سے آئے ہیں۔ پھر شمیم تخلص کیسا۔ موتی تخلص کیا کیجیے۔"

جواب: **متن کا حوالہ** یہ عبارت شفاء الملک مرحوم سے لی گئی ہے جس کے مصنف چراغ حسن حسرت ہیں۔

سیاق و سباق مولانا حسرت نے اس مضمون میں شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی مرحوم کی خاکہ نگاری کی ہے۔ ان کی برجستگی اور پھبتی کا ذکر کرتے ہوئے یہ چھوٹا سا واقعہ بیان کیا ہے جو اس عبارت میں درج ہے۔

تشریح حسرت کہتے ہیں کہ میں ایک بار حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میرے ساتھ میرے دوست مظفر حسین بھی تھے۔ جن کا تخلص شمیم تھا۔ حکیم صاحب ان سے متعارف نہیں تھے۔ میں نے ان کا تعارف کرایا۔ تو پوچھا "کہ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟" شمیم صاحب نے بتایا کہ "میں رائے پور کا رہنے والا ہوں۔" حکیم صاحب نے پھر پوچھا کہ رائے پور کہاں واقع ہے؟" جواب ملا کہ "یہ صوبہ سی پی (سنٹرل پراونس) میں واقع ہے۔" لفظ سی پی سے حکیم صاحب کو ایک پھبتی سوجھی۔ یہ لفظ سنٹرل پراونس کا مخفف ہے۔ یعنی صوبۂ متوسط۔ لیکن اسی آواز سے لفظ سیپی بنتا ہے۔ جس میں موتی بنتا ہے۔ چنانچہ حکیم صاحب نے برجستہ پھبتی کسی کہ پھر آپ نے تخلص شمیم کیوں رکھا۔ جب آپ سیپی سے آتے ہیں تو موتی رکھیے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی

الیکشن

تعارف اور پس منظر:

پروفیسر رشید احمد صدیقی ضلع جون پور کے گاؤں مڑیاں میں ۱۹۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ میٹرک جون پور سے کرکے علی گڑھ آ گئے۔ مالی نامساعدت کی بنا پر کچہری میں ملازمت اختیار کی۔ ساتھ ساتھ تعلیم بھی جاری رکھی۔ فارسی میں ایم اے کیا۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی مزاحیہ مضامین لکھنا شروع کیے۔ علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر بھی رہے۔ ۱۹۲۲ء میں علی گڑھ میں اردو کے پروفیسر بنے پھر صدر شعبہ بن گئے۔

آپ اردو کے سنجیدہ مزاح نگاروں اور طنز نگاروں میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ سماجی برائیوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اور قابل قدر اوصاف کی تبلیغ کرتے ہیں۔ ان کے لطیف طنزیہ اشارات سے وہ لوگ زیادہ لطف اندوز ہو سکتے ہیں جو علیگڑھ کے ماحول سے شناسا ہیں۔ وہ طنز و ظرافت کے سلسلے میں لفظی رعایات سے بھی کام لیتے ہیں۔ تاہم ان کے ہاں یہ عیب بھی موجود ہے کہ وہ اکثر موضوع سے بھٹک جاتے ہیں جس سے قاری کا ذہن اُلجھن میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ان کی تصانیف میں "مضامین رشید"، "خنداں"، "طنزیات و مضحکات" "گنج ہائے گراں مایہ" اور "ہم نفساں رفتہ" بہت مشہور ہیں۔

ہمارے نصاب میں ان کا ایک مزاحیہ مضمون الیکشن شامل ہے۔

مشکل الفاظ و محاورات ـــــ معانی و تشریح

صفحہ ۸۴ ضابطہ: قانون۔ نیازمند ساہونا، پورا پورا علم ہونا۔ کم علم ہونا۔ سنگین جرم: ایسا جرم جس پر سخت سزا ملے۔ معاً: ساتھ ہی۔ موزاہی۔ عافیت: خیریت، بھلائی

صفحہ ۸۵ پوسٹ مارٹم POST MORTEM موت کے بعد موت کا سبب دریافت کرنے کے لیے طبی معائنہ۔ آپ کی دعا سے: جملہ معترضہ یعنی زائد سا کیونکہ کلام ہے۔

حقار: وکیل۔ خائف: خوفزدہ۔ مشتبہ: شبہ میں مبتلا۔ ملزم: جس پر کسی جرم کا الزام لگایا گیا ہو۔ گلو خلاصی: چھٹکارا یا چھٹو۔ ایک جانب: ایک طرف۔ نفس معاملہ: معاملہ کی حقیقت و اصلیت۔ دقت: مشکل۔ نیت بخیر ہونا: نیت صاف ہونا۔ بال کی کھال نکالنا: بہت باریکی نکالنا۔ نکتہ چینی کرنا۔ گاؤ خورد: ختم بحمد: خدا کی قدرت۔ رقص: ناچ۔ فیصلہ صادر کرنا: فیصلہ کا حکم سنانا۔ گرگ باراں دیدہ: خرانٹ۔ تجربہ کار۔ پیشکار: مسل خواں۔ نائب سررشتہ دار۔ حلبی شیشہ: حلب کا بنا ہوا شیشہ۔ حلب ملک شام کا ایک مشہور شہر ہے۔ جہاں کے آئینے اور شیشہ گری بہت مشہور ہے۔ ناک کا پھننگ: ناک کا سرا۔

صفحہ ۸۶

عدالت کا کٹہرا: لوہے یا لکڑی کا جنگلہ جس پر ملزم یا وکیل عدالت کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔ نزول: اترنا وارد: اترنے والے۔ آنے والے۔ یعنی فرشتے یا شیطان۔ بحال: قائم۔ یہی لیل و نہار ہونا: ایسے ہی حالات رہنا سایہ زیادہ پڑنے لگا: ان کی آمد زیادہ ہونے لگی۔ تاکہ وہ رشوت دے کر فیصلہ اپنے حق میں صادر کرا سکیں۔ عدالت نوشیروانی: عدالت انصاف، نوشیروان کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ایک عادل بادشاہ تھا۔ اس لیے انصاف پسند عدالت کو عدالت نوشیروانی کہا جاتا ہے۔ یہاں طنز کی گئی ہے۔

فلک گفت "احسن" آسمان نے کہا بہت خوب۔ یعنی شاباش دی۔ طلب ہونے: بلائے گئے۔ داد چاہنا: تعریف و تحسین طلب کی تخلیہ: تنہائی۔ از غیبی فیصلہ: غیب سے، خدائی فیصلہ۔ رمز: بھید راز۔

صفحہ ۸۷

ہر چہ باداباد: نتائج سے بے پروا ہو جانا، جو ہو سو ہو۔ تیور: چہرے کا طور پر چرب پڑنا: زبان تیز ہونا۔ انکشاف، اظہار۔ کھلنا، دم بخود ہونا: چکا چکا ہونا۔ حیران رہ جانا۔ دھن ہے: شاباش ہے۔ جے کار: زندہ باد۔ کانوں پر ہاتھ رکھنا: توبہ کرنا۔ طنزیہ جملہ ہے۔ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنا: زور سے بھاگنا۔ مخبری: خفیہ خبریں پہنچانا۔ منہ سے نکل۔ ہونی پر آئی بات: بات زبان پر آئی تو پھر وہ راز نہیں رہتی۔ پیٹنٹ کرانا: اپنے نام مخصوص کرانا۔ جملہ حقوق محفوظ کرانا۔ قلب دفراز: انار چڑھاؤ۔

صفحہ ۸۸

جس کی لاٹھی اُس کی بھینس: زبردست کا ہر چیز پر قبضہ ہوتا ہے۔ مسابقت: سبقت لے جانا۔ جیت جانا۔ تہذیب کا علم: تہذیب کا جھنڈا۔ در پے ہیں: پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ گلچپ، مگرارات، پیچھ، پھلواریاں، پکوڑیاں، ہیضہ پھر ملا:

ہیضہ کی وبا ظاہر ہوئی۔ دشمنِ جہلا جاہل کی جمع۔ مینگیں بڑھانا: میل جول بڑھانا۔ سوکھا پڑنا: خشک سالی ہونا۔ خلجان: اندیشہ۔ خلش فصل: موسم۔ زمانہ۔

مامقیماں، فارسی کی ایک کتاب کا نام جو اس شعر سے شروع ہوتی ہے ؎

مامقیمانِ کوئے دلدارِیم
مرغِ شاخِ درختِ لاہوتیم

لاہوت: خدا کی ذات میں فنا ہونے کا مقام۔ مرغِ درختِ ناسوتیم: میں وہ پرندہ ہوں جو مقامِ لاہوت میں واقع درخت کی شاخ پر بیٹھا ہے

صفحہ ۸۹ روپے واجب تھے: قرض تھا۔ سبیل لگنا: راہ گیروں کے لیے پانی پلانے کا انتظام ہونا۔ خواص: خاصیتیں۔ مَن چلا: بہادر۔ بیباک: نڈر۔ سیاسی: جنگی پالیسیوں سے علاج کرنے والا۔ حیص بیص: تذبذب، کشمکش، پیچ۔ اعتراض کرنا: لنا کنہ میں جھنکوانا: بہت تلاش کروانا۔

صفحہ ۹۰ مجرا: ناچ گانا۔ قضیہ: جھگڑا، تکرار، بحث۔ حوالات: حراست۔ لفیری: شہنائی۔ تجمع: ہجوم۔ ہلڑ: ہنگامہ۔ صبر و شکر قسم کی کوئی چیز بن جانا: پکڑا جانا اور صبر و شکر کے بغیر چارہ نہ ہونا۔ بلوہ: فساد۔

صفحہ ۹۱ جلی حرفوں سے: موٹے حروف میں۔ انارکیسٹ (ANARCIST) زراجی۔ قانون شکن۔ عدیم المثال: جس کی مثال نہ ملتی ہو۔ بے مثال۔ باوقار: فکرِ عمل: سوچنا اور کام کرنا۔ مستثنیٰ: وہ جنہیں الگ نکالا گیا ہو۔ اہلیت: قابلیت۔ لیاقت۔ نفع بخش: نفع دینے والا۔

صفحہ ۹۲ زیرباری: مقروض ہونا۔ تلافی: نقصان کا عوض۔ نقصان کا پورا ہونا۔ زرِ عطیہ: بخشش کی رقم۔ لال بجھکڑ: پرلے درجے کا احمق۔ کان کھڑے ہونا: خبردار ہونا۔ مبحث: بحث۔ معاملہ خلط مبحث: گفتگو کے دوران غیر متعلق بات لے آنا۔ چنگھاڑ: چیخ۔ زار و قطار رونا: بہت رونا۔ موصوف: جس کی صفت بیان کی گئی۔ یہاں لال بجھکڑ مراد ہے۔ رجوع کرنا: کسی کے پاس جانا۔

نوٹ: یہ ایک طرح کا انشائیہ ہے جس کے موضوعات بے ربط ہوتے ہیں۔ اس لیے اس کا خلاصہ نہیں لکھا گیا۔

اہم اقتباس کی تشریح

سوال: متن اور سیاق و سباق کے حوالے سے مندرجہ ذیل کی تشریح کریں:

"میں نے کہا حضور! اپنا اصلی نام مجھے بھی ٹھیک یاد نہیں معلوم۔ لیکن کشتی لڑنا تو اکھاڑے میں بندو خان کے نام سے مشہور ہوا۔ غازی میاں کا علم اٹھانے لگا تو بدھو خلیفہ کہلایا۔ اب فقیری اور فیرنی بیچنا ہوں تو لوگ میر بنے کہنے لگے۔"

جواب: متن کا حوالہ | یہ عبارت "الیکشن" سے لی گئی ہے جس کے مصنف رشید احمد صدیقی ہیں۔

سیاق و سباق | مصنف ووٹر ہے۔ الیکشن میں تین اُمیدوار ہیں۔ تینوں کو ووٹ دینے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ مگر ان سے گریزاں ہے۔ اتفاق سے وہ پولنگ سٹیشن پر پہنچ جاتا ہے۔ وہاں تینوں اُمیدواروں کے ایجنٹ اُسے اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ اور ووٹ کی جانچ پڑتال کرنے والے کلرک کے پیش کرتے ہیں۔ فہرست میں نام بندہ حسن درج ہے، مگر تینوں اُمیدوار اُسے الگ الگ ناموں سے وہاں پیش کرتے ہیں۔ بندو خان، بدھو اور میر بنے۔ کلرک ان سے پوچھتا ہے۔ تو اس کے جواب میں وہ جو کچھ کہتے ہیں۔ اس عبارت میں درج ہے۔

تشریح | کلرک کے استفسار پر میں نے جواب دیا۔ "حضور! اپنا اصلی نام تو مجھے بھی یاد نہیں ہے۔ زندگی کے مختلف ادوار میں میرے نام اتنی بار بدلے ہیں کہ مجھے اپنا پیدائشی نام یاد نہیں رہا۔ جب پہلوانی کرتا تھا اور اکھاڑے میں اترتا تھا تو لوگ بندو خاں پہلوان کے نام سے پکارتے تھے۔ پھر پہلوانی چھوڑ کر میں نے غازی میاں کا جھنڈا اٹھانا شروع کیا تو لوگ مجھے بدھو خلیفہ کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ یہ کام چھوڑ کر اب میں فقیری بجا کر فیرنی بیچنے کا کاروبار کرتا ہوں۔ تو مجھے میر بنے کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ

حالات زندگی

مرزا اسد اللہ بیگ خاں نام اور غالبؔ تخلص تھا۔ ابتدائی دور میں اسدؔ تخلص کرتے تھے۔ ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام عبداللہ بیگ خاں تھا۔ قوم کے سلجوقی ترک تھے۔

غالب کے دادا مرزا قوقان بیگ سمرقند سے ہجرت کر کے ہندوستان پہنچے تو سلطنت مغلیہ رو بہ تنزل تھی۔ پہلے وہ شاہی ملازم رہے۔ پھر ریاست جے پور کی نوکری اختیار کی۔ غالبؔ کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں ابتدا میں نواب اودھ آصف الدولہ کے پاس لکھنؤ میں ملازم رہے پھر حیدر آباد چلے گئے۔ کچھ عرصہ بعد ملازمت کی غرض سے ریاست الور پہنچے اور ایک لڑائی میں مارے گئے۔ اس وقت غالب کی عمر پانچ برس تھی۔ ان کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ نے غالب، ان کی بڑی بہن چھوٹی خانم اور چھوٹے بھائی مرزا یوسف کی پرورش اپنے ذمہ لے لی مگر چچا بھی ۱۸۰۶ء میں وفات پا گئے۔ ان کے پسماندگان کی حیثیت سے دونوں بھائیوں کو انگریزی سرکار سے پندرہ سو روپے پنشن ملتی تھی۔ غالبؔ کا نصف حصہ ساڑھے سات سو یا ساڑھے باسٹھ روپے ماہانہ بنتا تھا۔ ابتدا میں کسی کو خیال نہ آیا کہ پنشن کی اس رقم میں ناجائز طور پر قطع و برید کی گئی ہے۔ تیرہ برس کی عمر میں غالب کی شادی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی صاحبزادی امراؤ بیگم سے ہو گئی۔ دو سال بعد وہ آگرہ چھوڑ کر دہلی آ گئے اور پھر پوری عمر وہیں گذار دی۔ قیام دہلی کے دور میں اخراجات بڑھتے گئے۔ امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ کے مقابلے میں آمدنی کے ذرائع ناکافی تھے۔ چنانچہ غالب نے پنشن کی اصل رقم کی بحالی اور بقایاجات کے حصول کے لئے سرکار انگریزی میں درخواست دی۔ اسی سلسلے میں ۱۸۴۲ء میں کلکتے کا سفر اختیار کیا جو انگریزی حکومت کا مرکز تھا۔ مگر ان کا دعویٰ خارج ہو گیا۔

غالب نے ابتدائی طور پر عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ آگرہ میں قیام کے آخری دو سالوں میں ان کے ہاں ایران کا ایک عالم عبدالصمد آ کر ٹھہرا۔ غالب نے اس سے بہت کچھ سیکھا۔ تیرہ برس کی عمر سے شعر کہنے لگے۔ دہلی میں شاہی دربار سے تعلق پیدا ہوا تو

۱۸۵۰ء میں مغلیہ خاندان کی تاریخ لکھنے پر مامور ہوئے۔ نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کا خطاب ملا اور پچاس روپے تنخواہ مقرر ہوئی۔ ۱۸۵۲ء میں تاریخ کی پہلی جلد "ہر نیمروز" کے نام سے مکمل ہوئی۔ ذوقؔ کے انتقال کے بعد بہادر شاہ ظفر کے استاد مقرر ہوئے۔

نواب یوسف علی خاں والیٔ رام پور نے بھی غالب کی مستقل تنخواہ مقرر کر دی تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد سرکاری پنشن موقوف ہو گئی اور شاہی وظیفہ بھی۔ مرزا کو سخت مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ دو تین سال بعد پنشن بحال ہو گئی مگر معاشی پریشانیوں نے عمر بھر پیچھا نہ چھوڑا۔

۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو انتقال کیا اور دہلی میں خواجہ نظام الدین اولیا کے مقبرے کے نزدیک دفن ہو گئے۔ ۱۹۶۹ء میں برصغیر پاک و ہند اور دیگر ممالک میں ان کی صد سالہ برسی دھوم دھام سے منائی گئی۔ غالبؔ کے سات بچے پیدا ہوئے مگر پندرہ مہینے سے زیادہ کوئی بھی زندہ نہ رہا۔

غالب کی تصانیف میں اردو اور فارسی کے شعری مجموعے، مکاتیب اور نثر کی دیگر کتابیں شامل ہیں جن کی تعداد تقریباً دو درجن ہے۔

مکاتیب غالبؔ کی خصوصیات

سوال: "مکاتیب غالبؔ" کی خصوصیات بیان کیجیے؟

جواب: غالب کے خطوط، اردو نثر کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں اور اسی وجہ سے انہیں جدید اردو نثر کا بانی کہا جاتا ہے۔ خطوط غالب کی اس انفرادیت و اہمیت کی وجہ ان کی مندرجہ ذیل خصوصیات اہم ہیں۔

۱۔ بے تکلفی

غالب کے خطوں کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر بات کو بغیر کسی تکلف کے بڑی بے ساختگی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ غلام رسول مہر کے الفاظ میں اس بے ساختگی کی مثال ایسے ہے "جس طرح فوارے کا منہ کھل جانے سے پانی خود بخود اچھلا چلا آتا ہے" اس لیے غالب کے خط "سراسر آمد" ہیں۔ مثلاً منشی ہرگوپال تفتہؔ کے نام لکھتے ہیں۔

"کیوں صاحب روٹھے ہی رہو گے یا کبھی منو گے بھی؟ اور اگر کسی طرح نہیں منتے تو روٹھنے کی وجہ لکھو" میر مجروحؔ کے نام لکھتے ہیں۔ "مارڈالا یار تیری جواب طلبی نے" بے تکلفی اور بے ساختگی کی یہ خوبی ان کے ہر خط سے نمایاں ہیں۔

۲۔ القاب و آداب میں جدت

مرزا غالب پامال اور فرسودہ طریقوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ شاعری کی طرح نثر میں بھی انہوں نے اپنی راہ سب سے الگ نکالی۔ خطوں میں قدیم انداز ترک کر کے القاب آداب کا نیا، مختصر اور بے ساختہ انداز رائج کیا۔ ان کے القاب اس طرح کے ہیں۔ بھائی میری جان، میرے لڑکے، میرن صاحب، صاحب، نورِ چشم، نورِ صاحب حضرتِ آداب، برخوردار کامگار وغیرہ۔

۳۔ حیاتِ غالب کا مرقع

ان خطوط کو پڑھ کر غالب کے خاندان، پیدائش معاشی حالت، مشاغل و مصروفیات، سفر و صحت دوستوں سے تعلقات، اخلاق و عادات اور شخصیت کے بے شمار پہلوؤں کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔ صرف مکاتیب کو سامنے رکھ کر بھی غالب کی ایک مفصل سوانح عمری مرتب کی جاسکتی ہے۔ خطوط کی روشنی میں "یادگارِ غالب" کی کئی غلطیاں درست کی گئی ہیں

۴۔ ماحول کی عکاسی

ذاتی حالات کے ساتھ خطوں میں غالب کے دور کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی احوال و واقعات بھی ملتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ماحول کی جو بے مثال عکاسی کی ہے، وہ تاریخ سے زیادہ مستند اور مفصل ہے۔ دہلی اور دوسرے شہروں کے حالات ان کے خطوں میں موجود ہیں۔ ملکی و سیاسی حالات کے بارے میں بھی خاصی معلومات ملتی ہیں غالب نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے نتائج و اثرات پر بھی بحث کی ہے۔ ان میں سے بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو اور کہیں نہیں ملتیں۔

۵۔ مکالمہ نگاری

غالب سے پہلے نثر میں، خصوصاً خطوں میں مکالمے کا رواج نہ تھا۔ غالب نے اپنے خطوط میں مکالمہ نگاری کو رائج کیا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں "میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے"۔ ان کے خطوں کے القاب و آداب اور عبارت کا انداز بات چیت کا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے مکتوب الیہ سامنے بیٹھا ہے اور غالب اس سے باتیں کر رہے ہیں۔ مثلاً میر مجروح کو لکھتے ہیں "یہ خط لکھ رہا ہوں، تم سے باتیں کرنے کو جی چاہا، یہ باتیں کر لیں"۔

۶۔ منظر کشی

غالب اپنے خطوں میں بعض مناظر اور اشخاص کی نقشہ کشی اس بلاغت کے ساتھ کرتے ہیں کہ ہو بہو تصویر سامنے آجاتی ہے۔ مثلاً ایک خط میں برسات کی منظر کشی اس طرح کرتے ہیں "برسات کا نام آگیا ——— یہ برسات جمیع حالات کی جامع ہے۔ آج اکیسواں دن ہے۔ آفتاب نظر آجاتا ہے جس طرح بجلی چمک جاتی ہے۔ رات کو کبھی کبھی اگر تارے دکھائی دیتے ہیں تو لوگ اُن کو جگنو

سمجھ لیتے ہیں۔ مبالغہ نہ سمجھنا۔ ہزارہا مکان گر گئے۔ سینکڑوں آدمی جا بجا دب کر مر گئے گلی گلی نہریں بہہ رہی ہیں۔

۷۔ علمی و ادبی مرقع

غالب نے اپنے خطوں کے ذریعے مختلف موضوعات پر بحث کی ہے۔ بہت سے شاگردوں کو شعری اصلاح دی ہے۔ اس ضمن میں بعض الفاظ و اصطلاحات کی وضاحتیں اور فن شعر سے متعلق رموز و نکات خطوں میں بیان ہوئے ہیں جن کے سبب مکاتیب غالب کو ایک جامع اور بلند پایہ علمی و ادبی مرقع کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔

۸۔ مزاح و ظرافت

مرزا غالب طبعاً خوش مزاج انسان تھے۔ اپنی زندہ دلی کی بنا پر وہ ہر بات کو مزاح و ظرافت کے پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ کہیں کہیں دوستوں پر طنز اور چوٹ بھی کر جاتے ہیں۔ مثلاً رام پور کے ایک سرکاری جشن کا حال لکھتے ہوئے بیان کرتے ہیں "طوائف کا وہ ہجوم، حکام کا وہ مجمع کہ اس مجمع کو طوائف الملوکی کہنا چاہیے"۔ اپنی پریشانیوں کا نقشہ کھینچتے ہوئے اپنے اوپر طنز کرتے ہیں "آپ اپنا تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں۔ یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں کہ لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی دان ہوں۔ آج دو روپے تک میرا جواب نہیں۔ لے اب تو قرض داروں کو جواب دے۔ سچ تو یہ ہے کہ غالب کی مرا، بڑا کافر مرا! بعض اوقات محض تقاضی سے لطف ظرافت پیدا کرتے ہیں۔

مندرجہ بالا خصوصیات کی بنا پر مکاتیب غالب، اردو نثر ہی میں نہیں اردو مکتوب نگاری میں بھی ایک امتیازی شان رکھتے ہیں اور ادب کی تاریخ میں ان کی اہمیت مسلم ہے۔

مرزا اسد اللہ خاں غالب

خطوط غالب

تعارف اور پس منظر

مرزا غالب نے اپنے بزرگوں، دوستوں اور عزیزوں کے نام بے شمار خطوط لکھے۔ ان میں سے کچھ تو ان کی زندگی میں "عود ہندی" کے نام سے شائع ہوئے۔ کچھ ان کی وفات کے بعد "اردوئے

معلی" کے نام سے شائع ہوئے۔ اس کے بعد بھی غالب کے متفرق خطوط سامنے آتے رہے۔ غلام رسول مہر نے تقریباً تمام دستیاب خطوط کو یکجا کر کے خطوط غالب" کے نام سے مرتب کیا ہے۔ مکاتیب رام پور کا مجموعہ اور منشی نبی بخش حقیر کے نام خطوط کا مجموعہ نادرات غالب" اس کے علاوہ ہے۔ ہمارے نصاب میں ان کے دو خطوط شامل ہیں جن کے نام یہ خط لکھے گئے ان کا مختصر تعارف حسب ذیل ہے۔

منشی ہرگوپال تفتہ سکندر آباد کے رہنے والے تھے۔ غالب سے دو برس چھوٹے اور ان کے شاگرد تھے۔ غالب کے دستیاب خطوط میں سے سب سے زیادہ انہی کے نام ہیں۔ وہ انہیں فرزندوں کے برابر جانتے تھے۔ چنانچہ ازراہ محبت انہیں مرزا کہتے تھے۔ حالانکہ کوئی ہندو مرزا نہیں کہلواتا۔ یہ فارسی کے شاعر تھے ان کا تخلص تفتہ تھا۔ ۱۸۵۰ء میں ان کا انتقال ہوا۔

منشی نبی بخش حقیر اکبر آباد کے رہنے والے تھے۔ علی گڑھ (کول) میں عہدہ دار تھے۔ غالب سے ان کی راہ و رسم غالباً ۱۸۴۱ء سے شروع ہوئی۔ پھر ربط ایسے بڑھے کہ مسلسل خط و کتابت رہی۔ اردوئے معلی میں ان کے نام اور ان کے صاحبزادے منشی عبداللطیف کے نام صرف تین خطوط ہیں مگر نادرات غالب میں ان کے نام ستر خطوط ہیں۔ شاید ہی کوئی خط ہو جس میں غالب نے حقیر کے بیٹوں بیٹی اور پوتوں میں سے ہر ایک کا نام لے کر دعا نہ لکھی ہو۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے غالب کے ساتھ نہایت ہی مخلصانہ دلی مراسم قائم تھے۔ ۱۸۶۰ء میں آگرہ میں وفات پائی۔

مشکل الفاظ و محاورات ـــــ معانی و تشریح

صفحہ ۹۵

مسودہ: کتاب یا مضمون کی ابتدائی غیر مطبوعہ صورت اصلاح: درستی ترمیم۔ فراہم ہونا: ملنا۔ نواب صاحب: نواب ضیاء الدین احمد خاں میرزا جو غالب کی بیگم کے چچیرے بھائی تھے۔ بالاخانہ: چوبارہ۔ مکان کے اوپر کا کمرہ۔ چھت چھلنی ہونا: چھت کا جگہ جگہ سے ٹپکنا۔ توشہ خانہ: وہ جگہ جہاں خانہ داری کا سامان رکھا جائے سٹور۔ کشتی نوحؑ: حضرت نوحؑ کی وہ کشتی جس میں سوار ہو کر وہ اور انکے ساتھی عذاب سیلاب سے محفوظ رہے۔ نجات: چھٹکارا۔ میر بادشاہ: یہ دہلی کے رہنے والے تھے پیشہ کے لحاظ سے منصف تھے۔ تفتہ کے ذریعے غالب سے متعارف ہوئے۔ میر قاسم علی خان: یہ بھی منصف تھے اور غالب کے دیرینہ شناساؤں میں سے تھے۔ ہاترس میں بھی

رہے۔ نواب مصطفےٰ خاں: جہانگیر آباد کے رئیس تھے۔ باذوق شاعر تھے۔ تخلص شیفتہ تھا۔ غالب ان کے بہت قدردان ہیں۔ حالی انہی کے ذریعے غالب سے متعارف ہوئے تھے۔ احسن اللہ خاں: دلی کے مشہور حکیم تھے، احترام الدولہ ان کا خطاب تھا۔ معالج: علاج کرنے والا۔ فصد: رگ سے خون نکالنا۔ طب مشرق کے مطابق اس طرح خون کی غلاظت دور ہو جاتی ہے۔ مسہل: دست لانے والی دوا۔ ناتواں: کمزور۔ صاحب فراش وہ بیمار جو بستر سے نہ اٹھ سکے۔

پورا خط نصاب میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ دوسرا نصف حصہ شامل نصاب نہیں۔

صفحہ ۹۶

آندہ: آئندہ۔ ناخوش: بے آئین مناسب: مناسب طریقے سے۔ رفع ہونا: دور ہونا۔ خاطر جمع ہونا، دل کی تسلی ہونا۔ اطمینان ہونا۔ جیوڑا نکلنا: مرجانا۔ عذر بہانہ۔ معافی۔

اہم اقتباس کی تشریح

سوال: متن اور سیاق وسباق کے حوالے سے مندرجہ ذیل عبارت کی تشریح کیجیے۔

"بھائی تم سچ کہتے ہو کہ بہت مسودے اصلاح کے واسطے فراہم ہوئے ہیں۔ مگر یہ نہ سمجھنا کہ تمہارے ہی قصائد پڑے ہیں۔ نواب صاحب کی غزلیں بھی اس طرح دھری ہوئی ہیں برسات کا حال تمہیں بھی معلوم ہے اور یہ تم جانتے ہو کہ میرا مکان گھر نہیں ہے۔ کرایہ کی حویلی میں رہتا ہوں۔ جولائی سے مینہ شروع ہوا، شہر میں سینکڑوں مکان گرے اور مینہ کی اسی نئی صورت۔ دن رات میں دو چار بار برسے اور ہر بار زور سے کہ ندی نالے بہ نکلیں"۔

جواب: متن کا حوالہ یہ عبارت مرزا غالب کے ایک خط سے لی گئی ہے۔ جو انہوں نے منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھا۔

سیاق وسباق تفتہ نے اصلاح کے لئے قصائد غالب کو بھیجے۔ مگر غالب نے واپس نہ کئے۔ تفتہ کے پوچھنے پر وضاحت کرتے ہیں کہ تاخیر کا سبب بارش بنی ہے۔ اس عبارت میں یہی معذرت پیش کی گئی ہے کہ ایسے عالم میں کہ چھت چھلنی ہے۔ میں کس طرح اطمینان سے کام کر سکتا ہوں۔

تشریح تفتہ کے پوچھنے پر کہ شاید غالب کے پاس بہت مسودات ملاحظہ اور اصلاح کے لئے جمع ہو گئے ہیں۔ اس لئے میرے قصائد اب تک نظرِ توجہ سے محروم ہیں۔ غالب انہیں خط میں لکھتے ہیں کہ بھائی تم سچ کہتے ہو۔ واقعی میرے پاس بہت سے مسودات جمع ہو گئے ہیں۔ مگر یہ نہ سمجھنا کہ صرف تمہارے قصائد کے

مسودات نہیں دیکھ سکا اور دوسروں کے مسودات دیکھتا رہتا ہوں۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں کی طرف سے غزلیات اصلاح کے لئے آئی ہیں۔ وہ بھی تمہارے قصائد کی طرح یونہی پڑی ہیں۔ میں ان مسودات کو کیسے دیکھوں جبکہ برسات کا حال تم جانتے ہو۔ یہاں سیکڑوں مکان برسات میں گر گئے ہیں اور بارش ہر بار نیا سماں دکھاتی ہے۔ دن رات میں کئی بار بادل اس زور سے برستا ہے کہ ندی نالے جاری ہو جاتے ہیں۔ زمین پر سیلاب کی شکل ہے اور چھت چھلنی ہے۔ یہ مکان میرا اپنا نہیں ہے ورنہ خود مرمت کرا لیتا۔ کرائے کا مکان ہے۔ مالک مکان ابھی مرمت پر آمادہ نہیں ہے۔ ایسے حالات میں بمشکل اپنی جان اور سامان کو سنبھالے ہوئے ہوں مسودات پر توجہ دینے کی فرصت کہاں؟

سرسید احمد خاں

حالات زندگی

سرسید احمد خاں ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید محمد متقی کو بادشاہ وقت کے دربار میں خاصا رسوخ حاصل تھا۔ سرسید نے زمانے کے دستور کے مطابق قرآن مجید، عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ شاعروں اور ادبی مجلسوں میں جانے لگے اور زمانے کی عام روش کے مطابق عاشقانہ رنگ میں شعر کہنے لگے۔ تخلص کرتے تھے ۱۸۳۸ء میں والد کی وفات پر ان کی زندگی میں نمایاں تبدیلی پیدا ہو گئی۔

صدر امین دہلی کے دفتر میں سررشتہ داری سے ملازمت کا آغاز کیا پھر آگرہ کچہری کے دفتر میں نائب منشی کے عہدے پر تقرر ہوا۔ ۱۸۴۱ء میں منصفی کا امتحان پاس کرنے پر مین پوری میں منصف مقرر ہوئے۔ ایک سال بعد فتح پور سیکری تبادلہ ہو گیا۔ ۱۸۴۵ء میں بڑے بھائی سید محمد خاں کی وفات نے سرسید کے دل پر ایسا گہرا اثر کیا کہ ان کی زندگی یکسر بدل گئی۔ رنگین مزاجی چھوڑ دی اور مذہبی رنگ طبیعت پر غالب آ گیا۔ والدہ گھر میں اکیلی تھیں اس لئے دہلی تبادلہ کرا لیا۔ اب انہوں نے فقہ، حدیث اور قرآن کا از سر نو غور سے مطالعہ کیا۔ لکھنے لکھانے کا ابتدا سے شوق تھا۔ ۱۸۴۷ء میں پہلی اہم کتاب "آثار الصنادید" شائع کی۔ ۹، ۸ سال بعد ترقی پا کر بجنور میں صدر امین مقرر ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے نتیجے میں مسلمانوں پر جو تباہی نازل ہوئی۔ اس سے سرسید کے دل پر ایسا مایوسانہ اثر ہوا کہ انہوں نے ترک وطن

کر کے مصر جا بسنے کا ارادہ کر لیا۔ پھر اسے کم ہمتی خیال کرتے ہوئے ہندوستان میں ہی رہ کر مسلمانوں کی خدمت اور اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔

۱۸۵۷ء میں سرسید نے بہت سے انگریزوں کی جانیں بچائیں۔ انگریزوں نے جاگیر دینے کی پیش کش کی مگر انہوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے مختلف مضامین اور کتابیں لکھیں جن کا مقصد یہ تھا کہ انگریزوں کا دل مسلمانوں کی طرف سے صاف ہو جائے ملازمت کے سلسلے میں وہ مراد آباد، غازی پور، علی گڑھ اور بنارس رہے۔ ۱۸۶۹ء میں رخصت لے کر انگلستان گئے اور ڈیڑھ برس وہاں مقیم رہے۔ انگلستان کے تعلیمی اداروں اور اخبارات و رسائل کا انہوں نے بغور مشاہدہ کیا ۱۸۷۶ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو علی گڑھ کے مدرسۃ العلوم پر ساری توجہ مرکوز کر دی۔ مسلمانوں کی ہمہ پہلو اصلاح خصوصاً ان کی تعلیمی ترقی ان کا مقصود تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ۱۸۷۰ء میں "تہذیب الاخلاق" کے نام سے ایک علمی و ادبی رسالہ بھی جاری کیا۔

سرسید احمد خاں نے عملی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا کام بھی جاری رکھا۔ ۱۸۹۸ء میں اسی سال کی عمر میں علی گڑھ میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے۔ سرسید کی عمر ۱۹ برس تھی کہ بیوی کا انتقال ہوا۔ دو بیٹے سید احمد، سید محمود اور ایک بیٹی یادگار چھوڑی۔ سرسید نے دوسری شادی نہیں کی۔ سرسید احمد خاں بیمار نویس تھے۔ ان کی تصانیف کی تعداد تیس سے اوپر بنتی ہے۔ بعض اہم کتابوں کے نام یہ ہیں۔

۱۔ رسالہ اسباب بغاوت ہند ۲۔ آثار الصنادید
۳۔ سفرنامہ مسافران لندن۔ ۴۔ خطبات احمدیہ
۵۔ تفسیر القرآن (صرف ۱۶ پارے) ۶۔ ترجمہ کیمیائے سعادت ۷۔ تبیین الکلام۔

سرسید احمد خاں کا اسلوب

سرسید احمد خاں کثیر التصانیف مصنف تھے۔ انہوں نے بے شمار مضامین و مقالات اور متعدد کتابیں لکھیں۔ ان کے موضوعات میں مذہب، تفسیر قرآن، تاریخ، سیاست، فلسفہ، معاشرت، تعلیم، آثار، ادب و شاعری شامل ہیں۔ سرسید کی مصنفانہ نویسی کی ابتدا اٹھارہ انیس برس کی عمر میں ہوئی اور اپنی زندگی کے آخری ایام تک وہ تصنیف و تالیف میں برابر مشغول رہے۔

ان کا اسلوب بیان ابتدا میں مسجع اور مقفیٰ ہوتا تھا کیونکہ زمانے کا عام طرز یہی تھا آثار الصنادید کے پہلے ایڈیشن میں سرسید نے قدیم اندازِ نگارش کی پیروی کی اور مشکل تحریر کو اپنایا مگر بعد میں انہوں نے یہ روش ترک کر دی ——— ان کے طرز تحریر کی نمایاں

خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ سادگی اور سلاست سرسید مشکل الفاظ اور پیچیدہ عبارت سے پرہیز کرتے تھے۔ ان کے فقرے بالعموم چھوٹے چھوٹے اور پر مغز ہوتے ہیں۔ انہوں نے سادہ نویسی پر زور دیا ہے۔ لکھتے ہیں "جہاں تک ہو سکے سادگی عبارت پر توجہ کی"۔ اسی وجہ سے اُردو نثر اس قابل ہوئی کہ اس میں دقیق اور فلسفیانہ مطالب بھی ادا ہونے لگے۔

۲۔ بے تکلفی سرسید احمد خاں عبارت آرائی کے بجائے ادائے مطالب پر زور دیتے تھے۔ اس لئے ان کا انداز بیان بڑا بے تکلفانہ ہے جو کچھ ان کے دل میں آتا ہے۔ بے ساختہ سپردِ قلم کر دیتے ہیں۔ ان کی تحریر میں کسی طرح کا تصنع نہیں ملتا۔ بے تکلفی اور بے ساختگی کی وجہ سے ان کے ہاں کہیں کہیں ناہمواری پائی جاتی ہے

۳۔ تنوع سرسید کی تحریروں میں بڑا تنوع ملتا ہے۔ انہوں نے مذہب سے لے کر سیاست اور فلسفہ سے لے کر فنِ تعمیر تک پر طبع آزمائی کی ہے اس معاملے میں غالباً اردو کا کوئی نثر نگار ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ لطف یہ ہے اس کے باوجود انہوں نے جس موضوع پر بھی لکھا، انہیں ادائے مطالب پر پوری قدرت حاصل رہی موضوع کی مناسبت سے ان کے طرزِ بیان میں بھی تبدیلی پیدا ہوتی رہی ہے۔

۴۔ استدلال سرسید کی پوری اصلاحی تحریک ایک عقلی تحریک تھی جس میں ہر چیز کو استدلال و منطق کی بنیادوں پر بیان کیا جاتا تھا۔ ان کی تحریروں میں بھی استدلال و منطق کی خصوصیت موجود ہے۔ انہوں نے مذہبی امور کو بھی استدلال و منطق کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی۔ مذہبی موضوعات سے قطع نظر عام علمی و ادبی بحثوں میں استدلال کو پیشِ نظر رکھنا، سرسید کی بڑی خوبی ہے۔

۵۔ ناہمواری چونکہ سرسید مقصد اور مفہوم پر زیادہ زور دیتے تھے اور تحریر کے حسن اور ادبی خوبیوں کو ان کے نزدیک ثانوی درجہ حاصل تھا اس لئے بعض اوقات وہ قواعدِ زبان کی پابندی نہیں کرتے۔ کبھی نامانوس اور غیر فصیح تراکیب استعمال کر جاتے ہیں، مثلاً سویلائزیشن۔ سویلائزڈ اقوام کبھی متروک الفاظ استعمال کر جاتے ہیں۔ ان کے ہاں بعض جگہ پیچیدہ جملے بھی ملتے ہیں۔

۶۔ جوشِ بیان سرسید بڑی پرجوش شخصیت کے مالک تھے انہوں نے جب کوئی کام ہاتھ میں لیا تو اس کی تکمیل کے لئے بڑے جوش و خروش اور سرگرمی سے کام کیا۔ ان کی کامیاب شخصیت کا عکس ان کی تحریروں میں بھی پایا جاتا ہے۔ ان

کی پرجوش اور ولولہ انگیز تحریروں میں کہیں کہیں خطابت کا رنگ بھی ملتا ہے۔ ان کا جوشِ بیان قاری کے دل پر اثر کئے بغیر نہیں رہتا۔

۷۔ مقصدیت سرسید کے پیشِ نظر مسلمانوں کی ہمہ گیر اصلاح اور ترقی تھی۔ وہ ادب برائے ادب کے قائل نہ تھے۔ ان کے نزدیک علم و ادب اور تحریر و تقریر کو اجتماعی اور اصلاحی مقاصد کا آلۂ کار ہونا چاہیے۔ ان کی جملہ تحریروں میں مقصدیت کا گہرا شعور ملتا ہے۔ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے محض عبارت آفرینی یا لطف بیان کی خاطر کبھی ایک سطر بھی نہیں لکھی۔

۸۔ انشائیہ نگاری سرسید کے بعض ادبی مضامین مثلاً کاہلی، خوشامد، وغیرہ کو باقاعدہ انشائیہ کی صف میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ ان سے پہلے انشائیہ نگاری مروج نہ تھی۔ اس لحاظ سے وہ انشائیہ نگاری کے بانی ہیں۔

۹۔ تمثیلی انداز سرسید کے بعض مضامین مثلاً امید کی خوشی اور گذرا ہوا زمانہ وغیرہ تمثیل کے انداز میں لکھے گئے ہیں۔ اردو نثر میں تمثیل کا یہ انداز بھی عام طور پر رائج نہ تھا۔ سرسید کے تمثیلی مضامین بڑے دلچسپ، شگفتہ اور ادیبانہ ہیں۔

ان خصوصیات کی بنا پر سرسید اردو نثر میں ایک نئی طرز کے موجد ہیں۔ انہوں نے اردو نثر کو اجتماعی اور علمی مقاصد و ضروریات کے لئے استعمال کرنے کا ڈھنگ نکالا اور اس طرح اردو نثر ایک نئے اور وسیع میدان میں داخل ہوئی۔ اس بنا پر انہیں جدید اردو نثر کا بانی کہا جاتا ہے۔

سرسید احمد خاں

اپنی مدد آپ

تعارف اور پسِ منظر سرسید احمد خاں انیسویں صدی میں مسلمانوں کے بہت بڑے سیاسی رہنما تھے جو مسلمانوں کی ہمہ پہلو اصلاح کے لئے کوشاں رہے۔ انہوں نے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لئے ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ میں ایک سکول قائم کیا جو ترقی کرتا رہا اور پھر ان کی وفات کے بعد یونیورسٹی کے درجے تک پہنچ گیا۔ انہوں نے اردو ادب کی بے حد خدمت کی۔ وہ جدید اردو نثر کے بانی ہیں۔ ایک رسالہ

تہذیب الاخلاق" کے نام سے جاری کیا جس میں خود انہوں نے اور ان کے ساتھیوں نے بے شمار اصلاحی اور علمی مضامین لکھے۔ "اپنی مدد آپ" کے عنوان سے جو مضمون ہمارے نصاب میں شامل ہے یہ بھی "تہذیب الاخلاق" سے لیا گیا ہے۔ سرسید کے ایسے تمام مضامین اب "مضامین سرسید" کے نام سے کتابی صورت میں ملتے ہیں۔

اس مضمون میں سرسید نے قومی ترقی کا راز بیان کیا ہے کہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کر اپنی تقدیر سنوارنے کی کوشش کرو۔ دوسروں پر انحصار کر کے اور دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلا کر ترقی نہیں کی جا سکتی۔ ان کی باتیں آج بھی ہماری قومی حالت پر صادق آتی ہیں۔ لیکن غیر ملکی امداد نے ہمیں ترقی سے ہمکنار کرنے کی بجائے تنزل کے ایسے گڑھے میں پھینک دیا ہے کہ اس سے باہر نکلنا مشکل ہو رہا ہے۔

مشکل الفاظ و محاورات معانی اور تشریح

صفحہ ۹۹

عمدہ: اچھا۔ بے عیب۔ آزمودہ: آزمایا ہوا۔ مقولہ: قول، کہاوت۔ گروہ: جماعت۔ از خود: اپنے آپ ہی۔ امر: بات۔ بدیہی: ظاہر و واضح وہ بات جسے ثابت کرنے کے لئے دلیل کی ضرورت نہ ہو۔ لابدی: لازمی۔ بہبودی: بھلائی گرامر کے اصول کے مطابق بہبود درست ہے اور بہبودی غلط۔ کر کر: کر کے۔ بیش بہا: بہت قیمتی، بہت قابل قدر۔ برتاؤ: رویہ۔ طرز عمل۔ قویٰ: قوت کی جمع۔ رد شدن ہونا: واضح ہونا۔ مثبت: تعمیری منفی کی ضد۔ معمل: عمل پر آمادہ کرنے والا۔ محرک:

صفحہ ۱۰۱

منفی: تخریبی۔ مثبت کی ضد۔ مانع: روکنے والا۔ جسمی محنت: حواس کی محنت جسمانی محنت۔ ثمر: پھل۔ نتیجہ۔ حظ اٹھانا: لطف اٹھانا۔ بہرہ یاب ہونا۔ نفس کشی: خواہشات کو کچلنا۔ خواہشات پر قابو پانا۔ الناس علیٰ دین ملوکھم: لوگ اپنے بادشاہوں کے طور طریقے اختیار کرتے ہیں۔ مقرب: قریب رہنے والا۔ مصاحب۔

صفحہ ۱۰۲

نیچر: قدرت، فطرت۔ قاعدہ: قانون۔ دستور۔ پنسال: وہ مقام جہاں پانی ناپنے کا آلہ لگا ہوتا ہے۔ ناتربیت یافتہ: جنہوں نے تربیت نہ پائی ہو۔ اکھڑ: جاہل۔ ناشائستہ۔ قدر و منزلت: عزت۔ توقیر۔ تنزل: زوال، پستی و نابود کرنا: بالکل تباہ کرنا۔

صفحہ ۱۰۳

مشغلہ اشغال: عادات و اطوار۔ مشغلے۔ حاشا و کلا: ہرگز نہیں۔ خدا نہ کرے کسی کام کے نہ کرنے کا عہد کرنے پر بولتے ہیں۔ ناخدا ترس: خدا سے نہ ڈرنے والا۔ مطیع: فرماں بردار۔ بیرونی زور: بیرونی دباؤ۔ خارجی اثر۔ خانوس خیال: فرضی

ایک کاغذی قندیل جس میں کاغذ کے ہاتھی، گھوڑے وغیرہ کتر کر لگا دیتے ہیں۔ گردش کرنے پر ان کا سایہ کاغذ پر معلوم ہوتا ہے۔ محافظ: حفاظت کرنے والا۔ ضامن: ضمانت دینے والا۔ ذمہ دار۔ حکیم: دانش ور۔ فلسفی۔ ہیچ: ہیچ مدان۔ ! : کچھ بھی نہیں۔

سبق کا خلاصہ

اس مضمون میں سرسید بتاتے ہیں کہ اپنی مدد آپ کا جذبہ جس قوم میں موجود نہ ہو۔ وہ دوسروں کی امداد کے باوجود بھی ترقی اور خوشحالی حاصل نہیں کر سکتی۔ کیونکہ اپنی مدد آپ کا جذبہ نہ ہو تو آدمی دوسرے کا محتاج ہو کر اسی پر بھروسہ کرتا رہتا ہے اس طرح وہ خود اعتمادی سے محروم ہو جاتا ہے۔ اپنی مدد آپ کرنے کا خیال اس کے دل سے مٹ جاتا ہے۔ جس سے بے غیرت بن کر دوسروں کی مدد کے لئے ہاتھ پھیلاتا ہے۔ افراد کے ساتھ ساتھ اقوام کا بھی یہی حال ہے۔ جو قومیں اپنے وسائل کو خود بروئے کار لانے کی بجائے دوسروں کی امداد طلب کرنے کی عادی ہوتی ہیں۔ وہ نکمی اور بے عمل ہو جاتی ہیں۔ ان میں ہر قسم کے پست اخلاق پیدا ہو جاتے ہیں۔ جو ان کی قومی زندگی کو تباہ کر دیتے ہیں۔ اور وہ کبھی ترقی اور عروج حاصل کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ سرسید چاہتے ہیں کہ احوال سدھارنے کے لئے حکومت کے سامنے بھی دست احتیاج نہیں پھیلانا چاہیے کیونکہ حکومت تو خود افراد کے اخلاق کا عکس ہوتی ہے جیسے افراد قوم ہوں گے ویسی ہی حکومت ہوگی۔ اس لئے ہمیں چاہیے کہ اپنے اندر جذبہ عمل اور خودداری کا احساس پیدا کریں اپنی بہتری اور ترقی کی خود کوشش کریں۔ کسی کی امداد کا سہارا نہ لیں۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جو کسی قوم کو ذلت سے نکال کر عزت کا مقام دلا سکتا ہے ہم مسلمانوں کو خاص طور پر اس طرف توجہ دینی چاہیے مگر موجودہ حالت پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ہم اس جذبے سے بالکل عاری ہیں۔

اہم اقتباس کی تشریح

سوال: متن اور سیاق و سباق کے حوالے سے مندرجہ ذیل عبارت کی تشریح کریں۔

"تاریخ کے دیکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان و انگلستان کا یہی حال ہوا۔ انگلستان کی رعایا تہذیب و شائستگی میں اس زمانہ کی گورنمنٹ سے آگے بڑھی ہوئی تھی۔ اس نے زبردستی گورنمنٹ کو اپنے ساتھ آگے کھینچ لیا۔ ہندوستان کی رعایا تہذیب و شائستگی میں موجودہ گورنمنٹ سے کوسوں پیچھے پڑی ہے۔ گورنمنٹ کتنا ہی کھینچنا چاہتی ہے مگر وہ نہیں کھینچتی بلکہ زبردستی گورنمنٹ کو پیچھے کھینچ لائی ہے۔"

جواب متن کا حوالہ | یہ عبارت اپنی مدد آپ سے لی گئی ہے جس کے مصنف سرسید احمد خاں ہیں۔

سیاق و سباق | سرسید احمد خاں نے اس مضمون میں ثابت کیا ہے کہ اپنی مدد آپ کا جذبہ ہی ترقی و عروج کی ضمانت ہے کہ اپنے دعوے کے ثبوت میں دلائل دیتے ہوئے وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ اگر قومی اخلاق درست ہو تو گورنمنٹ بھی خرابی پیدا نہیں کر سکتی اور قومی اخلاق درست نہ ہو تو کوئی گورنمنٹ فلاحی کام نہیں کر سکتی۔ یعنی گورنمنٹ اپنی رعایا کا رنگ اختیار کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ یہ عبارت اسی دلیل کے ضمن میں آئی ہے۔

تشریح | ہندوستان اور انگلستان کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو ثابت ہو جاتا ہے کہ انگلستان کی ترقی کا سبب یہ نہیں کہ وہاں اچھی حکومتیں قائم رہیں اور ہندوستان کے زوال اور پستی کا سبب یہ نہیں کہ یہاں کے اب حکومتیں قائم رہیں بلکہ اصل سبب دونوں ممالک کی رعایا اور وہاں کے عوام کا رویہ تھا۔ انگلستان کا حال دیکھو تو وہاں کے اچھے اخلاقی کردار رکھنے والے عوام نے حکومتوں کو مجبور کر دیا کہ وہ بھی ان کی طرح اچھا اخلاقی معیار پیش کریں اور کوئی ایسا قدم نہ اٹھائیں اور کوئی ایسی پالیسی وضع نہ کریں جو قوم کے اخلاقی معیار اور اقدار کو خراب کرے اس طرح انہوں نے اپنی حکومت کو اپنے آگے لگا لیا۔ اور اپنی خواہش کے مطابق ان سے کام لیا ہندوستان کو دیکھو تو اب موجودہ انگریزی حکومت مغربی طرز پر اچھی باتیں اور اچھے اقدام کرنا چاہتی ہے مگر ہمارے عوام کا ذہن فرسودہ اور قدامت پر ستانہ ہے۔ وہ موجودہ حکومت کو ایسے فلاحی کام نہیں کرنے دیتے جن سے ملک ترقی کر سکتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ملکوں کی ترقی کا سبب حکومتیں نہیں ہوتیں بلکہ وہاں کے عوام ہوتے ہیں۔

نذیر احمد دہلوی

حالات زندگی

ولادت: ۱۸۳۰ء۔ مقام: ریہڑ ضلع بجنور (یوپی)، والد: مولوی سعادت علی۔
ابتدائی تعلیم والد سے حاصل کی۔ اس کے بعد بجنور کے ڈپٹی کلکٹر مولانا نصیر اللہ خاں خورجوی سے فلسفہ و منطق اور عربی و نحو کا درس لیتے رہے۔ ان کا تبادلہ ہونے پر مولوی سعادت علی صاحب نے نذیر احمد کو دہلی بھیج دیا۔ یہاں وہ پنجابی کٹڑے کی اورنگ آبادی مسجد میں مولوی عبدالخالق صاحب کے مدرسے میں داخل ہو گئے۔ ان کی زندگی کا یہ دور بہت سخت تھا۔ گھر گھر جاکر روٹیاں مانگنی پڑتیں۔ ۱۸۴۶ء میں حسن اتفاق سے دہلی کالج میں داخلہ مل گیا اور وظیفہ بھی ملنے لگا۔ نذیر احمد نے دور طالبعلمی میں شدید محنت سے کام لیا۔ تکمیل تعلیم پر کچھ وقت ضلع گجرات میں مدرس مقرر ہوئے۔ ۱۸۵۶ء میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو کر کانپور چلے گئے مگر بعد کسی اختلاف کے سبب استعفیٰ دے دیا۔ جنگ آزادی میں انسانی ہمدردی کی بنا پر نذیر احمد نے انگریز عورتوں کی جان بچائی۔ حالات ٹھیک ہوئے تو ان کا تقرر الہ آباد میں ہو گیا۔
ان کے والد پرانے خیال کے آدمی تھے۔ اس لئے انہوں نے دہلی کالج میں انگریزی پڑھنے کی اجازت نہ دی۔ اب نذیر احمد نے محنت اور کوشش کر کے انگریزی سیکھی اور بعض احباب کیساتھ مل کر انڈین پینل کوڈ کا اردو ترجمہ "تعزیرات ہند" کے نام سے کیا۔ اس علمی خدمت پر پہلے تحصیلدار اور پھر ڈپٹی کلکٹر بنائے گئے۔ ۱۸۷۷ء میں حیدرآباد دکن میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہوئے اور ستر سو روپے ماہوار تنخواہ پانے لگے مگر وہاں ماحول سازگار نہ تھا اس لئے کچھ عرصہ بعد دہلی آکر مقیم ہو گئے۔

نذیر احمد کی باقی عمر تصنیف و تالیف میں گذری۔ اس کے ساتھ وہ سرسید کی اصلاحی تحریک کے سلسلے میں علمی اور تعلیمی کانفرنسوں اور اجتماعات میں شرکت کے لئے مختلف شہروں میں جاتے رہے۔ تقریر بھی بہت اچھی تھی حکومت نے ۱۸۹۷ء میں انہیں شمس العلماء کا خطاب دیا۔ برطانیہ کی ایڈنبرا یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی اور پنجاب یونیورسٹی نے ڈی او ایل کی اعزازی ڈگریاں عطا کیں۔
۳ مئی ۱۹۱۲ء کو دہلی میں وفات پائی۔

اہم تصانیف

۱۔ مرآۃ العروس ۲۔ بنات النعش ۳۔ ابن الوقت ۴۔ توبۃ النصوح ۵۔ فسانۂ مبتلا ۶۔ رویائے صادقہ ۷۔ امہات الامۃ ۔ علاوہ ازیں انہوں نے قرآن پاک کا بامحاورہ اردو ترجمہ بھی کیا۔

نذیر احمد کا اسلوب

نذیر احمد دہلوی اردو کے سب سے پہلے ناول نگار تھے ان کی تصانیف میں ناول کے علاوہ تراجم، تفسیر قرآن، تاریخ، سیرت، سیاست، اخلاقیات، مکتوب نگاری اور شاعری وغیرہ شامل ہیں ان کی علمی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے تاہم خالص ادبی نقطۂ نظر سے ان کے ناول ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا بہترین مظہر ہیں۔ ان کے ناول اولیت کے ساتھ ساتھ اصلاحی مقصد اور ادبی نقطۂ نظر سے بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

نذیر احمد کے اسلوب کی نمایاں خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ مقصدیت اور اصلاح

نذیر احمد سرسید کی علی گڑھ تحریک کے اہم رکن تھے انہوں نے سرسید کی اصلاحی تحریک میں بھرپور حصہ لیا ان کی کوئی تحریر اصلاحی مقاصد سے خالی نہیں۔ ان کے ناولوں کا مقصد مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح اور تعلیمی ترقی ہے۔ قصے کہانی میں ادبیت اور فن کو مقصد پر قربان کر دیتے ہیں۔ اسی میں شبہ نہیں کہ ان کے ناولوں نے مسلمان عورتوں کی تعلیم و اصلاح میں بہت نمایاں کردار ادا کیا۔ اس لحاظ سے نذیر احمد اپنے مقاصد میں کامیاب رہے۔

۲۔ مکالمہ نگاری

ان کے اسلوب میں بے تکلف گفتگو اور مکالمے کا رنگ غالب ہے وہ عورتوں کی زبان کے بادشاہ ہیں۔ انہوں نے عورتوں کے فطری مکالموں کو بڑی خوبصورتی اور کامیابی کے ساتھ اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے۔

۳۔ دہلوی زبان اور محاورے

نذیر احمد کی عمر کا بیشتر حصہ دہلی میں گذرا۔ اس لئے انہیں دلی کی ٹکسالی زبان پر پورا عبور حاصل تھا۔ دہلی کے شرفا کے انداز تکلم، الفاظ کے انتخاب و استعمال اور روزمرہ و محاورہ سے وہ بخوبی واقف تھے اور اس کا ثبوت انہوں نے اپنے ناولوں میں بہم پہنچایا ہے۔ انہیں ہزاروں محاورے ازبر تھے جو زبان پر تھے جنہیں وہ بڑی فراخدلی سے استعمال کرتے بعض اوقات محاورات کا استعمال اس سے کثرت سے کرتے ہیں کہ عبارت کی روانی میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔

۴۔ زبان کی شگفتگی نذیر احمد طبعی طور پر ایک زندہ دل اور خوش مزاج شخص تھے ان کی تحریروں میں ان کی طبعی شوخی اور شگفتگی نمایاں ہے۔ بعض اوقات یہ شوخی طنز و ظرافت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ان کے بعض کردار مثلاً مرزا ظاہر بیگ وغیرہ ظرافت کے عمدہ نمونے ہیں۔

۵۔ مثالی کردار نذیر احمد کے ناولوں کے اکثر کردار مثالی ہیں بعض لوگوں کو ان پر اعتراض ہے۔ مگر نذیر احمد کا مقصد اصلاح تھا اس لیے وہ یہ دیکھنے پر مجبور تھے کہ اچھے کرداروں کا انجام اچھا اور بُرے کرداروں کا انجام عبرت ناک ہوتا ہے۔ ان کے اچھے کرداروں میں حجۃ الاسلام اور اصغری اور بُرے کرداروں میں سلیم اور اکبری کو پیش کیا جا سکتا ہے ان کے اکثر کرداروں کے نام ان کی طبعی کیفیات کو ظاہر کرتے ہیں۔

۶۔ زبان کی ناہمواری عربی اور فارسی کے جید عالم ہونے کے سبب نذیر احمد بسا اوقات عربی و فارسی کے مشکل اور ثقیل الفاظ کا بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ عبارت کے درمیان عربی محاورات اور اقوال لے آتے ہیں کبھی کبھی ان کے فقرے طویل اور عبارت عالمانہ ہوتی ہے۔ ان خرابیوں نے ان کی بعض تحریروں کی روانی ختم کر دی ہے۔ ناہمواری کے سبب وہ دلچسپی کے ساتھ نہیں پڑھی جا سکتیں۔

بہر حال مجموعی طور پر نذیر احمد کا اسلوب بہت دلچسپ، جاندار اور شگفتہ ہے اور نثر کی ترقی میں ان کا حصہ ناقابل فراموش ہے ان کی ادبی خدمات کی اہمیت مسلم ہے۔

نذیر احمد دہلوی

سوہن کا راز

تعارف اور پس منظر نذیر احمد عام طور پر ڈپٹی نذیر احمد یا مولوی نذیر احمد دہلوی کے نام سے مشہور ہیں۔ وہ ایک عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے ادیب تھے۔ انہیں اردو کا پہلا ناول نگار خیال کیا جاتا ہے۔ ان کی ناول نگاری کے دو دور ہیں۔ پہلا دور ۱۸۶۵ء سے ۱۸۷۴ء تک ہے۔ مراۃ العروس اور توبۃ النصوح اس دور کے مشہور ناول ہیں۔ پہلے دور میں ناول نگاری کے فنی پرزوں کا مقصد غالب ہے۔ دوسرا دور ۱۸۸۴ء سے ۱۸۹۴ء تک جاری رہا۔ درمیان میں دس سال کا وقفہ حیدر آباد میں ان کی ملازمتی مصروفیات کی وجہ سے پیدا ہوا۔ دوسرے دور کے ناول فنی لحاظ سے زیادہ پختہ ہیں۔ ان میں مولانا نے نفسیاتی ژرف بینی اور

حقائق نگاری سے کام لیا ہے۔ دوسرے دور کا پہلا ناول محصنات (فسانۂ مبتلا) ہے اس کا کچھ حصہ سوکن کے عنوان سے ہمارے نصاب میں شامل ہے مبتلا اس ناول کا ہیرو ہے جو ایک خوب رو اور خود پرست نوجوان ہے۔ باپ نے اس کی آوارگی کا علاج شادی سے کیا اور اپنی بھانجی عبرت بیگم سے اس کی شادی کر دی، جو ایک چھوٹی دیہاتی لڑکی تھی، اپنے خاوند کو رام نہ کر سکی۔ ہریالی نامی ایک خانگی نے مبتلا پر جال ڈال کر اس سے شادی کر لی۔ گھر میں ماما کے روپ میں داخل ہوئی۔ مگر پرانی خادمہ ماما کے آنے سے راز کھل گیا۔ عبرت بیگم کے بڑے بھائی ناظر کی چالاکیوں سے مبتلا بے پس ہو گئے چھوٹے بھائی عاشر نے صلح کرانے کی کوشش کی۔ مگر ناظر کی چالاکیوں سے اور کچھ اپنی آوارہ مزاجی سے مبتلا کنگال ہو کر رہ گیا۔ ہریالی نے دولت ختم ہوتے دیکھ کر ساتھ چھوڑنے کی دھمکی دی، مبتلا کسمپرسی کے عالم میں مبتلا دنیا سے رخصت ہو گیا۔

ہمارے نصاب میں ناول کا وہ حصہ شامل ہے جس میں ہریالی کا راز افشا ہوتا ہے۔

مشکل الفاظ و محاورات ═══ معانی و تشریح

صفحہ ۱۰۷

سوکن: شوہر کی دوسری بیوی۔ مائل: متوجہ۔ راغب۔ عاشق۔ خاطر: مدارات خاطر تواضع۔ آؤ بھگت۔ متفرع: وہ مسائل جن کا تعلق عمل سے ہو۔ داخلِ حسن: حسن میں شامل۔ زبان ہلانا: زبان سے باتیں کرنا۔ متنبہ: تنبیہ پکڑنے والی۔ بے رخ: بے توجہ۔ بے لحاظ۔ ندارد: نہیں۔ غیر موجود۔ بالوں میں تیل کی خبر نہیں: بالوں میں تیل بالکل ہی نہیں ڈالا۔ بھورے روکھے بال، دور سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی ناتھ کوئی مرغی بیٹھی ہے: دور سے کالے بھورے خشک بال ایسے لگتے۔ جیسے سیاہ رنگ کی مرغی کوئی ہو کر کوئی کر کے پر پھیلا رہی ہے۔ کوئی ناتھ: سیاہ رنگ کی مرغیوں کی نسل۔

صفحہ ۱۰۸

اشکراہ: کراہت۔ چڑ: ایسی بات جس کا دیکھنا سننا ناگوار ہو۔ بے تدبیری بے عقلی۔ بد انتظامی۔ پاؤں جمنا: قبضہ ہونا۔ ٹھکانا بننا۔ چھکڑوں کوڑا نکلا: گھر سے اتنا کوڑا کرکٹ نکلا کہ چھکڑوں پر لادا گیا۔ امتیاز: تمیز۔ سوجھ بوجھ۔ پہچان۔ دھر: کنارہ۔ سرا۔ چاندنی: سفید چادر جو دری کے اوپر بچھاتے ہیں۔ چکت: دھبہ نشان۔

صفحہ ۱۰۹

ڈھنڈیا۔ تلاش۔ جستجو۔ کھاں: وہ تختہ یا لکڑیاں جو دیوار دل میں اسباب وغیرہ روکنے کے لیے اونچی جگہ لگاتے ہیں۔ بغارے: چیتھڑے۔ کپڑے یا

دیوار کے بڑے چھید۔ گونتھ گونتھ کر: گوندھ گوندھ کر۔ موٹا جھوٹا سی کر: چھوٹ بڑپن: بدسلیقگی۔ بے ہنری۔ اس نمط پر: اس طور پر۔ اس طریقے سے۔ کیا مضائقہ: کوئی ہرج نہیں تکمنو سدھاریں: لکھنو چل گئیں۔ تالبھاری: فرماں برداری نوکری۔

صفحہ ۱۱۰

بے خود: آپے سے باہر۔ یہاں غصے کے مارے آپے سے باہر ہونا مراد ہے۔ بگوے کی طرح: غضبناک ہو کر۔ اوندھے منہ: منہ بل۔ رانڈ: بیوہ عورت سہاگن: وہ عورت جس کا خاوند زندہ ہو۔ سینکڑوں کوسنے: سینکڑوں بد دعائیں۔ سینکڑوں بار برا بھلا کہنا۔ شامت کی ماری: مصیبت کی ماری۔ ٹھڑوں ٹول: اکیلا تنہا۔ بگٹٹ: باگ ٹوٹی ہوئی۔ سرپٹ: بہت تیز۔ دھم سے: فوراً۔ یکایک۔

صفحہ ۱۱۱

تدبیریں: طریقے۔ علاج۔ کنڈی مار پیٹ۔ گھی مار: وہ چوٹ جو ظاہر دکھائی نہ دے۔ مرغی کو تکلے کا گھاؤ بہت ہے: غریب کو تھوڑا نقصان بہت ہے۔ کمزور کو تھوڑی چوٹ بھی بہت ہے۔ تاہل: تذبذب۔ تردد۔ سوچ۔ اندیشہ

سبق کا خلاصہ

یہ درست ہے کہ مبتلا کا اپنی بیوی کی طرف مائل نہ ہونے کا بڑا سبب مبتلا کی خود پرستی اور آوارگی تھا۔ مگر غیرت بیگم بھی بے قصور نہ تھی۔ اس نے بھی اپنی طرف سے میاں کو مائل کرنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ گھر کے انتظام میں اس نے کوئی دلچسپی نہ لی اور جب میاں کی بے رخی دیکھی تو اپنی جسمانی صفائی اور حسن کی آرائش سے بھی غافل ہو گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مبتلا اس سے بالکل متنفر ہو گیا۔

مبتلا جب ہریالی کو نکاح کر کے گھر لایا تو اسے ماما ظاہر کیا۔ گھر میں ایک انتظام سنبھالنے والی عورت کی ضرورت تھی۔ اس لئے ہریالی کو گھر میں قدم جمانے کا خوب موقع مل گیا ہریالی نے صبح گھر کی بدنظمی، سامان کی بے ترتیبی اور صفائی کا فقدان دیکھا تو جھاڑو دلوائی۔ بے حد و حساب کوڑا نکلا۔ اس دوران بہت سی گم شدہ اشیاء بھی ملیں۔ پھر اس نے دریوں چاندنیوں، پردوں کی صفائی اور ترتیب کی طرف توجہ دی جو جا بجا پھٹی پڑی تھیں اور میل کچیل سے داغدار تھیں۔ اس ضمن میں اسے معلوم ہوا کہ چاندنیوں اور دریوں کا غلط استعمال بھی کیا جا رہا ہے۔ سلیم نے چاندنی کو اپنی اوڑھنی بنا رکھا ہے۔ ہریالی کا انتظامی سلیقہ دیکھ کر مبتلا اپنی پہلی بیوی غیرت بیگم سے اور بھی متنفر ہو گیا۔

ایک دن ہریالی کی پرانی ماما آئی۔ غیرت بیگم سے کہا کہ تمہارے میاں ان کو نکاح کر لائے ہیں۔ میں ان سے ملنا چاہتی ہوں جب پہلے انکشاف ہوا کہ ہریالی میری سوکن ہے۔ تو

عزت بیگم آپے سے باہر ہو گئی۔ اس نے ہریالی اور عزت بیگم کو زبان سے برا بھلا کہا اور دست درازی کی۔ دونوں کو خوب مار پڑی اور خود روتے روتے بے ہوش ہو گئی مبتلا گھر پر نہ تھے۔ نوکر وفادار بھاگا بھاگا کچہری گیا۔ وہاں سے عزت بیگم کا وکیل بھائی ناظر بھاگا بھاگا آیا اور اپنے دوسرے بھائی سید حاضر کو بھی بلوا بھیجا۔ ناظر نے بہن کو ہوش میں لانے کی تدبیریں کیں۔ اس نے پیٹ پیٹ کر اپنا بدن نیلا کر لیا تھا۔ ادھر ہریالی اور ماما کو بھی کافی چوٹ پڑی تھی چند روز دوا دارو میں گزر گئے۔ اب جبکہ راز افشا ہو چکا تھا تو ہریالی اور مبتلا کو کھلم کھلا میاں بیوی بن کر گھر میں رہنے کا پورا موقع مل گیا۔

اہم اقتباس کی تشریح

سوال: متن اور سیاق و سباق کے حوالے سے مندرجہ ذیل عبارت کی تشریح کریں۔

"میں تو ہریالی بیگم کے پاس آئی ہوں جن کو تمہارے میاں نکاح پڑھوا کر نکال لائے ہیں مدت سے میں ان کے یہاں اوپر کے کام پر نوکر تھی۔ بیگم کو تو نکلے تین مہینے ہونے آئے ہیں میں ان کی خالہ کے پاس رہی۔ آج آٹھواں دن ہے کہ وہ بھی لکھنؤ سدھاریں۔ میں نے کہا چلوں اگر بیگم پھر رکھ لیں تو میں ان کے مزاج سے واقف ہوں۔ انجان کی تابعداری کرنی کیا ضرور، کیا وہ اس گھر میں نہیں رہتیں؟"

جواب: متن کا حوالہ

یہ عبارت "سوکن کا راز" سے لی گئی ہے جو مولوی نذیر احمد دہلوی کے ناول "فسانۂ مبتلا" کا ایک اقتباس ہے۔

سیاق و سباق

ہریالی کو بظاہر ماما کے روپ میں آتے تین ماہ گذر چکے تھے۔ کسی کو یہ بات معلوم نہ تھی کہ مبتلا اسے نکاح کر کے لائے ہیں کہ اچانک ایک دن ہریالی کی پرانی خادمہ ادھر آ نکلی اور ہریالی سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ اتفاق سے اس کی مٹھ بھیڑ عزت بیگم سے ہو گئی۔ جو کچھ اس نے عزت بیگم سے بات کی وہ اس عبارت میں درج ہے۔ نو وارد ماما کی بات سے عزت بیگم پر پہلی بار انکشاف ہوا کہ ہریالی گھر کی ماما نہیں بلکہ میری سوکن ہے۔

تشریح

نو وارد ماما عزت بیگم کے پاس آ کر بیٹھی اور کہنے لگی میں تو ان ہریالی بیگم کو لینے آئی ہوں جن کو تمہارے میاں نکاح کر کے لائے ہیں۔ میں ان کے ہاں نوکری کرتی تھی کہ وہ نکاح سے یہاں آ گئی۔ تین مہینے ہو گئے کہ میں ان کی خالہ کے ہاں کام کرنی ہوں مگر وہ بھی اب لکھنؤ چلی گئی ہیں۔ میں نے سوچا کہ ایک بار ہریالی بیگم سے مل کر پوچھ لوں کہ مجھے ملازمت میں رکھیں گی۔ میں ان کی طبیعت اور مزاج سے

واقف ہوں۔ اگر کسی نئی جگہ ملازمت کی تو نئے لوگوں کی طبیعت اور مزاج کی شناسائی میں بھی کافی وقت لگے گا اگر ہریالی کی ملازمت مل سکے تو پھر ناواقف لوگوں کی فرمانبرداری اور نوکری کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جب ماما نے دیکھا کہ عزیز بیگم باتیں بن کر مہموت سی ہیں تو اسے شبہ گزرا کہ میں کہیں غلط گھر میں تو نہیں آ گئی۔ اس لیے زور دے کر عزیز بیگم سے پوچھا کہ ہریالی بیگ یہاں نہیں ہیں۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق

حالات زندگی

ڈاکٹر عبدالحق کے آباو اجداد ہندوؤں کی کائستھ ذات سے تعلق رکھتے تھے مغل شہنشاہ شاہ جہان کے عہد میں مسلمان ہوئے۔

۲۰ اگست ۱۸۷۰ء کو ضلع میرٹھ (یوپی) کے قصبے ہاپوڑ میں پیدا ہوئے۔ انکے والد کا نام شیخ علی حسین تھا۔ ابتدائی تعلیم فیروزپور (پنجاب) میں حاصل کی ۱۸ سال کی عمر میں مزید تعلیم کے لئے علی گڑھ گئے۔ وہاں کے مدرسۃ العلوم سے ۱۸۹۴ء میں بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ علی گڑھ میں وہ پروفیسر آرنلڈ اور مولانا شبلی وغیرہ کے شاگرد رہے۔ ان کے نامور ہم جماعتوں میں ڈاکٹر ضیاء الدین، مولانا ظفر علی خاں اور خواجہ غلام الثقلین شامل تھے۔

بی اے کرنے کے بعد چند سال تک مدرسہ اسمٰعیلیہ حیدرآباد دکن کے صدر مدرس رہے۔ دکن میں ملازمت کے دور میں انہوں نے ایک ادبی رسالے "افسر" کی ادارت کی۔ سرکاری مترجم رہے محکمہ تعلیم میں مختلف عہدوں پر کام کیا۔ پھر اورنگ آباد کے عثمانیہ کالج کے پرنسپل اور بعد میں شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کے صدر کے فرائض انجام دیئے۔

۱۹۱۲ء میں وہ انجمن ترقی اردو کے سیکرٹری مقرر ہوئے تھے۔ ۱۹۳۶ء میں ملازمت چھوڑ کر دکن سے دلی منتقل ہو گئے اور اپنی ساری صلاحیتیں اور اوقات و خدمات اردو کی ترقی کے لئے وقف کر دیں۔ جنوری ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے کراچی آ گئے۔ جہاں انہیں اردو کے لیے سخت لڑائی لڑنی پڑی۔ مشکلات اور رکاوٹیں اپنوں کی طرف سے تھیں۔ مایوس کن حالات میں بھی انہوں نے حوصلہ نہیں ہارا ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۱ء تک انجمن ترقی اردو کے صدر رہے۔

ان کی علمی خدمات کے پیش نظر ۱۹۳۷ء میں آلہ آباد یونیورسٹی نے ڈی لٹ اور ۱۹۴۱ء میں

علی گڑھ یونیورسٹی نے بھی انہیں ڈی لٹ کی ڈگری عطا کی۔ اردو زبان کے لئے ان کی عظیم خدمات کے پیش نظر قوم نے انہیں "بابائے اردو" کا لقب دیا۔
۶ اگست ۱۹۶۱ء کو کراچی میں وفات پا گئے۔

اہم تصانیف اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصہ تنقیدات عبدالحق چند ہم عصر مقدمات عبدالحق۔ نصرتی مرحوم دہلی کالج۔ مکتوبات عبدالحق وغیرہ۔

ڈاکٹر عبدالحق کی ادبی خدمات

سوال: ڈاکٹر عبدالحق کی علمی و ادبی خدمات پر ایک تنقیدی نوٹ لکھئے؟

جواب: عبدالحق مرحوم ایک بلند پایہ نثر نگار، محقق، نقاد اور ماہر لسانیات تھے انہوں نے اپنی ایک نوے سالہ طویل زندگی میں اردو زبان و ادب کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ درحقیقت عبدالحق اور ترقی اردو کی جدوجہد ایک ہی چیز کے دو نام اور ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں ان کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع اور نتائج کے اعتبار سے بے حد وقیع ہے۔ انہوں نے اردو کے علمی سرمائے میں قدر و اضافت، ہر اعتبار سے قابل ستائش اضافہ کیا۔ زندگی بھر وہ برابر اردو زبان کی اشاعت و مدافعت کے لئے معرکہ آرا رہے۔

ان کی شخصیت عظیم تھی اور ان کی ادبی خدمات عظیم تر ہیں۔ ان کی ادبی لسانی تحقیقی اور تنقیدی خدمات اس قدر وسیع، متنوع اور جامع ہیں کہ ان کا احاطہ بک نظر ممکن نہیں۔

انجمن ترقی اردو کے صدر اور سیکرٹری اور مختلف علمی و ادبی رسائل و جرائد کے ایڈیٹر کی حیثیتوں سے قطع نظر محض ان کے نثری ذخیرے اور تحریری کارناموں کو پیش نظر رکھیں تو بابائے اردو کی علمی و ادبی خدمات کے بعض اہم پہلو حسب ذیل ہیں۔

۱۔ دکنی ادب کی دریافت اردو کی نشو و نما میں دکن کا بڑا حصہ ہے۔ دکنی شعراء اور ادبا نے اردو ادب کے ذخیرے میں بیش بہا اضافے کئے مگر دکن کی ادبی کارنامے اہل ادب سے پوشیدہ تھے۔ عبدالحق کا کارنامہ ہے کہ انہوں نے قدیم دکنی تصانیف اور ادبی شاہپاروں سے اصحاب علم کو روشناس کرایا۔ انہوں نے رسالہ "اختر" کی ادارت کے زمانے میں اور پھر رسالہ اردو کے دور میں اس سلسلے میں بہت مفید کام کیا۔ بابائے اردو نے دکنی شعراء کے تذکرے اور نظم و نثر کی کتابیں ایڈٹ کر کے شائع کیں۔ دکنی ادب پر تحقیقی و تنقیدی مضامین و کتابیں لکھیں۔ تذکروں میں چمنستان شعراء اور گل عجائبات، نثر کی کتابوں میں معراج العاشقین، سب رس، نظم کی کتابوں میں قطب مشتری، مثنوی جنگ نامہ، علی نامہ، گلشن مثنوی تنقیدی میں نصرتی اور اردو کی نشو و نما میں صوفیائے

سرام کا حصہ وغیرہ شامل ہیں۔ دکنی شعر و ادب سے متعلق ان کے بے شمار مضامین و مقالات اس کے علاوہ ہیں۔ درحقیقت دکنی ادب کی اس وسیع پیمانے پر دریافت عبدالحق کا بہت بڑا تحقیقی کارنامہ ہے۔ یہ تاریخ ادب پر ان کا ایک عظیم احسان بھی ہے۔

۲۔ دیگر تحقیقی کام

دکنی ادب کے علاوہ شمالی ہند کے ادب سے متعلق بھی بہت سی تحقیقی کتابیں تصنیف کیں۔ شمالی ہند کے علاوہ ہندوستان کے بعض دوسرے غیر دکنی علاقوں اور قدیم مصنفین کی کتابیں بھی بابائے اردو نے دریافت کرکے ایڈٹ کیں اور انہیں شائع کرکے ادب کے طالب علموں کو ان سے روشناس کرایا۔ ان میں تذکرہ گلشن ہند، باغ و بہار، نکات الشعراء اور مرحوم دہلی کالج وغیرہ اہم ہیں۔ قدیم کتابوں کو از سر نو ایڈٹ کرنے کے ساتھ انہوں نے ان پر گراں قدر مقدمے بھی تحریر کیے۔ یہ مقدمات مقدمہ نگاری کا ایک مثالی نمونہ پیش کرتے ہیں۔

۳۔ تنقیدی کارنامہ

محقق کے علاوہ ایک بلند پایہ نقاد بھی ہیں۔ ان کی تنقید میں گہرائی، توازن اور معقولیت ہے۔ ان کی تنقید ایک طرح سے تحقیق کا درجہ رکھتی ہے۔ ان کی زبان بہت صاف، شستہ اور رواں ہوتی ہے۔ ان کے مقدمات میں خاص تنقیدی مواد ملتا ہے۔ ان کی تنقید کی بنیاد میں اس روایت سے پیوست ہیں جو شبلی اور حالی کی روایت ہے۔ تاہم بابائے اردو نے اس روایت کو آگے بڑھایا ہے اور اس میں اپنے انفرادی نقوش چھوڑے ہیں۔ تنقید میں عبدالحق کی رائے ہمیشہ بے لاگ ہوتی ہے ان کی تنقید سے ان کے وسیع مطالعے اور متوازن ذہن کا پتہ چلتا ہے۔

۴۔ ایک کامیاب تبصرہ نگار

بابائے اردو نے مختلف رسالوں کی ادارت کی بحیثیت ایک ایڈیٹر کے انہیں بے شمار کتابوں پر ریویو لکھنا پڑا۔ ان کے تبصرے بڑے جامع ہوتے ہیں وہ زیر تبصرہ کتاب کا جائزہ لیتے ہوئے کوئی قابل ذکر پہلو نگاہ سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔ وہ کتاب کے بارے میں ساری معلومات، اسکی خوبیاں اور خامیاں اس عمدگی سے پیش کرتے ہیں کہ قاری بڑی آسانی سے کتاب کے بارے میں صحیح رائے قائم کرسکتا ہے ان کے عالمانہ تبصرے ان کی تنقیدی بصیرت اور دو ادب و زبان سے انکی محبت کا اظہار ہیں۔ انہوں نے تبصرہ نگاری میں ایک نئی روایت کی داغ بیل ڈالی۔

۵۔ خطباتِ عبدالحق

عبدالحق ایک محقق ہونے کے علاوہ ایک اچھے مقرر اور خطیب بھی تھے انہوں نے بے شمار علمی و ادبی جلسوں اور قومی و ملی اور تعلیمی کانفرنسوں میں تقاریر کیں۔ ان کے یہ خطبات تحریری شکل میں موجود ہیں ان کی ادبی خدمات کے ضمن میں ان خطبات کا تذکرہ ضروری ہے کیونکہ مقالات میں بابائے اردو نے

اکثر اردو ادب کے مسائل پر اپنے خیالات پیش کئے ہیں۔ ان کے خطبات کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ قاری کو مسحور کر لیتے ہیں۔ ان میں عالمانہ نشان موجود ہے۔ خطبات میں بڑی گہرائی اور تنوع ہے کیوں ان میں سوانحی مواد بھی ہے اور تہذیب و ثقافت و ادب و سیرت کے بارے میں عبدالحق کے دقیع خیالات و جذبات بھی۔

۶۔ سیرت نگاری میں انفرادیت

"چند ہم عصر" میں عبدالحق نے دوستوں، بزرگوں اور نیازمندوں کے شخصی مرقعے لکھے ہیں جو اردو سیرت نگاری میں ایک نئے اور انوکھے باب کا اضافہ ہیں۔ یہ تمام خاکے ان کے ہم عصر دل سے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ بڑا کٹھن کام تھا مگر وہ کامیابی کے ساتھ اس سے عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ ان خاکے میں سیرت کا مکمل نقش اور شخصیت کی واضح تصویر پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے چند ہم عصر کے ذریعے اردو میں سیرت نگاری اور شخصی خاکہ نویسی کا ایک انفرادی نمونہ پیش کیا ہے۔

۷۔ منفرد اسلوب

عبدالحق کا اسلوب نگارش بڑا صاف، سادہ، دلچسپ اور پر لطف ہے انہوں نے سرسید کی سادہ نویسی کی روایت کو آگے بڑھایا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے بقول ان کا اہم ترین ادبی کارنامہ ان کا صاف ستھرا اور نکھرا ہوا اسلوب بیان ہے۔ ایسی سادگی دبستانِ سرسید کے کسی دوسرے فرد کے ہاں نہیں ملتی۔ بابائے اردو نے رنگینی بیان سے احتراز کیا ہے ان کا اسلوب شاعرانہ نہیں۔ ان کی تحریروں میں صاف گوئی کا عنصر بہت نمایاں ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں "اردو کے محسنوں اور مخلص خادموں کی فہرست مختصر نہیں۔ اچھی خاصی طویل ہے۔ سینکڑوں ناموں سے متاز اور خدمت کے لحاظ سے ایک سے بڑھ کر ایک۔ پھر بھی اگر مجموعی طور پر کسی ایک کو محسن اعظم کا لقب دیا جا سکتا ہے تو وہ وزارت بلا اختلاف بابائے اردو عبدالحق ہی کی ہو سکتی ہے۔"

عبدالحق کا اسلوب

سوال: بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے اسلوب بیان پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

جواب: عبدالحق اردو نثر نگاری میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ انکا تعلق نثر نگاری کی اس روایت سے ہے جس کا آغاز سرسید احمد خاں سے ہوتا ہے۔ اس اسلوب میں عبارت آرائی اور لفاظی سے قطع نظر کر کے سادگی اور سلاست بیان پر زور دیا جاتا ہے۔ محاورہ بندی کے بجائے مفہوم کی وضاحت پر توجہ رہتی ہے۔ اس طرز کی نثر کا آغاز سرسید احمد خاں سے ہوا چنانچہ عبدالحق کے اسلوب پر سرسید کے طرز تحریر کا گہرا اثر ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کے الفاظ میں سرسید نے انشا میں جس سادگی کی داغ بیل ڈالی تھی اس کی تکمیل کرکسی نے کی تو عبدالحق نے کی۔ اگر شاعری کی طرح نثر بھی سہل ممتنع کا اطلاق ہو سکتا ہے تو ہم بلا تکلف کہہ سکتے ہیں کہ عبدالحق کا اسلوب اردو نثر کا سہل ممتنع ہے۔ اس معاملے میں حالی شبلی نذیر احمد بلکہ کوئی بھی دوسرا ادیب ان کا ہم سر نہیں ہو سکتا۔ عبدالحق کے متعلق یہ کہنا غلط نہیں کہ انہوں نے سادگی کو ایک آرٹ بنا دیا۔ مگر سرسید اور عبدالحق میں فرق یہ ہے کہ سرسید کی تحریریں سادہ اور ہموار ہونے کے باوجود کرخت اور ناہموار ہیں۔ وہ زبان کے معاملے میں بے پروا تھے ان کی عبارتیں کہیں کہیں ناہمواری کا شکار ہو گئی ہیں۔ عبدالحق کی سادہ عبارت اس طرح کی ناہمواریاں اور کرختگی سے پاک ہے اس میں سرسید کا سا جوش و خروش نہیں بلکہ ایک خوشگوار سکون ہے۔ اس طرح ان کے اسلوب بیان میں دبستان سرسید کے رنگ تحریر کا حسین ترین روپ نظر آتا ہے۔

عبدالحق کی نثر باوجود سادہ اور سلیس ہونے کے بہت دلچسپ اور شگفتہ ہے۔ حالانکہ انہوں نے ان شاعرانہ وسیلوں سے اجتناب برتا ہے جو بہت سے ادیب عبارت کو خوبصورت اور رنگین بنانے کے لیے اختیار کرتے ہیں۔ وہ رنگین استعاروں اور تشبیہوں سے پرہیز کرتے ہیں وہ محض روزمرہ کے استعمال سے اپنی عبارت کو دلچسپ بناتے ہیں۔

وہ عربی فارسی کے مشکل الفاظ اور بھاری بھرکم تراکیب کے استعمال سے پرہیز کرتے ہیں ان کی تحریر میں عام بول چال کی زبان کے عناصر زیادہ ہوتے ہیں ان کے جملے مختصر اور برمحل ہوتے ہیں ان کا ذوق جمال بلند تھا۔ طبیعت شگفتہ رکھتے تھے چنانچہ ان کی نثر سادگی کے باوصف عامیانہ نہیں ہوتی۔ اس میں ایک خاص سطح کا رکھ رکھاؤ اور شگفتگی موجود ہے۔ یہ شگفتگی کبھی کبھی مزاح کا روپ بھی اختیار کر لیتی ہے۔ ان کے بعض انشائیے اردو میں سنجیدہ مزاح کا عمدہ نمونہ ہیں کہیں کہیں وہ طنز کے لطیف نشتر بھی چلاتے ہیں۔ ان کی طرز کا نشانہ عموماً ایسے لوگ بنتے ہیں جن کے ہاں قول و فعل کا تضاد دیکھتے ہیں۔ ان کے اسلوب کی شگفتگی میں بے جا محاورہ بندی سے پرہیز اور آسان اور سادہ پسندی کے الفاظ کے استعمال کو بڑا دخل حاصل ہے۔

بابائے اردو نے اردو نثر میں ایک نئے طرز بیان کو رائج کیا جو سادگی، اعتدال، صاف گوئی، دلکشی اور اثر انگیزی کے عناصر سے ترکیب پاتا ہے۔ "تحریر میں ان کا رنگ منفرد ہے اور ان کی یہی وجہ انفرادیت ان کو اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رکھے گی۔

عبدالحق کی شخصیت نگاری

چند معتبر عبدالحق کی سیرت نگاری یا خاکہ نویسی کا شاہکار ہے اس میں

ان کے لکھے ہوئے کل ۲۳ خاکے شامل ہیں۔ یہ خاکے انہوں نے کئی کئی برسوں کے وقفے سے رکھے۔

جن شخصیات پر انہوں نے خاکے لکھے ان میں سرسید احمد خاں، محسن الملک مولوی چراغ علی حالی، سید علی بلگرامی اور سید محمود جیسے اکابر کے ساتھ نام دیو مالی اور نور خاں جیسے معمولی انسانوں کے خاکے شامل ہیں۔ مگر ان کے طرز نگارش کا کمال ہے کہ انہوں نے جس شخصیت پر بھی لکھا اسے زندہ جاوید بنا کر رکھ دیا۔ ہم ان کے خاکے پڑھ کر جانتے ہیں بھی تو ان شخصیات کو نہیں بھلا سکتے حقیقت یہ ہے کہ "چند ہم عصر" اردو میں خاکہ نویسی اور شخصیت نگاری کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

انہوں نے جس شخصیت پر بھی قلم اٹھایا، بڑی صاف گوئی سے اور موثر طریقے سے اس کے نمایاں پہلوؤں کو قاری کے سامنے پیش کیا۔ اس میں وہ جزئیات تک کو نظر انداز نہیں کرتے۔ انہوں نے شخصیات کی اخلاقی اور انسانی خوبیوں کو سراہا ہے کیونکہ اسی بنا پر عبدالحق کے دل میں ان کی قدر ہے۔ سبق آموزی ان کی مرقع نگاری کا ایک اہم مقصد ہے۔

وہ کسی شخصیت پر لکھتے ہوئے اس کی زندگی سے متعلق مختلف چھوٹے چھوٹے واقعات بیان کرتے ہیں۔ پھر ان سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہی رجحانات اور ایسے ہی واقعات ہیں، جنہوں نے اس شخصیت کو عظیم بنایا۔ وہ شخصیتوں کے سیرت و کردار اور ذہن و مزاج کو ایک نمونہ بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

عبدالحق کی شخصیت نگاری نے بعض غیر اہم اور غیر معروف انسانوں مثلاً نامدیو مالی اور نور خاں وغیرہ جیسے اشخاص کو زندہ جاوید بنا دیا۔ بظاہر وہ معمولی انسان تھے مگر عبدالحق کو ان کے اندر ایسی شخصی خوبیاں نظر آئیں جو بعض بڑے لوگوں میں مفقود ہوتی ہے۔ عبدالحق نے انہی خوبیوں کی بنا پر ان شخصیات کی تعمیر کی ہے۔

عبدالحق کی شخصیت نگاری "مدلل مداحی" نہیں ہے۔ ان کے خاکے متوازن اور غیر جانبدار ہیں۔ اگر انہیں کسی شخصیت میں کوئی کمزوری یا خامی نظر آئی تو انہوں نے اسے مناسب طریقے سے بیان کر دیا ہے۔ بے جا پردہ پوشی اور مدح سازی سے کام نہیں لیا مثلاً وہ نواب محسن الملک کی ذہانت فیاضی اور خوش بیانی کے قائل اور معترف ہیں۔ مگر ان کی اس کمزوری کو صدر جو قابل افسوس گردانتے ہیں وہ گورنر کی دیکھ پار دو کی حفاظت کے لئے قائم ہونے والی انجمن سے دستبردار ہو گئے۔ اسی طرح راس مسعود کی شخصی کمزوریوں کو بھی بیان کیا ہے۔ انہوں نے حالی کی شاعرانہ تعلی اور مولوی محمد عزیز مرزا کی خوشامد پسندی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ مرقع نگاری میں وہ سچائی اور بے باکی کو ہاتھ سے نہیں دیتے۔

عبدالحق کی شخصیت نگاری میں انفرادی شخصی تاثر کے ساتھ تاریخی اشارے اور حوالے

بھی ملتے ہیں جس شخصیت پر قلم اٹھاتے وقت وہ اس دور کے حالات اور ماحول کو نظر انداز نہیں کرتے کیونکہ اس طرح شخصیت اپنے پس منظر سمیت مکمل ہو کر سامنے نہیں آسکتی۔

عبدالحق کی سیرت نگاری میں بڑا توازن اور بڑی گہرائی ہے۔ وہ نہ تو کسی کی بے جا وکالت کرتے ہیں اور نہ کسی کے نقائص و عیوب کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ایک شخصیت نگار کے ناز کے منصب اور اس کی ذمہ داریوں سے وہ پوری طرح آگاہ ہیں۔ وہ انسانیت اور اس کی اخلاقی برتری پر ایمان رکھتے ہیں۔ چند ہم عصر سے اس کے مصنف کے معتقدات، زندگی کے اصولوں اور ذاتی نظریات کا پتہ چلتا ہے۔ درحقیقت اس روشنی میں خود عبدالحق کی شخصیت بھی نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے۔ بہرحال ان کی شخصیت نگاری میں انفرادی شان ہے۔

عبدالحق

گدڑی کا لال — نور خان

تعارف و پس منظر

مولوی عبدالحق اور اردو کے نام لازم و ملزوم ہو گئے ہیں انہوں نے اپنی طویل زندگی اردو زبان کی ترویج، ترقی اور خدمت میں کھپا دی، مولوی صاحب کی بے پناہ لسانی، تحقیقی اور ادبی خدمات میں ان کی بیسیوں تصانیف اہمیت رکھتی ہیں۔ ان میں سے چند ہم عصر بڑی مقبول کتاب ہے اس میں انہوں نے بعض ساتھیوں بزرگوں اور نیاز مندوں کے خاکے لکھے ہیں۔ حالی، اقبال، حسرت موہانی اور خالدہ ادیب خانم جیسی مشہور معروف شخصیتوں کے ساتھ نام دیو، میرن صاحب اور نور خاں جیسے غیر معروف لوگوں کے شخصی خاکے بھی اس میں شامل ہیں۔ یہ غیر معروف لوگ سوسائٹی کے نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں مگر ان کے کردار میں ایسی عظمت تھی کہ مولوی صاحب نے انہیں عظیم لوگوں کی صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ ہمارے نصاب میں نور خاں کا خاکہ "گدڑی کا لال" کے عنوان سے شامل ہے کہ جو فوج میں سپاہی بھرتی ہوئے اور وفادار ریٹائر ہوئے۔ زندگی بھر اپنے اصولوں پر ڈٹے رہے۔ اور غیازہ بھگتنے پر بھی اصولوں کو نہ چھوڑا۔ ہمارے نصاب میں پورا خاکہ شامل نہیں ہے آخری نصف حصہ محذوف ہے۔

مشکل الفاظ و محاورات ——— معانی و تشریح

صفحہ ۱۱۳

گدڑی کا لال (لعل)، وہ شخص جو غریب گھرانے کا ہو کر صاحب ہنر ہو۔ نامور: نام آور، مشہور، علم بند کرنا: لکھنا۔ تحریر کرنا۔ سبق آموز: سبق سکھانے والی۔

عبرت دلانے والی۔ آن: شان، آبرو، عزت۔ کنٹنجنٹ: امدادی فوج۔ امتیاز: برتری نمایاں مقام۔ نسب نامہ: خاندان کا شجرہ۔ قید: پابندی شرط۔

صفحہ ۱۱۴ — سپہ گری: سپاہی کا پیشہ۔ فوجی کام، اشراف: شریف النفس لوگ، خاندانی لوگ آن بان: شان، عزت، آبرو۔ خودداری: رکھ رکھاؤ۔ غیرت، جوہر: خوبی کمال۔ توسط: ذریعہ۔ ڈرل انسٹرکٹر: ڈرل سکھانے والے۔ ورزشی مشقیں کرنے والے۔ شہسوار: گھوڑے کی سواری کا بڑا ماہر۔ پٹھے پر ہاتھ نہ دھرنے دینا: پاس نہ آنے دینا۔ بدکنا چھیڑنا: اکڑنا، ہٹکا۔ مستعدی: ہوشیاری، کمربستہ رہنا چستی۔ خوش تدبیری: خوش انتظامی حسن انتظام۔ کمر توڑ: ورزش۔ سختی۔ کمانڈنگ افسر: جس کے ہاتھ میں پورے دستے کی کمان ہو

صفحہ ۱۱۵ — روادار نہ ہونا: جائز نہ سمجھنا۔ رعایت نہ دینا۔ معاملہ رفع دفع ہونا: معاملہ ختم ہو جانا۔ معاملہ طول کھینچنا: بات بڑھ جانا۔ کورٹ مارشل: جنگی عدالت۔ فوجی عدالت جس میں فوجیوں کو فوجی قوانین کے مطابق سزا دی جاتی ہے۔ پیش نہ گئی: کامیاب نہ ہوئی۔ عبث: فضول۔ بے کار۔ دفعدار: سپاہیوں کے چھوٹے سے گروہ کا سردار۔ سر میں خناس سمانا: مغرور اور تکبر کرنا۔ درپے رہنا: پیچھے لگا دینا۔ معمول کرنا: گمان کرنا۔ قیاس کرنا۔

صفحہ ۱۱۶ — زحمت: تکلیف۔ برہم: ناراض۔ مجاز: مختار۔ اختیار یا اجازت رکھنے والا۔ قہر: غصہ۔ بھوک۔ قطع تعلق کرنا: تعلق توڑ دینا۔

صفحہ ۱۱۷ — روش: طور، چلن۔ طرز عمل۔ چیں بہ جبیں ہونا: تیوری چڑھانا۔ ماتھے پر بل ڈالنا۔ ناراض ہونا۔ ہسپتال میں رجوع ہونے: ہسپتال کا رخ کیا۔ ہسپتال میں داخل ہوتے۔ بے ڈھب بنا: نقصان پہنچانا۔ سبکدوش: فارغ۔ ریٹائر

سبق کا خلاصہ

انسان ہونے میں امیر غریب کا کوئی فرق نہیں ہے۔ صرف بڑے لوگوں کے حالات تحریر سے قابل نہیں ہوتے۔ بعض غریب لوگوں کی زندگی بھی ہمیں سبق سکھاتی ہے۔ مثلاً نور خاں مرحوم کنٹنجنٹ کے رسالے میں سپاہی بھرتی ہوئے تھے۔ یہ رسالہ فوج میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس میں لوگ بھرتی ہو کر ترقی پا کر کپتان، میجر اکرنل بنے مگر نور خاں کچھ نہ بن سکے وہ صاف گو اور فرض شناس انسان تھے۔ گوروں کو ڈرل سکھاتے۔ بڑے شہسوار تھے بڑے بڑے سرکش گھوڑے انہوں نے درست کیے۔ اُن کے افسران کی فرض شناسی اور سلیقے سے خوش تھے۔ مگر ان کی درشتی اور سختی سے وہ اکثر ناراض بھی ہو جاتے۔ ایک بار ایک انگریز افسر نے ڈیم فول کہہ دیا۔ انہوں نے رپورٹ کی۔ بیچ بچاؤ کی کوشش پر خاں صاحب راضی نہ ہوئے۔ بالآخر اس افسر کو

معافی مانگنا پڑی۔ مگر ان کی خودداری نے انہیں وفاداری سے آگے ترقی نہ کرنے دی۔

شریف افسران کی سچائی۔ دیانت اور جانکشی کی قدر کرتے۔ مگر مغرور افسران کو نقصان پہنچانے میں لگے رہتے۔ کرنل فرن ٹین ان پر بہت مہربان تھے۔ ولایت جاتے وقت اپنا سارا سامان امانت کے طور پر نورخاں کے حوالے کر گئے۔ دیگر انگریز افسروں نے انہیں لکھا کہ آپ نے ہم گورے دل پر ایک دیسی کو کیوں فوقیت دی۔ مگر جواب آیا کہ مجھے تمام انگریزوں سے بھی زیادہ اعتماد نورخاں پر ہے۔ کمانڈنگ افسر نے ایک بار سامان دیکھا اور کہا فلاں فلاں چیزیں ہماری ہیں۔ مگر خاں صاحب اڑ گئے کہ میں ایک چیز بھی آپ کو نہ دوں گا۔ خاں صاحب نے سارے سامان کی فہرست تیار کرائی اور سامان نیلام کر کے ساری رقم کرنل صاحب کو بھیج دی۔

ایک کرنل نے ریٹائر ہونے پر انہیں بہت سے قیمتی تحائف دیئے مگر انہوں نے امراء کے باوجود صرف ایک بندوق قبول کی۔ ایک بار ایک انگریز افسر نے انہیں گھوڑے کی باگ پکڑنے کو کہا تو جواب دیا کہ میں سائیس نہیں۔ وہ باگ درخت کے ساتھ باندھ کر اور ناراض ہو کر اندر چلا گیا۔ گھوڑا چھوٹ گیا۔ انگریز افسر نے ناراض ہو کر کرنل سے شکایت کی مگر کرنل نے کوئی اثر نہ لیا بلکہ وہ خاں صاحب سے خوش ہوا۔ اس قسم کے حالات میں خان صاحب نے بہتر یہی سمجھا کہ پنشن لے لوں۔ چنانچہ بیماری کا بہانہ بنا کر ہسپتال داخل ہوئے اور ڈاکٹر رپورٹ پر پنشن لے کر فوج سے سبکدوش ہو گئے۔ خاں صاحب کے لئے ان کی خوبیاں ہمیشہ ان کے نقصان کا سبب بنیں۔

اہم اقتباس کی تشریح

سوال: متن اور سیاق و سباق کے حوالے سے مندرجہ ذیل عبارت کی تشریح کریں۔

"اس وقت کے کمانڈنگ افسر سے نہ رہا گیا۔ اس نے کرنل موصوف کو خط لکھا کہ آپ نے ہم پر اعتبار نہ کیا اور ایک دیسی دفعدار کو اپنا قیمتی سامان حوالے کر گئے۔ اگر آپ یہ سامان ہمارے سپرد کر جاتے تو اسے اچھے داموں میں فروخت کر کے قیمت آپ کے پاس بھیج دیتے۔ اب بھی اگر آپ لکھیں تو انتظام ہو سکتا ہے۔"

جواب، متن کا حوالہ

یہ عبارت "گدڑی کا لال۔ نورخاں" سے لی گئی ہے جس کے مصنف مولوی عبدالحق ہیں۔

سیاق و سباق

مولوی عبدالحق نورخاں کا خاکہ لکھتے ہوئے ان کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ وہ اتنے دیانت دار تھے کہ کرنل فرن ٹین نے ملازمت سے سبکدوش ہونے پر ولایت جاتے وقت اپنا سارا سامان ان کے حوالے کیا کیونکہ انہیں خاں صاحب پر بے حد اعتماد تھا۔ اس بات پر انگریز افسر برہم ہوئے۔ یہ عبارت

اسی موقع سے لی گئی ہے۔

تشریح انگریز افسران کو کرنل صاحب کی یہ بات ناگوار گذری کہ وہ اپنا سارا سامان نورخاں کے حوالے کر گئے اور ہم پر اعتبار نہ کیا۔ چنانچہ اس زمانے کے کمانڈنگ افسر نے کرنل صاحب کو خط لکھا کہ افسوس آپ نے ہم گورے سافروں کی نسبت ایک دیسی دلال پر زیادہ اعتماد کا اظہار کیا۔ اگر آپ اب بھی اجازت دیں تو وہ سامان اس سے لیکر ہم فروخت کرنے کا انتظام کر سکتے ہیں۔ قیمت وصول کر کے آپ کو ارسال کر دیں گے۔

انگریز افسران کو کرنل صاحب کی یہ بات اس حد تک ناگوار گذری کہ وہ اس کا ازالہ کرنا چاہتے تھے اس لیے یہ خط لکھا گیا مگر اس خط کا کرنل صاحب نے کوئی اثر نہ لیا۔ اگرچہ خط کا انداز ایسا تھا کہ آپ کے اس اقدام سے انگریزوں کی بے عزتی اور ہتک ہوئی ہے۔ اسطرح کرنل صاحب کی قومی حمیت کو ابھارنے کی کوشش کی گئی مگر انہیں خاں صاحب پر اتنا اعتماد تھا کہ وہ انگریز افسروں کی بات ماننے پر آمادہ نہ ہوئے۔

حصہ نظم

میر تقی میر

(۱۷۲۰ء ـــــ ۱۸۱۰ء)

حالاتِ زندگی

نام میر تقی۔ تخلص میر۔ ان کے آباؤ اجداد حجاز سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے۔ وہ ۱۷۲۰ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد میر متقی ایک درویش منش انسان تھے۔ انہوں نے میر کو اپنے ایک دوست امان اللہ کے سپرد کر دیا تاکہ وہ ان کی تعلیم و تربیت کر سکیں۔ وہ بھی میر کو اپنی اولاد کی طرح چاہتے تھے۔ دس بارہ برس کی عمر میں ان کے والد اور امان اللہ دونوں کا یکے بعد دیگرے انتقال ہو گیا۔ والدہ بچپن ہی میں فوت ہو گئیں تھیں، اس لیے یہ بالکل بے یار و مددگار رہ گئے۔

عمر کے اس حصے میں جن مصیبتوں اور پریشانیوں کا سلسلہ شروع ہوا، وہ مرتے دم تک جاری رہا۔ میر کے بڑے بھائی محمد حسن کا سلوک اُن سے اچھا نہ تھا اس لیے وہ آگرے سے دہلی آ گئے۔ یہاں پر میر کی ملاقات اپنے والد کے ایک دوست سے ہوئی جو نواب تھے اور میر کے والد کے بڑے معتقد تھے۔ انہوں نے میر کے لیے ایک روپیہ روزانہ کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ بدقسمتی سے نادر شاہ کے حملہ دہلی میں وہ نواب مارا گیا میر کا وظیفہ بند ہو گیا۔ میر دوبارہ بے سہارا ہو گئے۔ دہلی میں اور کوئی ذریعہ معاش نہ تھا اس لیے آگرہ واپس آ گئے مگر یہاں رہنا مشکل تھا، کیونکہ بھائی کا سلوک بہت تکلیف دہ تھا۔ دوبارہ دہلی جا کر اپنے ماموں سراج الدین خان آرزو کے ہاں ٹھہرے، مگر زیادہ دنوں تک نہ نبھ سکے۔ میر بددل ہو کر گوشہ نشین ہو گئے اسی اثنا میں نواب آصف الدولہ نے انہیں لکھنؤ بلا بھیجا۔ جب یہ لکھنؤ پہنچے تو ظاہری حالت ایسی خراب تھی کہ میر کی پہچان مشکل تھی۔ سب سے پہلے انہوں نے مشاعرے میں یہ اشعار پڑھے ؎

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے

دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب — رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اُس کو فلک نے لوٹ کر ویران کر دیا — ہم رہنے والے ہیں اُسی اجڑے دیار کے

چنانچہ لکھنؤ میں اُن کی شاعری کی دھوم مچ گئی۔ نواب آصف الدولہ نے تین سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا۔ لیکن میرؔ کی طبیعت میں خود پسندی اور خودداری بہت زیادہ تھی۔ اس لیے تھوڑے ہی دنوں میں نواب سے کسی بات پر ناراض ہو گئے۔ ان کی زندگی کا آخری زمانہ بڑی تنگدستی اور مصیبت سے گزرا۔ بیوی اور جوان بیٹی کے انتقال سے انیس زبردست صدمہ پہنچا۔ نوے سال کی عمر میں ۱۸۱۰ء میں لکھنؤ میں انتقال کر گئے۔

کلامِ میرؔ کی خصوصیات

میرؔ کے بارے میں ڈاکٹر عبدالحق مرحوم نے لکھا ہے کہ:
"وہ اردو شاعروں کے سرتاج ہیں۔ اگر دنیا کے ایسے شعراء کی فہرست تیار کی جائے جن کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا تو میرؔ کا نام اس میں ضرور داخل ہوگا۔ انہوں نے اگرچہ شاعری کی تمام اصناف قصیدہ، رباعی، قطعہ اور غزل میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن بنیادی طور پر وہ ایک غزل گو شاعر ہیں۔ اردو کے تمام شاعروں نے غزل کے میدان میں ان کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔" مثلاً غالب کہتے ہیں۔

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالبؔ — کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

اسی طرح ذوق کہتے ہیں: ؎

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب — ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

میرؔ کو بھی اپنی بڑائی کا احساس تھا۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا — مستند ہے میرا فرمایا ہوا

حسرت موہانی، حالی اور بہت سے دوسرے شعراء نے بھی میرؔ کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ ان کے کلام کی خصوصیت مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ سادگی اور دل آویزی — وہ مختلف نوعیت کے مضامین کو نہایت سادگی اور صفائی اور خوبی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ مشکل استعاروں، بعید از قیاس مبالغہ، تکلف اور لفاظی سے پرہیز کرتے ہیں۔ اپنے

دل کی جذبات کو نہایت سادہ، سلیس اور نرم الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ اُنکے کلام کا بیشتر حصہ سہل ممتنع ہے مثلاً ؎

اس عہد میں الٰہی محبت کو کیا ہوا ۔۔۔ چھوڑا وفا کو اُن نے مروت کو کیا ہوا

سرہانے میر کے آہستہ بولو ۔۔۔ ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

۱۔ سوز و گداز

میر اپنی طبیعت کے لحاظ سے ایک حساس انسان تھے۔ امان اللہ کی صحبت، مسلسل تکلیف اور زمانے کی مصیبتوں نے ان کی طبیعت میں نہایت سوز و گداز پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے جو شعر لکھے ہیں، وہ ایسے پُر تاثیر ہیں کہ زبان سے نکلتے ہی دل میں بیٹھ جاتے ہیں۔ مثلاً ؎

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا ۔۔۔ دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

ہم طور عشق سے تو واقف نہیں ہیں لیکن ۔۔۔ سینے میں جیسے دل کو کوئی ملا کرے ہے

غیفتہ کے نزدیک میر کا ایک ایک مصرعہ "صد آہ و درد ناک" سے زیادہ پُر تاثیر ہے۔ میر کو انگریزی کے مشہور شاعر "KEATS" سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

۲۔ درد و غم

میر کی ساری زندگی طرح طرح کی تکلیفوں اور مصیبتوں میں گزری اور انہیں ہر طرح کی پریشانیوں اور مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ اُن کی غزلیں ان کے درد و غم کی سچی تصویر پیش کرتی ہیں۔ وہ اپنے درد و غم، مایوسیوں اور ناکامیوں کو بار بار شعر کے پیرائے میں بیان کرتے ہیں مثلاً ؎

متصل روتے رہیئے تو بجھے آتشِ دل ۔۔۔ ایک دو آنسو تو اور آگ لگا جاتے ہیں

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے ۔۔۔ درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

آبلے کی طرح ٹھیس لگی پھوٹ بہے ۔۔۔ دردمندی میں کٹی ساری جوانی اپنی

۳۔ حوصلہ مندی

میر کے بارے میں عام طور پر مشہور ہے کہ وہ ایک مایوس اور مردم بیزار انسان تھے۔ مگر یہ بات درست نہیں ہے۔ درد و غم کا بیان تو ان کی حساس طبیعت کا فطری تقاضا تھا مگر وہ مایوس ہرگز نہیں ہیں۔ ان کی شاعری

میں حوصلہ مندی کا رجحان ملتا ہے۔ وہ زندگی کو مردانہ وار بسر کرنے اور ہمت و جرأت سے کام لینے کا درس دیتے ہیں۔ مثلاً ؎

خوش رہا جب تک جیتا رہا میرؔ معلوم ہے قلندر تھا

شرط سلیقہ ہے ہر ایک عمل میں عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیئے

۵۔ رمز و ایما رمز و ایما اور اشاریت غزل کی بنیادی خصوصیت ہے۔ اسی طرح ایجاز و اختصار بھی غزل کے لوازمات میں شامل ہے۔ اور میرؔ کے کلام میں یہ خوبی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ ان کے بعض اشعار میں ایک جہان معنی پوشیدہ ہے یعنی جس قدر ان پر غور کیا جائے اُسی قدر لطیف اور نئے نئے نکات ظاہر ہوتے ہیں مثلاً ؎

کچھ کر و فکر مجھ دیوانے کی دھوم ہے پھر بہار آنے کی

سب پہ جس بار نے گرانی کی اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

۶۔ باتوں کا انداز میرؔ نے جس صفائی اور سادگی کے ساتھ مختلف مضامین کو اپنے کلام میں سمویا ہے۔ اس کے سبب ان کی غزلوں میں باتوں کا سا انداز پیدا ہو گیا ہے۔ وہ شعر فقرے کے مختلف اجزاء یعنی فاعل اور مفعول وغیرہ کی اصل ترتیب کو قائم رکھتے ہیں اور کبھی نہایت تکلف کے انداز میں تو اور تم کہہ کر خطاب کرتے ہیں۔ ان کا ایک شعر ہے ؎

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں نہ ایسی سنیئے گا کہتے کسو کو سنیئے گا تو دیر تلک سر دھنیئے گا

مندرجہ ذیل اشعار باتوں کے انداز کی عمدہ مثالیں ہیں ؎

ہم فقیروں سے بے ادائی کیا آن بیٹھے جو تم سے پیار کیا

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں ساری مستی شراب کی سی ہے

۷۔ خارجی حالات کا اثر میرؔ کا زمانہ نہایت انتشار اور افراتفری کا زمانہ تھا مسلمانوں کی شان و شوکت اور منصوں کی حکومت

زوال پذیر تھی۔ میر اس معاشرے کے ایک حساس فرد تھے۔ اس لیے وہ زمانے کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس کا اظہار ان کے کلام میں جابجا ملتا ہے ؎

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے — یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا
شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی — انہی کی آنکھ میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

۸۔ اخلاق و حکمت اور تصوف میر کی شاعری میں اگرچہ عشق و محبت اور درد و غم کا بیان نہایت کثرت کے ساتھ ہوا ہے۔ مگر ان کی بہت سی غزلوں میں دنیا کی بے ثباتی، اخلاقی اقدار، تصوف کے بارے میں حکیمانہ باتیں ملتی ہیں ؎

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے — یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

سرسری تم جہاں سے گزرے — ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

۹۔ ندرت و جدت میر نے غزل میں پرانے اور فرسودہ طریقوں کو چھوڑ کر نئے انداز میں بات کہنے کی کوشش کی ہے۔ ایک پرانے خیال کو ایک نادر اور جدید انداز میں پیش کرتے ہیں ؎

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے — دل ہے گویا چراغ مفلس کا

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے — دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

مولانا حالی نے لکھا ہے کہ چاک گریباں کا مضمون اس سے بہتر اور عمدہ کسی شاعر نے بیان نہیں کیا۔

۱۰۔ موسیقیت میر کی بہت سی غزلوں کی بحروں میں موسیقی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اسی طرح ان کے اکثر قوافی بھی اپنے اندر ایک آہنگ رکھتے ہیں۔ بعض اوقات وہ الفاظ کی تکرار سے موسیقیت پیدا کرتے ہیں اور یہ ان کی فنکاری کی عمدہ مثال ہے ؎

الٹی ہو گئی سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا — دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے — جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے۔

میر اُردو غزلگوئی کی تاریخ میں ایک منفرد اور نمایاں مقام رکھتے ہیں، وہ اُردو کے دو چار بہترین غزل گوؤں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

غزل نمبر ۱

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا ۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

تشریح: عشق خواہ مجازی ہو یا حقیقی اس میں مشکلات اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس کا مقابلہ باہمت اور حوصلہ مند لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ جب کمزور دل اور کم حوصلہ افراد جلد ہی گھبرا کر رونا شروع کر دیتے یا تقدیر کا شکوہ کرنے لگتے ہیں۔ ایک ایسے ہی شخص کو عشق کا دعوے کرنے کے ساتھ ہی چیختے چلاتے ہوئے دیکھ کر شاعر طنز کرتا ہے کہ ابھی تو عشق کا آغاز ہوا ہے، اصل اور بھاری مشکلات تو آگے والی ہیں۔ لیکن تم نے ابھی سے گلے شکوے شروع کر دیئے ہیں۔ یعنی اگر تم نے عشق کیا ہے تو مشکلات سہنے کی عادت بھی ڈالو۔

قافلے میں صبح کے اک شور ہے ۔ یعنی غافل ہم چلے سوتا ہے کیا

مشکلات: غافل ۔ غفلت برتنے والا ۔ بے خبر۔

تشریح: صبح رات گزرنے کی علامت بن کر آتی ہے اور اس کے ساتھ کئی خاص شامل ہوتے ہیں، ہلکا ہلکا اندھیرا، صبح کا ستارہ اور ٹھنڈی نرم ہوا یہ ساری چیزیں تھوڑی دیر کے لیے رہتی ہیں اور طلوعِ آفتاب کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہیں۔ ان کی طرف اشارہ کر کے شاعر کہتا ہے کہ صبح کا یہ سارا قافلہ رات بھر کے سوئے ہوئے انسانوں کو زبانِ حال سے پکار پکار کے کہہ رہا ہوتا ہے کہ ہم نیند، آرام کے پیامبر تھے، اب ہم ہی جا رہے ہیں تو تم بھی غفلت چھوڑ دو، اٹھو، خدا کو یاد کرو اور اپنے فرائض کی بجا آوری میں لگ جاؤ۔

سبز ہوتی ہی نہیں یہ سرزمیں ۔ تخم خواہش دل میں تو بوتا ہے کیا

مشکلات: سبز ہونا ۔ ہرا ہونا ۔ شاداب ہونا ۔ تخم ۔ بیج ۔ تخمِ خواہش ۔ ارادے یا آرزو کا بیج۔

تشریح: شاعر کے خیال میں دل کی سرزمین بڑی سخت ہے جہاں کسی خواہش کا بیج بونے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یعنی دل کی کوئی خواہش کبھی پوری نہیں ہوتی۔ دراصل شاعر اپنے تجربات کی روشنی میں یاس پرست ہو گیا ہے اور اس طرح میں

اسی بات کا اظہار کیا گیا ہے۔

یہ نشانِ عشق ہیں جاتے نہیں　　داغ چھاتی کے عبث دھوتا ہے کیا

مشکلات: عبث - بے فائدہ، بے کار۔ چھاتی - سینہ۔ مقامِ دل

تشریح: عشق اپنے ساتھ مشکلات۔ پریشانیوں، بدنامیوں اور محرومیوں کے ایسے زخم لاتا ہے جو عاشق کی شخصیت اور کردار پر دائمی نقش چھوڑ جاتے ہیں اور اُسے عمر بھر ان سے نجات نہیں ملتی۔ اس شعر میں اسی امر کا اظہار کیا گیا ہے۔ یعنی اے نادان عاشق، تیری یہ خواہش کہ عشق کے زخم دل سے مٹ جائیں محض فضول ہے۔ اب یہ داغ موت تک تیرا ساتھ دیں گے اور انہی کے حوالے سے تو پہچانا جائے گا۔

غیرتِ یوسف ہے یہ وقتِ عزیز　　میر اس کو رائیگاں کھوتا ہے کیا

مشکلات: غیرتِ یوسف: جس پر حضرت یوسفؑ بھی رشک کریں، یعنی بے حد قیمتی، خوب صورت اور مقدس۔ وقتِ عزیز: پیارا۔ محبوب وقت۔ رائیگاں: بے کار۔ فضول۔

تشریح: شاعر یہاں وقت کی قدر و قیمت کا احساس دلاتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ وقت جیسی قیمتی اور محبوب چیز جسے لوگ سو کر، رو دھو کر یا فضول کاموں میں مصروف رہ کر ضائع کر دیتے ہیں۔ خدا کی وہ عظیم نعمت ہے جسے حضرت یوسف علیہ السلام جیسے عظیم اور حسین و جمیل بادشاہ اور پیغمبر بھی مقدس سمجھتے تھے۔ شاعر نے پہلے مصرع میں رعایت لفظی پیدا کی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام "عزیزِ مصر" بھی تھے ——— وقت کی قدر و قیمت کے بارے میں میر حسن کا معروف شعر ہے۔

سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں　　گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

غزل نمبر ۲

جو اس زور سے میر روتا رہے گا　　تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

مشکلات: زور - شدت۔ تواتر

تشریح: رونا اور گریہ کناں رہنا میر کو والد کی طرف سے ورثے میں ملا تھا۔ یوں بھی اُن کی زندگی محرومیوں کا مرقع تھی اور اس طرح ان کی شاعری بھی درد و غم کی تصویر بن گئی ہے۔ اسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے میر کہتے ہیں کہ

اگر میں اسی طرح روتا اور چیختا چلاتا رہا تو میرا ہمسایہ بھی پریشان رہے گا اور وہ بھی کی نیند نہیں سو سکے گا۔ بقول غالب ؎

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہل جہاں دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

میں وہ رونے والا جہاں سے چلا ہوں رہے ابر ہر سال رونا رہے گا

مشکلات: ابر۔ بادل

تشریح: مجھے چونکہ ساری عمر محرومیوں اور مصیبتوں کا سامنا رہا، اس لیے رونا اور آہ و بکا کرنا میرا شعار بن گیا۔ حتیٰ کہ اسی حالت میں میں دنیا سے کوچ کر گیا۔ میری اس دردناک حالت کا صدمہ انسان تو کجا بادلوں کو بھی رہے گا اور وہ ہر سال رو رو کر میری تباہ حالی کی یاد منایا کریں گے۔ شاعر نے برسات کو بادلوں کے رونے سے تعبیر کیا ہے:

مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح تو کب تک مرے منہ کو دھوتا رہے گا

مشکلات: ناصح۔ نصیحت کرنے والا۔

تشریح: شاعر کا دوست اور خیر خواہ اُسے رونے سے منع کرتا ہے، اس کی دلجوئی کرتا ہے اور اس کے آنسو پونچھتا ہے۔ مگر شاعر اس کی کوششوں کو بے فائدہ قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ رفاہِ مستقبل شغل ہے۔ میں چاہوں بھی تو اس سے چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ اس لیے میرا منہ دھونے اور تسلیاں دینے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ اپنے دوست کو ایک لطیف انداز سے باز رہنے کی تلقین کرتا ہے

بس اے گریہ کیا تیری آنکھیں نہیں ہیں جہاں کو تو کب تک ڈبوتا رہے گا

مشکلات: گریہ: رونا۔ پیٹنا۔ آہ و زاری۔

تشریح: شاعر اپنی آہ و بکا کی عادت سے خود بھی پریشان ہے اور اس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اے میری حالتِ گریہ و زاری کیا تو دیکھ نہیں رہی کہ تیری حرکتوں سے لوگ کتنے بیزار اور خوفزدہ ہیں۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ گریہ و زاری لوگوں کو تباہ و برباد کر دیتی ہے اور کسی کام کا نہیں رہنے دیتی۔ پہلے مصرع میں صنعتِ ایہام استعمال ہوئی ہے۔

مرے دل نے وہ نالہ پیدا کیا ہے جرس کے بھی جو ہوش کھوتا رہے گا

مشکلات: نالہ: بلند آواز سے رونا۔ جرس: گھنٹی۔ ہوش کھونا: پاگل کر دینا۔

تشریح: میر دل جس طرح آہ وزاری کرتا ہے اور زبان سے اس کا جس انداز میں اظہار ہوتا ہے وہ اس قدر موثر اور دلآویز ہے کہ گھنٹی کی آواز کا ترنم بھی اس کے سامنے ماند ہے۔ میرے رونے کی آواز جو کوئی سنتا ہے دل پکڑ کے بیٹھ جاتا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ میرے رونے کی آواز میرے دکھوں کی حقیقی آواز ہے اسی لیے اس کا ہر انسان پر اثر ہوتا ہے۔

بس اے میر مژگاں سے پونچھ آنسوؤں کو ۔۔۔ تو کب تک یہ موتی پروتا رہے گا

مشکلات: مژگاں: پلکیں۔ موتی پرونا: لگاتار رونا۔

تشریح: میر اپنے آپ سے کہتے ہیں کہ یہ آنسو بہانا اور رونا دھونا چھوڑ دو۔ آخر تم کب تک یونہی روتے رہو گے اور آنسوؤں جیسے قیمتی موتی ضائع کرتے رہو گے۔ جب کہ کوئی ان کی قدر کرنے والا نہیں ہے۔ میر اس لیے خود کو رونے سے باز رہنے کی تلقین کر رہے ہیں کہ ہر وقت رونے دھونے اور منہ لپیٹ کر رونے والا انسان، کم ہمت اور بزدل سمجھا جاتا ہے اور لوگ اس کی توقیر نہیں کرتے۔ رونا اپنی شکست کا اعلان ہے اس سے اجتناب ضروری ہے۔

غزل نمبر ۳

ہو کوئی بادشاہ کوئی یاں وزیر ہو ۔۔۔ اپنی بلا سے بیٹھ رہے جب فقیر ہو

مشکلات: اپنی بلا سے: ہمیں کوئی پروا نہیں۔ فقیر: درویش۔ غریب آدمی۔

تشریح: اس شعر میں شاعر نے اپنی بے نیازی اور بے لبی کا اظہار کیا ہے یعنی ایک مفہوم تو یہ ہے کہ ہم نے درویشی اختیار کر لی ہے ہمیں کسی بادشاہ کی پروا ہے نہ کسی وزیر کی۔ دوسرا مطلب اس کا یہ ہے کہ جب ہمارے پاس روپیہ پیسہ نہیں ہے تو کسی بادشاہ یا وزیر کا ہمیں کیا فائدہ۔ یوں پہلا مفہوم زیادہ قرین قیاس ہے۔

کس طرح آہ خاک مذلت سے میں اٹھوں ۔۔۔ افتادہ تر جو مجھ سے میرا دستگیر ہو

خاکِ مذلت : ذلت و رسوائی کی جگہ ۔ افتادہ : گرا ہوا ۔ دستگیر : ہاتھ پکڑنے والا ۔ راہنما ۔

مشکلات :

تشریح : جب رہنمائی کا دعویٰ کرنے والے ہی اخلاقی روحانی زوال کا شکار بن جائیں ۔ تو عام لوگ ذلت و زوال سے کس طرح چھٹکارا پا سکتے ہیں ۔ اس شعر میں اسی تلخ حقیقت کو بیان کیا گیا ہے ۔ شاعر کہتا ہے کہ میرا راہنما مجھ سے بھی گہری جگہ میں گرا ہوا ہے ، یعنی زوال کا شکار ہو گیا ہے ۔ پھر ظاہر ہے میں ذلت و رسوائی سے کس طرح نجات پا سکتا ہوں ۔ یعنی کسی قوم کے لیڈر اپنے اخلاق و کردار سے عوام الناس کو شدید طور پر متاثر کرتے ہیں ۔

حد سے زیادہ جورِ ستم خوشنما نہیں ایسا سلوک کر ، جو تدارک پذیر ہو

جورِ ستم : ظلم و زیادتی ۔ خوشنما : مناسب ۔ پسندیدہ ۔ تدارک پذیر :

مشکلات : جس کی تلافی ہو سکے ۔

تشریح : شاعر اپنے دوست ، محبوب یا دنیا والوں کو مخاطب ہو کے کہتا ہے کہ ظلم کی ایک حد ہوتی ہے ۔ اور مناسب حد تک زیادتیاں بھی قابلِ برداشت ہوتی ہیں ۔ اس لیے اگر تم نے ظلم کرنا ہی ہے تو اسے معقول حدوں کے اندر رہنے دو ، ایسے زخم نہ لگاؤ جو بھر نہ سکیں اور جن کے نتیجے میں تم سے نفرت کرنے لگ جائیں ۔ بقول غالب ؎

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے آخر گنہگار ہوں کافر نہیں ہوں

ہو سکتا ہے تمہیں خود اپنے طرزِ عمل پر ندامت ہو اس لیے ظلم میں اس حد تک نہ بڑھ کہ پھر تلافی کی صورت ہی باقی نہ رہے ۔ یعنی توازن اور اعتدال ہی بہتر طرزِ عمل ہے ۔

ایسا ہی اس کے گھر کو بھی آباد دیکھیو جس خانماں خراب کا یہ دل مشیر ہو

خانماں خراب : تباہ حال ، جس کا گھر ویران ہو گیا ہو ۔ مشیر : مشورہ دینے والا ۔

مشکلات :

تشریح : دل جذبات کا منبع و مرکز ہے اور جذبات انسان کو انقلابی اقدامات پر ابھارتے اور خطرات میں کود پڑنے پر آمادہ کرتے رہتے ہیں ۔ اسی لیے معتدل زندگی گزارنے کے لیے دل کے ساتھ ساتھ دماغ یا عقل کا مشورہ بہت ضروری ہے ۔ ورنہ معاملات بگڑنے کا ہر لمحہ خطرہ رہتا ہے اور نتیجے کے طور پر

زندگی پریشانیوں اور الجھنوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس شعر میں شاعر نے یہی بات طنزیہ انداز میں کہی ہے کہ جس بدنصیب کا ضمیر صرف دل ہو، بس وہ آباد ہو چکا یعنی اس کی ویران حالی میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔

ہم جس کو ٹھہرے دل میں نہ آنکھوں میں ایک پل　　اتنے سے قد پہ تم بھی قیامت شریر ہو

مشکلات: قیامت شریر۔ غضب کی شرارتی، شوخ۔

تشریح: عاشق اپنے محبوب کو کبھی دل میں جگہ دینے کی آرزو رکھتا ہے اور کبھی آنکھوں میں بٹھانے کی تمنا کرتا ہے۔ مگر وہ روایتی بے وفائی کا مظاہرہ کرتا ہے اور عاشق کے قریب نہیں پھٹکتا۔ اس پر جھنجلا کر شاعر کہتا ہے کہ تم میرے دل میں آنا پسند کرتے ہو نہ آنکھوں میں۔ یوں اگر چہ تم عام انسانی قد رکھتے ہو۔ مگر قیامت کی طرح شریر ہو جس کی وسعتوں کا کوئی اندازہ نہ ہوگا۔ بنیادی طور پر شاعر نے "دل آنکھوں میں جگہ دینا" (محاورہ) سے فائدہ اٹھایا ہے۔

اک وقتِ خاص حق میں میرے کچھ دعا کرو　　تم بھی تو میرؔ صاحبِ قبلہ فقیر ہو

مشکلات: وقتِ خاص: خاص وقت میں جب قبولِ دعا کا امکان ہو۔ حق: اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام۔ لیے، واسطے۔ قبلہ: احترام کا کلمہ۔ فقیر: درویش۔ صوفی۔

تشریح: جب دنیاوی تدبیریں مسائل کو حل نہ کر سکیں، تو آخری چارہ کار کے طور پر ہر انسان خدائے تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اور اسی سے مدد طلب کرتا ہے۔ یہاں شاعر اپنے ہمزاد یا اپنے آپ سے درخواست کر رہا ہے کہ آخر تم بھی معمولی آدمی نہیں، درویش اور بزرگ ہو۔ اس لیے جب تمہارا دل جذب و کیف اور رقت کی خاص حالت میں ہو تو میرے معاملات کی بہتری کے لیے دعا کرنا۔ شاید اللہ میرے معاملات کو بہتر بنا دے۔ شاعر یہاں اپنی تعریف بھی کر گیا ہے اور دعا کی افادیت بھی بیان کر دی ہے۔

خواجہ میر درد

حالاتِ زندگی

(۱۷۲۱ء — ۱۷۸۵ء)

سید خواجہ میر نام ۔ دردؔ تخلص ۔ والد کا نام خواجہ محمد ناصر عندلیب جو صاحب دیوان شاعر تھے ۔ خواجہ میر دردؔ ۱۷۲۱ء میں دلی میں پیدا ہوئے ۔ تربیت اور تعلیم اپنے والد سے پائی ۔ اور قرآن، حدیث، تفسیر، فقہ اور تصوف میں عبور حاصل کیا ۔ جوانی میں دنیاوی کاموں میں حصہ لیتے ۔ جاگیر کا انتظام کرتے اور سپاہی پیشہ تھے ۔ مگر اٹھائیس برس کی عمر میں والد کی وفات کے بعد سجادہ نشین بنے ۔ خاندانی وجاہت اور ان کے ذاتی تقوے و تقدس کی وجہ سے شاہ و گدا سب ان کی عزت کرتے تھے وہ تہذیب و متانت اور آداب و اخلاق کے مجسم پیکر تھے ۔ قناعت و توکل اور تسلیم و رضا ان میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے ۔ چنانچہ مختلف بیرونی حملوں کے بعد بہت سے شاعر دہلی چھوڑ کر چلے گئے ۔ مگر خواجہ میر دردؔ مستقل مزاجی سے وہاں مقیم رہے ۔ آزادی، خودداری اور قناعت و استغنا اس درجہ تھا کہ انہوں نے ساری عمر کسی حکمران کی مدح و ثنا نہ کی ۔ تاہم اور تواضع کو بہت پسند کرتے تھے ۔ جہاں اہل کمال اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ۔

خواجہ میر دردؔ کی تصانیف کی تعداد بارہ ہے جن میں اُن کے فارسی اور اُردو دیوان بھی شامل ہیں ۔ آخر کار ۲۳ جنوری ۱۷۸۵ء کو دلی میں وفات پائی ۔

خواجہ میر درد کی خصوصیات کلام

خواجہ میر دردؔ بنیادی طور پر ایک صوفی تھے ۔ اس لئے ان کی ساری شاعری کا لب لہجہ صوفیانہ ہے ۔ یعنی معنوی اور خارجی دونوں اعتبار سے ان کی شاعری پر صوفیانہ زندگی اور ذہن کی چھاپ لگی ہوئی ہے ۔ زندگی اور کائنات کے متعلق ان کے تصورات، عشق و محبت کے متعلق اُن کا نقطۂ نظر، مجاز اور حقیقت کے سلسلے میں ان کا انداز خیال غرض ہر موضوع کے بارے میں ان کا طریق بحث مخصوص اور طرز بیان منفرد ہے ۔

جگر داری اور حوصلہ و برداشت | درد اپنی زندگی میں استقامت، پامردی اور ثابت قدمی کی زندہ مثال بنے رہے

اور اس کا عکس ان کی شاعری پر بھی پڑا ہے۔ وہ زندگی کی مصیبتوں پر اس طرح نہ شکایت نہیں کرتے جس طرح مثلاً میر تقی میر کرتے ہیں۔ ان کی فریاد میں تلخی اور بے حوصلگی نہیں۔ البتہ وہ صوفی کی حیثیت سے موجودہ زندگی کو قید اور فراق قرار دیتے ہیں ؎

جان پہ کھیلا ہوں میں میرا جگر دیکھنا — جی رہے یا نہ رہے مجھ کو ادھر دیکھنا
فرصتِ زندگی بہت کم ہے — مغتنم ہے یہ دیدِ جو دم ہے

قید اور جبر کا احساس

درد تصوف میں نظریہ جبر کے قائل ہیں۔ یعنی یہ تصور کہ انسان مجبورِ محض ہے اور تقدیر کے ہاتھوں میں بے بس ہے ؎

تھا نہ جبر، کیا بتاؤں میں — کس طور سے زلیست کر گئے ہم
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے — ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

میاں درد کے کلام میں جبر کے خلاف شکایت کا یہ انداز بہت دھیما اور کم ہے۔ مجموعی اعتبار سے وہ رضا برضا اور تقدیرِ الٰہی کے قائل نظر آتے ہیں ؎

کیا فائدہ درد شور و شر سے — اٹھے ہے جو کچھ سو مار جی میں
ہمیشہ فتح نصیبی ہمیں نصیب رہی — جو کچھ کہ اپنے ہے جی میں سو ہار رکھتے ہیں

یہ بات بڑی قابلِ تعریف ہے کہ درد کا زمانہ اگرچہ مصائب و حوادث سے پُر تھا جس کے سامنے بڑے بڑے ثابت قدم لوگ جی ہار گئے، مگر درد نے زبردست ضبط اور استقلال کا مظاہرہ کیا ؎

اے آنسو نہ آوے کچھ دل کی بات منہ پر
لڑکے ہو تم کہیں مت افشائے راز کرنا

سوالیہ انداز

ایک سچے صوفی کی طرح درد انسانی معاملات اور کائنات کے اسرار کے بارے میں سوالیہ انداز اختیار کئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ معرفت کی راہ میں روحانی جد و جہد، ذاتِ باری کا کھوج اور اس کے لئے کشمکش درد کی شاعری کی بنیاد ہے اور اس کے آثار جگہ جگہ نظر آتے ہیں ؎

؎ درد کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب — کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے؟
؎ یارب یہ کیا طلسم ہے ادراک و فہم یاں — دو ڈھائی آپ سے باہر نہ جا سکے
؎ نظر میرے دل کی پڑی درد کس پر — جدھر دیکھتا ہوں وہی روبرو ہے
؎ رونے سے ہے نقشِ پا کی طرح خلق یاں مجھے — اے عمرِ رفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے

ان سب اشعار میں زندگی اور کائنات کے کسی نہ کسی پہلو کے بارے میں سوال موجود ہیں۔ ان میں حیرت اور حیرت کے بعد حقیقت کی تلاش کے آثار اچھی طرح نمایاں ہیں جن سے درد کی مفکرانہ اور

عارفانہ جستجو کا پتہ چلتا ہے۔

صوفیانہ مشاہدہ | دردؔ کے کلام میں ایسے اشعار کی تعداد خاصی ہے جن میں چند الفاظ "دید"، "سیر" اور "دیکھنا" استعمال ہوئے ہیں۔ یہ بھی اُن کی صوفیانہ عارفت مشاہدہ کا نتیجہ ہے۔ ان کی چند غزلوں میں قافیہ و ردیف ہی دیکھنا استعمال ہوا ہے ؎

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا — تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا
جان پر کھیلا ہوں میں میرا جگر دیکھنا — جی رہے یا نہ رہے مجھ کو اُدھر دیکھنا
تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا — برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

دردؔ کی عاشقانہ شاعری | دردؔ کے عاشقانہ اشعار کو تین حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

اوّل:۔ وہ اشعار جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عشقِ حقیقی کا بیان ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا گیا ہے ؎

دو عالم نے ہر طرف تیرے جلوے دکھائے — پردے تعیّنات کے جو تھے اٹھا دیئے

دوم:۔ ایسے عاشقانہ اشعار جن میں محبوب کا تعین نہیں ہے۔ محبوب حقیقی کا عکس بھی ہے اور مجازی کا بھی ؎

مرا جی ہے جب تک، تری جستجو ہے — زباں جب تلک ہے یہی گفتگو ہے
تمنّا ہے تیری اگر ہے تمنّا — تری آرزو ہے اگر آرزو ہے

سوم:۔ ایسے اشعار جو خالص مجازی رنگ کے ہیں۔ ان میں چلتا پھرتا ہوا انسانی محبوب نظر آتا ہے ؎

سو مرتبہ یوں ٹھہر چکی اس سے نہ ملیے — وہ بھی تو نہیں بنتی ہے کیا کیجیے اس سے
ہم کتنے نہ تھے درمیاں چھوڑ یہ باتیں — پائی نہ سزا اور وفا کیجیے اس سے
دل بھی تیرے ہی ڈھنگ سیکھا ہے — آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے

خاص عشقیہ اسلوب | دردؔ کی وہ شاعری جس میں عشقِ مجازی اور محبوبِ انسانی کا ذکر ہے۔ اس میں عام شاعروں سے ہٹ کر ایک خاص قسم کا رکھ رکھاؤ، پاسداری اور وقار نظر آتا ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ صوفیانہ تربیت شاعر کو بے راہ روی سے روک رہی ہے ؎

دید و دید ہوئی دور سے میری اس سے — ایک بھی اس سے ملاقات نہ ہونے پائی
گرچہ وہ خورشید رُو نت ہے میرے سامنے — پھر بھی میسّر نہیں بھر کے نظر دیکھنا

اخلاقی موضوعات | میر دردؔ نے انسانی ہمدردی اور باہمی خیر خواہی پر زور دیا ہے اور اسے مقصدِ تخلیقِ آدم قرار دیا ہے ؎

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

ان کے ہاں صوفیانہ پن یا ابتذال کا کہیں نشان نہیں ملتا۔

فنی قدر و قیمت اردو کی زبان عام فہم اور پیرایہ اظہار سادہ و رواں ہے۔ بحریں مختصر مگر مؤثر و دلنشیں ہیں۔ فارسی کی خوبصورت ترکیبیں بھی ہیں۔ جو اب اردو زبان کا اٹوٹ حصہ بن گئی ہیں۔ مثلاً ہستی بے بود، کشتۂ غم، دل گرفتہ، مسجودِ خلائق، گوشہ خاطر وغیرہ۔

غزل نمبر ۱

اب کے تیرے در سے گر گئے ہم پھر یہ ہی سمجھ کہ مر گئے ہم

مشکلات: در: دروازہ۔

تشریح: شاعر اپنے محبوب سے کہتا ہے کہ اگرچہ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ ہمیں تیرے دروازے سے ذلیل و رسوا کر کے نکالا گیا ہے اور ہم نے اس صدمے کو ہر مرتبہ گوارا کیا ہے۔ مگر اب ہم کسی حادثے کو برداشت کرنے کی سکت نہیں رکھتے چنانچہ اگر ہمیں اس مرتبہ تمہارے دروازے سے اٹھانے کی کوشش کی گئی تو ہم زندہ نہیں رہ سکیں گے۔ رسوائی و جدائی کا یہ غم ہماری جان لے کر چھوڑے گا۔

جوں نورِ بصر تیرا تصور تھا پیشِ نظر جدھر گئے ہم

جوں: طرح، مانند۔ نورِ بصر: آنکھ کا نور۔ پیشِ نظر: سامنے۔

مشکلات:

تشریح: جس شخص سے کسی کو زیادہ محبت ہو، اس کے ذہن میں اسی کا خیال بسا رہتا ہے۔ اور یہ خیال اندھیرے میں روشنی بن کر اس کی راحت اور مسرت کا باعث بنتا ہے۔ شاعر اپنے محبوب سے (جو مجازی اور حقیقی دونوں طرح کا ہو سکتا ہے) اسی امر کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جس طرف اور جہاں بھی میں گیا ہوں تیرے تصور نے میری اسی طرح راہنمائی کی ہے جس طرح آنکھ کی روشنی دیا (انسان کی راہنمائی کرتا ہے)

کس نے یہ ہمیں بھلا دیا ہے معلوم نہیں کدھر گئے ہم

تشریح: اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ جب سے ہمارے محبوب نے ہمیں مردود قرار دے کر اپنے سے جدا کر دیا ہے، ہماری حالت ہی غیر ہو گئی ہے اور ہم اپنے آپ کو بھی بھولے رہتے ہیں۔ جبکہ محبوب حقیقی کے حوالے سے اس کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ جب سے مالکِ حقیقی نے ہمیں فراموش کیا ہے ہم سچے اور سیدھے راستے سے بھٹک کر پتہ نہیں کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں میر درد کی شاعری کی روشنی میں دونوں مفہوم درست ہیں۔

تھا عالمِ جبر کیا بتا دیں کس طور سے زیست کر گئے ہم

مشکلات: عالمِ جبر: مجبوری کی حالت۔ جہاں انسان کو آزادی حاصل نہ ہو۔ طور: مانند۔ حالت۔ زیست کرنا: زندگی گزارنا۔

تشریح: خواجہ میر درد جبر پہ تصوف کے حامی تھے۔ یعنی یہ خیال کہ انسان دنیا میں پابند محض ہے اور اسے عمل کی کوئی آزادی حاصل نہیں ہے اسی کے تحت وہ کہتے ہیں کہ میرے دوستو! میں کیا بتاؤں کہ میں نے کس طرح زندگی گزاری۔ بس ایک جبر اور پابندی تھی جس میں تمام عمر جکڑا رہا۔ اس شعر کا مطلب یہ بھی ہے کہ حدیث نبویؐ کے مطابق کہ "دنیا مسلمان کے لیے قید خانہ جبکہ کافر کے لیے مقامِ عیش ہے"۔ ہماری زندگی طرح طرح کی پابندیوں میں محدود رہی اور ہم عام دنیا دار انسانوں کی طرح عیاشی نہ کر سکے۔

جس طرح ہوا اسی طرح سے پیمانۂ عمر بھر گئے ہم

مشکلات: پیمانۂ عمر بھرنا: عمر کا پیالہ بھرنا۔ یعنی زندگی گزارنا۔

تشریح: شاعر کہتا ہے کہ ہم نے تو بس جیسے تیسے زندگی کے دن پورے کیے ہیں اور خدا کے احکام کے تحت جس طرح اس کا حق ادا کرنا چاہیے تھا، نہیں کر سکے۔ اپنی بے بسی اور بے چارگی کا اظہار کیا ہے۔

افسوس کہ دردؔ اس کو جب تک ہو دے ہے خبر گزر گئے ہم

تشریح: شاعر اپنے محبوب کی سنگ دلی اور بے وفائی کا شکوہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہم نے اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی بہت کوشش کی، مگر اس کے دل میں ہمارے لیے رحم یا محبت کے جذبات پیدا نہ ہوئے لیکن شومئی

قسمت کہ جب اس کا دل پسیجا اور اُسے ہمارے عشق صادق کی خبر ہوئی، ہم تھک ہار کر کوچ کر گئے اور یوں اس کی بے موقع توجہ ہمارے کسی کام نہ آئی۔ بقولِ غالب ؎

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

غزل نمبر ۲

تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلے کس لیے آئے تھے ہم کیا کر چلے

مشکلات: تہمتیں: الزامات۔ بُری باتیں۔

تشریح: شاعر کہتا ہے اللہ نے ہمیں اعلیٰ و ارفع مقاصد دے کر پیدا کیا تھا کہ اللہ کا کلمہ بلند کریں۔ اور انسانیت کا بول بالا کریں۔ مگر افسوس ہم ایسے کاموں میں پڑ گئے جو انسانیت پر الزام کی حیثیت رکھتے تھے۔ مثلاً ظلم و ستم بے انصافی۔ بے مروتی اور یوں ہم نے بہت سی تہمتیں تو لے لیں۔ مگر انسان ہونے کا مقصد پورا نہ کیا۔

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

تشریح: زندگی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نعمت بھی ہے اور بہت بڑا امتحان بھی۔ یہ امتحان اپنے اندر بے شمار مشکلات اور نشیب و فراز رکھتا ہے۔ اہلِ ہمت ان سے خوش اسلوبی سے نبرد آزما ہوتے اور سرخروئی حاصل کرتے ہیں جب کہ کمزور اور کم ہمت لوگ حوصلہ ہار بیٹھتے اور گلے شکوے کرنے لگتے ہیں۔ اس شعر میں ایک ایسے ہی فرد کی سوچ نظر آتی ہے جو زندگی کی ہماہمی کے سامنے ہمت ہار بیٹھتا ہے اور مایوسی کا اظہار کر رہا ہے۔

کیا ہمیں کام ان گلوں سے اے صبا ایک دم آئے اِدھر، اُدھر چلے

مشکلات: گلوں: پھولوں۔ خوب صورت لوگوں۔ ایک دم: تھوڑی دیر کے لیے۔

تشریح: شاعر کہتا ہے کہ ہم پھولوں سے کوئی گہرا تعلق استوار نہیں کر سکتے کہ ایک دم کے لیے ہم آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ دراصل یہ استعارے کی زبان ہے۔ اصل مدعا یہ ہے کہ انسان فانی ہے۔ چند روزہ زندگی لے

اگر دنیا میں آتا ہے۔ اس حالت میں اگر وہ حسن پرستی کرتا ہے اور عشق و عاشقی کے کاموں میں پڑ جائے تو مناسب بات نہ ہوگی۔

دو حشر دیکھا تماشا یاں کا بس تم رہو اب ہم تو اپنے گھر چلے

تشریح: شاعر دنیا سے رخصت ہوتے وقت اپنے دوستوں سے کہہ رہا ہے کہ میں نے تو دنیا کی حقیقت سمجھ لی۔ یہ محض کھیل تماشا ہے اور یہاں دل لگانا فضولِ محض ہے اس لیے میں تو اپنے اصلی گھر یعنی آخرت کو سدھارتا ہوں، اب تم جانو اور تمہارا کام۔

آہ افسوس جی مت جلا تب جانئے جب کوئی افسوں تیرا اُس پر چلے

مشکلات: آہ: کلمہ افسوس۔ جی جلانا (محاورہ) تنگ کرنا، پریشان کرنا۔ افسوں: جادو۔

تشریح: اُردو شاعری کی روایت یہ ہے کہ عاشق آہیں بھرتا اور نالہ و زاری کرتا رہتا ہے، مگر محبوب پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ یہاں اسی بات کا شاعر نے اظہار کیا ہے کہ میری آہو اور آنسوؤ! تم میرا تو جی جلاتے رہتے ہو، تم نے میری زندگی اجیرن کر دی ہے مگر پتہ تو تب چلے جب تمہارا جادو میرے محبوب پر چل سکے۔ اور وہ تم سے متاثر ہو کر میرے قریب آ جائے۔

ایک میں دل ریش ہوں ویسا ہی دوست زخم کتنوں کے سنا ہے بھر چلے

مشکلات: دل ریش: زخمی دل والا۔

تشریح: شاعر کہتا ہے کہ میری طرح بہت سے دوسرے لوگوں نے بھی عشق کیا تھا اور انہیں مختلف صدموں سے واسطہ پڑا تھا مگر وقت کے ساتھ ساتھ یا تو ان کے زخموں کا مداوا ہو گیا یا پھر وہ ان صدموں کو فراموش کر گئے، مگر میں ہوں کہ نہ کسی نے میری دلجوئی کی نہ میرے زخم بھرے اور نہ ہی میں ان زخموں کی ٹیس کو بھلا سکا۔

شمع کے مانند ہم اس بزم میں چشم تر آئے تھے دامن تر چلے

مشکلات: چشم تر: روتے ہوئے۔ دامن تر: گناہگار، مجرم یعنی دامن کا شراب سے آلودہ ہونا۔

تشریح: ہم دنیا میں آئے تو رو رہے تھے (بچہ پیدا ہوتے وقت رو رہا ہوتا ہے) اور اگرچہ ہر گناہ سے پاک تھے مگر بعد میں ہم نے زندگی ایسے

گزاری کہ گناہوں میں لت پت ہو گئے۔ اور اسی حالت میں دنیا سے اُٹھ گئے گویا ہماری مثال شمع کی سی ہے۔ جو محفل میں روتی ہوئی آتی ہے (شاعر موم کے گرتے ہوئے قطروں کو رونے سے تعبیر کرتے ہیں) مگر جب بجھتی ہے تو کتنے ہی پتنگوں کا خون اُس کی گردن پر ہوتا ہے اور صبح کی شکل میں کے سرد جسم کو شبنم میں نہلا دیتی ہے یعنی اُس کا دامن بھی تر ہو جاتا ہے۔

ہم جہاں میں آئے تھے تنہا ولے ساتھ اپنے اب اُسے لے کر چلے

مشکلات: تنہا۔ اکیلے۔ ولے: لیکن۔

تشریح: ہم تنہا دنیا میں آئے تھے مگر عالم آخرت کو واپس جاتے ہوئے ہم اکیلے نہیں ہیں بلکہ اپنے محبوب کو ساتھ لیے جا رہے ہیں۔ جو یہاں بھی ہمارا سہارا بنا رہا اور وہاں بھی راحت و مسرت کا سبب بنے گا۔ یہاں محبوب سے مراد اللہ تعالیٰ ہے، ورنہ مجازی محبوب کی رفاقت کا اس فخریہ انداز میں اظہار بے معنی ہے۔

جوں شرارِ ہستیٔ بے بود، یاں بارے ہم بھی اپنی باری چلے

جوں: طرح۔ شرار: چنگاری۔ ہستیٔ بے بود: بے وقعت زندگی۔ باری بھرنا: اپنے وقت کا فرض انجام دینا۔

تشریح: اس شعر میں انسان کے بہت ہی فانی ہونے کا ذکر کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ آگ کے ایک حقیر ذرّے کی مانند جو ایک لمحے کے لیے چمکتا اور بجھ جاتا ہے۔ ہم دنیا میں چند لمحوں کے لیے آئے تھے اور کوئی بڑا کام انجام دیئے بغیر جلد ہی ختم ہو گئے۔

درد کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب کس طرف سے آئے تھے کدھر چلے

تشریح: موت اور زندگی کا چکر بڑا عجیب اور پُراسرار ہے۔ لوگ پیدا ہوتے، زندگی گزارتے اور پھر مر جاتے ہیں۔ اس پر پریشان ہو کر شاعر سوال کرتا ہے کہ کچھ پتہ نہیں چلتا لوگ کہاں سے آتے ہیں اور کس طرف چلے جاتے ہیں۔ یہ ایک عام آدمی کی سوچ ہے ورنہ مذہبی نقطہ نظر سے اس سلسلے کی ضروری معلومات رکھتے تھے۔

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ

(۱۷۹۷ء ——— ۱۸۶۹ء)

حالاتِ زندگی

مرزا غالبؔ کے حالاتِ زندگی قبل ازیں "خطوطِ غالبؔ" کے تحت بیان کیے جا چکے ہیں۔ صفحہ ۸۰ ملاحظہ کریں۔

کلامِ غالبؔ کی خصوصیات

غالبؔ کی شاعرانہ عظمت کو ہر دور میں تسلیم کیا گیا ہے۔ اگرچہ انہوں نے اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کی ہے مگر ان کی شہرت کی بنیاد ان کا اُردو دیوان ہے جسے بعض لوگوں نے ہندوستان کی "الہامی کتاب" قرار دیا ہے۔ یہ بات اگرچہ مبالغہ پر مبنی ہے تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُردو شاعری کی تاریخ میں ان کا مقام بہت بلند ہے۔ میرؔ اور اقبالؔ کے سوا تمام شاعروں میں ان کا مقام بہت اہم ہے۔ ان کے کلام کی چیدہ چیدہ خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ جدت طرازی خیالات و افکار اور زبان و بیان دونوں لحاظ سے جدت طرازی غالبؔ کے کلام کی امتیازی خصوصیت ہے۔ بقول

آلِ احمد سرور "ان کے قصرِ شاعری کی بنیاد جدت طرازی پر ہے" چونکہ وہ زندگی کی عام روشوں سے ہٹ کر چلنا چاہتے تھے۔ اس لیے شاعری میں بھی انہوں نے پامال اور فرسودہ مضامین کو نئے انداز میں بیان کیا ہے۔ حالی کہتے ہیں" جب میر و سودا اور ان کے متقدمین کے کلام میں ایک ہی قسم کے خیالات اور مضامین دیکھتے دیکھتے جی اکتا جاتا ہے اور اس کے بعد مرزا کا دیوان دیکھتے ہیں تو جس طرح خشکی کا سیاح سمندر کے سفر میں یا ایک میدان میں رہنے والا پہاڑ پر جاکر بالکل ایک نئی اور نرالی کیفیت کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اسی طرح مرزا کے دیوان میں بھی ایک اور ہی سماں نظر آتا ہے" غالب کو بھی اپنی جدت طرازی کا احساس تھا کہتے ہیں ؎

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے　　کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

ان کی جدت طرازی اور اندازِ بیان کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں: ؎

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی　　موت آتی ہے پر نہیں آتی

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے　　مرے بتخانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے　　رکتی ہے میری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

معنوی جدت کے علاوہ غالب کی اختراع پسند طبیعت نے بیان کے بھی نئے نئے پیرائے تلاش کیے ہیں اور اس سلسلے میں نئی نئی تشبیہوں، جدید استعاروں، موزوں تمثیلوں اور کنایوں سے کام لیتے ہیں۔ یہاں تک ہو سکا ایک لفظ کو دوبارہ استعمال نہیں کیا۔ بہت سی نئی تراکیب وضع کی ہیں۔ مثلاً دامِ خیدن، گلبانگِ تسلی، اور آتشِ خاموش وغیرہ۔

۲۔ فکر و فلسفہ

غالب کا مزاج فلسفیانہ ہے اس لیے ان کے کلام کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جس میں حیات و کائنات کے مختلف پہلوؤں پر مفکرانہ، فلسفیانہ اور حکیمانہ خیالات کا اظہار ملتا ہے۔ ان کا فلسفیانہ انداز انہیں تمام شعراء سے ممتاز کرتا ہے۔ تصوف کے موضوع پر بھی ان کے ہاں حکیمانہ اشعار ملتے ہیں۔ مثلاً ؎

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں　　ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی — چمن زنگار ہے آئینہ بادِ بہاری کا

۳۔ آفاقی لہجہ

غالبؔ نے انسانی ذہن کی مختلف کیفیتوں کو ایسے انداز میں اپنے اشعار میں سمو دیا ہے کہ آج کا انسان ذہنی طور پر بہت قریب معلوم ہوتا ہے۔ دورِ جدید کے انسان کو بھی بے یقینی، محرومی اور تنہائی کے مسائل درپیش ہیں۔ غالبؔ نے جہاں ایسی کیفیات کو بیان کیا ہے وہاں ان کا لہجہ آفاقی ہو گیا ہے اُن کی اس آفاقیت نے اُن کے کلام کی مقبولیت میں زبردست اضافہ کیا ہے۔

تیری وفا سے کیا ہو تسلّی کہ دہر میں — تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

عاشقی صبر طلب، اور تمنا بے تاب — دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل — انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار — لیکن تیرے خیال سے غافل نہیں رہا

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

۴۔ نفسیات نگاری

غالبؔ نے اپنی شاعرانہ ذہانت کی بدولت انسانی زندگی اور اس کی مختلف نفسیاتی کیفیات کا گہرا مطالعہ کیا ہے وہ قلبِ انسانی کی گہرائیوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ آدمیوں کو پرکھنا ان کے اعمال و افعال کا جائزہ لینا ان کا محبوب مشغلہ تھا لکھتے ہیں "شہ برس کی عمر میں بالمبالغہ ستر ہزار آدمی نظر سے گزرے ہوں گے۔ زندگی کے اسی گہرے مشاہدے کے سبب انھوں نے اپنی شاعری میں کامیاب نفسیات نگاری کی ہے۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج — مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم — کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں وہ بھی

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے — تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

۵۔ تنوّع غالبؔ کے کلام میں زندگی کے مختلف پہلوؤں اور اُن کے بیان کی مختلف اور متنوع کیفیات ملتی ہیں۔ مثلاً کہیں زندگی کی غیر معمولی اور پُرجوش کیفیتیں ہیں اور کہیں رکھ رکھاؤ، تحمل اور وضع داری کی کیفیت پائی جاتی ہے اسی طرح اظہارِ مطالب کے وسیلوں میں بھی کہیں کہیں پیچیدگی اور دشوار پسندی ہے جسے انہوں نے "گنجینۂ معنی کا طلسم" کہا ہے۔ مثلاً ؎

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے — مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

کہیں سادگی و لطافت ہے۔ اسی طرح کے شعر سہل ممتنع کے ذیل میں آتے ہیں مندرجہ ذیل اشعار متنوع کیفیات کی مثالیں پیش کرتے ہیں ؎

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے — آخر اس درد کی دوا کیا ہے
جان تم پر نثار کرتا ہوں — میں نہیں جانتا دُعا کیا ہے

کوئی اُمید بر نہیں آتی — کوئی صورت نظر نہیں آتی

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی — میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

نقشِ فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا — کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

۶۔ ایجاز و بلاغت مرزا نے جدّتِ ادا کے سبب نئی ترکیبوں اور نشستوں کے موزوں استعمال سے بعض ایسے نکات کو اپنے شعروں میں اس ایجاز و بلاغت سے بیان کیا ہے کہ دوسرے شاعر بہت سے اشعار میں بھی نہیں کر سکتے۔ ان کے کلام کا ایک بڑا حصہ ایجاز و بلاغت کا عمدہ نمونہ پیش کرتا ہے اسی لیے ان کے ہاں کہیں کہیں پیچیدگیاں بھی پیدا ہو گئی ہیں۔

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

۷۔ انداز تغزل

تکیہ نہ لفظ نظر کے ساتھ ساتھ غالب کے کلام میں تغزل کی مختلف کیفیات بھی جلوہ نما ہیں۔ ان کی غزلوں میں دکھ اور درد سے پیدا ہونے والی کسک، سوز و گداز، تڑپ، شدتِ احساس اور غم انگیزی کی کیفیات موجود ہیں۔ مثلاً ان کی غزلوں میں ایسی کیفیات کا بھرپور اظہار ملتا ہے ؎

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

۸۔ حسن و تجمل

غالب متمول ہونے کے سبب نوابی ذہن رکھتے تھے۔ نفاست پسند اور خوش مزاج تھے۔ طبیعت میں خودداری کا مادہ بہت زیادہ تھا۔ ان کے شاعرانہ مزاج کے سبب اُن کی شاعری میں بھی حسن و تجمل، آن بان، شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ اور طمطراق پایا جاتا ہے۔ ان کے شعروں میں حسن و تجمل کی جو تصویریں ملتی ہیں بعض اوقات وہ دلوں میں جوش پیدا کرتی ہیں ؎

ترے جواہر طرفِ کلاہ کو کیا دیکھیں
ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

۹۔ شوخی و ظرافت

شوخی و ظرافت مرزا کی طبیعت کا خاصا تھا۔ خطوط غالب کی طرح کلامِ غالب میں بھی اس کی پُر لطف اور دلچسپ مثالیں ملتی ہیں۔ مولانا حالی نے غالب کی ظریفانہ طبیعت کے پیشِ نظر کہا تھا کہ "اگر انہیں حیوان ناطق کی بجائے حیوان ظریف کہا جائے تو بہتر ہے" ؎

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیئے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

وہ آ کے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے
ولے مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے

اگر لکھ لے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور کان پر رکھ کر قلم نکلے

بہر حال مرزا غالب ایک عظیم شاعر ہیں۔ رشید احمد صدیقی کے بقول: مجھ سے اگر پوچھا جائے کہ ہندوستان کو مغلیہ سلطنت نے کیا دیا، تو میں بے تکلف یہ تین نام لوں گا: غالب، اُردو اور تاج محل۔

غزل نمبر ۱

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا دل جگر تشنۂ فریاد آیا

دیدۂ تر: روتی ہوئی آنکھ۔ تشنہ: فریاد: فریاد کے پیاسے۔

مشکلات:

تشریح: جب بھی میرے دل و جگر فریاد کے پیاسے ہوتے ہیں۔ تو مجھے [illegible] بہائی ہوئی آنکھیں یاد آ جاتی ہیں جو ان دونوں کی پیاس بجھایا کرتی تھیں۔ مگر افسوس اب مسلسل گریہ وزاری سے وہ خشک ہو گئی ہیں۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ جب میرے دل و جگر فریاد کر کے میرے جذبات کی تشفی نہ کر سکے تو مجھے آنکھیں یاد آ گئیں جو یہ فرض خوش اسلوبی سے انجام دے دیا کرتی تھیں مطلب یہ کہ آجکل میں فریاد کرنے سے معذور ہو گیا ہوں۔

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

مشکلات: دم لینا۔ وقفہ آنا۔ ہنوز: ابھی تک

تشریح: محبوب کو رخصت کرتے وقت جو دردناک کیفیت گزری تھی اور اس کے چلے جانے کے بعد رہ رہ کر یاد آتی ہے اسے شاعر قیامت سے تعبیر کرتا ہے اور اس یاد میں جو کبھی کبھی وقفہ آتا ہے اس کو قیامت کے دم لینے سے تعبیر کرتا ہے مطلب یہ ہے کہ جب کبھی اس تکلیف دہ حالت میں ذرا سی کمی آتی ہے عین اسی وقت مجھے جدائی کا وقت یاد آ جاتا ہے۔

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی کیوں ترا رہگزر یاد آیا

مشکلات: رہگزر: راستہ

تشریح: تجھ سے بچھڑنے کے بعد میں جیسے تیسے زندگی کو گزارنے کی کوشش کر رہا تھا مگر افسوس کہ رہ رہ کر مجھے تیرے گھر کا راستہ یاد آ جاتا ہے۔ جس پر میں پہلے پہل چلا تھا اور جس سے میری ناقابل فراموش یادیں وابستہ ہیں

اور یہ یاد مجھے دوبارہ میری زندگی کو کانٹوں کی سیج میں بدل دیتی ہے۔

آہ! وہ جرأتِ فریاد کہاں دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا

مشکلات: جرأتِ فریاد: فریاد یا اظہارِ غم کی جرأت۔

تشریح: غالب اپنے دل کے زوال پر افسوس کرتے ہیں کہ اس میں جرأت فریاد نہیں رہی۔ ایسے موقع پر انہیں جگر یاد آتا ہے جو دل کا سہارا بنا کرتا تھا مگر مدت ہوئی وہ بھی ہمت ہار بیٹھا ہے۔ مطلب یہ کہ دل اور جگر دونوں اپنی قوت کھو بیٹھے ہیں اور اظہارِ غم میں اب جرأت مندی کا مظاہرہ نہیں کر سکتے۔

پھر تیرے کوچے کو جاتا ہے خیال دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا

مشکلات: کوچہ: گلی۔ گم گشتہ: گم شدہ

تشریح: مجھے رہ رہ کر تیری گلی کی یاد آتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ دوبارہ وہاں جاؤں اور تیرے نقوشِ پا دیکھوں۔ مگر سوچتا ہوں کہ وہیں میں نے اپنا قیمتی دل کھویا تھا جس کا سراغ اب تک نہیں ملا اور جب پہلے میں دل ہی نہیں تو وہاں جانے کا فائدہ کیا؟

کوئی ویرانی سی ویرانی کیا دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

تشریح: اس کا ایک مفہوم یہ ہے کہ ہم جنگل یا صحرا میں کھڑے ہیں اور وہاں اس قدر ویرانی اور اداسی ہے کہ ڈر کے مارے گھر یاد آ رہا ہے۔ مگر دراصل اس کے معنی یہ ہیں کہ جب میں صحرا کی ویرانی اور اداسی کو دیکھتا ہوں تو مجھے اپنا گھر یاد آنے لگتا ہے کہ وہاں بھی ایسی ہی ویرانی اور اداسی کا راج ہے۔

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

مشکلات: مجنوں: پاگل، لیلیٰ نامی مشہور عاشق کا عرف جو لیلیٰ کے عشق میں دیوانہ ہو گیا تھا۔ لڑکپن: جوانی کے آغاز کا زمانہ۔

تشریح: جب میں بچہ تھا تو میں نے مجنوں کو مارنے کے لیے پتھر اٹھایا تھا مگر چونکہ عشق کے آثار اسی وقت سے نمایاں تھے۔ اس لیے خیال آیا کہ عین ممکن ہے۔ میری بھی کبھی یہی کیفیت ہو جائے اور لوگ مجھے بھی پتھر مارنے لگیں اس لیے مجھے اپنا سر یاد آ گیا اور میں نے اٹھایا ہوا پتھر نیچے پھینک دیا مجنوں سے مجھے ہمدردی ہو گئی۔

غزل نمبر ۲

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

مشکلات: بسکہ: مختصر یہ کہ۔ دشوار: مشکل

تشریح: دنیا میں آسان سے آسان کام بھی بہت مشکل ہے۔ جس کی سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ آدمی جو کہ عین انسان ہے، اس کا حقیقی معنوں میں انسان بننا مشکل ہے۔ دراصل شاعر اس امر پر افسوس کا اظہار کر رہا ہے کہ انسانوں کی شکلیں تو بہت سی ہیں مگر دردمند، مخلص، ہمدرد اور صحیح معنوں میں انسانی خوبیوں کے حامل لوگ نظر نہیں آتے

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

مشکلات: گریہ: رونا، آہ و بکا کرنا۔ کاشانہ: گھر۔ ٹپکے ہے: ظاہر ہو رہا ہے
بیاباں: جنگل۔

تشریح: معلوم ہوتا ہے کہ رونا، آہ و بکا کرنا ایک روز میرے گھر کو تباہ و برباد کر دے گا۔ کیونکہ مکان کی دیواروں اور دروازوں سے ویرانی ابھی سے جھلکنے لگی ہے اور اگر میں نے یہ شغل جاری رکھا تو مکمل تباہی یقینی ہے

وائے دیوانگیٔ شوق کہ ہر دم مجھ کو آپ جاناں اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

مشکلات: وائے: افسوس۔ دیوانگیٔ شوق: عشق کا جنون۔ اُدھر: محبوب کی گلی مراد ہے۔ حیراں ہونا: ششدر رہ جانا۔

تشریح: شاعر اپنے عشق کی دیوانگی پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں محبوب کی گلی میں جاتا تو بڑے شوق سے ہوں، مگر وہاں جا کر بھول جاتا ہوں کہ یہاں آنے کا مقصد کیا تھا۔ حیرانی کی ایک ایسی کیفیت مجھ پر طاری ہو جاتی ہے کہ وہاں جا کر اپنے آپ کو بھی بھول جاتا ہوں۔

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

مشکلات: جفا: ظلم۔ زود پشیماں: بہت شرمندہ ہونے والا، پچھتانے والا۔

تشریح: میرے محبوب نے مجھے قتل کر دیا مگر اس کے ضمیر نے اُسے اتنی ملامت کی کہ وہ بہت پچھتایا اور شرمندہ ہوا اور آئندہ کے لیے ظلم و ستم سے توبہ کر لی۔ شاعر شرمندگی اور پچھتاوے کے منظر سے لطف اندوز بھی ہو رہا ہے اور

افسوس کا اظہار بھی کرتا ہے کہ محض میری وجہ سے میرے محبوب کو ایک ناگوار قسم کے احساس سے دوچار ہونا پڑا۔

حیف اس چارہ گر کپڑے کی قسمت غالب جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

مشکلات: حیف: افسوس۔ چارہ گر: تھوڑا سا۔ گریباں: قمیض کا وہ حصہ جو گردن اور سینے کے قریب ہوتا ہے اور جہاں عموماً بٹن لگتے ہیں۔

تشریح: عاشقوں پر جب دلبانگی کا دورہ پڑتا ہے تو وہ اپنا گریبان پھاڑ ڈالتے ہیں اور ایسا بار بار ہوتا ہے۔ شاعر یہاں عاشق کے گریبان میں لگے ہوئے کپڑے کی قسمت پر افسوس کا اظہار کرتا ہے کہ یہ بیچارہ اکثر چاک ہوتا اور ذلت و رسوائی کا سامنا کرتا رہتا ہے۔

غزل نمبر ۳

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

مشکلات: ہم سخن: جس سے بات کی جا سکے۔ ہم زباں: جو زبان سمجھتا ہو۔

تشریح: شاعر عام انسانوں کی بے وفائی، بے مروتی اور عدم اخلاص سے اتنا تنگ آ گیا ہے کہ وہ اس خواہش کا اظہار کرتا ہے کہ ایسے انسانوں سے تو بہتر ہے کہ کسی جنگل میں جا کر بسیرا کر لیا جائے جہاں کسی سے بات کرنی پڑے نہ سننے کی نوبت آئے۔

بے در و دیوار سا اک گھر بنانا چاہیئے کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

مشکلات: بے در و دیوار: جس کی دیوار ہو نہ دروازہ۔ پاسباں: محافظ، چوکیدار۔

تشریح: شاعر اس خواہش کا اظہار کرتا ہے کہ یہ مکان جن کے اندر بھی چوروں کا ڈر پریشان رکھتا ہے اور جو بار بار شوں میں مسلسل ٹپکتا رہتا ہے اسکو چھوڑ دینا چاہیئے۔ ان مسائل سے بھی علیحدگی تعلق کر لینا چاہیئے۔ جو کسی تکلیف میں ساتھ نہیں دیتے اور ان محافظوں سے بھی جان چھڑا لینی چاہیئے جو چوروں، ڈاکوؤں سے مصالحت کر لیتے ہیں اور ایسی جگہ چل کر رہنا چاہتے ہیں جہاں اس قسم کا کوئی تکلف نہ ہو نہ مکان، نہ ہمسائے نہ پاسبان۔

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

مشکلات: تیمار دار: بیماری میں نگہداشت کرنے والا۔ نوحہ خوان: ماتم کرنے والا

تشریح: پچھلے دو شعروں کی طرح یہاں بھی شاعر اپنی جھنجلاہٹ اور بیزاری کا اظہار کرتا ہے کہ جی چاہتا ہے ایسی جگہ چلے جائیں جہاں ہم بیمار پڑیں تو کوئی مزاج پرسی کرنے والا نہ ہو اور اگر مر جائیں تو قریب کوئی ایسا شخص نہ ہو جو دو فنا کفنا تو کجا آہ و بکا ہی کر سکے۔

خواجہ الطاف حسین حالی

(۱۸۳۷ ـــــ ۱۹۱۵ء)

حالاتِ زندگی:

مولانا حالی کے حالاتِ زندگی آپ حصہ نثر میں سب سے پہلے سبق "سرسید کا بچپن" کے تحت پڑھ چکے ہیں۔

حالی کی غزل:

حالی اردو کے ممتاز شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ انھوں نے شاعری کی تمام اصناف نظم غزل مثنوی، رباعی، قطعہ وغیرہ میں طبع آزمائی کی اور ہر میدان میں اپنی خداداد صلاحیتوں کی بدولت اپنی انفرادیت کا نقش قائم کیا۔

حالی کی شہرت کی بنیاد ان کی معروف نظمیں "مسدس" "چپ کی داد" اور "مناجات بیوہ" ہیں۔ لیکن وہ قدرت کی طرف سے شعر و سخن کا جو ذوق اور مذاق لے کر آئے تھے اس کی بدولت انھوں نے غزل کی تعمیر و ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اُن کی عظمت اس میں ہے کہ انھوں نے غزل کو دورِ جدید کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے قابل بنایا۔ ان کی غزل گوئی کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں۔

۱۔ جدّت اردو غزل عشق و محبت کے روایتی افسانے اور گل و بلبل کے فرسودہ قصے دہرا دہرا کر بے جان ہو چکی تھی۔ حالی شاعری کے مروجہ رجحان سے غیر مطمئن تھے انہوں نے "مقدمہ شعر و شاعری" میں مروجہ شاعری کے تاریک پہلوؤں کی نشاندہی کی اور اپنی شاعری کے اصول متعین کر کے انہیں اپنے کلام میں برت کر دکھایا۔ ان کی جدت پسندی کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے غزل میں اصلیت اور واقعیت پر زور دیا اور بتایا کہ غزل میں زندگی کا ہر مسئلہ موضوعِ سخن بن سکتا ہے۔ اس طرح انہوں نے تنگنائے غزل کو وسعت بخشی۔ اپنی اس روش کے بارے میں خود کہتے ہیں ؎

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر — شہر میں کھولی ہے حالی نے دوکان سب سے الگ

انھوں نے غزل کو جس نئے انداز اور نئے آہنگ سے روشناس کرایا اس کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں ۔۔۔ مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

یارانِ تیز گام نے محمل کو جالیا ۔۔۔ ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں ۔۔۔ اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

۲۔ اصلاحی رنگ حالیؔ سرسیّد کی تحریکِ اصلاحِ قوم کے پُرجوش حامی تھے، ملی جذبے کے تحت ہی انہوں نے مسدس اور دوسری قومی نظمیں لکھیں۔ اُن کی غزلوں میں بھی واعظانہ اور ناصحانہ رنگ ملتا ہے۔ تصوف، اخلاق، حکمت اور بے ثباتیٔ دنیا کے بارے میں انہوں نے جو اشعار کہے ہیں، ان میں شعریت اور لطافت کم ہے اور واعظانہ خشکی زیادہ۔ اس لئے یہ غزلیات حالیؔ کا کمزور پہلو ہے۔ مثلاً ؎

بڑھاؤ نہ آپس میں ملّت زیادہ ۔۔۔ مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ

۳۔ خلوص اور سچائی حالیؔ کو مبالغہ آرائی اور تصنع سے سخت نفرت تھی۔ وہ مانگے تانگے کے جذبات کو شعر کا جامہ پہنانے کے شدّت سے مخالف تھے۔ اس لیے اُن کی غزلیں سادگی، سچائی اور خلوص سے معمور ہیں ؎

کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت ❊ ہم کو طاقت نہیں جدائی کی

ٹپکتا ہے اشعارِ حالیؔ سے حال ❊ کہیں سادہ دل مبتلا ہو گیا

ہوتی نہیں قبول دُعا ترکِ عشق کی ❊ دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

۴۔ دھیما لہجہ حالیؔ طبعاً معتدل مزاج انسان تھے۔ شورش، ہنگامے اور انقلاب سے انہیں دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ اُن کی دھیمی طبیعت کا عکس ان کے اشعار میں بھی کیفیاتِ عشق کے بیان میں اُن کے ہاں ایک طرح کی نرمی، تہذیب اور اعتدال پایا جاتا ہے جذبات میں وارفتگی کی انتہائی کیفیت کے بجائے ایک دھیمی لہر ہے۔

۵۔ سوز و گداز حالیؔ طبعاً حساس تھے۔ قومی غم اور ہم وطنوں کی غلامی کے خیال سے ان کے دل میں دکھ اور دردمندی کے احساسات اور زیادہ ہو گئے تھے چنانچہ غزلوں میں بھی سوز و گداز اور اثر آفرینی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اپنی شاعری کی اسی خصوصیت کے بارے میں خود کہتے ہیں ؎

اے شعر دلفریب نہ ہو تو تو غم نہیں — پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دلگداز تو

اسی دل گدازی کی کیفیت سے تغزل کا وہ مخصوص رنگ پیدا ہوتا ہے، جو اُردو غزل کا امتیازی وصف ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے بقول "میرؔ کے بعد تغزل کا امتیازی رنگ حالیؔ کے ہاں ملتا ہے" ؎

اک عمر چاہیئے کہ گوارا ہو نیشِ عشق — رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

۶۔ حزن و افسردگی ہندی مسلمانوں کی پستی اور زوال پر حالیؔ کو بہت دکھ تھا۔ اُن کا نقطۂ نظر مخلصانہ تھا۔ مگر ۱۸۵۷ء کے بعد جب انگریز پورے ہندوستان پر قابض ہو گئے تو حالات کچھ زیادہ پُر اُمید نظر نہ آتے تھے۔ مسلمانوں کی سلطنت ختم ہو گئی تھی۔ اور اس وقت کے حالات بھی دگرگوں تھے۔ حالیؔ جب اس پس منظر کے ساتھ شعر کہتے تو اس میں اُن کا حزنیہ لہجہ صاف جھلکتا ہے ؎

کر دیا چپ واقعاتِ دہر نے — تھی کبھی ہم میں بھی گویائی بہت

حالیؔ کے بعد کوئی نہ ہمدرد پھر ملا — کچھ دل میں تھے کہ دل میں ہمارے رہے

اسی طرح حالیؔ کی پوری غزل پر افسردگی چھائی ہوئی ہے ؎

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ — نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

بہر حال اُردو غزل کو ایک نیا رُخ عطا کرنے کے سلسلے میں اُن کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ فی الواقع وہ جدید غزل کے بانی ہیں۔

غزل نمبر ۱

۱۔ کہیں الہام منوانا پڑے گا — کہیں کشف اپنا جتلانا پڑے گا

مشکلات: الہام: وہ بات جو اللہ کی طرف سے دل میں ڈالی جائے۔ کشف: غیب کی باتوں کا اظہار۔

تشریح: مولانا حالیؔ ایک نئے دور اور تحریک کے علمبردار تھے جس میں جدیدیت اور عقل پرستی

حاوی تھی۔ مگر عام لوگ توہم پرستی کے قائل تھے اور جب تک بات کو کشف و کرامات کے انداز میں بیان نہ کیا جاتا۔ قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوتے تھے۔ حالی اسی صورتِ حال کی طرف ارشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ شاید ہمیں بھی اپنی بات سمجھانے کے لیے الہام اور کشف کا دعویٰ کرنا پڑے گا تب کہیں عام لوگ ہماری باتوں کو قبول کریں گے۔ شعر کا لہجہ طنزیہ ہے۔

۴۔ نہ ہو صوفی صفا گو تجھ میں لیکن کرشمہ کوئی دکھلانا پڑے گا

صوفی : مذہبی انسان۔ تصوف کا قائل صفا : روحانی پاکیزگی

مشکلات! کرشمہ : کھیل کا جادو۔

تشریح! حالی ان نقلی صوفیوں پر طنز کرتے ہیں جو روحانی پاکیزگی کی تو پروا نہیں کرتے مگر جادو اور ٹونے ٹوٹکوں کے بل پر لوگوں کو بیوقوف بنا کر دوکانداری چلاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ صوفی صاحب آپ میں تقدس و پاکیزگی نہیں تو نہ سہی بس کرشمے دکھلاتے رہیئے۔ پھر آپ کا وقار قائم رہے گا۔

۳۔ نصیحت بے اثر ہے گر نہ ہو درد یہ گر ناصح کو سمجھانا پڑے گا

گر : طریقہ، راز ناصح : نصیحت کرنے والا، خطیب یا

مشکلات! مولوی صاحب۔

تشریح! یہ شعر بھی پیشہ ور واعظین پر طنز ہے جو تقریریں اور وعظ و نصیحت تو بہت کرتے ہیں لیکن چونکہ دل میں درد اور روح میں سوز نہیں ہوتا۔ اس لئے کسی پر اُن کا اثر نہیں ہوتا۔ حالی اسی بات کو یوں بیان کرتے ہیں کہ ناصح کو بتا دو کہ جب تک اُس کے دل میں دین کا اور مخلوقِ خدا کا درد نہیں ہوگا۔ اس کی بات میں کوئی تاثیر نہیں ہوگی۔

۴۔ جنہیں ہو جھوٹ کو بیچ کر کھانا انہیں سچوں کو جھٹلانا پڑے گا

تشریح! بعض لوگوں کی زندگی کا تمام کاروبار جھوٹ پر مبنی ہوتا ہے۔ ان کی سیاست، مذہب اور عام چلن جھوٹ کے بغیر نہیں چل سکتے۔ اس صورت میں انہیں لامحالہ ان لوگوں کی مخالفت اور تردید کرنی پڑتی ہے جو حق و صداقت کے علمبردار ہوتے ہیں کہ جب تک سچائی کو داغدار نہ بنایا جائے جھوٹ مقبولیت حاصل نہیں کر سکتا۔ چنانچہ حالی جھوٹ کے پجاریوں پر طنز کرتے ہیں کہ جب تک وہ سچے لوگوں کو نہیں جھٹلائیں گے۔ ان کے قدم نہیں جم سکیں گے۔

۵۔ سخن میں پیروی کی گر سلف کی انہیں باتوں کو دہرانا پڑے گا

مشکلات! سخن۔ شاعری پیروی: نقل، تقلید۔ سلف: پچھلے لوگ پرانے لوگ۔

تشریح! حالی شاعری میں ایک انقلاب کے بانی ہیں اور عشق و عاشقی کی فرسودہ باتوں کو چھوڑ کر قومی خیرخواہی اور ملی مفاد کو موضوع بنانا چاہتے ہیں اس شعر میں وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم نے شاعری میں پرانے لوگوں کی تقلید کی، تو پھر وہی زلف و رخسار اور ساقی و میکدہ کی پرانی باتیں دہرانی پڑیں گی جن کا اب وقت ہے نہ ضرورت۔

۶۔ بہت یاں ٹھوکریں کھائی ہیں ہم نے بس اب دنیا کو ٹھکرانا پڑے گا

مشکلات! ٹھکرانا: چھوڑ دینا۔ ترک کر دینا۔

تشریح! دنیا والوں نے ہمیں اتنے دھوکے اور فریب دیے ہیں اور اتنی مشکلات نے دوچار کیا ہے کہ مجبوراً ہمیں اب مختلف تعلقات اور وابستگیوں کو ترک کرنا پڑے گا۔

۷۔ زمانہ کر رہا ہے قطع پیوند وفا سے ہم کو پچھتانا پڑے گا

مشکلات! قطع پیوند: تعلقات کو ختم کرنا۔ وفا۔ محبت۔ مروّت۔

تشریح! زمانے والے یعنی لوگ اس قدر مادہ پرست اور بے مروت ہو گئے ہیں کہ وہ بہت گہرے مراسم اور دوستیوں کو بھی فراموش کئے جا رہے ہیں۔ اور ہم نے دیکھ لیا ہے کہ محبت یا خلوص کی کوئی قیمت نہیں۔ چنانچہ اگر ہم نے ایسا رویہ اختیار کیا تو ایک روز ہمیں اپنی وفا پر پچھتانا پڑے گا کہ کاش ہم مروّت کا انداز اختیار نہ کرتے۔

۸۔ جو منصوبے ہیں یہ حالی کو شاید ارادہ فسخ فرمانا پڑے گا

مشکلات! منصوبے: ارادے۔ فسخ کرنا: توڑ دینا۔ ختم کرنا۔

تشریح! شاعر اپنے آپ سے کہتا ہے کہ تم نے خدمت خلق اور قومی بہبود کے بڑے بڑے پروگرام بنا رکھے ہیں حالانکہ لوگ نہ تو ایسی باتوں کو پسند کرتے ہیں نہ ہی بے لوث خادموں کی قدر کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک روز آئے گا کہ پریشان اور مایوس ہو کر تمہیں ان نیک ارادوں کو ترک کرنا پڑے گا۔

۹۔ بشر پہلو میں دل رکھتا ہے جب تک اسے دنیا کا غم کھانا پڑے گا!

مشکلات! بشر: انسان۔ غم کھانا: درد محسوس کرنا۔

تشریح! انسان خواہ کتنا ہی مادہ پرست کیوں نہ ہو جائے اور وہ خواہ کتنا ہی کاروباری ذہنیت اختیار کیوں نہ کر لے، مگر چونکہ وہ سینے میں دل رکھتا ہے اس

لئے اُس کا ضمیر کبھی نہ کبھی بیدار ہو کر انسانی ہمدردی اور خیر خواہی پر ضرور اکسائے گا ــــ اس کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ انسان غموں اور تفکرات سے بچنے کی خواہ کتنی ہی کوشش کرے، مگر اسے کسی نہ کسی غم یا فکر کا سامنا ضرور کرنا پڑے گا۔

غزل نمبر ۲

بری اور بھلی سب گزر جائے گی یہ کشتی یونہی پار اُتر جائے گی

تشریح: زندگی عیش و عشرت میں گزرے یا بھوکے ننگے رہتے ہوئے۔ بہر حال یہ گزر ہی جاتی ہے اور آخر کار سب کو یکساں طور پر قبر کی تنہائی اور تاریکی سے واسطہ پڑتا ہے زندگی کو کشتی سے تشبیہ دیتے ہوئے شاعر یہی بات کہتا ہے کہ طوفانوں میں سفر کرنا پڑے یا ہموار پانیوں پر پُر لطف رفتار ملے ہو کشتی ساحل پر پہنچ ہی جائے گی۔

۲۔ ملے گا نہ گلیں کو گل کا پستہ ہر اک پنکھڑی یوں بکھر جائے گی

مشکلات: گلیں: پھول توڑنے والا

تشریح: پھول توڑنے والا پھول کی ہیئت اس کی پتیوں کو الگ الگ کر کے معلوم کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے اس طرح پھول اپنی شکل و صورت اور وجود کھو بیٹھے گا۔ مگر پھول کا تجزیہ نہیں ہو سکے گا۔ پھول تو پتیوں کے مجموعے اور تناسب کا نام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ کسی قوم کا بحیثیت مجموعی مطالعہ نہیں کرتے بلکہ چند افراد سے میل جول رکھ کر کوئی رائے قائم کرتے ہیں، وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

۳۔ رہیں گے نہ ملاح یہ دن سدا کوئی دن میں گنگا اتر جائے گی

مشکلات: ملاح: کشتی چلانے والا۔ گنگا: ہندوستان کے ایک بڑے دریا کا نام۔

تشریح: اے ملاح گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ گنگا کا یہ طوفان اور زور شور ایک روز ختم ہو جائے گا۔ اور ہم دوسرے کنارے پر پہنچ جائیں گے ــــ یہ شاعر کی زبان اپنے اصل مطلب یہ ہے کہ غیر ملکی اقتدار کا رعب و دبدبہ ایک روز ختم ہو جائے گا اور بر صغیر ایک روز آزادی حاصل کر کے رہے گا۔

۴۔ اِدھر ایک ہم اور زمانہ اُدھر یہ بازی تو سو بسو سے ہر جائے گی

مشکلات: بازی: کھیل، مقابلہ سو بسو سے: یقیناً، بلاشبہ۔

تشریح: یہ شعر بھی اوپر کے شعر کی مانند قومی شاعری کی مثال ہے یعنی ہم مسلمان

سیاست اور دیگر معاملات میں اکیلے ہیں جبکہ زمانے کی ساری قومیں یعنی انگریز، ہندو، سکھ، یہودی سب ہمارے مقابلے میں متحد ہیں چنانچہ بظاہر یہی نظر آتا ہے کہ ہم یہ مقابلہ ضرور ہار جائیں گے کیونکہ بدقسمتی سے ہمارے اندر کسی ایک دشمن سے لڑنے کی بھی صلاحیت یا تیاری نہیں ہے۔

۵۔ نہ پوری ہوئی ہیں امیدیں نہ ہوں — یونہی عمر ساری گزر جائے گی

تشریح! ہم نے ذاتی اور اجتماعی بہبود کے جو منصوبے بنائے ہوئے تھے یا قوم سے جو امیدیں وابستہ تھیں۔ ان میں سے کوئی بھی پوری نہیں ہوئی اور نہ مستقبل میں ایسا ہونے کی توقع ہے۔ اس طرح افسوس کہ ہماری عمر ناکامی و نامرادی میں گزر جائے گی اور ہم اپنی کسی حسرت کو پورا ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکیں گے۔

۶۔ سنیں گے نہ حالی کی کب تک صدا — یہی ایک دن کام کر جائے گی

مشکلات! صدا - آواز۔

تشریح! میری قوم اگرچہ میری باتوں کو سرِ دست قبول نہیں کر رہی، بلکہ اُلٹا مجھے پریشان اور تنگ کرتی ہے، لیکن چونکہ میں خلوصِ نیت اور سچی ہمدردی کے جذبے سے ان کی اصلاح چاہتا ہوں۔ اس لیے ایک دن ضرور ایسا آئے جب وہ میرے مشوروں کو قبول کرنے پر آمادہ ہو جائے گی اور خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر منزل کی طرف گامزن ہو گی۔

جگر مرادابادی

حالاتِ زندگی علی سکندر نام، جگر تخلص۔ ۱۸۹۰ء میں مرادآباد میں پیدا ہوئے۔ والد علی نظر نظر صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ مورثِ اعلیٰ مولوی محمد سمیع دہلی کے رہنے والے اور شہنشاہ شاہجہان کے استاد تھے۔ عتابِ شاہی کے باعث ترکِ وطن کر کے مرادآباد میں آباد ہو گئے۔

جگر کی ابتدائی تعلیم غیر مستقل طور پر ہوئی۔ فارسی کی چند ابتدائی کتابیں پڑھیں پھر میٹرک تک انگریزی سیکھی۔ البتہ شاعری کا ذوق ورثے میں پایا۔ ابتدائی کلام پر داغ کا رنگ غالب ہے۔ جگر ایک عرصے تک بے تحاشا شراب نوشی کرتے رہے لیکن فطرتاً نیک اور سلیم الطبع تھے اس لئے بعد میں مکمل طور پر توبہ کر لی۔ حج کیا اور مدینہ منورہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان

میں بہت سی نعتیں بھی کہیں۔ دینداری کو عملاً اختیار کئے رکھا۔

حضرت جگر درویش منش اور منکسر المزاج انسان تھے۔ اور شریف النفس اور خود دار تھے۔ اعلیٰ سیرت کے مالک تھے۔ شراب پی کر بھی کبھی بکواس نہ کی۔ سادہ مزاج تھے طبیعت میں بھولپن اور بچوں کی سی معصومیت تھی۔ سنجیدگی وقار کو ہمیشہ قائم رکھا اور پھپھورے پن سے کامل اجتناب کیا۔ ان کے کلام کے تین مجموعے داغ جگر، شعلہ طور اور "آتش گل" شائع ہو چکے ہیں۔ جنہوں نے اردو غزل میں خاص مقام حاصل کر لیا ہے اور سخن فہم حلقوں سے خراج تحسین وصول کیا ہے۔

خصوصیات کلام

جگر عہد حاضر کے بڑے ہی کامیاب غزل گو ہیں۔ ان کی غزل قدیم رنگ تغزل اور موجودہ رنگین نگاری کا خوبصورت ملا جلا نمونہ ہے، جس میں میر کا سوز، غالب کا تفکر، مومن کی رنگینی اور داغ کی زبان کا رنگ بہت ستھرے اور جامع الفاظ میں یکجا ہو گئے ہیں۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی بدولت حسرت، فانی اور اصغر کے ساتھ ساتھ جگر بھی افق شعر پر چاند بن کر جگمگائے ہیں اور نقاد مجبور ہو گئے ہیں کہ ان چاروں کو عصر حاضر میں اردو غزل کے "عناصر اربعہ" قرار دیں۔ ان کی غزل کی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:

جگر بنیادی طور پر حسن و عشق کے شاعر ہیں۔ ان کا تصور حسن و عشق زندہ اور حقیقی نظر آتا ہے۔ وہ ایسے عشقیہ شاعر ہیں جن کا محبوب شاعری کی عام روایت کے مطابق سنگدل اور ستم پیشہ نہیں۔ وہ جفا کرتا ہے مگر رحم سے خالی نہیں ؎

کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا — دل کچھ اس صورت سے تڑپا ان کو پیار آ ہی گیا
اب نظر کو بھی نہیں دم بھر قرار — اس نے بھی انداز دل پیدا کیا

اٹھتے ہیں تیری راہ میں جب سے میرے قدم
احساس قرب و دوری منزل نہیں رہا

۲۔ جگر کے ہاں قنوطیت نام کو نہیں، امید و بیم ہمیشہ اس کے ہمرکاب رہتی ہے ؎

مجھے تھا شکوۂ ہجراں بدہ ہوا محسوس
مرے قریب سے ہو کر وہ ناگہاں گزرے

؎ وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں، وہ پھر رہے ہیں، یہ آ رہے ہیں، وہ جا رہے ہیں

۳۔ جگرؔ جذبۂ عشق سے بذاتہٖ محبت کرتے ہیں۔ اور اس کے غم کو نہایت عزیز رکھتے ہیں۔ چونکہ اُن کا عشق پاکیزہ اور جذبہ صادق ہے اس لئے یہ بات عین فطری ہے ؎

اب اُن کا کیا بھروسہ وہ آئیں یا نہ آئیں
آ، اے غمِ محبت تجھ کو گلے لگائیں
عشق کو مطمئن نہ کر کہ حسن سے استوار پر
وہ تجھے آزما چکا تو اُسے آزمائے جا

۴۔ عشق سے بھی محبت اور گہری وابستگی ایسا انداز پیدا کرتی ہے کہ بعض اوقات مجازی حُسن میں حُسنِ حقیقی کی جھلک نظر آنے لگتی ہے ؎

وہی ہے عشق، وہی حُسن ہے، وہی سب کچھ
مگر کسی سے کسی کا جواب ہو نہ سکا
جلے جاتے ہیں بڑھ بڑھ کر مٹے جاتے ہیں گو گر کے
حضورِ شمع پروانوں کی نادانی نہیں جاتی

۵۔ جگرؔ کا تعلق اس متوسط مسلمان طبقے سے تھا جس کو ماضی سے محبت تھی۔ اور وہ وضعداری اور تہذیب و شائستگی پر جان دیتا تھا۔ بعد میں تو وہ دینی رنگ میں رنگ گئے تھے اور اس امر نے بھی ان کی شاعری کو متاثر کیا تھا۔ چنانچہ ان کے ہاں اخلاقی قدروں کا گہرا شعور ملتا ہے ؎

کریں گے مر کے بقائے دوام کیا حاصل
جو زندہ رہ کے مقامِ حیات پا نہ سکے
جہلِ خرد نے دن یہ دکھائے
گھٹ گئے انسان بڑھ گئے سائے

۶۔ جگرؔ اگرچہ درویش منش انسان تھے اور سیاسیات سے بے تعلق تھے، مگر تقسیم ہند کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں نے جو سلوک روا رکھا، اس نے اُن کے دل پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں اور اس کا ذکر انہوں نے جابجا کیا ہے مگر مایوسی کا اظہار یہاں بھی نظر نہیں آتا۔ اُمید و یقین افروزی کی کیفیت اُن کے ہاں برابر دکھائی دیتی ہے ؎

یہ صحن و چمن یہ غنچہ و گل ہونے دو جو ویراں ہوتے ہیں
تخریبِ جنوں کے پردے میں تعمیرِ گلستاں ہوتے ہیں
یہ خون جو ہے مظلوموں کا ضائع تو نہ جائے گا لیکن
کتنے وہ مبارک قطرے ہیں جو صرفِ بہاراں ہوتے ہیں

۷۔ فنی نقطۂ نظر سے جگرؔ کی غزل تغزل کی تمام تر خوبیوں سے آراستہ ہے۔ زبان کوثر و تسنیم میں دُھلی ہوئی اور بحریں مترنم ہیں جو مشاعروں کو لوٹ لیتی ہیں ؎

وہ یوں دل سے گزرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں ہوتی
وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی
میں وہ صاف ہی نہ کہہ دوں جو ہے فرق تجھ میں مجھ میں
تیرا درد دردِ تنہا، میرا غم غمِ زمانہ۔

غزل نمبر ۱

۱۔ غم سے چھوٹوں تو ادھر دیکھوں میں دل کو روؤں تو جگر دیکھوں میں

تشریح: ذاتی اور اجتماعی غموں نے اس طرح مجھے گھیر رکھا ہے اور دل و جگر کو اس طرح زخمی بنا دیا ہے کہ میں دونوں کی ٹھیک طرح سے خبر گیری بھی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ جسے قومی صدموں سے (کہ دل جن کا مرکز ہوتا ہے) چھٹکارا پاؤں تو پھر ذاتی غموں کی طرف توجہ دے سکوں گا، جگر کا تعلق ذاتی غموں سے بھی ہو سکتا ہے اور یہ شاعر کا مخلص بھی ہے۔ یوں یہاں ایہام صورت ایہام پیدا ہو گیا ہے۔

۲۔ آشیاں کے جو اٹھا لوں تنکے اپنے ٹوٹے ہوئے پر دیکھوں میں

مشکلات: آشیاں: گھونسلہ۔

تشریح: یوں لگتا ہے یہ ساری غزل ہندوستان میں مسلمانوں کی تباہ حالی کا نوحہ ہے۔ چنانچہ اس شعر میں بھی استعارے کی زبان سے ایسی ہی بات کا اظہار ملتا ہے کہ شکاری نے میرا گھونسلہ بھی تباہ کر دیا ہے اور میرے پر بھی توڑ دیئے ہیں۔ اب پہلے میں گھونسلے کی بکھری ہوئی تیلیوں کو اکٹھا کروں گا، گھونسلہ دوبارہ بنانے کی کوشش کروں گا، تب کہیں مجھے فرصت ملے گی کہ اپنے ٹوٹے ہوئے پروں اور زخمی بدن کی طرف توجہ دے سکوں۔

۳۔ داغ ہی داغ نظر آتے ہیں کس طرح قلب و جگر دیکھوں میں

مشکلات: داغ۔ زخم۔

تشریح: میرا دل اور جگر دونوں اس قدر زخمی ہیں (اور یہ زخم اپنوں اور بیگانوں سب نے لگائے ہیں) کہ میں ان کی طرف نظر بھر کے دیکھنے کا حوصلہ بھی نہیں رکھتا۔

۴۔ دم گھٹا جاتا ہے اے دشتِ جنوں چاکِ دامانِ سحر، دیکھوں میں

مشکلات: دشتِ جنوں: ایسا جنگل جس میں دیوانے اور سودائی لوگ یعنی عاشق پھرتے رہتے ہیں۔ چاکِ دامانِ سحر۔ صبح کے دامن کا شگاف یعنی روشنی کی کرن۔

تشریح! میری زندگی ایک ایسے صحرا یا جنگل کی مانند ہے جس میں ہر طرف گھپ اندھیرا ہے اور اس میں مجھے دیوانوں اور پاگلوں کی مانند بے مقصد آوارہ گردی کرنی پڑ رہی ہے کاش میں صبح کی کوئی کرن نمودار ہوتے ہوئے دیکھ سکوں۔

۵۔ زندہ محفل ہے نہ وہ پروانے خاک اے شمعِ سحر! دیکھوں میں

مشکلات! شمعِ سحر! صبح کے وقت جلنے والی شمع۔

تشریح! شاعر یہاں پرانی محفلوں کے اجڑنے اور دوستوں کے بچھڑنے کا ماتم کر رہا ہے اور شمع سے مخاطب ہو کہتا ہے کہ نہ وہ محفل ہے اور نہ شمعِ محفل پر مرمٹنے والے پروانے ہیں، اس صورت میں میں یہاں دیکھوں تو کیا دیکھوں دوستوں کے بغیر میری دنیا ویران ہو گئی ہے۔

۶۔ دل دیوانہ یہ قسمت میری کر تجھے خاک بسر دیکھوں میں!

مشکلات! خاک بسر۔ مٹی میں سر ہونا یعنی تباہ حال، پریشان۔

تشریح! اے میرے دیوانے، سودائی دل افسوس ہے صد ہزار میری قسمت میں لکھا تھا کہ میں تجھے پریشان اور تباہ حال دیکھوں۔ کاش میں تیری پریشانیوں کا کوئی مداوا کر سکتا۔

۶۔ چھوٹ جاؤں جو غمِ ہستی سے بھول کر بھی نہ ادھر دیکھوں میں

مشکلات! غمِ ہستی: زندگی کا دکھ یا غم۔

تشریح! شاعر زندگی کے دکھوں اور صدموں سے اتنا بیزار ہے کہ تنگ آ کر پکار اٹھتا ہے کہ اگر میں زندگی کی مصیبتوں اور غموں سے نجات پا کر آخرت کو سدھار جاؤں تو میں بھول کر بھی اس کم بخت دنیا کا خیال دل میں نہ لاؤں گا۔

غزل نمبر ۲

یہ ساری کی ساری غزل نعتیہ ہے۔ جگر صاحب سرورِ کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح و تحسین فرما رہے ہیں۔

۱۔ قدرت کی آن والے، رحمت کی شان والے تجھ پہ جہاں تصدق او پاک جان والے

مشکلات! آن: شان۔ عزت۔

تشریح! شاعر آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے کہہ رہا ہے کہ آپ کے اخلاق، اعمال اور کارناموں سے اللہ تعالیٰ کی شان و شوکت کا ظہور ہوا اور خود اللہ کو آپ

کی ذات اور صفات پر ناز ہے۔ آپ دوستوں، دشمنوں اور سب مخلوقات کے لیے سراسر رحمت ہیں اور چونکہ ساری زندگی مبارک تقدس اور پاکیزگی کا جیتا جاگتا نمونہ رہے اس لئے سارا جہاں آپ پر قربان ہونے کو تیار ہے یا ہمارا جی چاہتا ہے کہ سارے جہان کو آپ پر نثار کر دیں۔

۲۔ دونوں جہاں کی نعمتیں ہیں جن کی ۔ بوسیدہ کپڑوں والے ٹوٹے مکان والے

مشکلات: بوسیدہ: پرانے۔

تشریح: حضورؐ اگرچہ آپ بے حد سادہ زندگی گزارتے تھے۔ آپ کا لباس پرانا اور سستا ہوتا تھا اور رہنے معمولی سے حجرے میں رہتے تھے جس پر کھجور کے پتوں کی چھت پڑی ہوئی تھی۔ مگر آپ کے اختیار اور اقتدار کا یہ عالم ہے کہ سارے جہانوں کی نعمتیں آپ کے قبضے میں ہیں۔ اور آپ کی خواہش تب دو جہاں خدا پوری کرتا ہے۔

۳۔ یہ تھے آپ اُمّی کھولی زبان جس دم ۔ دم بھر میں بے زبان تھے سب زبان والے

مشکلات: اُمّی: ان پڑھ ۔ بے زبان ۔ جو بول نہ سکتا ہو۔

تشریح: حضورؐ اگرچہ آپ پڑھے لکھے نہ تھے اور اگرچہ آپ نے اس سلسلے میں کسی انسان سے استفادہ نہ کیا تھا مگر آپ کی علمی معلومات، فصاحت و بلاغت اور جادو بیانی کا یہ عالم تھا کہ جب آپ خطابت کے لیے کھڑے ہوتے تو عالموں فاضلوں کی زبانیں بھی حیرت سے گنگ ہو جاتیں یا بڑے بڑے فلسفی اور علامہ قسم کے لوگ بھی آپ کے علمی معجزات کے سامنے خاموش اور عاجز ہیں۔

۴۔ اِک جنبشِ نگہ کے سب منتظر کھڑے ہیں ۔ پُر درد قلب والے پُر سوز جان والے

مشکلات: جنبشِ نگہ: آنکھ کا اشارہ۔ حکم ۔ منتظر: انتظار کرنے والے ۔ پر درد قلب والے ایسے لوگ جن کے دلوں میں نوعِ انساں کا درد ہے ۔ پر سوز جان والے: غم خوار دردمند۔

تشریح: شاعر انسانیت کے اخلاقی و روحانی زوال اور اُمتِ مسلمہ کی تباہی و خستہ حالی پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ حضورؐ اب حالت بہت خراب ہوتی جا رہی ہے اور وہ لوگ جو اس پر پریشان اور غمزدہ ہیں۔ بڑی بے تابی سے آپ کا ایسا حکم ہونے کے انتظار میں ہیں، جو انسانیت اور مسلمانوں کی قسمت سنوار ڈالے۔

نظیر اکبر آبادی

۱۷۴۰ء ——— ۱۸۳۰ء

حالاتِ زندگی

نظیر ۱۷۴۰ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام ولی محمد تھا۔ نظیر تخلص کرتے تھے۔ والد کا نام سید محمد فاروق تھا۔

نظیر کا بچپن بڑے لاڈ میں گزرا کیونکہ وہ والدین کی واحد زندہ اولاد تھے۔ ان سے پہلے نظیر کے بارہ بھائی بہن فوت ہو چکے تھے۔ روایت ہے کہ کسی فقیر نے نظیر کے لیے خصوصی دعا کی تھی۔ اس لیے نظرِ بد سے محفوظ رہے۔ ان کے والدین نے انھیں نظرِ بد سے بچانے کے لیے اُن کے کان اور ناک چھید کر ان کی شکل بالکل لڑکیوں کی سی بنا دی تھی۔

نظیر کے زمانے کے حالات بہت خراب تھے وہ بیس سال کے تھے کہ والدہ اور نانی کے ساتھ ہجرت کر کے آگرہ چلے گئے۔ آگرہ کا قدیم نام اکبر آباد تھا۔ اس لیے اکبر آبادی کہلانے لگے۔ قدیم طرز کی تعلیم وہیں حاصل کی۔ لڑکپن ہی سے انہیں میلوں ٹھیلوں اور تقریبات میں شرکت کا بے حد شوق تھا۔ ان کی شاعری سے اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

وہ حصولِ تعلیم کی طرف کما حقہٗ توجہ نہ کر سکے۔ اس لیے تعلیم ادھوری رہ گئی۔ البتہ فارسی میں انہوں نے خوب مہارت پیدا کر لی۔ نظیر ایک ذہین انسان تھے۔ اس لیے ذاتی مطالعے سے انہوں نے اپنے علم میں وسعت اور گہرائی پیدا کر لی۔ انہوں نے معلمی کو کاروبارِ حیات کے طور پر اپنایا اور طویل عرصے تک درس و تدریس کے مقدس کام میں مشغول رہے۔

آخری عمر میں آپ پر فالج گرا اور ۱۸۳۰ء میں فوت ہو گئے۔

نظیر اکبر آبادی کی شاعری

نظیر اکبر آبادی کے زمانے میں غزل، مثنوی اور قصیدہ اہم اصناف سخن سمجھی جاتی تھیں۔ لیکن انہوں نے زمانہ کی عام روش سے ہٹ کر نظم نگاری کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور اس طرح اپنے لیے ایک علیحدہ راستہ منتخب کیا جس کی وجہ سے وہ اُردو شاعری کی تاریخ میں ایک منفرد اور بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری کی نمایاں خصوصیات حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ **عوامیت:۔** نظیر طبقۂ عوام سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے شاعری کی تاریخ

میں پہلی مرتبہ ایسے موضوعات پر طبع آزمائی کی۔ جو سماج کے نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کے بارے میں کچھ کہنا گھٹیا پن خیال کیا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے ان کی شاعری کو بازاری اور عامیانہ سمجھا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے شعروں میں عوامی زندگی کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔ ان کی شاعری کا کینوس ہم عصر شعراء کی نسبت کہیں زیادہ وسیع ہے۔ انہوں نے عوامی تہواروں اور میلوں اور عام لوگوں کی پسند کی چیزوں مثلاً تربوز، تل کے لڈو اور مٹی کے گورے برتنوں جیسے موضوعات پر نظمیں لکھیں اور عوام کی معاشی بدحالی، افلاس اور غربت کا نقشہ کھینچا۔ ان کی شاعری کا لہجہ اور اسلوب اور الفاظ و تراکیب کا انتخاب بھی عوامی سطح کا ہے اس وجہ سے شیفتہ نے ان کی زبان کو بازاری اور سوقیانہ قرار دیا ہے۔

۲۔ مقامیت :- نظیر کی شاعری کا ہندوستانی سماج سے گہرا تعلق ہے۔ وہ پہلے شاعر ہیں۔ جن کی شاعری کو پڑھ کر ہندوستان کے رسم و رواج عام سماجی اور معاشی حالات اور معاشرت، مذہبی تہواروں، موسموں اور مقامی روایات سے گہری واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ ہولی، دیوالی، شب برات، برسات کی بہاریں اس بات کا واضح ثبوت ہیں۔ مزید برآں ان کی تشبیہات اور تلمیحات میں بھی مقامی رنگ پایا جاتا ہے۔ مقامی عناصر کی کثرت نے نظیر کی شاعری کو زبردست مقبولیت بخشی۔

۳۔ سیاسی اور سماجی حالات کی ترجمانی :- نظیر نے ایسے دور میں آنکھ کھولی جب سیاسی انقلابات کے نتیجے میں سیاسی، سماجی، معاشی ابتری زوروں پر تھی۔ علم و تہذیب کا مرکز دہلی تباہ ہو چکا تھا۔ مغلوں کی قوت و طاقت کھوکھلی ہو چکی تھی اور پورے ملک میں ایک المناک ڈرامہ کھیلا جا رہا تھا۔ ہر طرف قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ شہر اور قصبے تباہ و برباد ہو چکے تھے علوم و فنون کے ماہر بیکاری کے ہاتھوں نالاں تھے اور معاشی بدحالی کے سبب عوام کی اخلاقی حالت بہت پست ہو گئی تھی۔ نظیر کی مختلف نظموں میں اپنے دور کے سیاسی و سماجی اور معاشی حالات کا گہرا مشاہدہ ملتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی طویل نظم "شہر آشوب" قابل ذکر ہے۔ عوام کی معاشی بدحالی پر بھی انہوں نے بہت سی نظمیں لکھیں مثلاً پیسے کی فلاسفی، چپاتی، آٹے دال کا بھاؤ روٹیاں اور مفلسی وغیرہ۔

۴۔ دردمندی :- نظیر کے موضوعات اور ان کا اسلوب اس بات کا ثبوت پیش

کرتا ہے کہ انھیں عام لوگوں، ان کے دکھوں اور ان کی تکالیف کا احساس ہے اور ان کی معاشی بدحالیوں میں وہ بھی برابر کے شریک ہیں۔ ان کے ہاں انسانی ہمدردی سوز و گداز اور دردمندی کا رجحان موجود ہے وہ مظلوم انسان کے دکھ درد میں خود شریک ہو کر اس کے لیے باعث تقویت بنتے ہیں۔ ان کی معروف نظم "آدمی نامہ" انسان کے بارے میں ان کے دردمندانہ رویے کا واضح ثبوت ہے۔

۵۔ اخلاق و حکمت:- ان کی بہت سی نظمیں اخلاقی موضوعات سے متعلق ہیں وہ طرح طرح کے واقعات اور مثالیں بیان کر کے ان کے اخلاقی نتائج اخذ کرتے ہیں، مگر ان کی نصیحت کا انداز بالواسطہ ہوتا ہے۔ تصوف کے مسائل کو بھی انہوں نے اپنا موضوع بنایا ہے موت، بے ثباتی دنیا، ترک دنیا، قناعت وغیرہ پر انہوں نے بہت سی نظمیں لکھی ہیں۔ ایسی نظموں میں "موت" "بنجارہ" "کل نفس ذائقۃ الموت" "پھر کیا" "انجام" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ع جو خاک سے بنا ہے، آخر کو خاک ہے
ع سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائیگا، جب لاد چلے گا بنجارہ
ع میاں ایک دن وہ آئے گا، نہ تم ہو گے نہ ہم ہوں گے

الفاظ کی تکرار سے وہ تاثر میں شدت پیدا کرتے ہیں۔

۶۔ خوش طبعی اور ظرافت:- اخلاقی اور سنجیدہ موضوعات پر لکھنے کے باوجود خوش طبعی، خوش باشی اور ظرافت نظیر کی شاعری کا بنیادی عنصر ہے وہ خود ایک زندہ دل آدمی تھے اس لیے پوری شاعری میں شگفتگی کی ایک لہر موجود ہے۔ سنجیدہ اور تلخ باتوں کا ذکر کرتے ہوئے بھی وہ اپنی خوش مزاجی کی بدولت اس چیز کے نشاط انگیز پہلو کا ذکر کر کے قاری کے لیے ہنسی کا سامان پیدا کر دیتے ہیں۔

۷۔ مرقع نگاری:- نظیر ہندوستان کے مختلف میلوں ٹھیلوں، جلسے، جلوسوں اور تہواروں میں خود شریک ہوتے تھے۔ چنانچہ ان کی نظموں میں منظر نگاری اور مصوری کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ نظیر کی معلومات اور تجربہ وسیع اور مشاہدہ بہت گہرا تھا ان کے موضوعات میں تنوع تھا۔ اس لیے انہوں نے برسات کی بہاریں دیوالی اور آگرے کی تیراکی کے نظیر مرقعے پیش کیے ہیں۔ اور منظر کو پوری جزئیات سمیت ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ مجنوں گورکھپوری

نے نظیر کو مرقع نگاری کے مشہور انگریزی شاعر CHAUCER کا ہم پایہ ٹھہرایا ہے

۸- وسعتِ زبان و بیان:- چونکہ نظیر کی شاعری کے موضوعات متنوع ہیں اس لیے ان کی زبان کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے۔ غالباً انیس کے سوا اس میدان میں ان کا اور کوئی مدمقابل نہیں۔ انہوں نے عامیانہ الفاظ بھی شاعری میں استعمال کیے مگر نظیر الفاظ کے انتخاب میں موزونیت اور مناسبت کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں مثلاً پرسکون مناظر کے لیے نرم و سبک الفاظ استعمال کرتے ہیں ایک جگہ مہادیو کی شادی کے منظر میں جو الفاظ استعمال کیے ہیں ان کا صوتی تاثر پڑھنے والے کے دل میں ایک خوشی اور ولولہ پیدا کر دیتا ہے۔

۹- صوتی حسن اور نغمگی:- نظیر کی نظموں میں مناسب الفاظ اور بحروں کے انتخاب کے سبب نغمگی اور موسیقی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ الفاظ کی تکرار سے بھی یہ کیفیت پیدا کی گئی ہے۔ ان کی نظموں کے بہت سے موضوعات ہندوؤں کے تہواروں سے متعلق ہیں۔ جن کا ایک عنصر گانا بجانا ہوتا ہے ایسی نظموں کے ترنم میں ایک طرب انگیز موسیقی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے ان کی اکثر نظمیں گانے بجانے کے مواقع کے لیے موزوں ہیں۔ ان کی تشبیہات میں بھی جدت اور ندرت ہے اور انہوں نے مختلف چیزوں اور تفصیلات کے بیان میں اپنی قادرالکلامی کا ثبوت دیا ہے۔

آدمی نامہ

تعارف:- نظیر کی نظم "آدمی نامہ" دراصل ایک مخمس ہے۔ مخمس وہ نظم ہوتی ہے جس کا ہر بند پانچ مصرعوں پر مشتمل ہو۔ جس کے پہلے دو شعر تو ہم ردیف ہوتے ہیں، مگر پانچواں مصرع ان سے مختلف ہوتا ہے اور یہ عموماً ایک ہی خیال کو دہراتا رہتا ہے جس کا مقصد تاثر میں شدت پیدا کرنا ہوتا ہے۔

مرکزی خیال:- اس نظم میں شاعر نے اُس افسوسناک ناہمواری اور عدم مساوات کو بیان کیا اور اس پر طنز بھی کی ہے، جو انسانوں نے اپنے ہی ہم جنسوں کے درمیان پیدا کر رکھی ہے۔ شاعر نے آدمیوں کی مختلف "اقسام" کو دلچسپ اور خوبصورت عوامی انداز میں بیان کیا ہے۔

نظم کی تشریح

دنیا میں بادشہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار، بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مشکلات :۔ مفلس۔ غریب گدا۔ بھکاری زردار۔ امیر، مالدار۔ بے نوا۔ بے کس۔ نعمت۔ اچھے کھانے۔

تشریح :۔ جو شخص بادشاہ ہے اور عیش و عشرت سے زندگی گزارتا ہے وہ بھی آدمی ہے۔ اس کے مقابلے میں وہ بھی آدمی ہے جو بہت غریب ہے، اور بھیک مانگ کر دن پورے کرتا ہے۔ یوں مالدار اور بے کس دونوں آدمی ہیں حالانکہ دونوں کی حالت میں بہت فرق ہے۔ پھر وہ شخص بھی آدمی ہے جو اچھے اچھے کھانے کھاتا ہے اور وہ بھی آدمی ہے جو بے چارہ ایک ایک دروازے پر جا کر روٹیوں کے ٹکڑے جمع کرتا اور پانی میں بھگو کر اپنے بچوں کو کھلاتا ہے۔ اس بند میں بعض باتوں کی تکرار ملتی ہے جو نظیر کا خاص اسلوب ہے۔

۲ — ابدال و قطب، غوث ولی آدمی ہوئے
منکر بھی آدمی ہوئے اور کفر کے بھرے
کیا کیا کرشمے کشف و کرامات نے کئے
حتیٰ کہ اپنے زہد و ریاضت کے زور سے
خالق سے جا ملا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مشکلات :۔ ابدال، قطب، غوث، ولی :۔ اسلامی تصوف میں روحانی طور پر بہت زیادہ ترقی کر جانے والے بزرگوں کے مختلف درجے۔ بہت نیک، پرہیزگار لوگ۔ منکر۔ خدا کا انکار کرنے والے۔ کرشمے۔ عجیب بات۔ کشف و کرامات۔ ایسی باتیں جو عام معمول کے خلاف ہوں۔ زہد و ریاضت :۔ عبادت، تقویٰ خالق۔ پیدا کرنے والا۔ اللہ تعالیٰ

تشریح :۔ وہ لوگ بھی انسان ہیں جو اپنی عبادت گزاری اور تقوے کی وجہ سے ابدال، قطب اور غوث و ولی ہو جاتے ہیں اور اللہ کے بہت ہی مقرب ہو جاتے ہیں اور

وہ لوگ بھی انسان ہیں جو خدا کا انکار کرتے ہیں اور کفر میں ڈوبے رہتے ہیں۔ بات کو دہراتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ غوث قطب جیسے بزرگ اپنی کرامتوں سے نئے نئے انہونے کام کرتے ہیں اور وہ اپنے تقوے اور عبادت کی وجہ سے اللہ کے بہت قریب ہو جاتے ہیں۔

۳۔ فرعون نے کیا تھا جو دعویٰ خدائی کا
شداد بھی بہشت بنا کر ہوا خدا
نمرود بھی خدا ہی کہلاتا تھا بر ملا
یہ بات ہے سمجھنے کی آگے کہوں میں کیا
یاں تک جو ہو چکا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مشکلات: فرعون۔ مصر کا بادشاہ جس نے خدائی کا دعویٰ کیا اور آخر کار پانی میں ڈوب کر مر گیا۔ شداد۔ یمن کا بادشاہ۔ اس نے خدائی کا دعویٰ کیا۔ اور ایک مصنوعی جنت بنا ڈالی، مگر اُس میں داخل ہونے سے قبل ہی اچانک مر گیا۔ نمرود۔ عراق کا بادشاہ۔ اس نے بھی خدا ہونے کا دعویٰ کیا۔ اس کے نتھنوں کے راستے دماغ میں ایک مچھر گھس گیا جس کے اثر سے یہ ذلت کی موت مرا۔ بر ملا۔ اعلانیہ۔

تشریح: فرعون، شداد اور نمرود کی طرح کے بھی آدمی ہوتے ہیں جو نہ صرف خدا کا انکار کرتے ہیں، بلکہ خود ہی خدا بن بیٹھتے ہیں اور مصنوعی جنت تک بنا لیتے ہیں۔ یہ باتیں غور و فکر کے قابل ہیں، مختصراً یہ سمجھ لو کہ وہ بھی انسان ہیں جو اپنے تقوے اور پرہیزگاری سے خدا کے قریب ہو جاتے ہیں۔ اور وہ بھی انسان ہیں جو بغاوت میں اتنی دور پہنچ جاتے ہیں کہ خود ہی خدا بن بیٹھتے ہیں۔

۴۔ یاں آدمی ہی نار ہے اور آدمی ہی نور
یاں آدمی ہی پاس ہے اور آدمی ہی دور
کل آدمی کا حسن و قبح میں ہے یاں ظہور
شیطان بھی آدمی ہے جو کرتا ہے مکر و زور
اور ہادی، رہنما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

نار۔ آگ نور۔ روشنی۔ حسن و قبح۔ نیکی بدی مکر و زور۔ دھوکا فریب جھوٹ۔

تشریح: یہاں آدمی دوسرے انسانوں کے لیے آگ یعنی عذاب اور مصیبت کا باعث بن جاتے ہیں اور وہ بھی آدمی ہیں جو دوسرے لوگوں کے لیے اجالا یا رہنمائی کا سبب بنتے ہیں۔ یہاں نیکی اور بدی دونوں میں آدمی ہی اپنے کارناموں کا

مظاہرہ کرتا ہے۔ اور یہ آدمی ہے جو دوسرے انسانوں سے دھوکا فریب کرتا ہے اور جھوٹ سے کام لیتا ہے اور اس کے مقابلے میں وہ بھی آدمی ہے جو دوسروں کی نیکی اور پارسائی کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

۵۔ مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں
بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآن اور نماز یاں
اور آدمی ہی ان کی چراتے ہیں جوتیاں
جو اُن کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مشکلات:۔ خطبہ خواں ۔ خطیب، تقریر کرنے والا۔ تاڑنا ۔ پہچاننا۔ ڈانٹنا۔ مارنا۔

تشریح:۔ انسان ہی مسجدیں بناتے اور انسان ہی ان میں امامت کراتے، خطبہ دیتے اور قرآن و نماز پڑھتے ہیں۔ اور پھر وہ بھی انسان ہیں جو ان کے جوتے چوری کرتے ہیں اور وہ بھی انسان ہیں جو جوتا چور کو پہچان لیتا اور اس کی مرمت کرتا ہے۔

۶۔ یاں آدمی پہ جان کو وارے ہے آدمی
اور آدمی کو تیغ سے مارے ہے آدمی
پگڑی بھی آدمی کی اتارے ہے آدمی
چلّا کے آدمی کو پکارے ہے آدمی
اور سُن کے دوڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مشکلات:۔ جان وارنا ۔ جان قربان کرنا، تیغ ۔ تلوار ۔ پگڑی اتارنا ۔ ذلیل کرنا۔

تشریح:۔ یہاں ایسے مخلص اور ایثار پیشہ آدمی بھی ہیں جو اپنی زندگی تک دوسروں پر قربان کر دیتے ہیں جبکہ اس کے مقابلے میں ایسے ظالم انسان بھی ہیں جو انسانوں کو قتل کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ پھر وہ بھی انسان ہیں جو دوسرے انسانوں کو ذلیل کرتے اور ان پر رعب اور حکم جھاڑتے ہیں اور وہ بھی بے چارے انسان ہیں جو اس حکم پر دیوانہ وار لپکتے ہیں

۷۔ چلتا ہے آدمی ہی مسافر ہو، لے کے مال۔
اور آدمی ہی مارے ہے پھانسی گلے میں ڈال
یاں آدمی ہی صید ہے اور آدمی ہی جال
سچا بھی آدمی ہی نکلتا ہے میرے لال
اور جھوٹ کا بھرا ہے سو ہے وہ آدمی

مشکلات :۔ صید ، شکار میرے لال ۔ میرے پیارے ۔

تشریح :۔ یہاں جو شخص روپے پیسے کے ساتھ سفر پر نکلتا ہے وہ بھی آدمی ہے اور جو ڈاکو اس کو لوٹ لیتا اور گلے میں پھندا ڈال کر اُسے مار ڈالتا ہے وہ بھی آدمی ہے ۔ اس طرح گویا شکار بھی آدمی ہے اور شکاری بھی آدمی ۔ دوسری طرف وہ بھی آدمی ہے جو سچ بولتا اور سچائی کا علمبردار ہے اور وہ بھی جو جھوٹ میں غرق ہے ۔

۸۔ یاں آدمی نقیب ہو بولے ہے بار بار
اور آدمی ہی پیادے ہیں اور آدمی سوار
حقہ ، صراحی ، جوتیاں دوڑیں بغل میں مار
کاندھے پر رکھ کے پالکی ہیں آدمی کہار
اور اس پر جو چڑھا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مشکلات :۔ نقیب ۔ بادشاہ کی سواری کے آگے آواز دینے والا ، کہار ۔ پالکی کو اٹھا کر چلنے والے ۔

تشریح :۔ جو شخص پالکی میں بیٹھا مزے سے سفر کر رہا ہے وہ بھی آدمی ہے جب کہ اس کی پالکی اٹھانے والے ، پالکی کے ساتھ ساتھ دوڑنے ، اس کی حفاظت کرنے والے اور ہٹو بچو کا شور مچانے والے بھی آدمی ہیں ۔

۹۔ بیٹھے ہیں آدمی ہی دکانیں لگا لگا
اور آدمی ہی پھرتے ہیں رکھ سر پہ خوانچا
کہتا ہے کوئی لو کوئی کہتا ہے لا رے لا
کس کس طرح سے بیچتے ہیں چیزیں بنا بنا
اور مول لے رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مشکلات :۔ خوانچا = چھابڑی ۔

تشریح :۔ یہاں ایسے لوگ بھی ہیں جن کی ایک جگہ مستقل دکانیں ہوتی ہیں ، مگر ایسے بے چارے بھی ہیں جو غریب ہیں ۔ اُن کی دکانیں نہیں ہوتیں اور چھابڑی سر پر رکھ کر چل پھر کے سودا بیچتے ہیں ۔ پھر سودا بیچنے والے اور خریدنے والے دونوں انسان ہیں جو سودا خریدتے اور بیچتے وقت مختلف آوازیں دیتے ہیں ۔

۱۰۔ یہاں آدمی ہی لعل و جواہر ہیں بے بہا
اور آدمی ہی خاک سے بدتر ہے ہو گیا

کالا بھی آدمی ہے کہ اُلٹا ہے جوں توا
گورا بھی آدمی ہے کہ ٹکڑا ہے چاند کا
بدشکل و بدنما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مشکلات: لعل و جواہر۔ قیمتی چمکدار موتی۔ خاک سے بدتر ہونا۔ مٹی کی طرح بے کار ہونا۔ چاند کا ٹکڑا۔ بہت خوبصورت۔

تشریح: وہ بھی انسان ہیں جو سچے موتیوں کی طرح قیمتی ہوتے اور لوگ ان کی بے حد قدر کرتے ہیں جبکہ وہ بھی انسان ہے جو مٹی سے بھی زیادہ حقیر اور بے وقعت ہوتا ہے۔ پھر وہ بھی انسان ہے جس کا رنگ گہرا سیاہ ہوتا ہے اور وہ بھی جو حسن و خوبصورتی میں چاند کا ٹکڑا نظر آتا ہے اور وہ بے چارہ بھی انسان ہی ہے جو بہت بدصورت اور غیر دلکش ہوتا ہے۔

۱۱۔ اِک آدمی ہیں جن کے یہ کچھ زرق برق ہیں
روپے کے اُن کے پاؤں ہیں سونے کے فرق ہیں
جھگے تمام غرب سے لے تا بہ شرق ہیں،
کم خواب، تاش، شال دوشالوں میں غرق ہیں
اور چیتھڑے لگا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مشکلات: زرق برق۔ شان و شوکت۔ چمک دمک۔ روپے۔ چاندی فرق۔ ماتھا۔ جھگے۔ ایک زیور کا نام، مغرب سے لے تا بہ شرق۔ مغرب سے مشرق تک کم خواب۔ قیمتی ریشمی کپڑا۔ تاش۔ ریشمی زری کا کپڑا۔ زربفت۔ شال دوشالے۔ قیمتی ریشمی گرم چادریں چیتھڑے۔ پھٹا پرانا لباس۔ ٹکڑے۔

تشریح: کچھ ایسے انسان بھی ہیں جو بڑی شان و شوکت سے زندگی گزارتے ہیں اور انہوں نے سونے چاندی کے اتنے زیورات پہنے ہوتے ہیں یوں لگتا ہے گویا اُن کے پاؤں چاندی کے اور سر سونے کا بنا ہوا ہے۔ اُن کے تمام جسم پر زیورات جگمگ جگمگ کر رہے ہوتے ہیں اور بدن پر نہایت قیمتی ریشمی کپڑے اور بیش قیمت چادریں زیب تن کی ہوتی ہیں۔ جب کہ دوسری جانب وہ قسمت کا مارا بھی انسان ہی ہوتا ہے جسے عزت کا لباس تو دُور کی بات ہے، پھٹے پرانے ٹکڑے جوڑ کر اپنا تن ڈھانپنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔

۱۲۔ مرنے میں آدمی ہی کفن کرتے ہیں تیار
نہلا دُھلا اٹھاتے ہیں کاندھے پر کر سوار

کلمہ بھی پڑھتے جاتے ہیں روتے ہیں زار زار
سب آدمی ہی کرتے ہیں مُردے کا کاروبار
اور وہ جو مر گیا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مشکلات:۔ زار زار رونا ۔ بہت رونا۔ مردے کا کاروبار ۔ مردے کا انتظام کرنا۔ کفنانا دفنانا۔

تشریح:۔ جو شخص مرجاتا ہے وہ بھی انسان ہوتا ہے اور جو اُس کا کفن تیار کرتے، نہلاتے دھلاتے اور کاندھے پر رکھ کر قبرستان لے جاتے اور رنج و افسوس سے روتے جاتے اور پھر جاکر دفن کر دیتے ہیں۔ وہ بھی انسان ہوتے ہیں اور جو ایک انسان کی موت کو کاروبار یعنی کھانے پینے کا ذریعہ بنا لیتے ہیں اور اس کی جائیداد کو حاصل کرنے میں مقابلہ بازی کرنے لگ جاتے ہیں۔

۱۳۔ اشراف اور کمینہ سے لے شاہ تا وزیر
ہیں آدمی ہی صاحبِ عزت بھی اور حقیر
یاں آدمی مرید ہیں اور آدمی ہی پیر
اچھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے اے نظیر
اور سب میں جو بُرا ہے وہ ہے وہ بھی آدمی

مشکلات:۔ اشراف ۔ معزز و شریف ۔ کمینہ۔ ذلیل، گھٹیا۔

تشریح:۔ عام شرفا۔ اور کمینے لوگوں سے لے کر بادشاہ اور وزیر تک یہ انسان ہی ہیں جو صاحبِ عزت بھی ہوتے ہیں اور ذلیل و خوار بھی۔ پھر انسانوں ہی میں سے ایک طبقہ مریدوں کا اور دوسرا پیروں کا ہوتا ہے یعنی بعض خدمت کرتے ہیں اور بعض کی خدمت ہوتی ہے۔ پھر اچھے لوگ بھی انسان ہی ہوتے ہیں اور بدترین اخلاق کے مالک بھی انسان ہوتے ہیں۔

اس نظم میں شاعر نے روحانی اور مادی اعتبار سے انسانوں کے جو مختلف طبقے ہیں، اُن پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ اور انسانوں نے اپنے طور پر جو عدم مساوات قائم کر رکھا ہے، اُس پر تعجب اور افسوس کا اظہار کیا ہے۔

خواجہ الطاف حسین حالی

حبِ وطن

تعارف حبِ وطن مثنوی کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ مثنوی وہ نظم ہے جس میں کوئی مسلسل بات بیان کی جاتی ہے۔ اس میں ہر شعر کا قافیہ جُدا لیکن ہر شعر کے دونوں مصرع ہم قافیہ ہوتے ہیں۔

مرکزی خیال اس نظم کا مرکزی خیال یہ ہے کہ اپنے وطن میں ایک چیز بہت اچھی لگتی ہے، لیکن وہی چیز پردیس میں کاٹنے کو دوڑتی ہے۔ مثال کے طور پر مختلف مناظرِ فطرت شاعر کو وطن میں بہت اچھے لگتے تھے، مگر اب پردیس میں انہیں چاند ستاروں اور گل و بلبل کو دیکھتا ہے تو اُس کے سینے سے ہُوک اٹھتی ہے اور وطن کی یاد اُسے پریشان کر دیتی ہے۔

نظم کی تشریح

اے سپہرِ بریں کے سیّارو — اے فضائے زمیں کے گلزارو
اے پہاڑوں کی دلفریب فضا — اے لبِ جُو کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
اے عنادل کی نغمۂ سحری — اے شبِ ماہتاب تاروں بھری
اے نسیمِ بہار کے جھونکو — دہرِ ناپائیدار کے دھوکو

مشکلات:۔ سپہرِ بریں = بلند آسمان سیّارو = مراد ستارے گلزار۔ باغ دلفریب۔ خوبصورت، دلکش۔ لبِ جُو۔ نہر کا کنارا عنادل۔ واحد عندلیب بلبلیں نغمہ سحری۔ صبح کا نغمہ یا گیت شبِ ماہتاب = چاند رات یا چاندنی رات نسیمِ بہار۔ بہار کے موسم میں چلنے والی ٹھنڈی ہوا۔ دہرِ ناپائیدار۔ ایسا زمانہ جو پائیدار نہیں۔ فانی دُنیا۔

تشریح:۔ شاعر مختلف مناظرِ فطرت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اے بلند اونچے آسمان پر چمکنے والو ستارو اور اے زمین پر اپنی چھب دکھانے والو باغو۔ اے سرسبز پہاڑوں کے حسین و جمیل مناظر! اور اے بل کھاتی گنگناتی ندی کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا۔ اے صبح کے وقت بلبلوں کے پیارے پیارے

گیتو اور اسے تاروں سے بھری ہوئی چاندنی رات۔ اے بہار کے موسم میں چلنے والی ٹھنڈی نرم ہوا۔۔۔ تم سب اس فانی دنیا میں انسان کو اپنے حسن و جمال سے عارضی طور پر دھوکا دے لیتے یا متاثر کر لیتے ہو۔

تم ہر اک حال میں ہو یوں تو عزیز — تھے وطن میں مگر کچھ اور ہی چیز
جب وطن میں ہمارا تھا رہنا — تم سے دل باغ باغ تھا اپنا
تم میری دل لگی کے ساماں تھے — تم میرے دردِ دل کے درماں تھے
تم سے کٹتا تھا رنجِ تنہائی — تم سے پاتا تھا دل شکیبائی

مشکلات:۔ عزیز۔ پیارے دل باغ باغ ہونا۔ بہت ہی خوش ہونا۔ دل لگی۔ دل کا مطمئن رہنا، مسرور رہنا درماں۔ علاج۔ رنجِ تنہائی۔ اکیلے ہونے کا غم یا دکھ۔ شکیبائی۔ صبر، قرار۔

تشریح:۔ تم سب یوں تو ہر حال میں مجھے پیارے اور محبوب لگتے ہو، مگر جب میں وطن میں تھا تو تم کہیں زیادہ خوبصورت دکھائی دیتے تھے۔ وہاں جب میں تمہیں دیکھتا تھا تو خوشی کا بے پناہ احساس دل میں پیدا ہوتا تھا۔ تمہیں دیکھ دیکھ کر میرا دل لگا رہتا تھا اور سارے غم اور پریشانیاں دُور ہو جاتی تھیں تمہاری موجودگی میں میری تنہائی مجھے پریشان نہ کرتی تھی اور یہ غم دب کر رہ گیا تھا اور دل تمہیں دیکھ کر عجیب قسم کا اطمینان اور قرار محسوس کرتا تھا۔

آن اک اک تمہاری بھاتی تھی — جو ادا تھی وہ جی لبھاتی تھی
کرتے تھے جب تم اپنی غم خواری — دھوئی جاتی تھیں کلفتیں ساری
جب ہوا کھانے باغ جاتے تھے — ہو کے خوشحال گھر میں آتے تھے
بیٹھ جاتے تھے جب کبھی لبِ آب — دھو کے اٹھتے تھے دل کے داغ شتاب

مشکلات:۔ آن۔ ادا بھاتی تھی۔ پسند آتی تھی۔ لبھاتی تھی۔ بہلاتی تھی۔ غم خواری۔ غم کھانا، ہمدردی کرنا کلفتیں۔ تکلیفیں۔ خوشحال۔ خوش، مسرور لبِ آب۔ پانی کے کنارے۔ داغ۔ زخم، دھبے۔ شتاب۔ جلدی

تشریح:۔ تمہاری ایک ایک ادا اور حسن کا ایک ایک پہلو مجھے بہت پسند آتا تھا اور دل کو اُس سے قرار اور خوشی ملتی تھی۔ تمہیں دیکھ کر میں اپنے غموں کو بھول جاتا تھا اور ساری مصیبتیں اور پریشانیاں دور ہو جاتی تھیں۔ چنانچہ جب بھی ہم باغ کی سیر کو جاتے تھے، خوشی و مسرت کا بے پناہ احساس لے کر واپس

آتے تھے اور جب ہم کسی ندی کے کنارے بیٹھتے تھے تو بہتے ہوتے پانی کا حسن فوراً ہی دل کی تمام آلائشیں دھو ڈالتا تھا اور دل کے زخموں پر گویا مرہم رکھ دیا جاتا تھا۔

کوہ و صحرا و آسمان و زمین — سب مری دل لگی کی شکلیں تھیں
پر چھٹا جب سے اپنا ملک و دیار — جی ہوا تم سے خود بخود بیزار
نہ گلوں کی ادا خوش آتی ہے — نہ صدا بلبلوں کی بھاتی ہے
سیرِ گلشن ہے جی کا اک جنجال — شبِ ماہتاب جان کو ہے وبال

مشکلات :۔ کوہ ۔ پہاڑ۔ چھٹا ۔ چھن گیا۔ ملک و دیار ۔ ملک اور شہر۔ خوش آتی ہے ۔ اچھی لگتی ہے ۔ صدا ۔ آواز ۔ جنجال ۔ پریشانی ۔ وبال ۔ مصیبت ۔

تشریح :۔ بات کو سمیٹتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ الغرض پہاڑوں ، صحراؤں اور آسمان و زمین کے مختلف مناظر میں میرا دل لگا رہتا تھا اور انہیں دیکھ کر بے پناہ خوشی محسوس کرتا تھا۔ مگر افسوس کہ جب سے میں اپنے وطن اور شہر سے جُدا ہوا ہوں ، ان تمام چیزوں سے دل بیزار ہو گیا ہے ۔ اب پھولوں کا حسن دل میں خوشی پیدا کرتا ہے نہ بلبلوں کی چہچہاہٹ اور نغمہ آرائی اچھی لگتی ہے ۔ اب تو یہ حال ہو گیا ہے کہ باغ کی سیر پریشانی اور مصیبت کا باعث بن گئی ہے اور چاندنی رات کاٹنے کو دوڑتی ہے ۔

کوہ و صحرا سے تا لبِ دریا — جس طرف جائیں جی نہیں لگتا
کیا ہوتے دن وہ اور وہ راتیں — تم میں اگلی سی اب نہیں باتیں
ہم ہی غربت میں ہو گئے کچھ اور — یا تمہارے ہی کچھ بدل گئے طور
گو وہی ہم ہیں اور وہی دنیا — پر نہیں لطف ہم کو دنیا کا

مشکلات :۔ غربت ۔ پردیس طور ۔ انداز ، طریقے ۔

تشریح :۔ پہاڑوں اور صحراؤں سے لے کر دریاؤں کے کناروں تک جس طرف میں جاتا ہوں جی کو قرار نہیں ملتا۔ ہائے وہ دن کہاں گئے جب میں اپنے وطن میں پہاڑوں اور جنگلوں کے مناظر سے لطف اندوز ہوتا تھا اور وہ راتیں کہاں چلی گئیں جب میں ستاروں کی جھلملاہٹ اور چاند کی رعنائی میں محو رہا کرتا تھا۔ اب کسی چیز میں وہ پہلے والی بات نہیں رہی۔ مجھ میں نہیں آتا کہ ہم پردیس میں آکر بدل گئے ہیں یا مناظرِ فطرت کے انداز اور حسن میں کمی آگئی ہے ۔۔۔ اب تو یہ حالت ہے کہ اگرچہ ظاہری طور پر ہم میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور دنیا کا رنگ بھی پہلے جیسا ہے ، مگر افسوس اب دنیا کا وہ لطف محسوس نہیں ہوتا ، جو پہلے ہوا کرتا تھا اور اس کا واحد سبب یہ

ہے کہ یہ ساری بہاریں، ساری رونقیں وطن کے دم سے تھیں، وطن چھوٹنے کے ساتھ چیزوں کا حسن بھی ماند پڑ گیا ہے۔

علامہ شبلی نعمانی

شہدائے قوم

تعارف جولائی ۱۹۱۳ء میں انگریزی حکومت نے کانپور کی ایک مسجد کے ایک حصے کو شہید کر دیا۔ مسلمانوں نے بہت احتجاج کیا، مگر جب اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا تو ایک روز زبردست جلوس کی صورت میں جمع ہو کر اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ انگریزی فوج اور پولیس نے گولی چلا دی، جس سے بیسیوں مسلمان شہید اور سینکڑوں شدید زخمی ہوئے۔ یہ نظم مولانا شبلی نے اسی موقع پر کہی تھی۔

مرکزی خیال شاعر نے شہداء کی تصویر کشی کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اس میں بچے، جوان اور بوڑھے ہر عمر کے شہید تھے۔ اور سب اپنی اپنی جگہ شہادت کے نشے میں سرشار تھے۔

نظم کی تشریح

۱- کل مجھ کو چند لاشۂ بے جاں نظر پڑے
دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چُور ہیں

مشکلات:۔ لاشۂ بے جان = بے جان لاشیں۔ زخموں سے چُور۔ جنہیں بہت زیادہ زخم لگے ہوتے تھے۔

تشریح:۔ کل میں نے ایک جگہ چند ایسی لاشیں پڑی ہوتی دیکھیں جن میں زندگی کے کوئی آثار نہ تھے۔ قریب جا کے دیکھا تو ان کے جسم زخموں سے اَٹے ہوتے تھے۔

۲- کچھ طفل خورد سال ہیں جو چپ ہیں خود، مگر
بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں

مشکلات:۔ طفل خورد سال = چھوٹی عمر کے بچے

تشریح: ان لاشوں میں بہت معصوم اور ننھے بچے بھی پڑے ہیں جو خاموش ہیں اور دم توڑ چکے ہیں، مگر اُن کا بچپن پکار پکار کے کہہ رہا ہے کہ ہم نے کوئی قصور نہیں کیا تھا اور قاتلوں نے ہمیں بے گناہ ہلاک کر دیا ہے۔

۳۔ آئے تھے اس لیے کہ بنائیں خدا کا گھر
نیند آگئی ہے منتظرِ نفخِ صور ہیں،

مشکلات: خدا کا گھر۔ مسجد۔ منتظر۔ انتظار کرنے والے۔ نفخِ صور۔ وہ صور یا آلہ جو قیامت کے روز حضرت اسرافیل بجائیں گے اور ساری دنیا بیدار ہو کر میدانِ حشر میں جمع ہو جائے گی۔ منتظرِ نفخِ صور: قیامت کا انتظار کرنے والے۔

تشریح: ہم گھروں سے صرف اس لیے آئے تھے کہ مسجد جو شہید ہو گئی ہے، اُس کو دوبارہ تعمیر کرنے میں اپنے بڑوں کی مدد کریں۔ مگر یہاں آئے تو بندوق کی گولیوں نے ہمیں موت کی نیند سلا دیا ہے۔ اور اب ہم اس وقت کا انتظار کر رہے ہیں جب حضرت اسرافیل صور بجائیں گے اور ہم بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ اُٹھ کر اللہ کے دربار میں انصاف کے طالب ہوں گے۔

۴۔ کچھ نوجواں ہیں بے خبرِ نشۂ شباب
ظاہر میں گرچہ صاحبِ عقل و شعور ہیں

مشکلات: بے خبرِ نشۂ شباب: جوانی کے نشے سے بے خبر یعنی مدہوش، خاک و خون میں لتھڑے ہوتے۔ صاحبِ عقل و شعور۔ عقل مند، باہوش۔

تشریح: ان میں ایسے نوجوانوں کی لاشیں بھی ہیں جو دیکھنے میں ہوش مند اور عقل و شعور کے مالک نظر آتے ہیں، لیکن اس وقت جوانی کے تمام تقاضوں سے بے خبر خاک و خون میں لتھڑے ہوتے ہیں اور انہیں تن بدن کی ہوش نہیں ہے۔

۵۔ اُٹھتا ہوا شباب یہ کہتا ہے بے دریغ
مجرم کوئی نہیں ہے، مگر ہم ضرور ہیں

مشکلات: اُٹھتا ہوا شباب۔ بھرپور جوانی۔ بے دریغ۔ برملا، بے تکلف

تشریح: ان نوجوان شہیدوں کی لاشیں زبانِ حال سے کہہ رہی ہیں کہ کوئی اور مجرم ہو یا نہ ہو، مگر ہم لوگ اقراری مجرم ہیں کہ ہم نے ظالم کے خلاف نعرہ حق بلند کیا تھا اور ہماری جوانی تقاضا کرتی تھی کہ ہم غیرت اور شجاعت کا مظاہرہ کریں۔

۶- سینے پر ہم نے روک لیے برچھیوں کے وار
ازبسکہ مستِ بادۂ ناز و غرور ہیں

مشکلات:- ازبسکہ بہت زیادہ بادہ - شراب -
تشریح:- چونکہ ہم جوان تھے اور جوانی کے نشے میں سرشار تھے، اس لیے ہم نے برچھیوں کے وار اپنے سینے پر سنبھال لیے اور اس پر ہمیں ناز ہے۔

۷- ہم آپ اپنا کاٹ کے رکھ دیتے ہیں جو سر
لذت شناسِ ذوقِ دلِ ناصبور ہیں

مشکلات:- لذت شناس - لذت اور لطف سے واقف - ذوق = دلِ ناصبور - بے قرار دل - دردمند دل -
تشریح:- ہم اس ذوق و شوق کی لذت سے آگاہ ہیں جو بے قرار، جوشیلے اور دردمند دل میں پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے ہم اس ذوق کی تسکین کی خاطر ضرورت پڑنے تو سر ہتھیلی پر رکھ کر پیش کر دیتے ہیں۔ یعنی دل کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے ہم اپنا سر بھی پیش کر دیتے ہیں۔ اور آج ایسا ہی موقع تھا کہ ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔

۸- کچھ پیرِ کہنہ سال ہیں دلدادہ فنا
جو خاک و خوں میں بھی ہمہ تن غرقِ نور ہیں

مشکلات:- پیرِ کہنہ سال - بہت بوڑھے بزرگ - دلدادۂ فنا - موت کے عاشق ہمہ تن - پورے کے پورے غرقِ نور - نور میں بسے ہوئے۔
تشریح:- حیرت کی بات ہے کہ بچوں اور جوانوں کی لاشوں کے درمیان بہت بوڑھے لوگوں کے جسم بھی نظر آ رہے تھے جنہوں نے موت کی آواز پر لبیک کہا تھا اور اگرچہ وہ خون اور مٹی میں لتھڑے ہوئے تھے، مگر اُن کی صورتیں بے حد نورانی تھیں اور یوں لگتا تھا وہ نورِ الٰہی میں نہا کر لیٹے ہیں۔

۹- پوچھا جو میں نے کون ہو تم؟ آئی یہ صدا
ہم کشتگانِ معرکۂ کانپور ہیں،

مشکلات:- صدا - آواز کشتگان - شہید، ہلاک شدگان معرکہ - مقابلہ، لڑائی
تشریح:- میں نے بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کی ان لاشوں سے مخاطب ہو کر پوچھا کہ تم کون ہو اور کس ظالم نے تمہیں بلا امتیاز عمر ہلاک کر دیا ہے تو آواز آئی کہ ہم مسجد کانپور کے معرکے میں شہید ہوئے ہیں۔

مولانا شبلی نعمانی کے کلام کی خصوصیات

مولانا شبلی نعمانی کے حالاتِ زندگی آپ نثر کے حصے میں دیکھ چکے ہیں۔ ان کے کلام کی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:۔

مولانا شبلی ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ مورخ، سیرت نگار، نقاد، ادیب، مصلح اور شاعر۔ وہ علیگڑھ کی اصلاحی تحریک میں اتنے مصروف رہے کہ شاعری کی طرف پوری توجہ نہ دے سکے۔ حالانکہ وہ مختلف فارسی اور اردو اصنافِ شاعری پر مکمل قدرت رکھتے تھے۔ اور غزل، نظم وغیرہ پر استادانہ مہارت کے حامل تھے۔ ان کی فطری شاعرانہ صلاحیت۔ عربی و فارسی شاعری پر گہری نظر، جدید انگریزی ادب سے آگاہی اور فلسفیانہ نکتہ آفرینی ایسی امتیازی خصوصیات ہیں کہ اگر ان کی دیگر مصروفیات آڑے نہ آتیں، تو وہ اپنے ہم عصر شعراء یعنی آزاد اور حالی سے کہیں زیادہ بہتر و برتر شاعر بننے میں مدد دیتیں۔ اس کے باوجود شبلی نے فارسی کے علاوہ اردو شاعری میں جو اپنا ایک مختصر مجموعہ کلام چھوڑا ہے۔ وہ دو باتوں کی وجہ سے بہت قابلِ قدر ہے۔ اوّل یہ کہ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے مولانا حالی کی اصلاحی تحریکات میں بڑی کامیابی سے ہاتھ بٹایا ہے۔ گو بالنصب العین کے اعتبار سے دونوں کی شاعری ایک ہے۔ دوسرے مولانا حالی کے قدرے غم انگیز اندازِ بیان کے برعکس شبلی کی نظموں میں امید افزا کیفیت کارفرما ہے اور ساتھ ہی سنجیدہ غور و فکر کے لئے بھی بہت سے خیالات حاصل ہوتے ہیں۔

شبلی ابتدائی دورِ شاعری میں علیگڑھ کی اصلاحی تحریک میں سرسید کی معاونت اور حالی کی ہمنوائی کرتے رہے۔ حالی نے مسدس کی شکل میں مسلمانوں کے زوال کا مرثیہ لکھا اور شبلی بھی مسلمانوں کی حالت پر نوحہ کناں رہے۔ مگر دونوں کے اندازِ فکر میں نمایاں فرق تھا۔ حالی مسلمانوں کی پستی کا سبب ان کی مادی زندگی کے زوال میں تلاش کرتے رہے، جبکہ شبلی نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے اس کی اصل وجہ مذہبی اصولوں اور دینی روایات سے انحراف قرار دیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

ان حقائق کی بنا پر سبب پستیٔ قوم ترکِ پابندیٔ اسلام ہے، اسلام نہیں

یہی وجہ ہے کہ قوم پرستی کا جو تصور شبلی نے پیش کیا، اسی کو اکبر و اقبال نے صحیح مانا۔ اور اسے مزید ترقی دی۔ مولانا کے اس دور کے معروف کارنامے مثنوی "صبح امید" اور "مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم" ہیں۔ جن کی بدولت انہیں جدید شاعری کے بانیوں میں قابلِ قدر مقام حاصل ہو گیا۔

شبلی کی شاعری کا دوسرا دور وہ ہے جس میں علی گڑھ کی تحریک سے الگ ہو کر جدید طریقۂ تعلیم کی اصلاح اور سیاستِ حاضرہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس زمانہ میں وہ ایک طرف علی گڑھ تحریک کے زیرِ اثر پیدا ہونے والے مثبت نتائج سے مطمئن تھے مگر دوسری جانب انہیں تشویش بھی تھی کہ تقلیدِ مغرب کے نتائج بہت خطرناک ہوں گے اور مسلمانوں کی آئندہ نسلیں دینی خیالات و قومی اقدار سے دور اور بے خبر ہو جائیں گی۔ انہوں نے بہت سی نظموں میں اپنے ان خیالات کا اظہار کیا ہے۔

سیاسی اعتبار سے شبلی ہندو مسلم اتحاد کے بڑے حامی تھے جس سے علیگڑھ تحریک کے حامی خوش نہ تھے۔

اس دور کی شاعری خیالات کی گہرائی اور وسعت اور اسلوبِ بیان کی پختگی اور روانی کے باعث امتیازی شان رکھتی ہے۔ ان کے کلام میں زبردست جوش و خروش ہے لیکن لہجے پر متانت و سنجیدگی غالب ہے۔

بحیثیت مجموعی مولانا شبلی اپنے ہم عصروں میں کم عمر ہونے کے باوجود شاعرانہ اعتبار سے بہت ہی کامیاب شاعر تھے۔ اُن کا رنگِ سخن نہایت پختہ و رواں اور خیالات بہت پاکیزہ تھے۔ انہوں نے سرسید اور حالی کی تحریکِ اصلاح میں ایک سرگرم رکن کی حیثیت سے کام کر کے تحریک کے مقاصد کو بہت فروغ دیا۔ ان کی سیاسی، قومی اور اسلامی نظمیں دلکش ہونے کے ساتھ ساتھ بڑی سنجیدہ، پُرمغز اور موثر ہیں۔

اکبر الٰہ آبادی (۱۸۴۶ء / ۱۹۲۱ء)

حالاتِ زندگی سید اکبر حسین نام اور اکبر تخلص تھا۔ وہ ضلع الٰہ آباد کے قصبہ بارہ کے خاندان سادات سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد سید تفضل حسین ایک صوفی منش درویش تھے۔ اکبر ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے ان کے بھائی اکبر حسن عالمِ جوانی میں انتقال کر گئے۔

اکبر نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ انگریزی ذاتی محنت و کوشش سے سیکھی۔ شروع میں دو ایک جگہ معمولی نوکری کی۔ پھر ۱۸۶۷ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا اور پریکٹس کرنے لگے۔ پھر نائب تحصیلداری کی، داروغہ آبکاری ہوئے اس کے بعد ہائی کورٹ میں مسل خوانی کی ملازمت مل گئی۔ قانون سے مزید واقفیت ہوئی

تو ۱۸۷۳ء میں ہائی کورٹ کی وکالت کا امتحان پاس کر کے پریکٹس شروع کر دی تھوڑے عرصے بعد منصف اور پھر سب جج مقرر ہو گئے۔ آخر میں جج ہو گئے۔ ملازمت کے سلسلے میں ہاتھرس بھی گئے۔ مگر زیادہ عرصہ الٰہ آباد میں ہی گذرا۔ ۱۹۰۵ء میں سیشن جج کے عہدے سے ریٹائر ہو گئے۔ دو سال بعد حکومت نے خان بہادر کا خطاب دیا۔ الٰہ آباد یونیورسٹی کے فیلو منتخب ہوئے۔ ۱۹۱۰ء میں بیوی کے انتقال پر ان کی پریشانیاں بڑھ گئیں اور بہت متفکر رہنے لگے۔

صحت ابتدا سے ہی خراب رہتی تھی۔ ۹ ستمبر ۱۹۲۱ء کو الٰہ آباد میں انتقال کر گئے اُن کا پورا کلام "کلیاتِ اکبر" کے نام سے چھپ چکا ہے۔

مشرق و مغرب

تعارف یہ نظم حضرت اکبر نے اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں کہی ہے اور اس میں یورپ اور مشرقی اقوام خصوصاً برصغیر پاک و ہند کی صورت حالات کا مقابلہ و تجزیہ کیا گیا ہے۔ یوں بظاہر اس نظم کو نصاب میں شامل کرنے کی کوئی تک نہ تھی کہ اب یہاں انگریز قابض نہیں ہیں اور ساری باتیں اُن کے قبضہ و اقتدار کے حوالے سے کی گئی ہیں۔

مرکزی خیال نظم میں بتایا گیا ہے کہ چونکہ حکومت انگریزوں کے ہاتھ میں ہے، اس لیے انہیں کے خیالات و نظریات کو قبول کیا جاتا ہے اور مشرقی قومیں اپنے مذہب اور معاشرتی قدریں سے بے نیاز ہوتی جا رہی ہیں

نظم کی تشریح

۱۔ تخت کے قابض وہی ، دیہیم اُن کے ہاتھ میں
ملک اُن کا رزق کی تقسیم اُن کے ہاتھ میں

مشکلات:۔ دیہیم = تاج شاہی۔

تشریح:۔ حکومت و اقتدار انگریزوں کے قبضے میں ہے۔ یعنی تخت بھی انہی کا اور تاج بھی انہی کا اور چونکہ ملک پر اُن کا قبضہ ہے، اس لیے رزق اور معاش کے سارے وسیلے بھی اُن کے پاس ہیں۔ وہ جس کو چاہتے ہیں بھوکوں مارتے ہیں۔

جس کو چاہتے ہیں رزق و مال سے نہال کر دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں گویا وہ خدا بن گئے ہیں۔

۲۔ برق کی صورت پہنچتا ہے طبائع پر اثر
آگیا تار اُمید و بیم اُن کے ہاتھ میں

مشکلات :۔ برق ۔ بجلی ۔ طبائع ۔ واحد طبیعت بمعنی مزاج ۔ اُمید و بیم ۔ اُمید اور خوف۔

تشریح :۔ اُمید انسان کے تمام اعمال کی بنیاد بنتی ہے۔ جبکہ انجام کے بارے میں خوف اور خدشہ انسان کو احتیاط بھی سکھاتا ہے اور خدا کی یاد بھی دل میں برقرار رکھتا ہے۔ اس طرح امید و بیم دونوں مل کر کامیابی کا راستہ استوار کرتے ہیں۔ شاعر کہہ رہا ہے کہ یورپ والوں خصوصاً انگریزوں کو کامیابی کے اس گُر کا پتہ چل گیا ہے وہ حالات سے کبھی مایوس نہیں ہوتے، مگر محتاط رہتے ہیں۔ اور یہ خوبی بجلی کی مانند ان کی ساری قوم کے مزاج میں سرایت کر گئی ہے۔

۳۔ ہم کو ساتے پر جنوں وہ دھوپ میں مصروفِ کار
مِس پر اپنی نظر اور سیم اُن کے ہاتھ میں

مشکلات :۔ جنوں ۔ دیوانگی، عشق ۔ مصروفِ کار ۔ کام میں لگے رہنا ۔ مِس ۔ تانبہ۔ سیم ۔ چاندی۔

تشریح :۔ ہم مشرق کے لوگ یا مسلمان سست اور آرام طلب ہو گئے ہیں اور سایے کی تلاش میں رہتے ہیں کہ کہاں کوئی درخت یا مکان ملے کہ ہم لیٹ کر آرام فرمائیں۔ مگر انگریز قوم سخت کوش اور مشکل پسند ہے اور سخت دھوپ میں بھی اپنے کام میں لگی رہتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے حصے میں تانبہ آگیا ہے اور انہیں چاندی کی دولت مل گئی ہے۔ تانبہ چاندی کے مقابلے میں سستی اور کم مفید دھات ہے۔

۴۔ صبر باقی ہے نہ ہم میں باہمی اعزاز ہے
سب کی ہے تذلیل اور تعظیم اُن کے ہاتھ میں

مشکلات :۔ باہمی اعزاز ۔ ایک دوسرے کی عزت ۔ تذلیل ۔ ذلیل و رسوا کرنا تعظیم ۔ عزت و احترام۔

تشریح :۔ ہم نہ تو اپنی مشکلات اور مصیبتوں پر صبر کرتے ہیں نہ ہی ایک دوسرے کی عزت کرتے ہیں۔ ہماری یہ حالت ہے کہ حسد، بغض اور نفاق کی وجہ سے اپنے بھائیوں اور ہم وطنوں کو ذلیل و رسوا کرنے میں دریغ نہیں کرتے جبکہ انگریز اپنی قوم کے ہر فرد کی عزت

کرتے ہیں اور ہر شخص کی صلاحیتوں کے مطابق اس کی قدر کرتے ہیں۔

۵۔ شیخ کی جانب کوئی جاتی نہیں، کہتے ہیں سب
ہے فقط اب کوثر و تسنیم اُن کے ہاتھ میں

مشکلات:۔ شیخ۔ مذہبِ اسلام کا ترجمان۔ مولوی صاحب، واعظ۔ کوثر و تسنیم۔ جنت کی دو نہریں۔

تشریح:۔ ہماری قوم کا یہ حال ہو گیا ہے کہ کوئی شخص مولوی صاحب یا مذہبی طبقے کی باتوں پر توجہ نہیں دیتا۔ لوگ اُن کا مذاق اُڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ تو بس جنت کی باتیں کرتے رہتے ہیں اور کوثر و تسنیم کا ذکر چھیڑے رکھتے ہیں۔

۶۔ مغربی رنگ و روش پر کیوں نہ آئیں اب قلوب
قوم اُن کے ہاتھ میں، تعلیم اُن کے ہاتھ میں

مشکلات:۔ روش۔ طریقے۔ قلوب۔ واحد قلب۔ بمعنی دِل۔

تشریح:۔ لوگوں کے دل یورپین خیالات اور طریقوں کی طرف مائل کیوں نہ ہوں۔ جبکہ قوم کی تقدیر بھی انگریزوں کے ہاتھ میں ہے اور خاص طور پر تعلیم اور تعلیمی ادارے تمام تر اُن کے قبضے میں ہیں۔ اور یہ بہت بڑی حقیقت ہے کہ تعلیم دِلوں اور دماغوں پر قبضہ کرنے کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔

۷۔ جج بنا کر اچھے اچھوں کا لبھا لیتے ہیں دِل
ہیں نہایت خوشنما دو جیم اُن کے ہاتھ میں

مشکلات:۔ دِل لبھا لینا = فریفتہ بنانا۔ عاشق بنانا۔

تشریح:۔ جو لوگ باشعور ہوتے ہیں اور انگریزوں کے جال میں گرفتار نہیں ہوتے انہیں تمغے اور رشوت کا لالچ دے کر پھانس لیتے ہیں اور اس کے لیے وہ عموماً ایسے لوگوں کو جج کا معزز عہدہ پیش کرتے ہیں اور یوں اچھے اچھے محبِ وطن و قوم افراد بھی دو جیموں (جج) کے پھندے میں پھنس کر رہ جاتے ہیں۔

مجموعی اعتبار سے یہ نظم طالب علموں میں احساسِ کمتری پیدا کرنے کا سبب بن سکتی ہے اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ دنیا کی ساری خوبیاں تو بس انگریزوں کو بخش دی گئی ہیں اور ہمارے حصے میں خامیوں اور برائیوں کے سوا کچھ نہیں آیا۔ یہ نظم آج سے سو برس پہلے کے حالات کی صحیح عکاسی کرتی تھی، مگر اب حالات بہت بدل گئے ہیں اب اسے شاملِ نصاب کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

اکبر الہ آبادی کی شاعری کی خصوصیات

۱- طرزِ نو کے موجد اکبر سے پہلے بھی اردو شاعری میں طنز و مزاح کے نمونے ملتے ہیں۔ لیکن شاعری میں طنز و مزاح کا بامقصد آغاز اکبر ہی نے کیا۔ وہ اس طرز کے خاص کے بانی بھی ہیں اور خاتم بھی کہ بعد میں کوئی شخص ان کی تقلید میں کامیاب نہ ہو سکا۔

۲- حسن پرستی و تغزل اکبر نے ابتدا میں وحید الہ آبادی کی شاگردی اختیار کی تھی جو بڑے رنگین مزاج شاعر تھے، اس لئے ان کی غزل میں اپنے استاد کا رنگ جھلکتا ہے اور ابتدائی کلام تغزل میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔

۳- طنز و مزاح ان کے کلام کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کا طنز و مزاح ہے انہوں نے قومی زندگی کے مضحکہ خیز پہلوؤں پر غضبیں انداز میں نکتہ چینی کی ہے وہ مغربی تہذیب کے اندھے مقلدوں پر تابڑ توڑ حملے کرتے اور اسلامی تہذیب و تاریخ کی فوقیت ثابت کرتے ہیں۔

؎ شوق لیلائے سول سروس نے مجنوں مفتون کو
اتنا دوڑایا لنگوٹی کر دیا پتلون کو

؎ کیا تعجب ہے جو لڑکوں نے بھلایا گھر کو
جب کہ بوڑھے روشن دینِ خدا بھول گئے

؎ قرآن یہ کہتا ہے خدا حسن سے خوش ہے
کس حسن سے؟ یہ تو بھی سنو! حسنِ عمل سے

۴- حرکت و عمل کا درس اکبر کا انداز محض منفی نہیں، بلکہ انہوں نے نہایت مثبت انداز میں نوجوانوں کو کارآمد مشورے دیئے ہیں اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق انہیں حرکت و عمل اور انقلاب کا درس دیا ہے ؎

جو دیکھی ہسٹری اس بات کا کامل یقین آیا
اسے جینا نہیں آیا جسے مرنا نہیں آیا

خدا کے واسطے اے نوجوانو ہوش میں آؤ　　دلوں میں اپنی غیرت کو جگاؤ جوش میں آؤ

۵- نادر تشبیہ و استعارے اکبر نے پرانی تشبیہات کی بجائے نادر اور خوبصورت تشبیہ و استعارے ایجاد کئے ہیں اور مخصوص مطالب کے اظہار کے لئے خاص علامتیں بھی اختیار کی ہیں۔ مثلاً مسلمانوں کے لئے اونٹ گائے، مسجد، ہندوؤں کے لئے لنگوٹی، دھوتی، زنار، یورپ اور انگریزوں کے لئے بسکٹ، بیٹ، پتلون وغیرہ۔

۶- انگریزی الفاظ کا استعمال اکبر اپنے کلام میں انگریزی الفاظ بھی استعمال کرتے تھے۔ لیکن بے ڈھنگے طریقے سے نہیں۔ ان کے ہاں یہ الفاظ نگینے کی طرح جڑے ہوتے ہیں اور مطالب کو حسن و خوبی سے ادا کرتے ہیں۔

پانی پینا پڑا ہے "پائپ" کا
حرف پڑھنا پڑا ہے "ٹائپ" کا

اسمال نہیں گریٹ ہونا اچھا　　دل ہونا بُرا ہے، پیٹ ہونا اچھا
پنڈت ہو کہ مولوی ہو دونوں بیکار　　انسان کو گریجوایٹ ہونا اچھا

۷- انگریزی تہذیب و تمدن پر تنقید اکبر انگریزی تہذیب و ثقافت اور طرزِ زندگی کی ترویج کو مسلمانوں کے لئے نقصان دہ سمجھتے تھے انہوں نے فرنگی ذہنیت کے ہندوستانیوں کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا۔ ان کے طنز کا شکار وہ طبقہ ہے جو مغرب کی اندھا دھند تقلید میں مبتلا ہے۔

کیا کہوں اس کو میں بدبختی بہ نیشن کے سوا
اس کو آتا نہیں اب ایٹیشن کے سوا

ڈاکٹر محمد صادق لکھتے ہیں، "اکبر کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مغربی تہذیب کے کمزور اور بدنما پہلوؤں سے پردہ اٹھا کر اور ہماری اپنی تہذیب کی خوش آئند خصوصیات کی طرف ہماری توجہ منعطف کر کے، ہمیں ذہنی آزادی اور خود اعتمادی کا سبق دیا ——————"

مولانا ظفر علی خاں

(۱۸۷۳ — ۱۹۵۶ء)

حالات زندگی

مولانا ظفر علی خاں کا سن پیدائش ۱۸۷۳ء ہے۔ وہ ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں کوٹ مہرتھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ماجد مولوی سراج الدین ڈاکخانے میں ملازمت کرتے تھے۔ ظفر علی خاں نے مڈل کا امتحان ہائی سکول وزیر آباد اور میٹرک پٹیالہ سے پاس کیا۔ پھر علی گڑھ چلے گئے اور بی اے تک وہیں تعلیم پائی۔

انہیں ابتدا ہی سے شعر و شاعری سے دلچسپی تھی۔ ایف۔ اے کے بعد والد صاحب نے ظفر علی خاں کو ڈاک میں ہی ملازم کرا دیا تھا۔ مگر صاحبزادے ذرا تیز مزاج تھے۔ کسی افسر سے ناراض ہوئے تو اس کی بھرکھ ماری۔ آخر ملازمت چھوڑنی پڑی اور پھر علی گڑھ جا کر بی۔ اے کیا۔ علی گڑھ میں انہیں مولانا شبلی اور پروفیسر آرنلڈ سے مستفیض ہونے کا موقع ملا۔ انہوں نے مباحثوں اور تقریروں میں سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا اور ناموری حاصل کی۔

بی اے کے بعد وہ نواب محسن الملک کے پرائیویٹ سیکرٹری مقرر ہو گئے۔ اس دور میں انہوں نے حیدرآباد دکن کی فوج میں ملازمت کر لی تھی۔ مگر جلد ہی چھوڑ دی۔ دکن سے پانچسو روپے تنخواہ ملتی تھی اور ترجمہ کا کام سپرد تھا۔ دکن میں ہی انہیں داغ کی صحبتوں میں شریک ہونے کا موقع ملا جس نے اُن کے ذوقِ شعری کو اور چمکا دیا۔

۱۹۰۹ء میں ظفر علی خان کے والد فوت ہوئے تو وہ آبائی گاؤں کرم آباد آ گئے اور والد کے جاری کردہ رسالہ "زمیندار" کی ادارت سنبھالی۔ اگلے سال "پنجاب ریویو" نکالا۔ پھر دونوں رسالے لاہور لے آئے۔ "زمیندار" روزنامہ بن گیا۔ اور ظفر علی خاں نے برطانیہ کے خلاف تیز و تند مضامین لکھے جس کی وجہ سے انہیں کئی بار جیل جانا پڑا۔ اور اخبار بھی بند ہوا۔ برطانوی سامراج کے خلاف حصولِ آزادی کی جدوجہد میں ظفر علی خاں اور "زمیندار" کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔

۱۹۵۶ء میں لاہور میں انتقال کر گئے۔ ظفر علی خاں کے شعری مجموعوں کے نام چمنستان، بہارستان، نگارستان اور حبسیات ہیں۔ وہ بڑے جری، بیباک اور نڈر شخص تھے۔

ظفر علی خاں کو فی البدیہہ شعر کہنے میں کمال حاصل تھا مشکل سے مشکل بحر اور سنگلاخ زمین میں طویل نظمیں کہہ لینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ وہ نادر اور اچھوتے قافیوں کو بڑی برجستگی کیساتھ کلام میں کھپا دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری میں نئی نئی ترکیب وضع کی ہیں اور محاورات کے استعمال میں بڑی جدت دکھائی ہے۔ ان کی شاعری کا یہ پہلو خاص اہمیت رکھتا ہے کہ ان کے مزاج کے طرح انکی شاعری بھی قوت و توانائی اور رعب و دبدبے شان و شوکت اور جوش و خروش کی آئینہ دار ہے۔

زبان و بیان پر انہیں زبردست قدرت حاصل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وقتی ہنگاموں میں الجھنے کی وجہ سے ان کی شاعری کا بیشتر حصہ ایسا ہے جو دائمی قدر و قیمت کا حامل نہیں۔ ان کے ہاں فکری عناصر کم ہیں۔ تاہم ان کے کلام میں ایسے جوہرات بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں جن کی چمک دمک کبھی ماند نہ پڑ سکے گی اور جب تک اردو زبان زندہ ہے ظفر علی خاں کا کلام زندہ رہے گا۔

مستقبل کی جھلک

تعارف یہ نظم اس وقت لکھی گئی جب انگریز کے خلاف جنگ آزادی لڑی جا رہی تھی بظاہر اس وقت حالات خوشگوار نہ تھے، مگر مولانا ظفر علی خاں نے قومی اور اسلامی نقطہ نظر سے بڑی ہی خوش کن اور خوبصورت پیشین گوئیاں کی ہیں جو اللہ کے فضل سے واقعی حقیقت بنتی نظر آتی ہیں۔

مرکزی خیال شاعر یہاں مسلمانوں کو روشن مستقبل کی نوید سناتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ غلامی کے اندھیرے چھٹ جائیں گے اور مسلمان آزاد و خود مختار ہو کر دین اسلام اور امت مسلمہ دونوں کے لیے ترقی و خوشحالی کا باعث بنیں گے۔ یورپی سامراج اپنی موت آپ مر جائے گا اور ایشیا مغربت و افلاس سے نجات پا لے گا۔

نظم کی تشریح

۱۔ کوئی دن جاتا ہے پیدا ہوگی اک دنیا نئی خونِ مسلم صرف تعمیرِ جہاں ہو جائے گا۔

مشکلات: کوئی دن جاتا ہے: چند روز میں۔ عنقریب۔ خونِ مسلم: مسلمان کا خون صرف: استعمال۔ تعمیرِ جہاں: دنیا کی تعمیر۔

تشریح شاعر جب دنیا بھر میں مسلمانوں پر ظلم و ستم ہوتے ہوئے دیکھتا ہے تو مایوس نہیں ہوتا۔ بلکہ امید کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ وقت جلد آنے والا ہے جب ظلم اور غلامی کا یہ دور ختم ہو جائے گا۔ مسلمانوں کا خون اور ان کی قربانیاں رنگ

لائیں گی۔ اندھیروں کے اندر سے ایک نئی دنیا کی صبح طلوع ہوگی اور مسلمانوں کا خون ایک نئے عہد کو پیدا کرنے کا سبب بن جائے گا۔

۲۔ بجلیاں غیرت کی تڑپیں گی فضائے قدس میں حق عیاں ہو جائیگا، باطل نہاں ہو جائیگا

مشکلات: غیرت: شرم و حیا؛ فضائے قدس: مقدس فضا یا سرزمین مراد فلسطین۔ حق: صداقت، سچائی۔ عیاں: ظاہر۔ باطل: جھوٹ۔ نہاں: چھپا ہوا

تشریح: فلسطین کے علاقے جہاں انگریز اور یہودی، مسلمانوں کو غلام بنانے کی کارروائیاں کر رہے ہیں۔ وہاں ایک روز لوگوں کی غیرت اور اسلامی احساس کا جذبہ بیدار ہو جائے گا جس کے نتیجے میں حق و صداقت یعنی اسلام کو فتح و کامیابی نصیب ہوگی۔ جبکہ باطل یا شیطانی قوتوں کو شکست سے دوچار ہونا پڑے گا۔

۳۔ ان کواکب کے عوض ہونگے نئے انجم طلوع ان دنوں رخشندہ تر یہ آسماں ہو جائیگا

مشکلات: کواکب: واحد کوکب بمعنی ستارے عوض: بدلے میں انجم: ستارے طلوع: نکلنا رخشندہ تر: زیادہ روشن، چمکدار

تشریح: یہ جو ستارے اب ڈوب رہے ہیں ان کے بدلے میں نئے اور زیادہ روشن ستارے طلوع ہوں گے (شاعر نے ستاروں کا استعارہ شہیدوں کے لئے استعمال کیا ہے) یعنی شہیدوں کا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔ ان کی جگہ نئے مجاہد اور غازی پیدا ہوں گے اور اس وقت اسلامی دنیا کا آسمان پہلے سے کہیں زیادہ روشن اور پر عظمت ہوگا۔ یعنی مسلمان جہاد کی برکت سے آگے ہی آگے بڑھیں گے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔

۴۔ پھر نئے محمود ہوں گے حامیٔ دینِ متین بچہ بچہ غیرتِ الپ ارسلاں ہو جائیگا

مشکلات: محمود: ایک مشہور مسلمان بادشاہ۔ مجاہد اور غازی جس نے ہندوراجاؤں کو بار بار شکست دی اور پنجاب کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ حامی: مددگار دینِ متین محکم، اٹل دین۔ الپ ارسلان: مشہور سلجوقی بادشاہ جس نے یورپ کی رومی سلطنت کو شکست فاش دی اور ایشیا سے رومیوں کو نکال دیا۔ دیندار اور مصنف مزاج تھا۔

تشریح: محمود اور الپ ارسلان استعارے کے طور پر استعمال کئے گئے ہیں مطلب یہ ہے کہ ایک زمانہ ضرور آئے گا جب امتِ مسلمہ میں نئے محمود پیدا ہوں گے۔ جو دینِ اسلام کی قوت و سربلندی کا سبب بنیں گے اور اسلام کے دشمن ہندوؤں کے ناپاک ارادوں کو خاک میں ملا دیں گے۔ اسی طرح الپ ارسلان کی طرح کے بہادر مجاہد بھی ضرور پیدا ہوں گے جو یورپ والوں کا غرور توڑ دیں گے اور مسلمانوں کو نئی زندگی بخشیں گے۔

۵۔ میرے بیٹے ہونگے پیدا سینکڑوں اہلِ سخن نکتہ تحقیق جن کا آزادی کی جاں ہو جائیگا

مشکلات: اہلِ سخن۔ شاعر

تشریح صرف فوجی محاذ پر ہی مسلمان اپنی قوت و شجاعت کا مظاہرہ نہیں کریں گے بلکہ شاعری کے میدان میں بھی ایسے بے شمار اہل کمال پیدا ہوں گے جو حسن و عشق کی سطحی اور بنا وٹی باتیں کرنے کے بجائے ایسے شعر اور نظمیں لکھیں گے جو مسلمانوں میں آزادی کی تڑپ پیدا کر دیں گے اور اُن کا ایک ایک شعر آزادی کی نوید بن جائے گا۔ شاعر نے دراصل اپنی شاعری پر فخر و مسرت کا اظہار بھی کیا ہے کہ میری شاعری آزادی کی پیامبر ہے۔

۶۔ شانِ حمدیت کی دنیا میں بڑھا دی جائیگی بے نشاں ہو گا یہ سرمایہ داری کا نشاں ہو جائیگا

مشکلات: بے نشاں ہونا: مٹ جانا، سرمایہ داری: دولت پرستی کا نظام جس میں آدمی ساری اخلاقی قدروں کو پامال کر کے غریبوں اور مزدوروں کا استحصال کرتا ہے۔

تشریح اسلام کا وہ سنہرا دور جس کی پیش گوئی شاعر کر رہا ہے، جب آئے گا تو اس میں حقیقی مساوات قائم ہوگی۔ عزت کا معیار نیکی اور شرافت کو ٹھہرائے جائیگا اور مزدور اور غریب آدمی پر نہ صرف ظلم و زیادتی نہ ہوگی۔ بلکہ اُن کی صحیح معنوں میں عزت ہو گی۔ اس کے ساتھ ہی سرمایہ داری نظام ختم ہو جائے گا اور کسی امیر آدمی کو جرأت نہیں ہوگی کہ وہ اپنی دولت کی وجہ سے کسی غریب آدمی کو ظلم کا نشانہ بنا سکے۔

۷۔ ڈھالی جائے گی بنا یورپ کے استعمار کی ایشیا آپ اپنے حق کا پاسباں ہو جائیگا

مشکلات: بنا: بنیاد، استعمار: زمین یا ملک کی ہوس میں کسی آزاد ملک کو غلام بنا لینا۔ نوآبادیاتی نظام، پاسبان: محافظ، نگران

تشریح شاعر پیش گوئی کرتا ہے کہ مستقبل میں یورپ کے نوآبادیاتی نظام کی بنیاد اکھاڑ دی جائے گی۔ غلام اور پس ماندہ ملک یورپ کی غلامی سے نجات حاصل کر لیں گے۔ وہ خود مختار ہوں گے اور اس طرح ایشیا کے تمام ملک یورپی طاقتوں کے محتاج ہونے کے بجائے خود اپنے قدموں پر کھڑے ہوں گے اور اپنے حقوق کی خود حفاظت اور پاسبانی کریں گے۔

۸۔ نغمۂ آزادی کا گونجے گا حرم اور دیر میں وہ جو دارالحرب ہے دارالامان ہو جائیگا

مشکلات: حرم، مسجد۔ دیر: بت خانہ، دارالحرب: جنگ و لڑائی کا گھر، وہ ملک جہاں کافروں کی حکومت ہو اور مسلمانوں کو مذہبی فرائض سے روکا جائے۔

دارالامان: امن کا گھر۔ وہ ملک جہاں امن ہو۔

تشریح ہندوستان اور دیگر اسلامی ملک جہاں اب انگریزوں کا قبضہ ہے اور جہاں اب ظلم و ستم داد و خوف و ہراس کا دور دورہ ہے، ایک دن آزاد ہو جائیں گے مسجدیں اور بت خانے آزاد ہو جائیں گے اور ہر مذہب کے پیروکار کو اپنی مذہبی رسموں پر عمل کرنے کی آزادی ہوگی پھر یہ ملک جنگ و جدال اور ظلم سے نجات پا جائیں گے اور ہر طرف امن و سکون کا دور دورہ ہوگا۔

۹۔ ہم کو سودا ہے غلامی کا کہ آزادی کی دھن چند ہی دن میں ہمارا امتحان ہو جائے گا

مشکلات: سودا: جنون، عشق۔ دھن: لگن، شوق

تشریح ہم بہت دعوے کرتے ہیں کہ ہمیں آزادی سے عشق ہے اور غلامی سے نفرت ہے۔ اس بات کا پتہ جلد ہی چل جائے گا کہ اس دعوے میں ہم کتنے سچے ہیں۔ جب آزادی کی باقاعدہ جنگ لڑی جائے گی تو جو لوگ جان و مال کی قربانیاں دیں گے وہ اس امتحان میں کامیاب ٹھہریں گے باقی ناکام قرار پائیں گے۔

۱۰۔ اس بشارت کو سمجھ اک دل خوش کن قیاس جس کو سن کر ہر مسلماں شادماں ہو جائیگا

مشکلات: بشارت: خوش خبری۔ دل خوشکن: دل کو خوش کرنے والا۔ قیاس: تصور، گمان۔ شادماں: خوش، مسرور۔

تشریح شاعر نے جو خوشخبریاں دی ہیں یعنی آزادی و خود مختاری اور یورپ کے زوال کی۔ اُسے محض یہ نہ سمجھا کہ جی دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے، یہ محض میرا تصور اور گمان نہیں ہے بلکہ بالکل سچی اور حقیقی باتیں ہیں جو ضرور وقوع پذیر ہوں گی اور مسلمان انہیں سُن کر اور ظہور میں آتے ہوئے دیکھ کر بے حد خوشی محسوس کریں گے۔

۱۱۔ سچ ہے میرا حرف حرف اور جس کو اس میں شک ہے آج
دیکھ لینا کل میرا ہم داستاں ہو جائے گا

مشکلات: ہم داستاں: ایک ہی انداز میں واقعہ یا کہانی بیان کرنے والے

تشریح میری ان باتوں کا ایک ایک حرف درست ہے جو باتیں میں نے کہی ہیں یہ سچی رہیں گی اور جو لوگ آج ان پر شک کر رہے ہیں۔ وہ بہت جلد

میرے ہم خیال ہو جائیں گے اور میری پیش گوئیوں کی تائید و تصدیق کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔
اس نظم میں مولانا ظفر علی خاں نے ایشیا کی آزادی اور انگریزی سامراج کے زوال کی جو پیش گوئیاں فرمائی ہیں۔ وہ صحیح ثابت ہو چکی ہیں۔ لیکن جہاں تک فلسطین کی آزادی اور اسلامی دنیا میں باغیرت اور اولوالعزم قیادت کا تعلق ہے سرمایہ داری نظام کے خاتمے۔ مزدور کی خوشحالی اور ایشیا کی ترقی کا حل خود مختاری اور امن دنیا کا معاملہ ہے، یہ پیش گوئیاں ابھی تک شرمندہ تعبیر نہیں ہوئیں اور مسلمان ملک آزاد ہوتے ہوئے بھی سیاسی، تہذیبی اور معاشی طور پر غلام ہیں اور اب انگریز کی جگہ روسی امریکی اور بھارتی سامراج نے لے لی ہے۔

ظفر علی خان کی شاعری

ظفر علی خان برصغیر کے معروف سیاسی لیڈر، بلند پایہ صحافی، شعلہ بیان مقرر اور قادر الکلام شاعر تھے انہوں نے صحافت اور سیاست کی طرح دنیائے شعر و ادب میں بھی اپنی عظمت و برتری کا نقش قائم کیا۔ "نگارستان" "چمنستان" "بہارستان" اور "حلیات" وغیرہ ان کی شاعری کے مختلف مجموعے ہیں۔
وہ ایک قادر الکلام شاعر ہیں موضوعات کے اعتبار سے ان کی شاعری میں بڑا تنوع ہے۔ حمد و نعت کے میدان میں ظفر علی خان کو منفرد حیثیت حاصل ہے۔ اس کے ساتھ اسلام اور اسلامی روایات سے والہانہ عقیدت نے ظفر علی خان کی شاعری میں دینی اخلاقی اور تاریخی موضوعات کو بڑی اہمیت دی ہے۔ اتحاد عالم اسلامی کا رجحان ان کی ملی شاعری کا اہم پہلو ہے۔ انہوں نے اسلامی تاریخ کے بعض واقعات کو اختصار کے ساتھ دل نشین طریقے سے بیان کر کے اسلام کی سادگی، سچائی اور عدل و انصاف کے خوبصورت مرقعے پیش کئے ہیں۔
ظفر علی خاں کی شاعری کا اہم ترین موضوع ملکی سیاست ہے۔ انہوں نے خود سیاست اور آزادی میں بھرپور حصہ لیا۔ ان کی بے شمار سیاسی نظمیں تحریک آزادی کے ہنگامہ خیز دور کی یادگار ہیں ان کی سیاسی شاعری میں سائمن کمیشن کا مقاطعہ، شہید گنج اور تحریک پاکستان کے مختلف مراحل کی تفصیل ملتی ہے۔ ظفر علی خاں کی سیاسی شاعری بلاشبہ ایک وقتی چیز تھی۔ لیکن یہ شعری سرمایہ اس لحاظ سے مستقل قدر و قیمت کا حامل ہے کہ یہ تاریخ آزادی میں منظوم یادداشت اور اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے ان کی بعض سیاسی نظمیں، ہنگامی حالات کی پیداوار ہونے کے باوجود تعلق و دوام کی حامل ہیں۔
ظفر علی خاں کی شاعری کا ایک اہم رنگ ان کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری ہے۔ ان کی طنزیات کی حدود بہت وسیع ہیں مختلف افراد جماعتیں، ادارے اور تحریکیں بھی اس کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ ہندوستان کا بڑے سے بڑا لیڈر بھی ان کی طنز گرفت سے نہیں بچ سکا۔ مگر وہ کسی شخص کو ذاتی وجوہ

کی بنا پر ہنر کا نشانہ نہیں بناتے۔ بلکہ قومی اور ملی وجوہ کی بنا کر ایسا کرتے ہیں۔ مغربی تہذیب کے متعلق ان کا شعر ملاحظہ ہو۔ جو بڑے جارحانہ رنگ کا حامل ہے ؎

تہذیب نو کے منہ پہ وہ تھپڑ رسید کر ۔۔۔ جو اس حرام زادی کا حلیہ بگاڑ دے

مولانا ظفر علی خاں نے چند غزلیں بھی کہی ہیں۔ مگر ان کے مزاج کو غزل سے مناسبت نہیں تھی اس لیے ان کی غزلیں اردو غزل گوئی کی تاریخ میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں۔

ڈاکٹر محمد اقبال ۱۸۷۷ء ۱۹۳۸ء

حالات زندگی

اقبال کشمیری برہمنوں کے ایک خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے آباؤ اجداد نے ایک بزرگ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا۔ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ والد شیخ نور محمد ایک درویش صفت انسان تھے۔ ابتدائی تعلیم مولوی سید میر حسن سے حاصل کی۔ اس کے بعد سکاچ مشن سکول سے میٹرک اور مرے کالج سے انٹرمیڈیٹ کے امتحان پاس کیے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے اور ایم اے (فلسفہ) کے امتحانات امتیازی حیثیت سے پاس کیے۔ کچھ عرصے تک اورینٹل کالج لاہور اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھاتے رہے۔

۱۹۰۵ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ گئے۔ جرمنی سے پی۔ ایچ۔ ڈی اور انگلستان سے بیرسٹر لاء کی ڈگری حاصل کی۔ کچھ عرصہ اپنے استاد پروفیسر آرنلڈ کی جگہ لندن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر بھی رہے مگر جلد ہی ملازمت چھوڑ دی۔ ۱۹۳۴ء میں وکالت بھی ترک کر دی۔ ۱۹۲۶ء میں مجلس قانون ساز کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے سالانہ جلسے منعقدہ الہ آباد میں مسلمانوں کے لیے ایک الگ مملکت کا تصور پیش کیا۔ گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے دوبار یورپ کا سفر اختیار کیا۔ حکومت افغانستان کی دعوت پر ایک بار افغانستان بھی تشریف لے گئے۔

آخری پانچ سالوں میں صحت خراب ہو گئی۔ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو لاہور میں فوت ہوئے اور بادشاہی مسجد کے پاس دفن ہوئے۔

تصانیف: اہم تصانیف یہ ہیں:

(ا) **شاعری:** بانگ درا۔ بال جبریل۔ ضرب کلیم۔ اسرار و رموز۔ پیام مشرق۔ جاوید نامہ ارمغان حجاز۔ زبور عجم۔ پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق۔ مسافر

(ب) **نثر:** تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ۔ حرف اقبال۔ مکاتیب اقبال۔ خطبات اقبال

علم الاقتصاد۔ فلسفہ وعجم۔ اقبال اُردو کے عظیم ترین شاعر ہیں۔ وہ اپنے نظریات اور شاعرانہ عظمت کی بناء پر اُردو شاعری کی تاریخ میں ایک ایسے روشن مینار کی حیثیت رکھتے ہیں جس سے شاعر اور ادیب صدیوں تک اکتساب فیض کرتے رہیں گے۔ علامہ اقبال کو اُردو شاعری کی آبرو کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

اُنھوں نے اسلام کے انقلابی نظریۂ حیات کے ذریعے مسلمانوں کو بلندیٔ کردار، عمل پیہم جدوجہد اور استقلال کا درس دیا۔ اپنی شاعری کے ذریعے ایک طرف تو انھوں نے دُنیا کے مسلمانوں اور خصوصاً ہندوستان کے مسلمانوں کے ذہنوں میں ایک عظیم الشان انقلاب برپا کیا۔ دوسری طرف اُنھوں نے فن اور اظہارِ بیان کے ایسے دلکش پیرائے ایجاد کیے۔ جن کی مثال اُردو اُردو شاعری میں نہیں ملتی۔ اُن کی شاعری صحیح معنوں میں "الشعراء تلامیذ الرحمٰن" (شاعر براہِ راست خدا کے شاگرد ہوتے ہیں) کا زندہ ثبوت ہے۔ ان کے انقلابی نظریۂ حیات اور شاعرانہ عظمت کی بناء پر انہیں "حکیم الامت" اور "شاعرِ مشرق" جیسے القابات سے یاد کیا جاتا ہے۔

اقبال نے اپنی شاعری کا آغاز روایتی طور پر غزل گوئی سے کیا اور دورانِ تعلیم ہی بلند پایہ مشاعروں میں شریک ہو کر دادِ تحسین حاصل کی لیکن جلد ہی انھوں نے روایتی ڈگر سے ہٹ کر اپنی شاعری کا نیا رُخ متعین کیا جو دوسروں سے منفرد بھی تھا اور ایک خاص پیغام کا حامل بھی۔ ان کی شاعری کے بارے میں مندرجہ ذیل نکات زیادہ اہم ہیں۔

(۱) قومی اور ملی شاعر: اقبال نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو اسلام کی عظمت اور مسلمانوں کی اصلاح کیلئے استعمال کیا۔ وہ صحیح معنوں میں ایک اسلامی، قومی اور ملی شاعر تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کو ان کے اسلام کے کارنامے یاد دلا کر ان کی عزت و حمیت کو جگانے کی کوشش کی تاکہ وہ دُنیا میں دوبارہ اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر سکیں۔ ایک حساس اور باشعور انسان کی طرح اپنی ملت کی پستی اور زوال کا تجزیہ کر کے اُنھوں نے مسلمانوں کو باہمی اتحاد و اتفاق کے رشتے میں منسلک ہونے کا مشورہ دیا۔ اپنی ملت کے لیے علامہ اقبال کا پیغام دراصل قرآن کا پیغام ہے۔ اقبال کی تمام قومی اور ملی نظمیں مثلاً شمع و شاعر، شکوہ، جواب شکوہ، خضرِ راہ، طلوعِ اسلام وغیرہ مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے جگانے کی کوششیں ہیں۔

(۲) انقلابی اندازِ فکر: اُنہوں نے مسلمانوں کو اپنے اندر انقلابی روح پیدا کرنے کی تلقین کی جو ترقی کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ اُنھوں نے جمود کو ختم کر کے عزم و ہمت اور عمل و حرکت پر زور دیا۔ کیونکہ عمل کے بغیر کوئی منزل سر نہیں ہو سکتی۔ اُن کے نزدیک کائنات کا ہر ذرہ سرگرمِ عمل ہے اور عمل کا دوسرا نام جہاد ہے۔ ؎

خطِ تسلیم طبیعت کو سازگار نہیں ۔۔۔ وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی روحِ اُمم کی حیات، کشمکشِ انقلاب

---

(۳) تہذیبِ مغرب پر تنقید: علامہ مغرب پرستی اور مغربی تہذیب کی نقالی کے سخت خلاف تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کو اس تہذیب کے کڑوے پھلوں کی تلخی سے آگاہ کرتے ہوئے انہیں تلقین کی کہ وہ اپنے آپ کو مغربی تہذیب کے طلسم سے آزاد کریں۔ اگر وہ سیاست افرنگ کی عیاریوں سے آزاد ہو کر آزاد ذہن کے ساتھ نہ سوچیں گے تو کبھی بھی غلامی اور پستی کے گڑھے سے نہ نکل سکیں گے۔ ؎

اُٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

---

(۴) اتحادِ اسلامی: علامہ اقبال اتحادِ اسلامی کے زبردست حامی تھے۔ مغربی سامراج نے جس طرح اپنی ریشہ دوانیوں کے ذریعے مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر سلطنتِ عثمانیہ کو تباہ کر دیا۔ اقبال کو اس سے سخت صدمہ ہوا۔ وہ ہمیشہ مسلمانوں کو نسلی اور علاقائی امتیازات ختم کر کے اسلام کے جھنڈے تلے جمع ہونے پر اُکساتے رہے ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے نیل کے ساحل سے لے کر تابہ خاکِ کاشغر

تہ و بالا ہو جا کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا نہ ایرانی رہے باقی، نہ تورانی، نہ افغانی

---

(۵) مردِ مومن کا تصور: اقبال نے اپنے آئیڈیل انسان کو مردِ مومن کے نام سے موسوم کیا۔ اقبال کے نزدیک مردِ مومن بننے کے لیے فقر و حق اور بعض دوسری خصوصیات کا پیدا کرنا ضروری ہے۔ اقبال کا مردِ مومن وہ مردِ حُر ہے جو ہمیشہ حق کی حمایت اور باطل کی مخالفت میں صف آرا نظر آتا ہے۔ وہ تمام صفات کا حامل ہوتا ہے جو ہر اس انسان میں ہونی چاہئیں جسے زمین پر خدا کا نائب بنا کر بھیجا گیا۔ ؎

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

ہر حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

---

(۶) نظریۂ خودی: اقبال کی فکر اور فلسفہ میں اُن کا نظریۂ خودی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ خودی کا مطلب ہے احساسِ نفس اور تعینِ ذات۔ اس سلسلے میں اقبال نے آنحضورؐ کے ایک فرمان کا حوالہ دیا ہے کہ "اپنے اندر اوصافِ خداوندی پیدا کرو" (تخلّقوا باخلاق اللہ) یعنی انسان اپنی مثبت اَنا (EGO) کی حفاظت، تحریت اور استحکام کی کوشش کرے۔ اس طرح اس میں اطاعتِ الٰہی، ضبطِ نفس اور خود شناسی کی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔ اقبال کا نظریۂ عشق بھی خودی کے استحکام میں مدد ہے۔

(۷) نظریۂ عشق: اقبال نے عقل و دانش کا موازنہ کرتے ہوئے عقل پر عشق کو فوقیت دی ہے۔ عشق سے مراد سچا جذبہ، لگن اور وابستگی ہے جو مقصدِ زندگی کی تکمیل کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ اقبال کے نزدیک انسان کی خودی اس وقت تک مستحکم نہیں ہو سکتی جب تک وہ عشق اختیار نہ کرے۔ مردِ مومن کے لیے بھی جادۂ عشق طے کرنا انتہائی ضروری ہے۔ تسخیرِ کائنات عشق کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔

(۸) تغزل کا منفرد انداز: اگرچہ نظم نگار کی حیثیت سے اقبال کی شہرت زیادہ ہے لیکن ان کی غزلیں بھی، اردو غزل گوئی کی تاریخ میں منفرد مقام رکھتی ہیں۔ ان کا مزاج تغزل کے تقاضوں سے پوری طرح مناسبت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی نظم میں تغزل کی حقیقی روح جاری و ساری ہے۔ ان کی غزلوں میں حُسن و عشق کے سچے جذبات بھی ہیں اور فلسفہ و تصوف، اخلاق و سیاسیات اور نفسیات بھی۔ مگر شاعرانہ لطف ہر جگہ موجود ہے

(۹) فنی عظمت: اقبال فنی اعتبار سے بھی ایک عظیم شاعر ہیں۔ انھوں نے غزل، رباعی، قطعہ، مثنوی اور مسدس بھی لکھے ہیں۔ اور ہر صنف کو نہایت کامیابی کے ساتھ نبھایا ہے۔ انھوں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے نئے نئے سانچے استعمال کیے ہیں۔ ان کی بعض نظمیں مثلاً مسجدِ قرطبہ، ساقی نامہ، خضرِ راہ وغیرہ انقلابی افکار کے علاوہ فنی اور شاعرانہ محاسن کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان کے کلام میں نادر تشبیہات، لطیف استعارات ایجاز و اختصار، اثر انگیزی، سوز و گداز اور حُسنِ ادا کی بہت اچھی مثالیں نہایت کثرت سے ملتی ہیں۔

مختصر یہ کہ وہ عصرِ حاضر کے عظیم انقلابی شاعر ہیں۔

خطاب بہ جوانانِ اسلام

تعارف علامہ اقبال نے یہ نظم ۱۹۱۲ء میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں پڑھ کر سنائی۔ یہ جلسہ اسلامیہ کالج لاہور کے میدان میں جمیعیہ ہال کے عین سامنے منعقد ہوا تھا۔ اس جلسے میں اقبال نے اس نظم کے علاوہ دیگر متفرق چیزیں بھی سنائیں۔

یہ نظم علامہ مرحوم کے پہلے اردو مجموعہ کلام "بانگ درا" میں شامل ہے۔

مرکزی خیال قرونِ اولیٰ کے مسلمان اپنے مضبوط اخلاقی کردار کی بدولت پوری دنیا میں ایک منفرد شان کے مالک تھے، مگر نئی نسل اپنے آباؤ اجداد کی تہذیبی و ثقافتی اور علمی روایات سے بے بہرہ ہے۔ امتِ مسلمہ کے زوال کا یہی سبب ہے۔

تشریح

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے — وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

مشکلات: تدبر کرنا: غور و فکر کرنا۔ سوچنا۔ گردوں: آسمان۔ یہاں مراد ہے قوم۔

تشریح: اقبال مسلم نوجوانوں سے مخاطب ہیں۔ کہتے ہیں کیا تو نے کبھی اس امر پر بھی غور کیا ہے کہ تو کون سے آسمان کا ٹوٹا ہوا ستارہ ہے؟ یعنی تو کس قوم سے تعلق رکھتا ہے۔ تیرے باپ دادا کون تھے؟ اقبال دراصل یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اے مسلم نوجوان، تو ملتِ اسلامیہ سے تعلق رکھتا ہے اور تیرے بزرگوں میں بڑی خوبیاں تھیں، افسوس کہ وہ تجھ میں نظر نہیں آتیں (اگلے شعروں میں وہ خوبیاں بیان کی ہیں) یہاں شاعر نے مسلم قوم کو گردوں سے اور مسلم جوان کو ٹوٹے ہوئے ستارے سے تشبیہ دی ہے۔

تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں — کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا

مشکلات: آغوشِ محبت: محبت کی گود۔ تاجِ سرِ دارا: دارا بادشاہ کا تاج۔ دارا ایران کا معروف حکمران گذرا ہے۔ یہاں مراد ہے ایرانی شہنشاہیت۔

تشریح: گذشتہ شعر میں اقبال نے مسلم نوجوان سے سوال کیا تھا کہ تو کس قوم سے تعلق رکھتا ہے؟ یہاں خود ہی اس کا جواب دیا ہے کہ تجھے ایک ایسی قوم نے اپنی محبت کی گود میں پالا ہے یعنی تو اسی قوم کا ایک فرد ہے جس نے اپنے عظیم الشان فرمانروا کا تاج بھی پاؤں میں کچل ڈالا تھا۔ (دارا تو بہت پہلے مر چکا تھا۔ یہاں اس کا تاج ایرانی شہنشاہیت کی علامت ہے) یعنی مسلمان نے

ایران جیسی عظیم سلطنت کو بھی مسخر کر لیا تھا۔ خیال رہے کہ اس مقدس سلطنت (ایران، آج کے امریکہ و برطانیہ کی طرح ایک عظیم الشان سلطنت (EMPIRE) تھی۔ اس کا تختہ اُلٹ دینا تاریخ عالم میں عرب مسلمانوں کا ایک غیر معمولی کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ اور اقبال کے نزدیک مسلم نوجوان کے لیے یہ بات باعث فخر ہونی چاہیے۔

تمدن آفریں، خلّاقِ آئینِ جہانداری — وہ صحرائے عرب، یعنی شتربانوں کا گہوارہ

مشکلات: تمدن آفریں: تہذیب اور تمدن پیدا کرنے والے۔ خلّاقِ آئینِ جہانداری: سلطنت و حکمرانی کا دستور تیار کرنے والے۔ شتربان: اُونٹ چرانے والے لوگ۔ گہوارہ: مراد ہے وطن، علاقہ، شہر۔

تشریح: اقبال نے اس شعر میں دورِ اوّل کے مسلمانوں کی خوبیاں بیان کی ہیں۔ کہتے ہیں: اگرچہ وہ صحرائی علاقے کے بسنے والے تھے۔ جن کا کام زیادہ سے زیادہ اُونٹ چرانا ہوتا ہے۔ مگر اسلام نے انھیں اتنی عظمت بخشی کہ انھوں نے ترقی یافتہ دنیا کو ایک نئی تہذیب اور نئے تمدن سے روشناس کرایا۔ دنیا پر ان کا مزید احسان یہ ہے کہ انھوں نے حکمرانی کے قوانین و دستور وغیرہ بھی مرتب کر کے دُنیا کے سامنے پیش کیے۔

سماں "الفقر فخری" کا رہا شانِ امارت میں — بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

مشکلات: سماں: منظر۔ حالت۔ الفقر فخری: حضورؐ کی حدیث کی طرف اشارہ جس میں آپؐ نے فرمایا کہ الفقر فخری والفقر منی یعنی فقر میرے لیے باعثِ فخر ہے اور فقر میری ہی ذات سے قائم ہے۔ باآب و رنگ: فارسی کا یہ مصرع دراصل حافظ شیرازی کا ہے۔ آب سے مراد ہے چہرے کو پانی سے دھونا۔ رنگ سے غازہ سُرخی، خال سے چہرے پر تل بنانا اور خط سے مراد ہے بوڑھے کے مقام پر سیاہ لکیر کھینچنا۔ روئے زیبا کا معنی ہے خوبصورت چہرہ۔ پورے مصرع کا مفہوم یہ ہے کہ بذاتِ خود خوبصورت چہرے کو حسین بننے کے لیے مصنوعی ذرائع کی ضرورت نہیں ہوتی۔

تشریح: آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے امیر تھے۔ مگر اس کے باوجود آپؐ کی زندگی فقر و درویشی میں گزری تھی۔ آپ کے نزدیک فقر باعثِ فخر تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر کوئی چیز بذاتِ خود اچھی ہو تو اُسے مصنوعی سہاروں اور تعریفوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ رسول پاکؐ کا ذاتی کردار اس قدر بلند اور پاکیزہ تھا، آپ کی شخصیت میں اس قدر پختگی تھی اور آپ کی ایک ایک ادا سے ایسا خلوص اور سچی صداقت ٹپکتی تھی کہ آپ کو دنیاوی امیروں کی طرح ظاہری شان و شوکت کی ضرورت نہ تھی۔ اقبال یہ اس سے یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ دورِ اوّل کے مسلمان بظاہر تو سادہ لوح لگتے تھے، مگر کیرکٹر کی مضبوطی اور بلندی کے سبب انھیں کسی کروّ فر کی حاجت نہ تھی۔ اس چیز کی وضاحت اس واقعے سے بخوبی ہو سکے گی کہ حضرت عمرؓ کے دور میں ایک بار کسی غیر مسلم بادشاہ کا سفیر مدینہ پہنچا اور

امیر المومنین سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ اس وقت شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ کوئی شخص سفیر کو سیدنا عمرؓ کے پاس لے گیا۔ آپ مدینے سے باہر ایک میدان میں زمین پر سو رہے تھے آپ کے جسم سے پسینہ بہتا ہوا زمین میں جذب ہو رہا تھا۔ سفیر یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ ملتِ اسلامیہ کا امیر اور اس قدر سادگی۔ چنانچہ وہ بڑا متاثر ہوا۔ اُسے متاثر کرنے والا صرف سیدنا عمرؓ کا کیریکٹر تھا۔ آج کے بڑے بڑے حکمرانوں کی شان و شوکت کا ہم پر اس لیے کوئی اثر نہیں ہوتا کہ وہ بڑے بڑے القاب و آداب اور خطابات، گارڈ آف آنر، ظاہری وقار اور کروفر کے باوجود کیریکٹر کے اعتبار سے بے حد کھوکھلے ہیں۔ لہٰذا کوئی شخص دل سے اُن کا احترام نہیں کر سکتا۔

گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے کہ منعم کو گدا کے ڈرسے بخشش کا نہ تھا یارا

مشکلات: گدائی: حالت فقر، تنگدستی۔ غیور: غیرت مند۔ منعم: امیر آدمی۔ کسی کو کوئی چیز دینے والا۔ یارا: ہمت۔ جرأت۔

تشریح: وہ لوگ تنگدستی اور غربت کے باوجود بھی اتنے غیرت مند تھے کہ کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا تو کجا اگر کوئی اُن کی ناداری سے تماش ہو کر ان کی مدد کرنا چاہتا تو وہ نہ صرف اُسے ٹھکرا دیتے بلکہ منعم کو ڈانٹ بھی دیتے کہ تم نے مجھے بھکاری سمجھا ہے۔ اُن کی خودداری اجازت نہ دیتی تھی کہ وہ کسی کا احسان اُٹھائیں لہٰذا کسی امیر آدمی کو ہمت نہ پڑتی تھی کہ ان کے سامنے کوئی چیز بطور عطیہ پیش کرنے کی جسارت کرے۔ دراصل اقبال مغربی حاضر کے مسلمان کو آئینہ دکھا رہے ہیں۔ کہ تیرے باپ دادا کا قریہ کردار تھا اور تو ایک مستقل بھکاری ہے جس نے زبان اور لباس سے لے کر تمدن و ثقافت تک سب کچھ غیروں سے مانگ رکھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مسلم نوجوان کو، جو درحقیقت اقبال کی ساری امیدوں کا مرکز ہیں۔ تاکید کر رہے ہیں کہ تم زندگی میں خودداری اور غیرت کو ہاتھ سے کبھی نہ جانے دینا۔

غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے جہاں گیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا

مشکلات: جہانگیر: دُنیا کو فتح کرنے والا۔ جہاں بان: دنیا پر حکومت کرنے والا۔ جہاں آرا: دُنیا کو سنوارنے والا۔

تشریح: اقبال قرنِ اوّل (دورِ اوّل) کے مسلمانوں کی خوبیاں بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ اُن کے اندر اتنی صفات تھیں کہ میں اُنھیں بیان ہی نہیں کر سکتا۔ اُن صحرا نشینوں کی ساری زندگی صحراؤں اور بیابانوں میں گذری مگر یہ اسلام کا اعجاز ہے کہ ایمان لانے کے بعد اُنھوں نے دُنیا کے ایک بڑے حصّے کو نہ صرف فتح کیا، بلکہ ایک جدید طرز کی سلطنت قائم کر کے دکھائی۔ دُنیا کے نظام کو سنوارا، حکومت اور حکمرانی کے اصول و قوانین وضع کیے۔ اصلاحات جاری کیں اور ایک مثالی نظام کا بہترین نمونہ

(خلافتِ راشدہ کی شکل میں) پیش کیا۔

اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں مگر تیرے تخیل سے فزوں تر ہے وہ نظارہ

مشکلات: تخیل: تصور۔ فزوں تر: بلند، زیادہ وسیع۔

تشریح: مسلم نوجوان اپنے باپ دادا کے کارناموں سے ناواقف ہے۔ لہٰذا اقبالؒ ان کی ایک جھلک دکھانے کے بعد اُسے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ میں ان کی عظمت اور ان کی حیرت تفصیل اور وضاحت کے ساتھ بیان کر سکتا ہوں۔ مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ وہ لوگ جس بلندی پر فائز تھے، تو اس کا تصور ہی نہیں کر سکتا۔ یعنی وہ جتنے عظیم اور بلند تھے تو اتنا ہی کم تر اور معمولی ہے۔

تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی کہ تو گفتار، وہ کردار، تو ثابت، وہ سیارا

مشکلات: آبا: باپ دادا، بزرگ۔ گفتار: بات چیت یعنی محض باتیں۔ ثابت: جامد۔ جس میں کوئی حرکت نہ ہو۔ سیارہ: متحرک گردش کرنے والا۔

تشریح: کہتے ہیں اے نوجوان، تجھے اپنے بزرگوں اور باپ دادا سے کوئی نسبت نہیں وہی جانتا ہے۔ اُن کے اور تمہارے علم، اخلاق، کردار، حتیٰ کہ طرزِ گفتگو تک میں زمین آسمان کا سا فرق ہے۔ تم محض باتیں کرتے ہو اور وہ سراپا عمل تھے۔ یعنی تم گفتار کے غازی ہو جبکہ وہ کردار کے غازی تھے۔ تمہارے اندر کوئی جوش و ولولہ نہیں۔ بالکل ساکن و ساکت ہو اور جمود کا شکار جبکہ تمہارے بزرگ سراپا حرکت تھے۔ کیونکہ باعمل انسان مسلسل کام کرتا رہتا ہے۔ وہ بانوتیوں کی طرح ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ نہیں رہتا۔ تمہارا حال تو "زمین جنبد نہ جنبد گل محمدؐ" والا ہے۔

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

مشکلات: اسلاف: بزرگ (سلف کی جمع) میراث: ورثہ۔ ترکہ۔ ثریا: ایک بلند ستارہ۔

تشریح: بزرگوں کے جس کردار نے ہمیں عروج عطا کیا تھا۔ ہم نے اُسے نہ سنبھالا، اس لیے ثریا کی بلندیوں نے ہمیں زمین کی پستیوں میں پھینک دیا۔ وراثت سے مراد پختہ ایمان اور خدا کی کتاب قرآن پاک اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام و فرمان، سیرت کی پختگی اور دینی روایات ہیں۔ چونکہ ہم نے ان سب چیزوں کو چھوڑ دیا اور دُنیاداری کے پیچھے لگ گئے۔ دگرگوں، عہدوں اور دولت کے حصول میں سرگرم ہو گئے، لہٰذا بحیثیت اُمت ہم زوال کا شکار ہو گئے۔ فطرت کا اصول ہے کہ: ؎

کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

اس اصول کی روشنی میں ہم دُنیا میں ذلیل و رسوا ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اجتماعی گناہوں کو کبھی معاف نہیں کرتا۔ افسوس کہ اُمتِ مسلمہ کے رویے میں تا حال کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دُنیا کے آئینِ مُسلّم سے کوئی چارا
مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں اُن کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

مُشکلات: آئینِ مُسلّم: مقررہ قانون۔ سیپارہ: تیس حصّے۔ چونکہ قرآن مجید کے تیس پارے ہیں، اس لیے ہر حصّے کو سپارہ کہتے ہیں۔ یہاں مراد ہے ٹکڑے ٹکڑے۔

تشریح: اگر حکومت اور اقتدار ہمارے ہاتھ سے جاتا رہا تو اس کا کچھ غم نہیں، کیونکہ اقتدار آنی جانی شے (چیز) ہے۔ کبھی ایک قوم کو دُنیا میں غلبہ حاصل ہوتا ہے اور کبھی دوسری کو۔ ایک وقت میں مُسلمان دنیا کی سب سے بڑی قوت تھے۔ مگر آج دوسری قومیں اقتدار پر قابض ہیں۔ دُنیا کی قیادت میں تِلک الایام نداولھا بین الناس کے مصداق ایک لحاظ سے تقاضائے فطرت ہے۔

اقبال کہتے ہیں جس چیز کے چھن جانے کا افسوس ہے وہ ہمارا علمی ورثہ ہے۔ اگر ہمارے آباؤ اجداد کا ذخیرۂ کتب ہمارے پاس رہتا تو ممکن ہے کہ ہم علم کے بل بوتے پر دوبارہ حکومت و اقتدار حاصل کر لیتے۔ مگر یہ سرمایہ تو اب یورپ میں منتقل ہو چکا ہے۔ اپنے بزرگوں کا علمی ورثہ یورپ میں دیکھ کر دل کو ٹھیس لگتی ہے۔

خیال رہے کہ انگریزوں نے ہندوستان پر قابض ہونے کے بعد یہاں کی تمام قیمتی چیزوں کو لوٹنے کے ساتھ ہمارے سب سے قیمتی خزانوں یعنی کتابوں اور علمی ذخیروں کو بھی یورپ میں منتقل کر دیا۔ آج لندن کے برٹش میوزیم اور انڈیا آفس لائبریری میں مسلمانوں کے تمام علوم و فنون سے متعلق قدیم قلمی نسخوں، مطبوعہ کتابوں اور نوادرات کا عظیم الشان ذخیرہ موجود ہے۔ انھیں وہاں دیکھ کر ایک صاحبِ احساس مسلمان کا رنجیدہ اور آزردہ ہونا فطرتی بات ہے۔ اقبال نے اسی دُکھ درد کا اظہار اس شعر میں کیا ہے۔

"غنی روزِ سیاہ پیرِ کنعاں را تماشا کن! کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را"

مُشکلات: غنی: شاعر کا تخلص ہے۔ پیرِ کنعاں: کنعان کا بوڑھا۔ مراد ہے حضرت یعقوب علیہ السلام۔ نورِ دیدہ اش: اس کی آنکھوں کا نور۔ یہاں اس سے مُراد ہیں حضرت یوسفؑ۔

تشریح: نظم کا آخری شعر اقبال کا اپنا نہیں بلکہ فارسی کے ایک شاعر مُلا محمد طاہر غنی کاشمیری کا ہے۔ اسی لیے اقبال نے اسے " " کے اندر دیا ہے۔ شعر کا ترجمہ ہے کہ اے غنی، تو پیرِ کنعان (حضرت یعقوبؑ) کی یہ نصیبی کو دیکھ کہ اُن کی آنکھوں کا نور (حضرت یوسفؑ) زلیخا کی آنکھوں کو روشن کر رہا ہے۔ اقبال نے اس شعر کو اُمتِ مُسلمہ کی (اپنے) علمی ذخائر سے محرومی حالت پر چسپاں کیا ہے۔ پیرِ کنعاں سے مراد ہے اُمتِ مُسلمہ۔ نورِ دیدہ سے مُراد ہے مُسلمان بزرگوں کا علمی ذخیرہ،

اور زلیخا سے ادب مراد ہے۔ شعر کا مفہوم یہ ہوگا: مسلمان اپنے علمی خزانوں سے غور تو محروم ہیں اور جو اس سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ غنی کاشمیری کے شعر سے حضرت یوسفؑ کے بارے میں کوئی اچھا تاثر قائم نہیں ہوتا۔ جو شخص باپ کو نظر انداز کر دے اور ایک بازاری قسم کی عورت (زلیخا) کو خوش کرنے میں مگن رہے، اس کی بے حسی میں کلام نہیں ہو سکتا۔ ہم کسی نبیؑ کے بارے میں نعوذ باللہ ایسا تصور ہرگز ہرگز نہیں لا سکتے۔ حقیقت حال صرف اتنی ہے کہ حضرت یوسفؑ کا زلیخا یا اس قسم کی کسی اور بازاری عورت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ ایک بلند کردار اور پاکباز انسان تھے۔ اُنھوں نے عزیزِ مصر کی بیوی کو ایک شان کے ساتھ ٹھکرا دیا تھا۔ پھر اُنھیں جب اپنے والد حضرت یعقوبؑ کے بارے میں علم ہوا تو حضرت یوسفؑ نے بھائیوں سمیت اُنھیں اپنے پاس بلوا لیا۔ دراصل غنی کاشمیری کا شعر جو تاثر دیتا ہے وہ جھوٹی روایات کے پیدا کردہ "یوسف زلیخا" کے معاشقے اور بیہودہ تصورات پر مبنی ہے۔ خدا کے ایک نبی کی پاکیزہ سیرت کے بارے میں عدم احتیاط بڑی فروگذاشت ہے، جس سے ایک مسلمان کے لیے بچنا ضروری ہے۔

طارق کی دُعا

تعارف | یہ نظم "بالِ جبریل" سے لی گئی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ بعض دیگر نظموں یعنی "دعا"، "مسجد قرطبہ" اور "ہسپانیہ" کی طرح یہ نظم بھی اقبال کے سفرِ اندلس کی یادگار ہے۔ مشہور مسلمان فاتح طارق بن زیادؒ جب اپریل ۷۱۱ء میں شمالی افریقہ سے ہسپانیہ کی سرزمین میں داخل ہوئے تو وہاں کے بادشاہ راڈرک سے باقاعدہ جنگ لڑنے سے قبل اُنھوں نے اپنے فوجیوں سے خطاب کیا تھا۔ اس موقع پر اُنھوں نے مسلمان فوجیوں اور سپہ سالاروں کی روایت کے مطابق اللہ تعالیٰ سے فتح و کامرانی کی دعا بھی کی ہوگی۔ اقبال نے حالات کی مناسبت سے اس دعا کا تصور کیا اور طارق کی ترجمانی کرتے ہوئے نہایت مؤثر و والہانہ اور جوشیلے انداز میں اس کو نظم کی صورت دے دی ہے۔ حقیقت ہے کہ یہ نظم کسی بھی صاحبِ ایمان شخص کے دل میں جہاد فی سبیل اللہ کا زبردست جذبہ پیدا کر دیتی ہے اور اپنی تاثیر میں جواب نہیں رکھتی۔

مرکزی خیال | نظم کے دو بند ہیں۔ اس میں طارق کے ہمراہی مجاہدین کی شجاعت، جانثاری

جہاد فی سبیل اللہ کے ذوق و شوق اور شوقِ شہادت کو بیان کیا گیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ لوگ اخلاق اور کردار کے اعتبار سے کتنے بلند تھے۔ نظم کا اختتام دعائیہ ہے جس میں مسلمانوں کے اندر جذبہ جہاد و شہادت کی دعا کی گئی ہے۔

نظم کی تشریح

یہ غازی، یہ تیرے پُراسرار بندے — جنہیں تُو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا — سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

مشکلات: غازی: اللہ کے راستے میں لڑنے والا۔ پُراسرار: بھید اور راز والی بات جو آسانی سے سمجھ میں نہ آسکے۔ ذوقِ خدائی: (۱) اللہ کا شوق و محبت (۲) اللہ کے اخلاق و صفات۔ (۳) حکومت کرنے کی اہلیت و قابلیت۔ دو نیم: دو ٹکڑے۔ ہیبت: خوف، رعب۔ رائی: ایک قسم کا بہت چھوٹا بیج۔

تشریح: اقبال طارق کی زبان سے اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔ خدایا یہ مجاہد جو محض تیری رضا کی خاطر طول، طویل اور دشوار گزار سفر کر کے اندلس کی سرزمین میں پہنچے ہیں۔ یہ بڑے ہی پُراسرار ہیں۔ ان کے بے مثال اور عجیب و غریب کارنامے سمجھ میں نہیں آتے انہیں تُو نے اپنی محبت سے سرفراز فرمایا ہے اور حکومت کرنے کے صحیح طریقے سکھائے ہیں۔ ان کے حملے اور یلغار کے سامنے صحرا اور دریا، دو حصوں میں تقسیم ہو کر انہیں راستہ دے دیتے ہیں اور پہاڑوں پر اتنا رعب طاری ہوتا ہے کہ وہ رائی کے دانوں کی طرح ان کے سامنے سمٹ جاتے اور راستے کی رکاوٹ نہیں بن سکتے۔

ان دونوں شعروں میں اقبال نے محض تخیلاتی بات نہیں کہہ دی۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ جب بھی مسلمانوں نے محض اللہ کی رضا کے لیے جہاد کیا ہے، اُونچے اُونچے پہاڑ، گہرے طوفانی دریا اور خوفناک جنگل اُن کا راستہ نہیں روک سکے اور روم و ایران جیسی کوہ قامت سلطنتیں اُن کے سامنے ریزہ ریزہ ہو گئی ہیں۔ ان کے پُراسرار ہونے کی بہت سی مثالوں میں سے صرف اسی ایک کا ذکر کافی ہے کہ جب طارق اپنی فوج لے کر اندرونِ ملک کی طرف بڑھا تو ایک صوبے کے گورنر نے اُسے روکنا چاہا، لیکن شکست فاش کھا کر بھاگ اُٹھا۔ یہ بھاگا شاہ راڈرک کے دربار میں پہنچا اور ان الفاظ میں طارق کے حملے کی رپورٹ دی۔ "ہمارے ملک پر ایسے آدمیوں نے حملہ کیا ہے کہ نہ اُن کا وطن معلوم ہے نہ اصلیت کہ کہاں سے آئے ہیں۔ زمین سے نکلے ہیں یا آسمان سے اُتر پڑے ہیں؟"

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

مشکلات: دو عالم: دونوں جہان۔ بیگانہ: غیر، الگ، لذتِ آشنائی: عشق کی لذت۔ خدا سے دوستی کا لطف۔

تشریح: اقبال اُن بے مثال غازیوں اور مجاہدوں کے حیرت انگیز کارناموں کا سبب بیان کرتے ہیں کہ دراصل ان کے دلوں میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق کا جذبہ موجیں مار رہا تھا اور عشق کی یہ وہ پاکیزہ اور ارفع و اعلیٰ قسم ہے کہ جس کو نصیب ہو جاتی ہے وہ دُنیا کی کسی چیز کی پروا نہیں کرتے۔ وہ ہر قسم کے خوف اور ڈر سے بے نیاز ہو جاتے ہیں اور دیوانہ وار آتشِ نمرود میں کود پڑتے اور طوفانی دریاؤں میں گھوڑے ڈال دیتے ہیں۔

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

مشکلات: مطلوب: تمنا، خواہش۔ مقصود: غرض، مدعا۔ مالِ غنیمت: وہ مال و دولت جو کفار سے جنگ کے نتیجے میں ہاتھ آتا ہے۔ کشور کشائی: ملکوں کو فتح کرنا۔

تشریح: اقبال اللہ کے اُن سپاہیوں کی دوسری خصوصیت جس کی وجہ سے تھوڑے عرصے میں مشرق و مغرب تک ابرِ رحمت کی طرح دُنیا پر چھا گئے، یہ تھی کہ وہ شہادت یعنی اللہ کے راستے میں لڑ کر مرنے کو اپنی زندگی کا اوّل و آخر مقصد قرار دے چکے تھے۔ اُن کی انتہائی آرزو یہ ہوتی تھی کہ وہ خدا کے دشمنوں کا مقابلہ کرتے ہوئے جان دے دیں۔ ورنہ جہاں تک مالِ غنیمت کا یا محض ملکوں کو فتح کرنے کا تعلق ہے۔ وہ ہرگز ایسا شوق نہ رکھتے تھے۔ حالانکہ ان کی زندگی میں بار بار ایسے موقعے آتے تھے کہ مال و دولت کے ڈھیر اُن کے قدموں میں ہوتے تھے، مگر وہ اُن کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھتے تھے۔ اسی بات کو اقبال نے ایک دوسرے مقام پر محمود غزنوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے ؎

قوم اپنی جو زر و مالِ جہاں پر مرتی بُت فروشی کے عوض بُت شکنی کیوں کرتی

خیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے قبا چاہیئے اس کو خونِ عرب سے

مشکلات: خیاباں: کیاری، چمن۔ منتظر: انتظار کرنے والا۔ لالہ: ایک قسم کا سُرخ پھول جس کے اندر سیاہ داغ ہوتا ہے۔ قبا: لباس۔

تشریح: اس شعر میں استعارے کی زبان استعمال کی گئی ہے۔ خیاباں سے مراد یورپ ہے جو بہرحال خوش منظر ہے۔ لالہ کا استعارہ اُن باشعور اور دردمند لوگوں کے لیے ہے جن کا ضمیر حق و صداقت کا متلاشی اور منتظر تھا۔ قبا نظام کے معنوں میں ہے اور خونِ عرب سے

مراد مجاہدوں اور شہیدوں کی محنت ہے جس کے نتیجے میں اسلام کا پیغام یورپ کی فضاؤں میں پہنچا۔

طارق اپنی دعا کو جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ الٰہی یورپ کی فضائیں صدیوں سے تیرے دین کی منتظر ہیں اور صاحب ضمیر لوگ کسی ایسے پیغام کے لیے ترس گئے ہیں جو ان کے لیے اندھیروں میں روشنی کا کام دے سکے اور انہیں زندگی میں حسن اور وقار عطا کر سکے۔ اس کے لیے انہیں ایسے لباس کی ضرورت ہوگی جو عربی شہیدوں کے خون سے رنگین ہو۔ اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ جب اس پھول کی جڑوں کو عرب کا خون ملے گا تو اسے صحیح تازگی اور ترقی ملے گی اور یہ خوب بڑھے گا اور پھلے پھولے گا تاریخی نقطۂ نظر سے یہ بات بالکل درست ہے کہ سپین کو جو ترقی اور عظمت مسلمانوں کے دور میں نصیب ہوئی اس کی مثال پہلے ملتی ہے نہ بعد میں، اور پھر سپین کی اسلامی حکومت سے ہی یورپ کو دراصل علم و تہذیب کی روشنی حاصل ہوئی۔

کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا — خبر میں، نظر میں، اذانِ سحر میں

مشکلات : صحرا نشینوں: صحرا میں رہنے والے، بدو۔ یکتا: ممتاز، منفرد۔ خبر: علم اور معلومات۔ نظر: روحانی کمالات۔ اذانِ سحر: صبح کی اذان۔

تشریح : اقبال طارق کی زبان سے قرونِ اولیٰ کے عرب مجاہدین کی تعریف کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں۔ اے اللہ تو نے ریگستانوں میں رہنے والے بدوؤں کو ایسی خوبیاں عطا کر دیں، جن کی کسی دوسری قوم میں مثال نہیں ملتی۔ ہر قسم کے علم و فنون کو انہوں نے ایسی ترقی دی کہ دنیا نے انہیں کی نقل کرتے ہوئے زندگی گزارنے کے طریقے سیکھے۔ ان کی نظر میں زبردست وسعت اور گہرائی پیدا ہو گئی جس کے سبب سے اندھیرے کافور ہو گئے اور دلوں، دماغوں میں ایمان و یقین کی روشنی پیدا ہو گئی اور ان کے عمل سے دنیا یوں خواب غفلت سے بیدار ہوئی جس طرح صبح کی اذان کے ساتھ لوگ جاگ اٹھتے اور اندھیرے سے نجات حاصل کرنے کی خوشخبری پاتے ہیں۔

طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو — وہ سوز اس نے پایا انہی کے جگر میں

مشکلات : طلب: انتظار، خواہش۔ سوز: حرارت، گرمی، خلوص، محبت۔

تشریح : ان مجاہدین اور اولوالعزم مبلغین سے قبل (یعنی ظہورِ اسلام سے پہلے) اگرچہ انسان زندگی تو گزارتا تھا، مگر یہ زندگی کے نام پر ایک بدنما داغ تھا۔ وہ خلوص، وہ محبت، وہ ہمدردی وہ تپاک اور گرمجوشی جس کی انسانی ضمیر اور دل کو تلاش رہتی ہے، بالکل ناپید تھے

اور ساری انسانیت بے رحم مادہ پرستی، ملوکیت، سرمایہ داری اور ظلم و بے انصافی کے بوجھ تلے نیم جان حالت میں پڑی کراہ رہی تھی۔ یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا احسانِ عظیم ہے کہ انہوں نے اللہ کی ہدایت کے مطابق اپنے پیروکاروں کی ایسی تربیت فرمائی اور انہوں نے اس تعلیم کو ایسی محنت اور حکمت سے دوسرے انسانوں تک پہنچایا کہ انسانیت کو صدیوں پرانے سارے لاعلاج روگوں سے نجات مل گئی۔

اس شعر میں اسی بات کا اظہار کیا گیا ہے کہ دنیا بالخصوص یورپ کا انسان زندگی کے جس ارفع و اعلیٰ اور پاکیزہ انداز کے لیے صدیوں سے ترس رہا تھا، وہ اسے ان مجاہدین کے ہاتھوں حاصل ہو گئی۔ ان کے جگر کی گرمی نے زندگی کی ٹھنڈی مردہ رگوں میں نیا صحت مند خون دوڑا دیا۔

کشادِ درِ دل سمجھتے ہیں اس کو ہلاکت نہیں موت ان کی نظر میں

مشکلات: کشاد۔ فراخی، کھلنا۔

تشریح: قرونِ اولیٰ کے ان پاکباز مجاہدین کی ایک اور خوبی یہ ہے جس کو طارق کی زبان سے بیان کیا جا رہا ہے کہ وہ موت کو موت نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ یوں محسوس کرتے تھے جیسے اس عمل کے ساتھ ہی دل کا دروازہ کھل گیا ہے، جس سے محبوبِ حقیقی کا قرب بھی نصیب ہو گا اور دیدار بھی۔ ان لوگوں کو یقین تھا کہ موت انسان کو فنا نہیں کرتی، بلکہ یہ تو اخروی زندگی کا دروازہ ہے جہاں شہید ایسی نعمتوں اور انعامات کے سزاوار ہوں گے جن پر تمام جنتی رشک کریں گے۔ اس شعر میں علامہ اقبال کے تصورِ موت و حیات پر روشنی پڑتی ہے۔ اور ان کے اس قول کی تائید ہوتی ہے کہ ؎

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی ہے یہ شامِ زندگی، صبحِ دوامِ زندگی

دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے وہ بجلی کہ تھی نعرۂ لاتذر میں

نعرۂ لاتذر: لاتذر کا نعرہ۔ دراصل یہ قرآنِ پاک کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے، وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا ۝ (ترجمہ) اور نوح نے کہا۔ اے میرے رب زمین پر کافروں سے کسی کو سلامت نہ چھوڑ ○۔

تشریح: شاعر نے طارق کا ہم زبان ہو کر دعا کی ہے کہ یا اللہ مسلمان کے دل اور ضمیر میں وہ بجلیاں بھر دے جو کفر کی ساری قوتوں کو جلا کر راکھ کر دے اور دنیا میں خدا کا کوئی ایک منکر بھی نہ رہے۔

اس شعر میں اقبال نے اسلام کے نظریۂ جہاد کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جہادِ اسلامی کا مقصد و منشا یہ ہے کہ اللہ کی زمین پر صرف اور صرف اللہ کی حکمرانی ہونی چاہیئے اور کسی انسان یا انسانی قانون کو اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ اللہ کی مخلوق کو اپنا غلام بنالے۔ یہی نصب العین لے کر مسلمان مجاہدین باہر نکلتے ہیں اور دوسری حکومتوں کو انتباہ کرتے ہیں کہ اوّل تو مسلمان ہو جاؤ یا پھر اسلامی حکومت کی ماتحتی قبول کرو تاکہ انسان پر انسان کی حکومت کا سلسلہ رُک جائے۔ ورنہ آخری چارۂ کار کے طور پر لڑائی کے لیے تیار ہو جاؤ۔

طارق اندلس کی سرزمین پر کلمے کی سربلندی کے لیے آئے تھے اور اُن کی زبان سے کہلوا کے یہ کلمات عین فطری ہیں۔

عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے

مشکلات: عزائم: واحد عزم، پختہ ارادہ۔

تشریح: طارق دُعا مانگتے ہیں کہ اے اللہ یہ مجاہدین محض تیری خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنے گھروں سے نکلے اور دُور دراز مقام پر اجنبی زمین میں آئے ہیں۔ میں نے اِن کے اندر یقینِ محکم پیدا کرنے کی خاطر وہ کشتیاں تک جلوا دی ہیں، جن پر یہ بیٹھ کر افریقہ سے آئے ہیں، اب تو کرم فرما اور ان مجاہدین کے دلوں میں بلند اور پاکیزہ ارادوں کو بھرپور انداز میں بیدار فرما دے۔

اور نہ صرف یہ میدانِ جنگ میں تلوار کے جوہر دکھائیں، بلکہ ان کی نگاہوں اور تیوروں میں محبت، شفقت اور انسانی خیر خواہی کا وہ جوہر بھر دے کہ یہاں کے لوگ انہیں دیکھتے ہی ان کے گرویدہ ہو جائیں ——— اور اِن کی نگاہیں وہ کام کر جائیں جو میدانِ جنگ میں تلوار کرتی ہے۔

حقیقت بھی یہ ہے کہ مسلمان مجاہدین میدانِ جنگ میں تلوار سے تو چند ہزار افراد کو شکست دیتے تھے، مگر یہ اُن کا بے مثال حُسنِ سلوک اور اکرامِ انسانی تھا جو عام لوگوں کے دلوں کو فتح کرتا چلا جاتا تھا۔ اس طریقے سے ملک فتح کرنے کا کام بعض بے تیغ سپاہیوں یعنی تاجروں نے بھی کیا ہے۔ انڈونیشیا، ملائشیا اور مالدیپ وغیرہ اس کی چند روشن مثالیں ہیں۔ جہاں کبھی کوئی مسلمان فوجی داخل نہیں ہوا تھا اور لوگ نگاہِ مسلمان سے گھائل ہو کر اسلام کے قدموں میں آ رہتے تھے۔

طلوعِ اسلام

تعارف "بانگِ درا" کی آخری نظم ہے جسے ۱۹۲۳ء میں انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ اجلاس میں علامہ اقبال نے ترنم سے پڑھا تھا۔ اور سامعین نے اس سے بے پناہ اثر قبول کیا تھا۔

پس منظر ۱۹۲۳ء میں اسلامی دنیا کی صورتِ حال گزشتہ کئی سالوں کے مقابلے میں حوصلہ افزا اور اطمینان بخش تھی۔ ترکوں کو یونانیوں کے خلاف خاصی کامیابیاں حاصل ہو رہی تھی۔ یہاں تک کہ ستمبر ۱۹۲۲ء میں انہوں نے عصمت پاشا کی سرکردگی میں سمرنا پر قبضہ کر لیا۔ اس فتح پر ہندی مسلمانوں نے زبردست خوشیاں منائیں اور مسجدوں میں گھی کے چراغ جلائے۔ ترکوں کو مشرقی یونان اور اور نہ بھی واپس مل گئے ایران بھی انقلابی تبدیلیوں کی طرف گامزن تھا۔ مصر نے برطانوی اقتدار کے خلاف آزادی کا اعلان کر دیا۔ مراکش میں ہسپانوی فوج کے مقابلے میں مجاہد ریف عبدالکریم کا پلہ بھاری تھا۔ ہندوستان میں تحریکِ ترکِ موالات زوروں پر تھی۔ جس کے قیدیوں میں اسی فیصد مسلمان تھے۔ بیداری کی اس لہر نے اسلامیانِ ہند کے جذبات میں زبردست ہلچل مچا دی تھی۔ غرض یوں معلوم ہوتا تھا کہ سارا عالمِ اسلام سامراجیت کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔ اور غلامی کا جُوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکنے کے لئے انگڑائی لیکر بیدار ہو رہا ہے۔ علامہ اقبال جو اسلامی دنیا کے ایک ایک واقعے سے گہری دلچسپی رکھتے تھے اور اس سے شدید متاثر بھی ہوتے تھے۔ ان حالات سے بے خبر نہ تھے۔ "طلوعِ اسلام" اسی کیفیت کا پُرجوش فنکارانہ اظہار ہے۔

مرکزی خیال ہماری کتاب میں "طلوعِ اسلام" کے نو میں سے چھ بندوں کے پانچ پانچ شعر لئے گئے ہیں۔ اور ان میں امید افزا پیش گوئیاں کی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر پہلے اور دوسرے بند میں ملتِ اسلامیہ کی بیداری اور زوال و ادبار سے نجات کی امید دلائی گئی ہے۔ تیسرے میں مسلمان کو اس کی عظمت و اہمیت کا احساس دلایا گیا ہے۔ چوتھے اور پانچویں بند میں اتحاد و یقینِ محکم کی تلقین ہے کہ سارے دکھوں کا علاج یہی ہے۔ اور چھٹے بند میں ایک طرف خودی و خودشناسی کا درس دیا گیا ہے جبکہ دوسری جانب اخوت اور انقلاب کا درس ملتا ہے۔

نظم کی تشریح

دلیلِ صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی افق سے آفتاب ابھرا گیا دورِ گراں خوابی

مشکلات:- دلیل: ثبوت، سبب، شہادت تنک تابی: روشنی کا کم ہوجانا۔ دور: زمانہ گراں خوابی: دیر تک گہری نیند سونا، غفلت، مدہوشی۔

تشریح:- رات کے ابتدائی اور وسطی حصے میں ستاروں کی چمک بڑی تیز ہوتی ہے۔ مگر جب صبح قریب ہوتی ہے تو ستاروں کی چمک اور روشنی کم ہوجاتی ہے اور یہ اس امر کی علامت ہوتی ہے کہ اب سورج نکلنے والا ہے اور رات کی حکمرانی ختم ہونیوالی ہے۔

حضرت اقبالؒ نے عالمِ اسلام کی سیاسی بیداری کو استعارے کے انداز میں بیان فرمایا ہے۔ ڈوبتے ہوئے ستاروں کا استعارہ ان شہیدوں کے لئے ہے جو اسلامی دنیا کی آزادی کے لئے مختلف ملکوں میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کر رہے تھے۔ اور آفتاب کا استعارہ اس مجموعی بیداری اور آزادی کی تڑپ کے لئے ہے، جو ملتِ اسلامیہ میں پیدا ہو رہی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ ہندوستان سے لے کر ترکی تک مختلف ملکوں میں جو مسلمان حریت پسند اپنی زندگیوں کی قربانی دے رہے ہیں یہ اس امر کی شہادت ہے کہ غلامی کے اندھیرے ختم ہونے والے ہیں، آزادی کی صبح طلوع ہو رہی ہے اور روشن مستقبل کا سورج نکلنے والا ہے۔ یہ اس بات کی بھی علامت ہے کہ امتِ مسلمہ طویل گہری نیند سے جاگ اٹھی ہے اور وہ اب اپنی منزل تک پہنچ کر ہی دم لے گی۔

عروقِ مُردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی

مشکلات:- عروق: واحد عرق یعنی رگیں عروقِ مردہ مشرق: ایشیا کی مردہ رگیں۔ سینا: بوعلی سینا فارابی: دو مشہور فلسفی، عالم اور حکیم۔

تشریح:- مشرق یعنی ایشیا کے جسم کی رگیں مردہ ہو چکی تھیں اور یوں لگتا تھا کہ اب اس میں زندگی کی رمق کبھی پیدا نہیں ہوگی۔ مگر حیرت کی بات ہے کہ اب اس مردہ جسم میں زندگی کا نیا خون دوڑنے لگا ہے۔ ظاہر ہے یہ وہ راز ہے جس پر سینا و فارابی جیسے حکماء بھی ششدر رہیں کہ حکیموں کے نزدیک تو مردہ رگیں کبھی دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتیں۔

دنیا میں بہت سی قوموں مثلاً رومی، یونانی، مصری اقوام کی تاریخ بتاتی ہے کہ یہ قومیں زوال کی نذر ہوئیں اور ہمیشہ کے لئے ختم ہو کر رہ گئیں۔ انہیں دوبارہ زندہ کرنے کی ہر کوشش ناکام رہی۔ لیکن مسلمان قوم کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ اسے اپنی بے عملی اور دین سے

دوری کے صلیب کئی مرتبہ زوال آیا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد یہ دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاتی رہی۔ اسی قسم کی کیفیت عہدِ حاضر میں پیش آئی۔ بظاہر یوں لگتا تھا کہ پوری اسلامی دنیا سیاسی اور تہذیبی طور پر مفلوج ہو گئی ہے اور مغربی اقتدار کے سامنے دم توڑ گئی ہے لیکن بیسویں صدی کے نصف اول میں یہ قوم دوبارہ انگڑائی لے کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور اب یورپی سامراج کے مقابلے میں بھرپور زندگی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ ظاہر ہے مسلمان اور اسلامی تاریخ اس پر حیران ہیں کہ یہ معجزہ کیسے رونما ہو گیا۔

مسلمان کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے تلاطم ہائے دریا ہی سے گوہر کی سیرابی

مشکلات:۔ تلاطم ہائے دریا: دریا یا سمندر کے بہت سے طوفان۔ گوہر۔ موتی۔ سیرابی، شادابی۔ چمک۔

تشریح:۔ پہلے مسلمان محض نام کا مسلمان تھا ورنہ مسلمانوں والی حریت نوازی، غیرت، بہادری۔ جاں نثاری غرض کوئی خوبی بھی اس میں باقی نہیں رہی تھی۔ لیکن یورپی سامراج کے ظلم و ستم اور مغربی تہذیب کی تباہ کاریوں نے اس کی آنکھیں کھول دیں۔ وہ اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کا جائزہ لینے پر مجبور ہوا اور اپنی شاندار تاریخ اور عظیم تہذیب کو زندہ کرنے پر کمربستہ ہو گیا۔ یوں یورپی قوموں کی ترکتازیوں نے مسلمانوں کے لئے وہی کام کیا جو سمندر کے طوفان موتی کے لئے کرتے ہیں۔ طوفانوں کے تھپیڑے سہہ سہہ کر ہی بارش کا قطرہ قیمتی موتی کی صورت اختیار کرتا ہے۔

عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی

مشکلات:۔ درگاہِ حق: اللہ کا دربار شکوہِ ترکمانی: ترکوں کی شان و شوکت
ذہنِ ہندی: ہندوستانی مسلمانوں کی عقل و دانش نطقِ اعرابی: عربوں کی زبان دانی یا فصاحت و بلاغت۔

تشریح:۔ اقبال کہتے ہیں مجھے یوں نظر آ رہا ہے کہ رحمتِ باری کی گھٹائیں پھر اُمنڈنے والی ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے فضلِ خاص سے مسلمانوں کو پھر وہی خصوصیات عطا فرمائے گا جن کی بنا پر وہ اقوامِ عالم میں خاص امتیاز رکھتے ہیں یعنی انہیں وہی شان و شوکت حاصل ہو گی جو ترکوں کی عثمانی سلطنت میں حاصل تھیں، انہیں وہی علمی فضیلت اور ذہنی کمال حاصل ہوں گے جو ہندوستانی مسلمانوں کے طرۂ امتیاز رہے ہیں۔ اور وہی فصاحت و بلاغت، حسنِ بیان اور تاثیرِ کلام ملے گی جو عربوں کی خاص خوبی رہی ہے۔ یعنی عرب و عجم کی وہ ساری خوبیاں یکجا ہو کر مل جائیں گی جن کی وجہ سے اسے ماضی

میں خاص فضیلت حاصل تھی۔

ضمیرِ لالہ میں روشن چراغِ آرزو کر دے چمن کے ذرّے ذرّے کو شہیدِ جستجو کر دے

ضمیر: دل، روح لالہ: سرخ پھول جس کے اندر سیاہ داغ ہوتا ہے۔ اقبال نے لالہ کا استعارہ عام مسلمان کے لئے استعمال کیا ہے۔ ضمیرِ لالہ: مسلمان کا دل، روح۔ شہیدِ جستجو: تلاش و تجسس و تحقیق کا گرویدہ۔

تشریح:۔ اقبال اپنے آپ کو یا قائدینِ قوم کو مشورہ دیتے ہیں کہ جب حالات اتنے ساز گار ہیں اور فضا موافق ہو رہی ہے تو تمہارا بھی فرض ہے کہ تم مسلمان کے دل و دماغ میں آزادی کی خواہش اور آرزو کو مزید تیز کر دو اور اسلامی دنیا کے باغ کے ایک ایک پھول میں آزادی اور بیداری کی تڑپ پیدا کر دو۔ بالفاظِ دیگر جب لوہا گرم ہے تو فائدہ اٹھاؤ اور بھرپور چوٹ لگا کر دلوں کے زنگ اتار دو اور انہیں صحیح اسلامی صورت میں ڈھال دو۔

بند نمبر ۲:۔ سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا۔ خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا

مشکلات:۔ سرشکِ چشمِ مسلم: مسلمان کی آنکھ کا آنسو۔ نیساں: قدیم ایرانیوں کا ایک مہینہ جس کی بارش سے صدف میں موتی بنتے تھے۔ خلیل اللہ: اللہ کا دوست مراد حضرت ابراہیمؑ گہر: موتی۔

تشریح:۔ مسلمان کی آنکھوں سے ٹپکنے والے آنسوؤں میں بالکل وہی تاثیر پیدا ہو چلی ہے جو نیساں کی بارش میں ہوتی ہے جس کے قطروں سے موتی بنتے ہیں۔ اس طرح گویا حضرت ابراہیمؑ کے سمندر میں دوبارہ موتی پیدا ہوں گے۔

بات علامتی انداز میں کہی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنی کوتاہیوں اور کمیوں کا احساس کر لیا ہے۔ انہوں نے اللہ کے دین سے بغاوت کا جو انداز اختیار کیا تھا۔ اس پر پشیمان ہو کر اب وہ بے اختیار آنسو بہا رہے ہیں اور اپنی بے عملیوں اور غفلتوں کی تلافی کرنا چاہتے ہیں۔ اور چونکہ اللہ کو توبہ اور پشیمانی کے آنسو بہت عزیز ہوتے ہیں اس لئے یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ مسلمان کی آنکھوں سے بہنے والے یہ آنسو بے حد قیمتی موتیوں کی صورت اختیار کر جائیں گے۔ اور حضرت ابراہیمؑ کے سمندر میں گرانقدر موتیوں کے ڈھیر لگ جائیں گے۔ دوسرے لفظوں میں احساسِ زیاں کی بیداری ملتِ ابراہیمی (یعنی امتِ مسلمہ) میں ایسے باغیرت، بہادر اور حریت نواز جانبازوں کو پیدا کرے گی جو غلامی کے اندھیروں کو ایسے ہی ختم کر دیں گے اور افلاس و پس ماندگی کو دور کر دیں گے جیسے سچے موتی جو خوشحالی بھی لے کر آتے ہیں اور روشنی و نور بھی۔

کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

تشکلات:۔ ملتِ بیضا: مسلمان قوم شیرازہ بندی: جلد باندھنا، سلائی کرنا۔
شاخِ ہاشمی: کنایتہً۔ اُمتِ مسلمہ برگ و بر: پتے اور پھل

تشریح:۔ استعارے کی زبان میں عام مفہوم یہ ہے کہ اُمتِ مسلمہ کی کتاب جس کا ورق ورق جدا ہو گیا ہے اب اس کی پھر سے جلد بندی ہو رہی ہے اور اسلامی درخت کی وہ شاخ جو سوکھ گئی ہے، دوبارہ ہری ہو گئی ہے اور اس پر پتے پھر نکل رہے ہیں اور پھل بھی آ رہے ہیں۔

اصل مطلب یہ ہے کہ مسلمان باہمی نفرت و نفاق کو ترک کر کے دوبارہ اتحاد و اخوت اور محبت کے انداز اختیار کرنے لگے ہیں اور چونکہ زوال کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب نااتفاقی بھی ہوتا ہے، اس لئے اُمید ہے کہ مسلمان غلامی اور زوال سے نجات پا جائیں گے یہ سوکھا ہوا درخت دوبارہ ہرا ہو جائے گا اور نہ صرف اپنے مکینوں کو گھنی چھاؤں اور میٹھے پھل دے گا بلکہ اس کی خوشبو اور پھل پاس پڑوس کے لوگوں کے لئے بھی باعثِ مسرت اور وجہِ راحت بن جائیں گے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

تشکلات:۔ نرگس: ایک پھول جو آنکھ سے مشابہ ہوتا ہے۔ بے نوری: بینائی سے محروم دیدہ ور: صاحبِ نظر، جس کی نظر تیز ہو۔

تشریح:۔ استعارے کی زبان میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ نرگس کی آنکھ تو ہوتی ہے مگر بصارت سے چونکہ محروم ہوتی ہے اس لئے وہ اپنی اس بدنصیبی پر صدیوں ماتم کرتی رہتی ہے جو چیزوں کے جوہر کو دیکھنا تو کجا ان کی پہچان تک نہیں کر سکتی۔ اور کوئی ایسی صاحبِ نظر ہستی جو ہر چیز کے جوہر کو پہچان لے بڑی دیر کے بعد اور مشکل سے پیدا ہوتی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ یوں تو افراد کی کمی نہیں ہوتی اور ہر شخص کی دو آنکھیں بھی ہوتی ہیں، مگر ایسا شخص یا رہنما کہیں صدیوں کے بعد ہی پیدا ہوتا ہے جس کی نظر اتنی تیز اور گہری ہو جو تاریکیوں کا پردہ پھاڑ کر صحیح راستہ بھی دیکھ لے اور منزل کا تعین بھی کر لے۔ شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ قحط الرجال کا زمانہ ختم ہو گیا ہے اور ملتِ اسلامیہ کو ایسے رہنما میسّر آ رہے ہیں جو اس کی قیادت بہترین طریقے سے کریں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دیدہ ور کا اشارہ اقبال کی اپنی طرف ہو اور مبنی بر حقیقت شاعرانہ تعلّی کا اظہار کیا گیا ہو جیسا کہ اگلے دو شعروں سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

مشکلات:- نوا پیرا: نغمہ الاپنے والا، گیت گانے والا۔ ترنم: خوش آوازی۔

تشریح:- یہاں بلبل کا استعارہ شاعر کے لئے، کبوتر کا کمزور افراد قوم کے لئے اور شاہین کا طاقت ور، جری لوگوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اقبال اپنے آپ کو یا ہر اس مسلمان شاعر کو جو ملت اسلامیہ کے لئے درد اور ہمدردی رکھتا ہے مشورہ دے رہے ہیں کہ اس طرح کی پرجوش نظمیں اور گیت لکھو کہ جن کے اثر سے تمہاری یہ قوم شاہین کی مانند بہادر نڈر اور طاقت ور ہو جائے جو اس وقت کبوتر کی طرح کم ہمتی، خوف اور بزدلی کا شکار ہے۔

تیرے سینے میں ہے پوشیدہ راز زندگی کہہ دے
مسلماں سے حدیثِ سوز و سازِ زندگی کہہ دے

مشکلات:- پوشیدہ: چھپا ہوا۔ حدیث: بات سوز و سازِ زندگی: زندگی کی حرکت و حرارت۔

تشریح:- اس شعر میں بھی اقبال شاعرِ قوم سے کہہ رہے ہیں کہ اللہ نے تجھے زندگی گزارنے کے صحیح، صالح اور سچے طریقوں سے آشنا کر دیا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کو بھی اس راز سے باخبر کر دو اور انہیں بتا دو کہ زندگی محض کھانے پینے، عیش و آرام کرنے اور بچے پیدا کرنے کا نام نہیں ہے، بلکہ اس کے لئے دل کی خاص حرارت اور عمل کے خاص انداز کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اس میں معرفتِ خداوندی اور خود شناسی کے تقاضے انتہائی ضروری ہوتے ہیں۔

بند نمبر ۱۳:- خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو ہے، زباں تو ہے
یقین پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

مشکلات:- لم یزل: جسے کبھی زوال نہ آسکتا ہو۔ دستِ قدرت: اختیار کا ہاتھ مغلوبِ گماں: جس پر شک و شبے کا غلبہ ہو گیا ہو۔

اس بند میں اقبال نے براہِ راست مسلمان اور امتِ مسلمہ سے خطاب فرمایا ہے اور انہیں ان کی زبردست اہمیت کا احساس دلانے کی کوشش کی ہے۔

تشریح:- اے مسلمان تو خدائے لازوال کی قدرت کا ہاتھ ہے۔ اور اس کا ترجمان بھی، لیکن افسوس کہ تو اپنی غیر معمولی حیثیت اور اہمیت کو فراموش کر کے خوف اور شک و شبے میں مبتلا ہو گیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ تو اپنے خالق و مالک پر پختہ یقین و ایمان پیدا کرے تاکہ تیرا ہر عمل، اللہ کا عمل اور تیری ہر بات اللہ کی بات بن جائے۔

اس شعر میں اشارہ اس حدیثِ قدسی کی جانب ہے جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بقول مبارک اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ جو بندہ میری صحیح معنوں میں اطاعت و فرمانبرداری

کرتا ہے۔ اس کا ہاتھ میرا ہاتھ، اس کا پاؤں میرا پاؤں۔ اور اس کی زبان میری زبان بن جاتی ہے۔ (الوکی قول) مطلب یہ ہے کہ جس طرح اللہ کو فنا اور زوال نہیں اسی طرح سچے مسلمان کو بھی کبھی زوال آئے گا نہ فنا آئے گی۔ اس کا ہر عمل صداقت پر مبنی اور دنیا کے لئے رحمت ہوگا۔ اور اس کی زبان کا ایک ایک لفظ اللہ کا ترجمان ہوگا بشرطیکہ وہ یقینِ محکم پیدا کرے اور بے یقینی اور خوف سے نجات پالے۔

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

مشکلات:۔ پرے: آگے چرخ: آسمان نیلی فام: نیلے رنگ کا گردِ راہ: راستے کی گرد، پاؤں کے نیچے۔

تشریح:۔ مسلمان کی منزل نیلے آسمان سے بہت آگے ہے۔ بلکہ مسلمان بذاتِ خود ایک ایسا آسمان ہے کہ ستارے اس کے راستے کی گرد ہیں۔ یہاں مسلمان کی بے پناہ شان اور اہمیت کو بیان کیا گیا ہے، یعنی ایک تو اللہ کے نزدیک اس کی قدر و منزلت آسمانوں سے بھی بلند ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کی زندگی کا اصل منشاء آسمانوں سے بہت بہت اوپر عرشِ بریں پر متمکن ہستی کا رضا و قرب حاصل کرنا ہے۔ اور اگر وہ اپنی اس منزل کو پالے تو ستارے بھی اس کے راستے کی دھول بن جاتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ کعبۃ اللہ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا تھا کہ تو اللہ کے نزدیک بے حد عزیز و محترم ہے لیکن ایک مسلمان اللہ کو تجھ سے بھی زیادہ محبوب ہے (اوکما قال) اس شعر میں اسی قسم کی بات کہی گئی ہے۔

مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا خدا کا آخری پیغام ہے تو، جاوداں تو ہے

مشکلات:۔ مکاں: مراد دنیا مکیں: مراد عام انسان آنی: فانی، تھوڑی دیر کے لئے موجود رہنے والا ازل: وہ وقت جب کائنات بنائی گئی ابد: وہ وقت جب کائنات ختم ہو جائے گی، روزِ حشر جاوداں: ہمیشہ رہنے والا، جسے فنا نہ ہو۔

تشریح:۔ یہ دنیا اور اس کی ہر شے فنا ہو جائے گی۔ لیکن مسلمان کا تعلق چونکہ براہِ راست خداوند تعالیٰ سے ہے اس لئے وہ لافانی ہے۔ وہ ازل سے ابد تک سارے زمانوں پر محیط ہے۔ خصوصاً چونکہ وہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کا اُمتی ہے۔ اور اللہ کے آخری پیغام یعنی قرآنِ حکیم کا براہِ راست مخاطب ہے۔ اس لئے جس طرح وہ پیغام غیر فانی ہے اسی طرح مسلمان بھی غیر فانی ہے۔ دنیا لاکھ سازشیں کرے یا اُسے مٹانے کی کوشش کرے، کبھی اس میں کامیاب نہیں ہو سکے گی۔

یہ نکتہ سرگزشتِ ملت بیضا سے ہے پیدا کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے۔

مشکلات:- نکتہ: بھید کی بات۔ راز کی بات سرگزشت: کہانی، تاریخ
پاسبان: محافظ۔

تشریح:- اُمتِ اسلامیہ کے گزشتہ حالات و واقعات اور اس کی ماضی کی تاریخ سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے پہلے بھی ایشیا کی ساری اقوام کے محافظ کا فریضہ انجام دیا ہے اور اب بھی صرف یہی وہ قوم ہے جو مشرق کے حقوق کی نگہداشت کر سکتی ہے یعنی اگر مسلمان طاقتور اور متحد ہوں تو کسی یورپی طاقت کو ایشیا کی طرف آنکھ اٹھانے کی جرأت نہیں ہوگی، جبکہ خود مسلمان کسی قوم پر ظلم و زیادتی کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ یوں بھی اگر مسلمان صحیح معنوں میں اسلامی قدروں کے پابند ہو جائیں تو اللہ کی جو نوازشات ان پر نازل ہوں گی، ان سے ایشیا کی دیگر اقوام بھی مستفید ہوں گی۔ اور دنیا میں امن و آشتی صرف اسی صورت میں آئے گی جب عالم اسلام متحد بھی ہوگا اور اسلامی قدروں کی پاسداری بھی کرے گا۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

مشکلات:- صداقت: سچائی عدالت: عدل و انصاف شجاعت: بہادری
امامت: قیادت۔ رہنمائی۔

تشریح:- اقبال مسلمان سے کہتے ہیں کہ اب جبکہ دنیا کے تمام دیگر نظاموں اور قوموں نے انسانیت کو بُری طرح مایوس کیا ہے اور اسے دکھوں اور مصیبتوں کے سوا کچھ نہیں دیا۔ تاریخ اور وقت کا تقاضا ہے کہ اسلام کے علمبردار آگے بڑھیں اور دُکھی انسانیت کی مخلصانہ قیادت کر کے اس کے زخموں پر پھاہا رکھیں۔ اس کے لئے بے حد ضروری ہے کہ مسلمان اپنے اندر حق پرستی، صدق و اخلاص اور عدل و انصاف کے ساتھ ساتھ شجاعت و بہادری کے وہ اوصاف پیدا کریں جن کا مظاہرہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے ہر موقع پر کیا تھا اور جن کی بنا پر انہوں نے دنیا سے جبر و غلامی اور جہالت و ظلمت کے اندھیروں کو ختم کر کے انسانی احترام اور خدا پرستی کی روشنی پھیلائی تھی۔

بند نمبر ۴:- یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی

مشکلات:- مقصود: مدعا۔ مقصد رمز: راز اخوت: بھائی چارہ جہانگیری: دنیا بھر پر غالب آنا فراوانی: کثرت۔

اس بند میں اقبال نے اتفاق و اتحاد اور اخوت پر زور دیا ہے۔

تشریح:- اللہ کے قانون کی یہی منشا ہے کہ ساری دنیا کے انسان آپس میں محبت و پیار

اور بھائی چارے سے زندگی بسر کریں کہ تمام انسان ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کئے گئے ہیں۔ اور اسلام کا پیغام بھی یہی ہے اور یہی اس کی روح ہے کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور فضیلت و برتری کا معیار دولت و اقتدار نہیں بلکہ تقویٰ و پرہیزگاری ہے۔

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا۔ نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی

مشکلات:۔ بتان: بُت کی جمع۔ مراد مصنوعی خدا تورانی: ترکی کے رہنے والے

تشریح:۔ اقبال مسلمانوں کے زوال کا بہت بڑا سبب اس امر کو قرار دیتے ہیں کہ مسلمان رنگ، نسل اور علاقے کے تفرقوں میں پڑ کر مختلف قوموں اور گروہوں میں بٹ گئے، ان کی طاقت منتشر ہو گئی اور یوں غیر مسلموں نے انہیں غلام بنا کر ذلیل و خوار کر کے رکھ دیا۔ اقبال کے نزدیک مسلمانوں کا ایک خدا، ایک کتاب اور ایک رسول ہے۔ پھر وہ گروہوں اور قوموں میں کیوں تقسیم ہوں۔ اس شعر میں وہ کہتے ہیں کہ اے مسلمانو! تم نے مختلف رنگوں اور نسلوں کے جو بُت بنا لئے ہیں، گورے، کالے کی جو تفریق پیدا کر لی ہے اور عربی و عجمی کے جو امتیاز بنا لئے ہیں، ان سب کو ختم کر دو۔ ترکی، ایران، افغانستان اور کسی بھی دوسرے ملک کے رہنے والے اپنے آپ کو الگ قوم کی حیثیت سے متعارف نہ کرائیں بلکہ سب ایک جان ہو کر صرف اور صرف مسلمان قوم ہونے پر فخر کریں تب زوال کا دور ختم ہو گا اور ترقی و عروج اور خوشحالی کا سنہرا زمانہ آئے گا۔

شاہا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے وہ کیا تھا زورِ حیدرؓ، فقرِ بوذرؓ، صدقِ سلمانیؓ

مشکلات:۔ قیصر: شاہِ روم کا لقب کسریٰ: شاہِ ایران کا لقب استبداد: ظلم و جبر، مطلق العنانی زورِ حیدرؓ: حضرت علیؓ کی قوت و شجاعت فقرِ بوذرؓ: حضرت ابوذر غفاریؓ کی درویشی و فقیری صدقِ سلمانیؓ: حضرت سلمان فارسیؓ کی سچائی جس کا مظاہرہ انہوں نے قبولِ اسلام کے وقت بلکہ اس سے پہلے ہی کر دیا تھا۔

تشریح:۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے دور میں روم و ایران کی وہ عظیم سلطنتیں تھیں جن کے بادشاہوں نے اپنی خدائی قائم کر لی تھی۔ خدا کے بندوں — یعنی انسانوں — کو اپنا غلام بنا لیا تھا۔ اور ان پر اپنے خود ساختہ جاہلانہ نظام کو مسلط کر دیا تھا۔ اس اندھیر نگری اور ظلم و بے انصافی کو مسلمانوں نے ختم کیا اور جن خوبیوں کی بنا پر وہ اس عظیم مقصد میں کامیاب ہوئے وہ ان کی شجاعت بھی تھی، فقر و درویشی اور توکل بھی تھا اور صداقت پسندی اور عدل و انصاف بھی۔ شجاعت اور یقین و ایمان کے بل پر انہوں نے روم و ایران کو شکست فاش دی اور صداقت کیشی، فقر و توکل اور انصاف کی وجہ سے عام لوگ ان کے گرویدہ اور حلقہ بگوشِ اسلام ہوتے چلے گئے۔

پچھلے شعر کے حوالے سے یہ مطلب بھی نکلتا ہے کہ صحابۂ کرامؓ نے نبی اکرمؐ کی قیادت و تعلیمات کے زیرِ سایہ متحد ہو کر اپنی بے پناہ خوبیوں کی بنا پر کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ انہوں نے رنگ و نسل اور علاقے کے تفرقے مٹا ڈالے تھے۔ چنانچہ تم بھی وہی روش اختیار کرو۔ کہ کامیابی کا واحد راستہ یہی ہے۔

اس شعر میں تین جلیل القدر صحابہؓ کی خصوصیات کو محض مجازِ مرسل یا مثال کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ سارے صحابۂ کرامؓ میں اس نوعیت کی خصوصیات تھیں جنہوں نے دنیا کو ظلم و جور کے اندھیروں سے نجات دلائی تھی۔

ہوئے احرارِ ملت جادہ پیما کس تجمل سے تماشائی شگافِ در سے ہیں صدیوں کے زندانی

مشکلات:۔ احرار: واحد حرّ، آزاد۔ جو کسی کا غلام نہ ہو۔ احرارِ ملت: مسلمانوں میں سے وہ لوگ جو کبھی کسی کے غلام نہیں رہے۔ مراد ترک جو کبھی غلامی کی لعنت سے شناسا نہیں ہوئے۔ جادہ پیما: سفر پر روانہ ہونے والے تجمل: وقار، شان تماشائی: دیکھنے والے زندانی: قیدی۔

تشریح:۔ اس شعر میں ترکوں کی مختلف کامیابیوں کی طرف اشارہ کر کے اقبال کہتے ہیں وہ لوگ جو ہمیشہ آزاد رہے ہیں اور غیرت و خودداری کی زندگی گزارتے رہے ہیں۔ وہ اب بھی تاریخ کے سفر پر بڑے وقار اور شان سے روانہ ہوئے ہیں، لیکن دیگر بدقسمت مسلمان جو صدیوں سے غلامی کی زندگی گزار رہے ہیں وہ قید خانے کے دروازے کے سوراخ سے اس خوبصورت منظر کو دیکھ کر حیرت اور رشک کا اظہار کر رہے ہیں کہ کاش ہم بھی آزاد ہوں اور ترکوں کی طرح کے کارنامے انجام دیں۔ یاد رہے کہ ترکوں کی کامیابیوں اور ناکامیوں سے خصوصاً ہندوستان کے غلام مسلمان بے حد متاثر ہوئے تھے اور انہوں نے غیر معمولی جوش و جذبے کا مظاہرہ کیا تھا۔

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا ۔۔۔ تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

مشکلات:۔ انگارۂ خاکی: مٹی کا انگارہ۔ مراد انسان روح الامیں: حضرت جبرئیل (فرشتہ)

تشریح:۔ جب یہ انسان جو دراصل مٹی کا بنا ہوا ہے اور جس میں اللہ نے اپنی قدرت سے زندگی کی حرارت بھر دی ہے۔ اپنے اندر یقین و ایمان پیدا کر لیتا ہے اور خالقِ اکبر پر اس کا اعتماد پختہ ہو جاتا ہے، تو پھر اس میں بے پناہ قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر اس میں فرشتوں کی خصوصاً حضرت جبرئیل کی سی قوتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

اور یہ پلک جھپکتے میں عرشِ الٰہی تک جا پہنچتا ہے یعنی قربِ خداوندی حاصل کر لیتا ہے۔

بند نمبر ۵ :- غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

مشکلات :- تدبیریں: منصوبے، غور و فکر ذوقِ یقیں: ایمان کا لطف، مزا

تشریح :- غلامی ایک ایسی لعنت ہے کہ اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے محض مادی سہارے کام نہیں دیتے اور محض اسلحے کی قوت یا شاندار منصوبوں سے یہ اندھیرے ختم نہیں ہوتے۔ بلکہ اس کے لئے خدائے تعالیٰ پر پختہ ایمان اور نصب العین کی صداقت کا حکم یقین ہونا لازمی ہے۔ جس قوم کے افراد میں یہ دونوں خوبیاں پیدا ہو جائیں ظاہر ہے پھر وہ موت کو ایک کھیل سمجھتے ہیں اور شہادت کی آرزو میں تڑپتے رہتے ہیں۔ اور جب یہ صورت پیدا ہو جائے تو پھر ایسے لوگوں کو غلام بنائے رکھنا کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔ واقعی جو قومیں محض اسلحے کے بل پر آزادی حاصل کرتی ہیں اور یقین و ایمان کی پروا نہیں کرتیں، وہ اگر سیاسی آزادی حاصل کر بھی لیں تو تہذیبی اور نظریاتی غلامی سے نجات نہیں پا سکتیں اور اصل صورتِ حال میں کچھ زیادہ فرق نہیں آتا۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا - نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

تشریح :- اگر کوئی مسلمان صحیح معنوں میں یقین و ایمان اور عملِ صالح کی دولت سے سرفراز ہو جائے تو پھر اس کی نگاہوں میں وہ تاثیر پیدا ہو جاتی ہے جو دیکھنے والوں کے سینوں میں بھی نئی زندگی اور زبردست جذبہ و ولولہ پیدا کر دیتی ہے اور وہ سارے خطروں سے بے نیاز میدانِ جہاد میں کود پڑتے ہیں۔ ظاہر ہے اگر ایک مردِ مومن کی نگاہوں میں یہ جادو ہے کہ وہ زندگی کا دھارا بدل دیتی ہیں تو اس کی جسمانی و مادی قوت کا تو اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔

ولایت، پادشاہی، علمِ اشیا کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

مشکلات :- ولایت: ملک، سلطنت، ولی کا مرتبہ علمِ اشیا: مختلف چیزوں کے علوم۔ سائنسی علوم جہانگیری: فتح تفسیریں: وضاحتیں، صورتیں۔

تشریح :- سلطنتوں اور حکومتوں کا قیام اور مختلف علوم و فنون میں کمال محض ایمانِ کامل کے نتیجے میں حاصل ہو سکتا ہے۔ کسی قوم میں اگر اللہ تعالیٰ پر پختہ ایمان اور اس کی عطا کردہ انسانی صلاحیتوں پر بھروسہ پیدا ہو جائے تو پھر وہ سلطنت بھی قائم کر لیتی ہے۔

نظام حکومت بھی دے سکتی ہے اور مختلف علوم و فنون اور سائنسی ایجادات میں بھی کمال حاصل کر سکتی ہے۔ دراصل یہ ساری چیزیں ایمان و یقین کے ساتھ وابستہ ہیں۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ یورپ والوں نے بھی اپنی صلاحیتوں پر بھروسہ کیا، محنت و دیانت داری اور تندہی سے تحقیق و تجسس سے کام لیا اور یوں سلطنتیں قائم کرنے میں بھی کامیاب ہوئے اور زبردست سائنسی کمالات حاصل کرنے میں بھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قانونِ قدرت کے تحت محنت اور توجہ سے جو قوم بھی خواہ وہ منکرِ خدا ہی کیوں نہ ہو، کام کرے گی، اچھے نتائج دیکھ لے گی۔ افسوس مسلمان قوم اس جوہر سے ہاتھ دھو بیٹھی اور اقبال اس کے احیا کا درس دے رہے ہیں۔

یقینِ محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

مشکلات: یقینِ محکم: پختہ یقین یا ایمان عملِ پیہم: مسلسل کام محبت فاتحِ عالم: دنیا کو فتح کر لینے والی محبت۔

تشریح:- زندگی ایک زبردست جہاد ہے جس میں باطل کی بہت سی قوتیں انسان سے برسرِ پیکار رہتی ہیں۔ حتیٰ کہ انسان کی اپنی ہی خواہشات نیکی کے راستے میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ پھر معاشرے میں رہتے ہوئے حق و باطل کے بہت سے مرحلے آتے ہیں جن سے انسان کا واسطہ پڑتا ہے۔ ان سارے معاملات سے بخوبی نمٹنے کے لئے جن تین بڑی خصوصیات کی ضرورت ہے وہ علامہ اقبال کے نزدیک ہیں۔ ۱۔ خالقِ کائنات پر اور اپنے مقصدِ حیات کی سچائی پر پختہ ایمان و یقین۔ ۲۔ مسلسل و متواتر اور ان تھک محنت و تگ و دو۔ ۳۔ محبت و شفقت اور رحم و کرم کا ایسا رویہ ہو جو دشمنوں کو دوست بنا لے اور بنی آدم کے درمیان پیار و محبت کی فضا عام کر دے۔

ان تینوں خصوصیات کی انسانی زندگی میں جو زبردست اہمیت ہے اس کی وضاحت کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ مختصر یہ کہ محکم یقین اور ایمان انسان میں بے خوفی پیدا کرتا ہے۔ اسے شوقِ شہادت عطا کرتا ہے۔ اور تائیدِ حق کے لئے قربانیوں پر ابھارتا ہے۔ مسلسل کام اور محنت محنت انفرادی اور اجتماعی کامیابیوں کی سنہری اصل ہے اور محبت و پیار کی روایت انسان کو تنہائی کے عذاب سے چھٹکارا دیتی، دوستوں کی تعداد میں اضافہ کرتی اور دشمنوں میں کمی کرتی ہے اور جس شخص کو اخلاقِ عالیہ کی یہ تینوں نعمتیں مل جائیں، اس کی کامیابی میں کوئی کسر نہیں رہ جاتی۔

چو باید مرد را طبعِ بلندے مشربِ نابے
دلِ گرمے نگاہِ پاک بینے جان بیتابے

مشکلات :- طبعِ بلند : اونچی طبیعت ۔ فراخ حوصلہ ۔ وسیع القلب ۔ مشربِ نابے : پاکیزہ ، بے عیب ، طور طریقہ ۔ دلِ گرمے : گرم دل ۔ پرجوش و مخلص دل ۔ نگاہِ پاک بینے : ایسی نگاہ جو پاکیزگی اور نیکی کو دیکھنے کی عادی ہو ۔ جان بیتابے : بے قرار و مضطرب دل ۔

مفہوم :- ایک انسان میں کیا خوبیاں ہونی چاہئیں ؟ (یہ کہ وہ) فراخ حوصلہ ہو، پاکیزہ طور طریقوں کا مالک ہو ۔ دل میں خلوص رکھتا ہو ۔ نظر میں پاکیزگی ہو اور بنی آدم کے لئے درد اور تڑپ رکھتا ہو ۔

تشریح :- علامہ اقبال نے گذشتہ شعر میں تین اعلیٰ انسانی خصوصیات بیان فرمائی تھیں ۔ اور اس شعر میں چند مزید ایسی خوبیوں کا اظہار کیا ہے ، جو انسان کو صحیح معنوں میں انسان بناتی ہیں ۔ ان میں پہلی بات یہ ہے کہ انسان فراخ حوصلہ ، وسیع القلب اور اونچے ظرف کا مالک ہو کہ ایسا شخص ہی ایثار و شجاعت کا مظاہرہ کر سکتا اور آزمائشوں کا سامنا کرنے کی ہمت رکھتا ہے ۔ دوسرے نمبر پر انسان کو اپنی روزمرہ زندگی اور عمومی طرزِ عمل میں پاک طینت ہونا چاہیئے ۔ اور معاملات کے بارے میں بے میل قسم کا خالص رویہ اختیار کرنا چاہیئے جو صداقت پر مبنی ہو اور منافقت سے پاک ہو ۔ تیسری خصوصیت اس میں گرمی دل یا اخلاص اور گرم جوشی کی ہونی چاہیئے ۔ اور ریاکاری یا تصنع سے دور رہتے ہوئے عام انسانوں کے لئے اسے مخلص ہونا چاہیئے ۔ چوتھے نمبر پر اقبال ایسی نگاہ کی تعریف کرتے ہیں ۔ اور اسے انسان کے لئے ضروری سمجھتے ہیں جو بلندی اور پاکیزگی کی حامل ہو اور آخر میں انسان کے سینے میں ایک ایسا بے قرار دل ہونا چاہیئے جو مخلوقاتِ خدا کی ہمدردی میں تڑپتا ہو اور اللہ کے پیغام کی اشاعت میں مضطرب رہتا ہو ۔

بندِ نمبر ۲ تو راز کُن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا راز داں ہو جا ، خدا کا ترجماں ہو جا

مشکلات :- کُن فکاں (ترجمہ) ہو جا پس وہ ہو گیا ۔ اشارہ ہے قرآنِ پاک کے اس فرمان کی جانب کہ اللہ نے کائنات کو حکم دیا کہ وجود میں آجا اور وہ وجود میں آگئی ۔ (کُن فَیَکُوْنُ) ۔ رازِ کُن فکاں : کائنات کی تخلیق کا راز ۔ عیاں : ظاہر ۔

اس بند کے اشعار میں جذبے کی ایک خاص پرجوش کیفیت نظر آتی ہے جس میں رجز کا لہجہ اور درد و سوز کا انداز نمایاں ہے ۔ شاعر ایک سوئی ہوئی قوم کو جھنجھوڑ رہے ہیں ۔

تشریح :- اے مسلمان تو کائنات کی تخلیق کا اصل راز ہے۔ یعنی یہ کائنات محض اسی لئے بنائی گئی کہ تیرے ذریعے اللہ تبارک و تعالیٰ اپنی ذات و صفات کی اشاعت کرے۔ ذرا آنکھیں کھول کر اپنی اس عظیم الشان حیثیت کو پہچان اور اس کے تقاضے پورے کرنے کے لئے سب سے پہلے اپنی زندگی کے مقصد پر نگاہ ڈال۔ یعنی اپنی خودی کو پہچان۔ اپنی ذات کا عرفان حاصل کر اور پھر تجھے پتہ چلے گا کہ تجھے محض کھانے کمانے یا بے مقصد زندگی گزارنے کے لئے پیدا نہیں کیا گیا۔ بلکہ تیرا اصل مقصدِ حیات اللہ کی سرزمین پر اللہ کی ترجمانی کے فرائض سرانجام دینا اور اس کی حاکمیت قائم کرنا ہیں تاکہ انسان پر انسان کا اقتدار ختم ہو اور صرف اللہ کا دین ہی حاکم و غالب ہو جائے۔

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا

مشکلات :- ہوس : نفسانی و مادی خواہشات نوعِ انساں : مراد نسلِ انسانی۔ اخوت : بھائی چارہ

تشریح :- اس دور کا المیہ یہ ہے کہ نفسانی خواہشات اور مادہ پرستی نے انسانوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ انسان انسان کا شکاری ہے، اور بھائی، بھائی کا دشمن ہے۔ پوری دنیا بدامنی اور افراتفری کا جہنم بن گئی ہے۔ اس عالم میں یہ ملتِ اسلامیہ کا فرض ہے کہ آگے بڑھے، اپنا تاریخی کردار ادا کرے۔ اخوت اور محبت کا وہ پیغام عام کرے جو نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے خالقِ اکبر نے انسانوں تک پہنچایا تھا۔ صرف یہی وہ پیغام ہے جس نے پہلے بھی انسان کے زخموں پر پھایا رکھے تھے اور اب بھی صرف اسی میں یہ صلاحیت ہے کہ دکھوں، غموں اور المیوں کی دھوپ میں جلتی ہوئی انسانیت کو امن و راحت اور سکون کا سایہ فراہم کرے۔

یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بے کراں ہو جا

مشکلات :- خراسانی : ایران کا ایک علاقہ مراد ایرانی تورانی : ترکی کا ایک علاقہ مراد ترکی۔ شرمندۂ ساحل : کنارے تک محدود ہو جانے والا بے کراں : لامحدود جس کے کنارے نہ ہوں۔ بہت وسیع۔

تشریح :- اقبال ملتِ اسلامیہ کے زوال میں بنیادی حیثیت قومیت اور وطنیت کے نظریے کو دیتے ہیں جس نے ایک خدا، ایک کتاب اور ایک رسول کے ماننے والوں کو الگ

الگ قوموں میں بانٹ دیا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی اس دکھ کا اظہار کیا ہے کہ مسلمانوں نے محض ملکوں کی بنا پر اپنے آپ کو علیحدہ علیحدہ قوموں میں تقسیم کر لیا ہے۔ کوئی ہندوستانی ہونے پر فخر کرتا ہے اور کوئی ایرانی، افغانی اور ترکی النسل ہونے پر نازاں ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی سمندر کی وسعتوں کو چھوڑ کر محض ایک کنارے پر بیٹھ جائے اور اسی پر اکتفا کرے۔ تو اے مسلمانو۔ تم ایک سمندر ہو جس کا کوئی کنارہ نہیں۔ تم یہ تنگ نظری ترک کر دو۔ کناروں سے چمٹنا چھوڑ دو اور اپنے آپ کو الگ الگ قوموں میں بانٹنے کی بجائے ملتِ واحدہ میں ضم ہو جاؤ۔ یہی وقت کا تقاضا ہے اور یہی نجات کی راہ ہے۔

گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

مشکلات:۔ سیلِ تند رو: تیز خوفناک طوفان کوہ: پہاڑ بیاباں: جنگل صحرا۔
گلستاں: باغ جوئے نغمہ خواں: گانے والی ندی، آہستہ چلنے والی ندی

تشریح:۔ اقبال مختلف اقوام کے درمیان مسلمانوں کو زندگی گزارنے کا جو لائحہ عمل دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ اگر کوئی قوم ان کے راستے میں رکاوٹ بنے، ان کے عقائد و نظریات کی مخالفت کرے تو انہیں بھی اس کا مقابلہ بھرپور انداز میں کرنا چاہیئے اور اپنی قوت کا خوب مظاہرہ کرنا چاہیئے، لیکن اگر کوئی قوم دوستانہ اور مصالحانہ رویہ اختیار کرے تو اس کے ساتھ دوستی و مروت اور رحم و شفقت کا انداز اختیار کرو۔ اس بات کو استعارے کی زبان میں بیان کیا گیا ہے کہ اگر تمہارے راستے میں پہاڑ اور جنگل آئیں تو خوفناک طوفان بن کر ان کو عبور کر لو۔ جبکہ باغات یا خوشگوار مقامات میں سے گنگناتی ہوئی ندی کی طرح گزر جاؤ۔

اس مضمون کو اقبال نے کئی دیگر مقامات پر بھی بیان فرمایا ہے ؎

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

مشکلات:۔ سازِ فطرت: قدرتِ الٰہی کا ساز یعنی نظامِ کائنات۔ نوا: آواز

تشریح:۔ اے مسلمان خالقِ اکبر نے تمہیں ایسا ضابطۂ حیات عطا کیا ہے جس میں ایک طرف علم و حکمت اور غور و فکر کو بنیادی اہمیت حاصل ہے جبکہ دوسری جانب اس میں

محبت و شفقت اور رحم و کرم پر خصوصی زور دیا گیا ہے اسطرح اگر تم چاہو جیسا کہ ماضی کی تاریخ میں یہ کامیاب تجربہ ہو چکا ہے، تو دنیا پھر کی علمی و عقلی فتوحات تمہارے قدموں میں ہوں گی۔ اور مخلوقِ خدا کے لئے امن و آشتی کے پیامبر بھی ثابت ہو سکو گے ۔ انہی بے مثال خوبیوں کی بنا پر اے ملتِ اسلامیہ! تم کائنات بھر میں بہترین تخلیق ہو اور قدرتِ خداوندی کو اگر ایک ساز کا چھیڑ لیا جائے تو تم اس ساز کو سب سے دلکش روح پرور و دلنواز نغمہ ہو۔ ایسا نغمہ جو سننے والے کو ابدی مسرت سے ہمکنار کرتا ہے اور حیات پرور جذبات سے سرشار بھی۔

اختر شیرانی

(۱۹۰۳ء — ۱۹۴۸ء)

حالاتِ زندگی

اختر شیرانی کا تعلق ایک علمی گھرانے سے تھا۔ ان کے والد حافظ محمود شیرانی ایک بلند پایہ عالم لسانیات کے محقق اور ادب کے نمایاں نقاد تھے۔ "پنجاب میں اردو" ان کی سب سے معروف تصنیف ہے۔

اختر شیرانی ۱۹۰۵ء میں ٹونک میں پیدا ہوئے۔ اصل نام محمد داؤد خاں اور اختر تخلص تھا۔ دنیائے شعر میں اختر شیرانی کے نام سے مشہور ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ٹونک میں ہوئی۔ ۱۹۲۰ء میں حافظ محمود شیرانی نے انہیں لاہور بلا لیا۔ اختر نے اورینٹل کالج لاہور سے منشی فاضل پاس کیا۔ میٹرک کی تیاری کر رہے تھے کہ گھر سے بھاگ گئے جس کے نتیجے میں ان کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ انھیں تعلیم سے زیادہ شعر و شاعری سے دلچسپی تھی۔ شعر گوئی کے ساتھ مضامین بھی لکھنے لگے۔ کچھ عرصے بعد وہ "ہمایوں" کے مدیر مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۷ء میں اپنا ایک رسالہ "خیالستان" نکالا۔ لیکن جلد ہی بند ہو گیا۔ ۱۹۳۱ء میں "شاہکار" کی ادارت سنبھالی مگر جلد علیحدہ ہونا پڑا۔ اختر شیرانی کو بعض برے دوستوں کی صحبت کے سبب شراب نوشی کی عادت پڑ گئی جس کے نتیجے میں ان کی صحت خراب ہوتی گئی۔ حافظ محمود شیرانی کو اپنے بیٹے کے بگڑنے کا بڑا صدمہ تھا۔ مگر بیٹے سے ترکِ تعلق بھی اسے راہِ راست پر نہ لا سکا۔ کثرتِ مے نوشی کے سبب ۱۹۴۸ء میں انتقال کر گئے۔ ان کی شاعری کے مجموعے یہ ہیں:-

(۱) پھولوں کے گیت (۲) نغمۂ حرم (۳) صبح بہار (۴) اخترستان (۵) لالۂ طور (۶) طیورِ آوارہ (۷) شہناز (۸) شہرود۔

اختر شیرانی کی شاعری

اختر شیرانی عام طور پر شاعر رومان کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ رومان پسند انسان کو ہمیشہ ماضی سے گہرا لگاؤ ہوتا ہے، اور اسے حُسن سے گہری وابستگی بھی ہوتی ہے۔ اختر شیرانی کی شاعری میں یہ دونوں رجحانات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

رومان پسندوں کی طرح اختر شیرانی بھی اس مادی دنیا سے دُور تخیلات کی کسی ایسی دنیا میں جانا چاہتے ہیں جہاں ہر طرف حُسن کے جلوے اور نیرنگیاں ہوں۔ اُن کی شاعری مصائب و آلام سے فرار کی شاعری ہے۔ وہ دُنیا اور اس کے جھمیلوں سے فرار چاہتے ہیں۔ اُن کی نظمیں مثلاً "اے عشق کہیں لے چل" وغیرہ ان کے اسی رجحان طبع کی نمایندگی کرتی ہیں۔ وہ دُنیا کے پیچیدہ مسائل و معاملات اور الجھنوں کا سامنا کرنے سے قاصر ہیں۔ وہ پریشان کن ماحول کا مقابلہ کرنے کے بجائے اس سے دور امن و سکون کے کسی گہوارے میں بھاگ جانا چاہتے ہیں۔ ان کی نظم "مری سلمیٰ مجھے لے چل تو ان رنگین بہاروں میں" اس کی غماز ہے۔

اختر شیرانی ہر رومان پسند شاعر کی طرح ماضی کو بہت یاد کرتے ہیں۔ بچپن کے حسین دور سے وابستہ رنگین یادوں کا ذکر اُن کی شاعری میں ملتا ہے۔ بچپن اور لڑکپن کے واقعات کو دہراتے ہیں اور ایک رومان پرست کی طرح وطن کی محبت کے گیت بھی گاتے ہیں۔

ان کی شاعری میں فطرت پرستی کا رجحان بھی بہت نمایاں ہے وہ فطرت اور اس کے آثار و مظاہر چاند سورج، ستاروں، کوہساروں، درختوں، پھولوں، بادلوں وغیرہ کے حُسن و جمال سے بہت متاثر ہیں۔ فطرت کی رعنائیاں اور رنگینیاں اُن کا دامن دل کھینچتی ہے اور وہ اس کی طرف بے اختیار کھنچے ہوئے اس کی محبت و شوق میں گیت گاتے چلے جاتے ہیں۔

موسیقیت اختر کی شاعری کی ایک اہم صفت ہے۔ وہ فن موسیقی کے ماہر تھے۔ ان کی نظموں میں غنائیت کی کیفیت بے حد نمایاں ہے۔ وہ موسیقی کے سُر تال سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ان کے قافیے بڑے ترنم اور بحریں موزوں ہیں۔ وہ اپنے اشعار میں الفاظ کی تکرار سے عمدہ صوتی تاثر پیدا کرتے ہیں ان کی بیشتر نظمیں موسیقیت اور غنائیت کا عمدہ نمونہ ہیں۔

اختر شیرانی ایک بلند پایہ فن کار تھے۔ ان کی فنکاری کا ایک ثبوت ان کی خوبصورت تصویر کاری یا جذبات میں۔ وہ جذبات و احساسات کی موثر ترجمانی کے ساتھ ساتھ خارجی مناظر کے بھی دلکش نقشے بناتے ہیں۔ ان کی تصویریں نمایاں اور واضح ہوتی ہیں۔ ان میں رنگینی اور رعنائی ہوتی ہے کیونکہ اختر یہ تصویریں خلوص دل سے بناتے ہیں۔ انہوں نے سلمیٰ کی تصویریں بے جان الفاظ کے ذریعے بنائی ہیں مگر وہ زندہ و متحرک تصویریں معلوم ہوتی ہیں۔ اسی طرح نور جہاں، ریحانہ، عذرا، جوگن اور زلفا صہ وغیرہ کی تصویریں اختر شیرانی کے کامیاب تصویر کار ہونے کا ثبوت ہیں۔

اختر شیرانی کی شاعری کا مرکزی کردار "سلمیٰ" ہے۔ یہ ایک خیالی دوشیزہ کا نام ہے جسے شاعر نے اپنا آئیڈیل بنا لیا۔ ان کی پوری شاعری اس آئیڈیل کے حصول کی کوشش اور جدوجہد نظر آتی ہے سلمیٰ کے بغیر ان کے لئے دنیا میں کوئی رنگینی ہے اور نہ کشش و دلچسپی۔

مختصراً یہ سمجھنا چاہئے کہ اختر شیرانی کی شاعری رنگینی اور رومان کی شاعری ہے۔ ان کے ہاں کسی اعلیٰ مقصدِ زندگی یا نصب العین کی تلاش بے کار ہے۔

برسات

تعارف و مرکزی خیال

برصغیر پاک و ہند میں صحیح معنوں میں اگر کوئی بہار کا موسم ہے تو وہ "برسات" کا موسم ہے اس موسم میں گھٹاؤں کے جوبن، ہواؤں کی مستی اور فطرت کے حسن کا جو کمال ہوتا ہے اس کا کسی دوسرے موسم میں جواب نہیں ملتا۔ اختر شیرانی نے اس نظم میں برسات کے انہی مناظر کا ہلکا سا نقشہ کھینچا ہے جسے پڑھ کر واقعی ذہن کی سکرین پر رم جھم ہونے لگتی ہے۔

نظم کی تشریح

گھٹاؤں کی نیل فام پریاں، اُفق پہ دھومیں مچا رہی ہیں
ہواؤں میں تھرتھرا رہی ہیں، فضاؤں کو گدگدا رہی ہیں

مشکلات

گھٹا: نیلے، کالے اسفید گہرے بادل جو روئی کے گالوں کی مانند آسمان پر چھا جاتے ہیں۔ نیل فام: نیلے آسمانی رنگ کے دھوئیں چھانا: امنڈنا زور شور سے چھا جانا۔ تھرتھرانا: رقص کرنا۔ گدگدانا: مسرور کرنا۔ چھیڑنا۔

تشریح

برسات کا موسم ہے۔ سیاہی مائل نیلے رنگ کی گہری گھٹائیں آسمان پر چھا گئی ہیں۔ کبھی یوں لگتا ہے دور افق سے یہ جنگ کی تیاری کر کے زور شور سے بڑھی چلی آتی ہیں۔ کبھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ مست ہو کر ہواؤں کے ساتھ ناچ رہی ہیں اور کبھی ایسا نظر آتا ہے جیسے فضاؤں سے شرارتیں اور چہلیں کر رہی ہیں جس کے نتیجے میں ہر طرف مسرت و شادمانی کا احساس عام ہے اور قہقہے سے پھوٹتے دکھائی دیتے ہیں۔

چمن شگفتہ، دمن شگفتہ، گلاب خنداں، سمن شگفتہ بنفشہ و نسترن شگفتہ ہیں، پتیاں مسکرا رہی ہیں

مشکلات

دمن: دامن کا اسم تصغیر مراد پہاڑ کا دامن۔ شگفتہ: کھلا ہوا، تر و تازہ۔
خنداں: ہنستا ہوا۔ سمن: یاسمین کا پھول۔ بنفشہ: ایک خوشبو دار پودا

جو دو ایوں میں استعمال ہوتا ہے۔ نسترن: سفید رنگ کا گلاب۔

تشریح برسات کے اثر سے باغات و میدان اور ہر قسم کے پھول اور پودے بے حد تر و تازہ اور خوبصورت لگتے ہیں اور یوں نظر آتا ہے جیسے خوشی سے وہ بے اختیار ہو کر ہنس رہے ہیں۔ اس خوشی میں گلاب، یاسمین اور نسترن سے پھول ہی شامل نہیں بلکہ سبزہ اور پودوں کی عام پتیاں بھی شامل ہیں۔

یہ مینہ کے قطرے مچل رہے ہیں کہ نیلے سیارے ڈھل رہے ہیں
افق سے موتی اُبل رہے ہیں، اگلتا ہیں موتی لٹا رہے ہیں

مشکلات مچلنا: شرارت سے مختلف حرکتیں کرنا۔ ڈھل رہے ہیں: نیچے اتر رہے ہیں۔ موتی لٹانا: دولت نچھاور کرنا۔

تشریح جب بارش ہوتی ہے اور ہوا کے اثر سے قطرے اِدھر اُدھر اچھلتے کودتے دکھائی دیتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے ننھے ننھے سیارے ہیں جو آسمان سے زمین پر اتر رہے ہیں۔ اس منظر سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے زمین و آسمان کے درمیان سے بے شمار موتی ابل رہے ہیں اور بادل کی گھٹائیں خوش ہو کر دولت نچھاور کر رہی ہیں۔

نہیں ہے کچھ فرق بحر و بر میں کھنچا ہے نقشہ یہی نظر میں
کہ ساری دنیا ہے اک سمندر، بہاریں جس میں نہا رہی ہیں

مشکلات بحر: سمندر۔ بر: خشکی۔ زمین

تشریح موسلا دھار بارش کے نتیجے میں زمین اس طرح جل تھل ہو گئی ہے کہ خشکی اور سمندر میں کوئی فرق نہیں رہا۔ یوں لگتا ہے ساری دنیا سمندر بن گئی ہے جس میں بہاریں غوطہ ہو کر ڈبکیاں لگا رہی ہیں۔ موسلا دھار بارش میں دل مسرت اور طمانیت کے بے پناہ احساس میں ڈوب جاتا ہے۔ بہاروں کے نہانے کا یہی مطلب ہے۔

چمن ہے رنگیں، بہار رنگیں، مناظر منبرہ زار رنگیں
ہیں وادی و کوہسار رنگیں کہ بجلیاں رنگ لا رہی ہیں۔

مشکلات رنگیں: رنگوں والی۔ خوب صورت۔ سبزہ زار: سبزے کی جگہ۔ کوہسار: پہاڑ۔ رنگ لانا: نتیجہ سامنے آنا۔

تشریح برسات کے نتیجے میں باغوں، سبزہ زاروں، وادیوں اور پہاڑوں پر ہر طرف رنگ و نور کا سیلاب اُمنڈتا ہوا نظر آتا ہے اور حسن بے تاب ہو کر اپنے

آپ کو نمایاں کر دیتا ہے یوں لگتا ہے کہ بادلوں میں چھپی ہوئی بجلیاں مچل کر بارش کے ساتھ زمین پر برس گئی ہیں جن کے نتیجے میں ہر طرف بے شمار قسم کے رنگ نکھر گئے ہیں اور ہر چیز پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت ہو گئی ہے۔

چمن میں اختر بہار آئی، لپک کے صوتِ ہزار آئی
صبا گلوں میں پکار آئی، اٹھو گھٹائیں پھر آ رہی ہیں

مشکلات لپک کے: جھوم کر۔ مست ہو کر۔ صوتِ ہزار: ہزار آوازوں والی مراد بلبل۔

تشریح برسات کے نتیجے میں باغ میں بہار پورے جوبن پر ہے۔ پھول مسکرا رہے ہیں اور خوش الحان بلبل بھی جھوم کر آ گئی ہے اور خوشی کے گیت گانے لگی ہے۔ ایسے عالم میں صبح کی ہوا نے پھولوں کو یہ خوشخبری دے دی ہے کہ گھٹائیں دوبارہ آ رہی ہیں اس لیے خمار اور مستی کو خیرباد کہہ دو اور ان کے استقبال کی تیاری کرو۔

ابوالاثر حفیظ جالندھری

حالاتِ زندگی: نام: محمد حفیظ ——— تخلص: حفیظ ——— والد کا نام: حافظ شمس الدین۔ ولادت: جالندھر ۱۹۰۰ء۔ ابتدائی تعلیم جالندھر میں حاصل کی بچپن ہی سے شعر و شاعری سے دلچسپی تھی۔ چھوٹی عمر میں شعر کہنے لگے۔ گھر کے حالات سازگار نہ تھے۔ تعلیم مکمل نہ ہو سکی۔ ۱۹۲۲ء میں مولانا غلام قادر گرامی کی نگرانی میں رسالہ "اعجاز" جاری کیا۔ اس کے بعد جالندھر سے لاہور آ گئے اور ہونہار ڈپو قائم کیا۔ شعر و شاعری میں حفیظ نے مولانا گرامی کا تلمذ اختیار کیا۔ رفتہ رفتہ مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔ ایک شاعر کی حیثیت سے آپ کی شہرت میں اضافہ ہوتا گیا۔ دوسری جنگِ عظیم کا آغاز ہوا تو حکومتِ ہند نے آپ کو دہلی میں (SONG PUBLICITY ORGANISATION) کا ڈائریکٹر جنرل مقرر کیا۔ اس عہدے پر آپ نے خاصا عرصہ کام کیا۔ پاکستان قائم ہوا تو یہاں آ گئے اور آزاد کشمیر میں نشر و اشاعت کے سلسلے میں مختلف فرائض انجام دیتے رہے۔ آپ نے زندگی کے مختلف ادوار میں مختلف رسائل و جرائد کی ادارت کی۔ حفیظ کی تصانیف میں

"شاہنامہ اسلام" کے علاوہ "تلخابۂ شیریں" "سوز و ساز" "حفیظ کے گیت" "حفیظ کی نظمیں" اور "چیونٹی نامہ" وغیرہ اہم ہیں۔

حفیظ کی شاعری

حفیظ جالندھری ایک قادر الکلام شاعر ہیں۔ عوام اور خواص دونوں حلقوں میں آپ کی شاعری کو بے حد پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ پاکستان کا قومی ترانہ آپ ہی کا لکھا ہوا ہے اور آپ کی شہرت کا بڑا سبب یہی ترانہ ہے۔ حفیظ کی شعری شاہکار آپ کی طویل مثنوی "شاہنامۂ اسلام" (چار جلدیں) ہے۔ اس میں آپ نے تاریخ اسلام کے ایک بڑے حصے کو منظوم کیا ہے۔ شاہنامہ اسلامی، ملی اور قومی تاریخ میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ اسی شاہنامے کی بدولت آپ کو عوام میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ شاہنامے سے آپ کے اسلامی جذبات اور ملی غیرت کا اظہار ہوتا ہے۔ اسے میلاد کی محفلوں میں پڑھا جاتا ہے۔ واعظ اپنے وعظوں میں شاہنامہ پڑھتے ہیں۔ اس کی مقبولیت قابلِ رشک ہے۔

حفیظ ایک اچھے گیت نگار ہیں۔ اردو شاعری میں گیت کی صنف کو ترقی دینے میں آپ کے گیتوں کو خاصا دخل ہے۔ ترنم اور موسیقیت ان کے گیتوں کا خاص وصف ہے۔ ان کے گیتوں میں حسن و عشق کا رچا ہوا شعور ملتا ہے۔ زبان بہت دلکش شیریں اور رسیلی ہے۔ حسن و عشق کے علاوہ انہوں نے فطرت کے مناظر و مظاہر کو بھی اپنے گیتوں کا موضوع بنایا ہے۔

حفیظ نے بچوں کے لیے نظمیں اور گیت لکھے ہیں۔ اور ان کی زبان سادہ، دلچسپ اور مترنم ہے۔ بچوں کے لیے انہوں نے جو شاعری کی اس میں انہوں نے بچوں کی نفسیات کا خاص خیال رکھا ہے۔

اردو غزل میں بھی حفیظ کو منفرد مقام حاصل ہے۔ ان کی غزل میں روایت کے گہرے احساس کے ساتھ ایک گونہ شوخی اور شگفتگی نظر آتی ہے۔ صاف ستھری زبان میں جب وہ تغزل کی مختلف کیفیات کو قلم بند کرتے ہیں تو اُن کے اشعار کی تاثیر دوچند ہو جاتی ہے۔

حفیظ کی عام شاعری خصوصاً نظمیں — اردو شاعری کے ارتقا میں خاص اہمیت رکھتی ہیں، ان کی نظموں کے موضوعات میں بڑی رنگا رنگی ہے۔ اخلاق و حکمت، مناظرِ فطرت، معاشرتی مسائل، تاریخی واقعات وغیرہ۔ ان کی نظمیں "رقاصہ" اور "ابھی تو میں جوان ہوں" بہت مقبول ہیں۔

شہسوارِ کربلا

نظم کا تعارف یہ نظم حضرت امام حسینؓ کی تعریف میں کہی گئی ہے اور اس وقت کی عکاسی کرتی ہے جب امام عالی مقام کربلا کے میدان میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہادت کی سعادت سے سرفراز ہوتے تھے۔

مرکزی خیال نظم کا مرکزی خیال یہ ہے کہ یزیدی فوجوں کی اکثریت اور حالات کی ناسازگاری کے باوجود حضرت حسینؓ نے میدانِ کربلا میں بے پناہ صبر و استقامت اور شجاعت و پامردی کا مظاہرہ کیا تھا اور کوئی ظلم اُن کے پائے استقلال میں لغزش پیدا نہ کر سکا تھا۔

نظم کی تشریح

لباس ہے پھٹا ہوا ❊ غبار میں اٹا ہوا
تمام جسم نازنین ❊ چھدا ہوا کٹا ہوا
یہ کون ذی وقار ہے، بلا کا شہسوار ہے
کہ ہے ہزاروں قاتلوں کے درمیان ڈٹا ہوا
یہ بالیقین حسینؓ ہے
نبیؐ کا نورِ عین ہے

مشکلات: جسمِ نازنین - نازک جسم چھدا ہوا - زخمی - ذی وقار - وقار و شان والا - بلا کا شہسوار - زبردست سپاہی (گھوڑ سوار) بالیقین - یقیناً - نورِ عین آنکھوں کا نور - پیارا - لاڈلا۔

تشریح: شاعر اُس وقت کے دردناک منظر کو بیان کرتا ہے جب حضرت سیّدنا حسینؓ کربلا کے میدان میں دشمنوں کے نرغے میں گھرے ہوئے کمال بہادری سے اُن کا مقابلہ کر رہے تھے۔ شاعر سوالیہ انداز میں کہتا ہے کہ یہ شخص کون ہے جس کا لباس خاک آلود ہے اور جنگ کے ہنگامے نے اُسے تار تار کر دیا ہے پھر وہ جسم جو نازوں کا پلا ہوا ہے اور بے حد نرم و نازک اور خوبصورت ہے۔ وہ بھی جگہ جگہ سے زخمی ہے، کہیں تیر لگے ہیں اور کہیں تلواروں کے گھاؤ ہیں۔ آخر یہ شخص

ہے کون جو اس قدر بے بسی اور مظلومی کی حالت میں بھی وقار اور تحمل و سنجیدگی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ اُس نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور بڑی ہی بہادری سے ہزاروں دشمنوں کے درمیان گھوڑے کی پیٹھ پر جما بیٹھا ہے ورنہ کوئی اور ہوتا تو کب کا ہمت ہار کر گر چکا ہوتا ۔ شاعر اپنے سوالوں کا خود ہی جواب دیتا ہے کہ بے مثال صبر و استقامت اور وقار و تحمل کا حامل یہ انسان یقیناً حضرت حسین ہیں جنہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آغوشِ محبت میں تربیت پائی ہے اور جسے آنجنابؐ بیحد عزیز و محبوب رکھتے تھے۔

یہ جس کی ایک ضرب سے کمالِ فن حرب سے
کئی شقی گرے ہوئے تڑپ رہے ہیں کرب سے
غضب ہے تیغۂ دوسر کہ ایک ایک وار پر
اُٹھے صدائے الاماں، زبان شرق و غرب سے
یہ بالیقین حسینؓ ہے
نبی کا نورِ عین ہے

مشکلات :۔ کمالِ فنِ حرب :۔ لڑائی کی مہارت کا کمال۔ شقی ۔ ظالم ۔ بے رحم۔ کرب۔ تکلیف۔ تیغۂ دوسر۔ دو دھاری تلوار۔ الاماں۔ پناہ کے لیے پکارنا۔

تشریح :۔ جو تلوار اور نیزے کا ایک وار کرتا ہے اور لڑائی کی ایسی شاندار مہارت کا مظاہرہ کرتا ہے کہ کتنے ہی ظالم دشمن دین زمین پر گر کر تکلیف سے تڑپنے لگتے ہیں جس کی دو دھاری تلوار کی کاٹ کا یہ عالم ہے کہ جب وہ وار کرتا ہے۔ تو چاروں طرف سے الاماں کی فریاد بلند ہوتی ہے اور دشمن خدا کی پناہ طلب کرنے لگتا ہے۔ ظاہر ہے یہ جری اور بہادر شخص حسینؓ ہی ہو سکتے ہیں جو نبی اکرمؐ کے بیحد لاڈلے اور پیارے نواسے ہیں۔

یہ مردِ حق پرست ہے مئے رضا سے مست ہے
کہ جس کے سامنے کوئی بلند ہے نہ پست ہے
اِدھر ہزار گھات ہے، مگر عجیب بات ہے
کہ ایک سے ہزار ہا کا حوصلہ شکست ہے
یہ بالیقین حسینؓ ہے
نبیؐ کا نورِ عین ہے

مشکلات :۔ حق پرست ۔ خدا اور حق و صداقت کا پرستار۔ رضا ۔ اللہ کی رضا کی شراب ۔ گھات ۔ نشانے والی جگہ۔

تشریح :۔ اس ہستی نے حق کی حمایت میں سب کچھ داؤ پر لگا دیا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ اس کے سر میں رضائے الٰہی کا نشہ شراب کی طرح چھا گیا ہے۔ اب کیفیت یہ ہے کہ کوئی بادشاہ اس کی نظر میں جچتا ہے نہ کوئی فقیر آدمی اُس کے نزدیک حقیر ہے۔ اُس کے نزدیک عزت کا معیار عام لوگوں سے بالکل مختلف ہے۔ ایمان کی اسی بلندی اور پختگی کا نتیجہ ہے کہ دشمنوں کی کثرت اُسے خوفزدہ نہیں کر سکی، بلکہ اُلٹے دشمن ہزاروں کی تعداد میں ہوتے ہوئے بھی اُس سے ہراساں ہیں اور دُور بھاگنے کی کوشش میں ہیں۔ — ظاہر ہے ایسی بے مثال خوبیوں کے حامل صرف حسینؓ ہی ہو سکتے ہیں جنہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بے حد پیار کرتے تھے اور آنکھوں کی ٹھنڈک قرار دیتے تھے۔

عبا بھی تار تار ہے — تو جسم بھی فگار ہے
زمین بھی ہے تپی ہوئی — فلک بھی شعلہ بار ہے
مگر یہ مردِ تیغ زن، یہ صف شکن، فلک فگن
کمال صبر و تن دہی سے محوِ کارزار ہے
یہ بالیقین حسینؓ ہے
نبیؐ کا نورِ عین ہے

مشکلات :۔ عبا ۔ وہ لمبا چغہ جو لباس کے اُوپر پہنتے ہیں۔ فگار ۔ زخمی ۔ شعلہ بار ۔ شعلے برسانے والا۔ تیغ زن ۔ تلوار چلانے والا۔ صف شکن ۔ صفوں کو تباہ کر دینے والا۔ فلک فگن ۔ آسمان کو گرانے یا مارنے والا۔ کارزار ۔ جنگ ۔

تشریح :۔ صورتِ حال اتنی نازک ہے کہ لڑتے لڑتے اس محترم ہستی کی عبا پھٹ گئی ہے اور جسم زخموں سے چور ہے۔ دوسری جانب موسم کی شدت کا یہ عالم ہے کہ زمین سے آگ نکلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے جب کہ آسمان شعلے برسا رہا ہے۔ مگر ان ساری مشکلات بلکہ مصائب کے باوجود یہ شخص جو تلوار کا دھنی ہے، دشمنوں کی صفوں میں تباہی مچا دیتا ہے اور جس کی ہیبت کے سامنے آسمان بھی لرزاں ہے، بڑے ہی صبر و استقامت سے جنگ میں مصروف ہے اور مایوسی اس پر غالب نہیں آسکی۔ یقیناً ان اوصاف کے مالک حسینؓ ہی ہو سکتے ہیں جو نبی اکرمؐ

کے لختِ جگر اور نورِ نظر ہیں۔

دلاوری میں فرد ہے — بڑا ہی شیر مرد ہے
مگر جس کے دبدبے سے — دشمنوں کا رنگ زرد ہے

حبیبِ مصطفٰے ہے یہ، مجاہدِ خدا ہے یہ
جمی تو اس کے سامنے یہ فوج گرد گرد ہے

یہ بالیقیں حسینؓ ہے
نبیؐ کا نورِ عین ہے

مشکلات: دلاوری۔ بہادری، فرد۔ منفرد، یکتا۔ شیر مرد۔ بہت بہادر آدمی۔ دبدبے۔ خوف۔ رعب۔ رنگ زرد ہونا۔ خوفزدہ ہونا۔ گرد گرد۔ شکست خوردہ۔

تشریح: یہ شخص بہادری میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ شیروں کی طرح نڈر اور بے خوف ہے اور اس کے رعب اور ڈر سے دشمن سخت پریشان اور خوفزدہ ہے یہ قابلِ احترام شخص سرورِ کائنات جناب احمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کا پکا دوست اور فرمانبردار اور اللہ تبارک و تعالیٰ کا سپاہی نظر آتا ہے یہی سبب ہے کہ دشمن اتنی کثرت کے باوجود اُسے ہراساں نہیں کر سکا بلکہ خود شکست خوردہ دکھائی دیتا ہے۔ یقیناً یہ بے مثال انسان حسینؓ ہی ہو سکتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بے حد لاڈلے ہیں۔

اُدھر سپاہِ شام ہے — ہزار انتظام ہے
اُدھر ہیں دشمنانِ دیں — اِدھر فقط امام ہے

مگر عجیب شان ہے، غضب کی آن بان ہے
کہ جس طرف اُٹھی ہے تیغ بس خدا کا نام ہے

یہ بالیقیں حسینؓ ہے
نبیؐ کا نورِ عین ہے

مشکلات: آن بان۔ شان و شوکت، وقار۔

تشریح: مقابلے میں شام کی زبردست فوج ہے اور اُس نے ہر طرح کا انتظام کر رکھا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اُدھر دین کے سارے دشمن جمع ہو کر آ گئے ہیں۔ جب کہ ادھر امام عالی مقام سیدنا حسینؓ اکیلے مقابلے میں کھڑے ہیں

لیکن اس کے باوجود حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ زبردست وقار، استقامت اور رعب و داب کے ساتھ کھڑے دشمن کو للکار رہے ہیں۔ اور جس طرف اُن کی تلوار اُٹھ جاتی ہے، دشمن نیست و نابود ہو جاتا ہے۔ (اور وہاں صرف خدا کا نام ہی رہ جاتا ہے) ـــــ اس غیر معمولی قسم کے بہادر، مستقل مزاج، صابر و بلند حوصلہ انسان کا نام حسینؓ ہے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور ہے اور جنہیں جناب رسالتمآبؐ گود میں اُٹھا کر والہانہ پیار کیا کرتے تھے۔

احسان دانش

حالاتِ زندگی

نام احسان الحق اور تخلص احسان۔ ادبی حلقوں میں احسان دانش کے نام سے مشہور ہیں ان کے والد قاضی دانش علی ایک درویش منش اور بلند کردار انسان تھے۔ احسان ۱۹۱۴ء میں کاندھلہ ضلع مظفر نگر (یو۔پی) میں پیدا ہوئے۔

ان کا گھرانہ انتہائی غریب تھا اس لیے بمشکل پرائمری تک تعلیم پا سکے۔ اس کے بعد روزگار کی تلاش ہوئی۔ مختلف اوقات میں مختلف نوکریاں کیں۔ چوکیدار رہے۔ چپڑاسی بنے، مالی کا کام کیا۔ ٹوکری اٹھائی۔ احسان دانش نے محنت مزدوری کو عار نہ سمجھا اور رزقِ حلال کے لیے تگ و دو جاری رکھی۔

وہ اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکے تھے مگر علم کی لگن دل میں موجود تھی۔ ذاتی مطالعہ جاری رکھا۔ جس کے نتیجے میں اُن کا مطالعہ وسیع ہو گیا اور شعر و سخن سے دلچسپی بڑھتی گئی۔

تلاشِ معاش کے سلسلے میں لاہور پہنچے۔ ابتدا میں یہاں معمولی نوکریاں اور کام کیے۔ ایک عرصے تک چوکیداری کے فرائض انجام دیتے رہے۔ پھر مشاعروں میں جانے لگے۔ ان کی شاعری چمکتی اور شہرت پھیلتی گئی۔ حتیٰ کہ برصغیر کے چند نمایاں اور چوٹی کے شاعروں میں شمار ہونے لگے۔

وہ ایک فقیر صفت، سادہ مزاج اور علم دوست انسان ہیں۔ اُن کا سب سے پہلا مجموعۂ کلام "حدیثِ ادب" کے نام سے شائع ہوا۔ ابتک اُن کے بہت سے دوسرے مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں "چراغاں" "آتشِ خاموش" "جادۂ نو" "نیشِ زہر" "مقالات"

"گورستانِ اور تیراثِ مومن" وغیرہ شامل ہیں۔ اِن کی خود نوشت سوانح "جہانِ دانش" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

احسان دانش کا قیام لاہور میں ہے۔

احسان دانش کی شاعری

احسان دانش دورِ حاضر کے معروف شاعر ہیں جنہیں نظم اور غزل دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہے ——— وہ ایک پختہ گو اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ ان کی شاعرانہ عظمت اور شہرت کی بنیاد اُن کی خداداد ذہانت اور ان کی ذاتی محنت

احسان دانش کسی ادبی دبستانِ ندی میں شریک نہیں ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ ایک بلند پایہ شاعر شمار ہوتے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ انہوں نے محض اپنے اعلیٰ فن کی بدولت اپنا مقام پیدا کیا ہے ——— ابتدا میں انہیں نظر انداز کیا جاتا رہا۔ مگر ادب کے ٹھیکیداروں کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ زیادہ دیر تک اُن کا راستہ روکیں چنانچہ دُنیائے شعر و ادب میں وہ ایک مہاری شعر کہنے والے کی حیثیت سے چمکے اور آج دُنیائے شعر میں انہیں اُستادِ سخن مانا جاتا ہے۔ ان کے متعدد شعری مجموعے چھپ چکے ہیں۔

ان کی شاعری میں ارتقا پذیری کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ انہوں نے فن کے مروجہ مگر معیاری تقاضوں کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ دنیائے شعر کی فنی تبدیلیوں کا ساتھ دیتے رہے۔ اور اس کے ساتھ وہ شاعری کے جدید رجحانات سے بھی آگاہ رہے۔ اُن کی شاعری ہر دور میں فنی اور معنوی تبدیلیوں کا خیر مقدم کرتی رہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی شاعری کبھی کہنگی کا شکار نہیں ہوئی بلکہ اس میں ایک تازگی اور نئے پن کا احساس ہوتا ہے یہ وصف اردو کے بہت کم شاعروں کو نصیب ہوا ہے یہی وجہ ہے کہ شاعروں کے قدیم گروہ سے تعلق رکھنے کے باوجود جدید غزل اور جدید نظم میں احسان دانش ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں ——— غزل میں وہ بہر حال اپ ٹو ڈیٹ شاعر ہیں۔

احسان دانش چونکہ ذاتی طور پر ایک پختہ، متوازن اور سلجھی ہوئی شخصیت کے مالک ہیں اس لیے ان کی شاعری میں بھی بڑا توازن اور ٹھہراؤ ہے۔ ان کی شاعری کو پڑھ کر تاری دتو جیسے محسوس کرتا ہے اور نہ ابہام کا شکار ہوتا ہے۔ وہ بعض ترقی پسندوں کی طرح علمی پن، مصنوعی سیاست بازی یا مجبوری نعرے بازی کا شکار نہیں ہوئے۔ ان کے ہاں بناوٹ یا تصنع نہیں۔ ان کی شاعری میں مذہب، اخلاقی و روحانی

قدروں اور مشرقی تہذیب و روایات کی پاسبانی کا احساس ملتا ہے کیونکہ احسان کی اپنی پرورش رزقِ حلال پر ہوئی۔ ان کے شعری احساسات، ان کی شخصیت کے پختہ فکر سانچے کی پیداوار ہیں اس لیے ان میں کسی طرح کا کھوٹ نہیں۔ ان کی شاعری ایک کھرے اور پختہ انسان کے سچے جذبات ہیں جو فن کے پُرکشش لبادے میں ہمارے سامنے جلوہ گر ہیں۔

احسان دانش کی شاعری میں ایک قلندرانہ شان پائی جاتی ہے۔ ان کی شاعری ایک بے نیاز، درویش صفت اور فقیر منش انسان کی شخصیت کی آئینہ دار ہے۔ جھوٹی تعریفوں سے انہیں بہت نفرت ہے۔ قلندری کے سبب ان کے لہجے میں بلند آہنگی بھی موجود ہے۔

ان کی شاعری، مقصدی شاعری ہے۔ وہ "فن برائے فن" کے قائل نہیں۔ ان کی شاعری انسان کو اعلیٰ جذبات سے روشناس کراتی ہے۔ اسے پڑھ کر قاری کے اندر اخلاقی احساسات پیدا ہوتے ہیں۔

احسان دانش کی اپنی زندگی بڑی آزمائشوں سے گزری، ان کی شاعری رنج و غم اور سوز و گداز کی کیفیات سے خالی نہیں، غربت، افلاس اور مختلف طرح کی محرومیوں نے شاعر کو جو روحانی ترفع بخشا، اس کا افتخارانہ اظہار ان کی شاعری میں ملتا ہے۔

دیہات کی سیر

تعارف و مرکزی خیال: یہ نظم دیہات کے ایک منظر یعنی شام کی آمد کی عکاسی کرتی ہے۔ شاعر نے بتایا ہے کہ دیہات میں شام خاموشی اور سکون لے کر آتی ہے۔ اس حوالے سے اُس نے دیہاتی لوگوں کی سادگی، خلوص، بے ریائی اور معاشی اہمیت کی بھی تعریف کی ہے اور اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ شہر کو چھوڑ کر دیہات میں جا کر رہنا چاہیے۔

نظم کی تشریح

سُرخ سے برسا رہا تھا شام کا رنگین شباب
جھک رہا تھا دور کھیتوں کے کنارے آفتاب

مشکلات: رنگین شباب: خوبصورت جوانی۔

تشریح: شام کے وقت جب سورج دور مغربی اُفق پر جھک جاتا ہے تو تپش کم ہونے کی وجہ سے وہ ایک تو سُرخ گول پیالے کی طرح نظر آتا ہے، دوسرے سُرخ رنگ اُفق

پھر جاتا ہے اس منظر کو شاعر نے یوں بیان کیا ہے کہ شام پر جوانی آرہی تھی اور اس کے انگ انگ سے سُرخ رنگ کی شراب ٹپکتی ہوئی نظر آتی تھی۔ یعنی اس وقت سورج (شراب سے بھرے ہوئے گول پیالے کی طرح) دُور کھیتوں کے کنارے مغرب کی طرف جھکا جا رہا تھا۔

سرنگوں تھیں ٹہنیاں شرمار ہے تھے سبزہ زار
آرہی تھیں نیند کی پریاں ہواؤں پر سوار،

سرنگوں: سر جھکائے ہوئے

مشکلات: تشریح: اس وقت ہوا تھم گئی تھی جس کے نتیجے میں درختوں کی جھکی ہوئی ٹہنیاں یوں لگتی تھیں جیسے کسی سوچ میں غرق ہیں اور سبزے کے میدان یوں خاموش اور بے حس و حرکت تھے جیسے شرما رہے ہوں۔ دراصل بات یہ تھی کہ شام آنے والی تھی اور نیند کی پریاں ہواؤں پر سوار ہو کر آرہی تھیں۔ اور سروں کا جھکنا اور شرم و خاموشی کی یہ کیفیت صرف انہی کی وجہ سے تھی۔

دامن شب میں چھپی جاتی تھی فطرت کی اُمنگ
چھڑ رہی تھی آبشاروں میں سُہانی جل ترنگ

مشکلات: اُمنگ: بے پناہ خواہش سہانی: خوبصورت، دلکش جلترنگ: ایک راگ چینی کی پیالیوں میں پانی بھر کر انہیں چھڑیوں سے بجایا جاتا ہے جس سے یہ راگ پیدا ہو جاتا ہے۔ لفظی معنی پانی کی موسیقی۔

تشریح: دن کام کاج اور مصروفیت کے لیے ہوتا ہے۔ شام پڑتی ہے تو کم از کم دیہات میں یہ سارا سلسلہ رُک جاتا ہے اور تمام فطری آنکھیں دوسرے دن پر ملتوی ہو کر آرام کرنے لگتی ہیں۔ اس بات کو شاعر نے یوں بیان کیا ہے کہ شام کے وقت تمام انسانی ارادے اور پروگرام رات کے دامن میں چھپنے لگے تھے اور دُور آبشاروں اور چشموں کا بلندی سے گرتا ہوا پانی یوں سُریلی موسیقی الاپنے لگا تھا کہ ہر چیز پر خمار سا طاری ہو رہا تھا جس کے اثر سے نیند آنے لگی تھی۔

بند کیں ذرّوں نے آنکھیں اور لہریں رُک گئیں
رفتہ رفتہ شام کی دیوی کی آنکھیں جھک گئیں

تشریح: دن میں ریت کے ذرات دھوپ میں چمک رہے تھے، لیکن اب سورج افق کی آغوش میں اتر گیا ہے، اس کی کرنیں غائب ہو گئی ہیں، اس لیے ذرّوں کی چمک بھی ختم ہو گئی ہے۔ ندی کے پانی میں اتنا سکون ہے کہ لہروں کا نشان تک نظر

نہیں پاتا۔ اور یوں لگتا ہے کہ شام کی خاموشی نے اُن پر بھی جادو کر دیا ہے۔ اب سورج بالکل غروب ہو گیا ہے اور شام کی دیوی نے اپنی آنکھیں جھکا لی ہیں یعنی اندھیرا بڑھتا آ رہا ہے۔

راستوں میں ظلمتوں کے سانپ بل کھانے لگے پست چرواہے چراگاہوں سے گھر آنے لگے

مشکلات: ظلمتوں: اندھیروں پست: چھوٹے قد کے

تشریح: سورج غروب ہو گیا ہے اور اندھیرا بڑھ رہا ہے۔ اس وقت کم سن لڑکے جو دن بھر باہر میدانوں میں مویشی چراتے رہے ہیں، اب اپنے ڈھور ڈنگر لے کر واپس آ رہے ہیں۔ اس منظر کو شاعر نے یوں بیان کیا ہے کہ گھنے درختوں اور فصلوں سے گھرے ہوئے راستوں میں اندھیرے کے سانپ سرسرانے لگے ہیں اور چھوٹے قد کے چرواہے مویشی لے کر واپس گھروں کو آ رہے ہیں۔

آسمان کے سُرخ جلووں پر سیاہی آ گئی جھٹپٹا سا ہو کے عالم پر اُداسی چھا گئی

مشکلات: جھٹپٹا: ہلکا اندھیرا عالم: دُنیا

تشریح: سورج غروب ہونے سے ذرا پہلے مغربی افق پر چمکدار سرخ رنگ چھا گیا تھا، مگر اب یہ سُرخ جلوے سیاہی میں ڈوب رہے ہیں۔ حالت یہ ہے کہ ہلکا ہلکا اندھیرا چھا گیا ہے اور دُنیا پر اُداسی کی کیفیت چھا رہی ہے۔

اوڑھ کر اِک قیر گوں چادر بیابان سو گیا سبز کھیتوں پر خنک سایہ مسلط ہو گیا

مشکلات: قیر گوں: سیاہ رنگ کی مسلط ہو گیا: قابض ہو گیا۔

تشریح: بیابانوں یعنی جنگلوں اور صحراؤں نے اندھیرے کی سیاہ چادر اوڑھ لی ہے۔ اور وہاں یوں خاموشی چھا گئی ہے جیسے وہ سو گئے ہوں سرسبز کھیتوں پر (جو دن بھر دُھوپ میں جلتے رہے ہیں) بھی ٹھنڈے سائے لہرانے لگے ہیں۔ یعنی وہاں اندھیرا بھی ہے اور اداسی کی وجہ سے خنکی بھی۔

خامشی پر رنگ آیا شورشِ عالم گئی آسمان پر انجم تاباں کی محفل جم گئی

مشکلات: شورشِ عالم: دنیا کا شور و غل، ہنگامہ انجم تاباں: روشن چمکدار ستارے۔

تشریح: اب شام کا اندھیرا مزید گہرا ہونے لگا ہے خاموشی میں مزید اضافہ ہوا ہے اور انسانوں، حیوانوں اور پرندوں کا وہ شور و غل جو دن بھر جاری رہا ہے، اب ختم ہو گیا ہے۔ اس وقت آسمان پر روشن چمکدار تارے نکل آئے ہیں اور اُن کی محفل جمی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

شام کے اندھیر میں دن کا اُجالا کھو گیا آگ کے چوگرد دہقانوں کا جمگھٹ ہو گیا

مشکلات: جمگھٹ: ہجوم چوگرد: چاروں طرف

تشریح: شام کا اندھیرا دن کی روشنی پر مکمل طور پر غالب آگیا ہے کسان کھانا کھا کر گھروں سے باہر آگ کے گرد آکر بیٹھ گئے ہیں۔

ہالیوں کو مل گیا دن بھر کی محنت سے فراغ
ٹمٹمایا گاؤں کی چوپال میں دُھندلا چراغ

مشکلات: ہالی: ہل چلانے والے۔ فراغ: فرصت۔ فراغت۔ چوپال: وہ مقام جہاں گاؤں کے لوگ فرصت کے اوقات میں آکر بیٹھنے لگتے ہیں:

تشریح: تمام دن ہل چلانے والوں اور کھیتوں میں محنت کرنے والوں کو اب فرصت ملی ہے۔ گاؤں کی چوپال میں مدھم سا چراغ جل اُٹھا ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ لوگ وہاں آکر بیٹھنے لگے ہیں۔

مشورے ہونے لگے نشوونما کے باب میں سادہ خاطر پڑ گئے تقریر کے سیلاب میں

مشکلات: نشوونما: پرورش و ترقی باب میں: بارے میں۔ سادہ خاطر: سادہ دل۔

تشریح: چوپال میں لوگ جمع ہو گئے ہیں اور اب فصلوں، مویشیوں اور دیگر معاملات کی ترقی و افزائش کے بارے میں مشورے ہونے لگے ہیں۔ ایک صاحب جو زیادہ تیز طرار اور چرب زبان ہیں، خوب زور دار طریقے سے باتیں کر رہے ہیں اور باقی لوگ جن کی اکثریت سادہ دل ہے، اس تقریر کے سیلاب میں بہتے چلے جا رہے ہیں۔ اُن کے نزدیک یہ باتیں کسی عالم فاضل انسان کی تقریر سے کم نہیں۔

یہ ہیں وہ جن پر تغافل کارگر ہوتا نہیں جن کے دل میں کبر و نخوت کا گزر ہوتا نہیں

مشکلات: تغافل: غفلت، سستی، کوتاہی۔ کارگر ہونا۔ مفید رہنا۔ کام کرنا۔

کبر و نخوت: غرور، نخوت

تشریح: گاؤں کے ان لوگوں پر کبھی غفلت نہیں آتی۔ نہ یہ کبھی سستی یا کام چوری کے قریب پھٹکتے ہیں۔ لیکن اپنی تمام تر محنت اور ان تھک لگن کے باوجود ان کے دلوں میں غرور یا تکبر بھی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ پھر بھی عاجزی اور انکساری کو عادت بنائے رکھتے ہیں۔

جن کی گرد رہ گزر ہے غازۂ روئے بہار جن کا شانہ روز سلجھاتا ہے زلفِ روزگار

مشکلات: گرد رہ گزر: راستے کی خاک غازۂ روئے بہار: بہار کے چہرے کا پاؤڈر شانہ: کنگھی، روزگار: زمانہ

تشریح: لفظی مفہوم یہ ہے کہ ان کسانوں کے چلنے سے جو گرد اُٹھتی ہے وہ بہار کے

چہرے کا غازہ بن جاتا ہے، اور ان کی کنگھی زمانے کی زلفیں سنوارتی ہے۔ تشریح یہ ہے کہ بہاروں کا جتنا حسن ہے، پھولوں کو جو بھی جوبن ملتا ہے۔ اور میدانوں میں جو سرسبزی و شادابی پیدا ہوتی ہے وہ ان کسانوں کی وجہ سے ہے اور دنیا کی تقدیر میں جو خوبیاں آتی ہیں، جو خوش حالی اور امن و سکون آتا ہے وہ بھی انہیں کی وجہ سے ہے۔ یہ محنت نہ کریں تو نہ بہاروں کو حسن ملے نہ ہی شہروں میں رہنے والے انسانوں کو رزق دستیاب ہو۔

جن کی فطرت سے ہوس ناکی ہے فرسنگوں پرے
شہر تو ں سے جن کے کھوٹے بھی نکلتے ہیں کھرے

مشکلات: ہوس ناکی: نفسانی و مادی اغراض فرسنگ: فاصلے کا ایک ناپ جو ۱۸ ہزار فٹ کے برابر ہوتا ہے۔

تشریح: یہ کسان لوگ قناعت پسند ہوتے ہیں، ان کی لمبی چوڑی خواہشات نہیں ہوتیں۔ مخلص ہوتے ہیں اس لیے کسی کی دولت مندی سے حسد کا شکار نہیں ہوتے۔ وہ ایسے ذلیل جذبات سے بہت دور رہتے ہیں، بلکہ ان میں بعض لوگ جو بظاہر کھوٹے یعنی غلط قسم کے لوگ نظر آتے ہیں، وہ بھی دیہاتی روایات کے تحت کھرے یعنی اچھے آدمی ثابت ہوتے ہیں۔

بازوؤں پر جن کے نازاں فطرت گلشن طراز کاوشوں سے جن کی حسن انجمن مائل بہ ناز

مشکلات: نازاں: فخر کرنے والی۔ فطرت گلشن طراز: باغوں کو سجانے اور زینت دینے والی قدرت الٰہی۔ کاوش: کوشش، محنت حسن انجمن: محفل کا حسن یا جوبن۔ مائل بہ ناز: فخر کرنے پر آمادہ

تشریح: ان کسانوں کی بازوؤں کی قوت پر اللہ کی قدرت کو بھی ناز ہے کہ ان کے ذریعے باغوں کو زینت ملتی ہے اور انسانوں کی محفلیں بھی ان پر فخر کرتی ہیں کہ انہی کی وجہ سے ان محفلوں کا حسن اور رونق قائم ہے۔ وہی بات ہے جو پہلے کہی گئی ہے۔

واہ رے دیہات کے سادہ تمدن کی بہار سادگی میں بھی ہے کیا کیا تیرا دامن زرنگار

مشکلات: تمدن: رہنے سہنے کے طریقے زرنگار: سونے سے سجا ہوا۔ سنہری۔

تشریح: شاعر دیہاتی معاشرت کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اے گاؤں کی سادہ و بے تکلف زندگی آفرین ہے تجھ پر کہ اگرچہ تو سادہ ہے، تکلف اور بناوٹ سے بری ہے لیکن پھر بھی تیرا دامن سونے سے جڑا ہوا محسوس ہوتا ہے یعنی بیحد خوبصورت بھی ہے اور بہت قیمتی و اہم بھی۔

دل یہ کہتا ہے ذاتِ انجمن سے لگوں شہر کی رنگینیوں چھوڑ دوں یہیں رہنے لگی

تشریح: دیہاتی زندگی کا یہ سکون اور حسن دیکھ کر دل میں بے اختیار یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ شہر کی دوغلوں اور دوستوں کی محفلوں کو چھوڑ کر یہیں آباد ہو جاؤں اور ان سادہ دل دیہاتیوں میں باقی زندگی گزار دوں۔

میر حسن

۱۷۳۶ —— ۱۷۸۶ء

میر غلام حسن نام، حسن تخلص، میر حسن کے نام سے مشہور ہیں۔ دہلی میں ۱۷۳۶ء میں پیدا ہوئے۔ اُن کے جدِ اعلیٰ میر امامی ہرات کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اورنگ شاہجہان کے عہدِ حکومت کے آخری ایام میں دہلی آ گئے تھے۔ میر حسن کے والد میر غلام حسین ضاحک اپنے زمانے کے مشہور و معروف شاعر تھے۔ میر حسن کے بیٹے خلیق اور پوتے میر انیس تھے۔ میر انیس نے مرثیہ گوئی کو اوجِ کمال تک پہنچایا۔

میر حسن نے ابتدائی تعلیم اپنے والد میر ضاحک سے حاصل کی۔ والد ہی کی صحبت میں شعر و سخن کا ذوق پیدا ہوا۔ حضرت خواجہ میر درد سے اصلاح لی۔ کچھ مدت تک مرزا محمد رفیع سودا کی بھی شاگردی کی۔ درد، سودا اور میر تقی میر کا طرزِ سخن انہیں بہت پسند تھا۔

دہلی پر زوال آیا تو میر ضاحک اپنے خاندان کے ہمراہ دہلی سے فیض آباد پہنچے۔ یہاں میر حسن نواب سالار جنگ کے دربار میں ملازم ہو گئے۔ ۱۷۷۵ء میں جب صدر مقام لکھنؤ منتقل ہوا، تو وہ نواب آصف الدولہ کے پاس لکھنؤ چلے گئے۔

میر حسن کی زندگی تنگی و تکلیف میں گزری۔ مختلف قصیدوں اور مثنویوں پر جس قدر انعام و اکرام کی توقع ہوتی تھی، نہ ملتا تھا۔ شہرہ آفاق مثنوی سحر البیان انہوں نے وفات سے دو سال قبل لکھی، لیکن آصف الدولہ نے مناسب قدر افزائی نہ کی اور محض ایک دوشالہ دے کر ٹال دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس ناقدریٔ عالم پر شاعر کا حساس دل ٹوٹ گیا اور وہ ۱۷۸۶ء میں پچاس سال کی عمر میں وفات پا گئے۔

شاعری کی خصوصیات

میر حسن قادر الکلام شاعر تھے۔ غزل، قصیدہ اور مثنوی پر عبور حاصل تھا۔ تقریباً دو جزو بھر

مثنویاں اُن کی یادگار ہیں۔ جن میں "سحر البیان" کو خاص امتیازیت حاصل ہوئی۔ یہ مثنوی میر حسن کو ادبی دنیا میں ہمیشہ زندہ رکھے گی۔

میر حسن کی مثنوی نگاری کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ منظر نگاری میر حسن قادر الکلام شاعر تو نہیں ہیں۔ مگر اس کے باوجود اُن کا شاہکار بھی بے پناہ ہے۔ وہ جب کسی منظر کو بیان کرتے ہیں، تو گویا الفاظ کے سامنے تصویر کھینچ دیتے ہیں اور متعلقہ منظر مجسم صورت اختیار کر کے سامنے آجاتا ہے۔ مثال کے طور پر باغ کا ایک منظر ملاحظہ ہو:۔

بنی سنگِ مرمر سے اک پٹڑی کی نہر — گئی چلی سُو اس کے پانی کی لہر
قرینے سے گرداس کے سرو سہی — کچھ اک دور دور اس سے سیب و بہی
گلوں کا لبِ نہر پر جھومنا — اسی اپنے عالم میں مُنہ چومنا

۲۔ جزئیات نگاری اس کے ساتھ ہی میر حسن کی مثنوی کی دوسری خوبی یہ ہے کہ وہ منظر نگاری کرتے ہوئے یا کسی کردار کے خاص عمل کا بیان کرتے ہوئے چھوٹی سے چھوٹی بات کو نظر انداز نہیں کرتے۔ یہ واقعہ کے معمولی معمولی لیکن اہم گوشوں پر روشنی ڈالتے چلے جاتے ہیں۔ باغ میں مختلف نظاروں اور کیفیتوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

کوئی حوض میں جا کے غوطہ لگائے — کوئی نہر پر پاؤں بیٹھی ہلائے
مقابر کوئی کھول مستی مگائے — لبوں پر دھڑی کوئی اپنی جمائے

۳۔ محاکات نگاری دورانِ گفتگو کسی کردار کے جذبات و احساسات کے مطابق اس کے چہرے کے آتار چڑھاؤ، ہاتھوں اور گردن کی حرکات کو بیان کرنا محاکات نگاری کہلاتا ہے۔ میر حسن کو اس مشکل فن میں بھی کمال حاصل ہے۔ وہ انسانی نفسیات سے گہری شناسائی رکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ کس موقع پر کس کردار کی کیا حرکات ہوں گی۔ پھر نہایت مہارت اور چابکدستی سے انہیں بیان کرتے ہیں۔

طرزِ ادا اور کردار نگاری مثنوی سحر البیان کی غالباً سب سے بڑی خصوصیت اس کے طرزِ ادا میں مضمر ہے۔ جہاں جس قسم کے لوگوں کا ذکر آیا ہے، انہیں کے مناسب الفاظ و ترکیب اور اصطلاحات لائے ہیں۔ نجومیوں، فالگیروں اور برہمنوں کا جہاں ذکر آیا ہے، وہاں اُن کی عادات اور نفسیات کے مطابق اس کا نقشہ کھینچا ہے۔ یوں لگتا ہے شاعر نے اُن کی صحبتیں بھی عمر گزاری ہے۔ نظم

عیش و نشاط اور رقص و موسیقی کا منظر بیان کرتے ہوئے موسیقی اور رقص کے فن کی باریکیاں اور اصطلاحات بیان کر دی ہیں اور ساز و نغمے کی جزئیات کو بیان کیا ہے۔ ان کے علاوہ تمام انسانی جذبات، واقعات کے بیان پر مکمل قدرت رکھتے ہیں۔

تہذیب و معاشرت کی تصویر کشی | سحر البیان میں اگرچہ ایک فرضی قصہ بیان کیا ہے۔ لیکن جہاں جہاں معاشرت کی تصویریں نظر آتی ہیں وہ دراصل اس دور کے جاگیر دار اور نوابی گھرانوں کی عکاسی کرتی ہیں جن سے ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ آج سے دو ڈھائی سو سال پہلے شمالی ہند کے مسلمان امراء کیسی پُر تعیش زندگی گزارتے تھے اور اپنا مال و دولت عیش و نشاط کے وسائل جمع کرنے اور عورتوں کی فوج ظفر موج پالنے پر ہی صرف کرتے تھے۔
اس مثنوی سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور کا امیر طبقہ سر تا پا مادیت پرستی میں غرق ہو گیا تھا جس کے نتیجے میں سارا معاشرہ اندرونی طور پر کھوکھلا ہو کے رہ گیا تھا۔ جس پر بڑی آسانی سے انگریزوں نے غلبہ حاصل کر لیا۔

داستان، باغ کی تیاری میں

تعارف اور مرکزی خیال | نظم کا یہ حصہ میر حسن کی مشہور مثنوی "سحر البیان" سے لیا گیا ہے اس میں باغ کی آرائش اور زیب و زینت کے لئے جو کچھ کیا گیا اس کی ایک ایک تفصیل دی گئی ہے نظم کا کمال یہ ہے کہ اس میں منظر نگاری کے تمام تقاضے پورے کئے گئے ہیں اور کسی منظر کا کوئی پہلو نظروں سے اوجھل نہیں رہتا۔

نظم کی تشریح

مئے ارغوانی پلا ساقیا کہ تعمیر کو باغ کی دل چلا

مشکلات | مئے ارغوانی۔ سرخ رنگ کی شراب۔ ساقیا۔ اے ساقی اے شراب پلانے والے۔

تشریح | اے ساقی، اے میرے محبوب آج مجھے سرخ رنگ کی خاص شراب پلا کر میرا دل باغ کی تعمیر اور زیب و زینت کا عزم لے کر اٹھا ہے شعری کی روایت
یہ ہے کہ اس کی ابتدا کرتے ہوئے یا کسی نئے باب کو شروع کرتے ہوئے ساقی سے خطاب کیا جاتا تھا یہاں بھی وہی روایت نظر آتی ہے۔

بادشہ نے ترتیب اک خانہ باغ ہوا رشک سے جس کے لالے کو داغ

مشکلات خانہ باغ۔ گھر کا باغیچہ۔ پائیں باغ۔ رشک۔ یہاں حسد مراد ہے داغ ہونا زخم ہو جانا۔ سیاہ نشان پڑ جانا

تشریح بادشاہ نے محل کے قریب ایک باغ آراستہ کرایا۔ وہ اتنا خوبصورت تھا کہ اس کے حسن کو دیکھ کر مارے شرم کے پست کے سرخ پھول کے سینے پر داغ پڑ گیا یا کہ گلِ لالہ کے درمیان ایک سیاہ نشان ہوتا ہے۔ یوں یہ شعر حسن تعلیل کی ایک مثال ہے یعنی کی ایک ایسی وجہ بیان کی گئی ہے جو دراصل وجہ نہیں ہے۔

عمارت کی خوبی دروں کی وہ شان لگے جس میں زربفت کے سائبان

مشکلات دروں۔ دروازوں۔ زربفت۔ ایک قیمتی۔ ریشمی کپڑا جس میں سنہرے تار ہوتے ہیں۔ لفظی معنی سونے سے بُنا ہوا ہے۔

تشریح باغ کے درمیان جو عمارت تھی وہ بے پناہ خوبصورت تھی دروازوں کی الگ ہی شان تھی جن میں زربفت کے سائبان پردے لگے ہوئے تھے۔

چھتیں اور پردے بندھے زرنگار دروں پر کھڑی دست بستہ بہار

مشکلات چھتیں۔ پردوں کی ایک قسم جو عموماً تیلیوں سے بنائی جاتی ہیں زرنگار۔ سونے سے سجے ہوئے۔ دست بستہ۔ ہاتھ باندھے ہوئے۔ ادب سے۔

تشریح دروازوں پر جو چھتیں اور پردے لگے ہوئے تھے وہ سب سونے کی تاروں سے بنے ہوئے تھے جن کو خوبی کا یہ عالم تھا کہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے بہار کا موسم ہاتھ باندھے دروازوں پر آ کھڑی ہے۔

کوئی دُور سے در پہ اٹکا ہوا کوئی زہ پہ خوبی سے لٹکا ہوا

مشکلات زہ۔ منڈیر، کنارہ

تشریح بعض پردے تو دروازے کے ساتھ ڈوروں سے باندھ کر اٹکا دیئے گئے تھے اور بعض منڈیروں اور کناروں پر سے نہایت خوبصورتی سے لٹک رہے تھے۔

وہ مقیش کی ڈوریاں سو بسر کہ مہ کا بندھا جس میں تارِ نظر

مشکلات مقیش۔ سونے چاندی کے تاروں سے بُنا ہوا۔ سو بسر۔ سراسر۔ تمام۔ مہ کا تارِ نظر۔ رات کے وقت چاند کو دیکھیں تو نظروں سے لے کر چاند تک تار سے کھنچے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔

تشریح ان پردوں کو باندھنے کے لئے تمام تر سونے چاندی کے تاروں سے بنی ہوئی ڈوریاں یوں لٹک رہی تھیں کہ یوں لگتا تھا جیسے چاند کی کرنیں بُن دی گئی ہیں

چھتوں کا تھا شانتھا آنکھوں کا جال نگہ کو وہاں سے گزرنا محال

تشریح: چھتیں اس قدر دلکش اور نظر فریب تھیں کہ نگاہ جہاں پڑتی تھی وہیں رک جاتی تھی ایسا لگتا تھا یہ چھتیں نہیں ہیں بلکہ جال اور پھندا ہیں جن میں نگاہ گرفتار ہو کر رہ جاتی تھی۔

سنہری مغرق چھتیں سارے یاں وہ دیوار اور در کی گل کاریاں

مشکلات: مغرق سونے چاندی میں پکا ہوا۔ جگمگاتا ہوا۔ گل کاریاں۔ بیل بوٹوں کا کام

تشریح: اس عمارت کی چھتیں تمام کی تمام سونے چاندی سے پٹی ہوئی تھیں اور خوب چمک رہی تھیں جب کہ دیواروں اور دروازوں پر بے حد خوبصورتی سے بیل بوٹے بنے ہوئے تھے۔

دیئے ہر طرف آئنے جو لگا گیا چوگنا لطف اس میں سما

تشریح: اس عمارت کے اندر اور باہر ہر طرف آئینے لگا دیئے گئے اس طرح اس کے حسن و زیبائی میں چار گنا اضافہ ہو گیا۔

وہ مخمل کا فرش اس کا سطرا کہ بس بڑھے جس کے آگے نہ پائے ہوس

مشکلات: مخمل۔ سبز رنگ کا قیمتی ریشمی کپڑا۔ پائے ہوس۔ خواہش کے پاؤں۔

تشریح: اس مکان کے فرش مخمل کے تھے اور اس قدر نرم اور خوبصورت تھے کہ بس بیان نہیں ہو سکتے اسے دیکھ کر خواہش کے قدم آگے بڑھتے ہی نہیں تھے اور جی یہی چاہتا تھا کہ اُسے دیکھتے ہی رہیں۔

رہیں تخلئے اس میں روشن مدام معطر شب و روز جس سے مشام

مشکلات: تخلئے۔ خوشبودار چیزوں کا مجموعہ جسے مریضوں کو سنگھاتے بھی ہیں اور خوشبو کے لئے جلاتے بھی ہیں مدام۔ ہمیشہ، معطر۔ خوشبودار۔ مشام۔ سونگھنے کی حس۔ قوت شامہ

تشریح: اس عمارت میں ہر وقت خوشبودار چیزیں اس طرح جلتی رہتی تھیں کہ دن رات قوت شامہ کو خوشبو ہی خوشبو ملتی تھی

چھپر کھٹ مرصع کا دالان میں چمکتا تھا اس طرح ہر آن میں

مشکلات: چھپر کھٹ۔ دلہن کا پلنگ۔ مسہری۔ مرصع۔ سجا ہوا۔ دالان۔ برآمدہ برآن۔ ہر وقت۔

تشریح:۔ دالان میں شاندار اور خوبصورت مسہری رکھی ہوئی تھی جس میں مختلف قسم کے تار اور موتی اس طرح جڑے ہوئے تھے کہ وہ ہر وقت چمکتی رہتی تھی۔

زمین پر تھی اس طرح اس کی جھمک ستاروں کی جیسے فلک پر چمک

مشکلات: جھلک۔ نشکارے مارتی ہوئی روشنی۔ فلک۔ آسمان۔
تشریح:۔ اس مسہری میں سے یوں روشنی کے نشکارے نکل رہے تھے جیسے آسمان پر ستاروں کی جھلملاتی ہوئی روشنی ہوتی ہے۔

زمیں کا کروں واں کی کیا میں بیاں کہ صندل کا اک پارچہ تھا عیاں

مشکلات:۔ صندل۔ ایک خوشبودار لکڑی۔ پارچہ۔ ٹکڑا۔
تشریح: میں اس باغ کی زمین کا کیا ذکر کروں اس میں سے اس طرح خوشبوئیں پھوٹ رہی تھیں جیسے وہ صندل کا ایک ٹکڑا ہو۔

بنی سنگِ مرمر سے چوپڑ کی نہر گئی چار سو اس کے پانی کی لہر

مشکلات:۔ چوپڑ۔ ایک دوسری کو کاٹتی ہوئی چار سو۔ چاروں طرف۔
تشریح:۔ باغ میں سنگِ مرمر کی ایسی نہر تھی جس کی چار شاخیں تھیں۔ اس نہر کے پانی کی لہریں چاروں طرف آ جا رہی تھیں۔

قرینے سے گرد اس کے سرو سہی کچھ اب دور دور اس سے سیب و بہی

مشکلات: قرینے سے، سلیقے سے، خوبصورتی سے۔ سرو سہی۔ سیدھا سرو جس کی شاخیں اوپر کو اٹھی ہوتی ہوں۔ بہی۔ ناشپاتی سے ملتا جلتا ایک پھل
تشریح:۔ اس نہر کے کنارے سرو کے سیدھے بلند درخت بڑی خوبصورتی اور خوش ذوقی سے لگائے گئے جبکہ تھوڑے فاصلے پر سیب اور بہی جیسے پھل اور درخت بھی اپنی بہار دکھا رہے تھے۔

کہوں کیا میں کیفیت دار و بست لگائے رہی تاک واں مے پرست

مشکلات:۔ دار و بست۔ لکڑی کی وہ باڑ جس پر انگور کی بیلیں چڑھائی جاتی ہیں۔
تشریح:۔ اس باغ میں لکڑی کے ایسے ڈھانچے کھڑے کئے گئے تھے جن پر انگور کی بیلیں چڑھائی گئی تھیں اور جن پر انگور کے خوشے لٹک رہے تھے یہ حالت اور منظر اتنا خوبصورت اور مسرت انگیز تھا کہ شراب کے رسیا لوگ تاک لگائے بیٹھے رہتے تھے کہ کب ان انگوروں سے رس ٹپکے گا اور وہ ان سے لطف اندوز ہوں گے۔

تاک یہاں انتظار کے معنوں میں استعمال ہوا ہے لیکن فارسی میں یہ انگور کے معنی بھی دیتا ہے یوں اس شعر میں رعایت لفظی پائی جاتی ہے۔

ہوائے بہاری سے گل لہلہے چمن سارے شاداب اور ڈبڈبے

مشکلات:۔ ہوائے بہاری۔ موسم بہار کی ہوا۔ ڈبڈبے۔ سرسبز۔ پھلے پھولے ہوئے۔
تشریح:۔ موسم بہار کی ہوا سے پھول لہلہا رہے تھے اور جھوم رہے تھے جبکہ سارا باغ خوب

بوٹا پر تھا پھلا پھولا تھا اور سرسبز تھا۔

زمرد کے مانند سبزے کا رنگ روش پر جواہر لگا جیسے سنگ

مشکلات:۔ زمرد۔ سبز رنگ کا قیمتی پتھر۔ ہیرا۔ روش۔ کیاریوں کے درمیان راستہ

تشریح۔ سبزے کا رنگ یوں چمک رہا تھا جیسے زمرد اور کیاریوں کے درمیان روشوں پتھروں کے بجائے ہیرے جواہرات لگے ہوئے تھے۔

روش کی مفائی پہ بے اختیار گلِ اشرفی نے کیا زر نثار

مشکلات:۔ گلِ اشرفی۔ زرد رنگ کا گول پھول۔ گیندا۔ زر۔ سونا۔ نثار قربان۔

تشریح۔ روشیں اتنی صاف اور پاکیزہ تھیں کہ گلِ اشرفی نے خوش ہو کر اُن پر اپنا سونا نثار کر دیا (پھول کی پتیوں پر جو زردہ سا ہوتا ہے اُسے زر سے تعبیر کیا ہے)

چمن سے بھرا باغ گل سے چمن کہیں نرگس و گل، کہیں یاسمین

تشریح۔ باغ میں بہت سی چھوٹی چھوٹی کیاریاں (چمن) تھیں جبکہ ہر کیاری پھولوں سے لدی ہوئی تھی کہیں نرگس کے پھول بے تاب نظروں سے کسی کے منتظر تھے تو کہیں گلاب اور یاسمین اپنی بہار دکھا رہے تھے۔

چنبیلی کہیں اور کہیں موتیا کہیں رائے بیل اور کہیں موگرا!

مشکلات:۔ رائے بیل۔ ایک خوشبودار بیل، موگرا۔ دوہرا موتیا

تشریح:۔ کہیں چنبیلی اور کہیں موتیا تھا جبکہ دوسری جگہ پر رائے بیل خوشبو بکھیر رہی تھی اور موگرا مسکرا رہا تھا۔

کھڑے شاخ شبو کے ہر جا نشان مدن بان کی اور ہی آن بان

مشکلات:۔ شاخ شبو۔ پھولدار پودا جس کے پھول رات کو کھلتے ہیں مدن بان بیلے کی قسم کا ایک پھول آن بان۔ شان و شوکت۔

تشریح۔ ہر جگہ شاخ شبو کے پودے کھڑے تھے جبکہ مدن بان اپنی الگ شان دکھا رہا تھا۔

کہیں ارغوانی اور کہیں لالہ زار جدی اپنے موسم میں سب کی بہار

مشکلات:۔ ارغوان۔ سرخ رنگ کا خوشنما پھول۔ لالہ زار۔ جہاں لالے کے بہت سے پھول کھلے ہوں۔ جدی۔ الگ الگ۔

تشریح۔ اسی طرح کہیں ارغوان کے پھول تھے اور کہیں لالہ کے جھنڈ ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر خاص حسن و جمال کا حامل تھا۔

کہیں جعفری اور گیندا کہیں سماں شب کو داؤدیوں کا کہیں

تشریح:۔ کہیں جعفری کے پھول اپنی بہاری دکھا رہے تھے اور کہیں گیندے کے جھنڈ رات

کو گل داؤدی اپنا جوبن دکھا رہا تھا

عجب چاندنی میں گلوں کی بہار ہر اک گل میں مہتاب زار

مشکلات:۔ مہتاب زار۔ چاند کو ماند کر دینے والا۔

تشریح:۔ چاندنی رات میں ان پھولوں کا حسن عجیب ہی کیفیت دکھا رہا تھا۔ ان کے جوبن کے سامنے چاند بھی شرما رہا تھا اور اُس کی دلکشی ماند پڑ گئی تھی۔

کھڑے سرو کی طرح چنبے کے جھاڑ کہے تو کہ خوشبوؤں کے پہاڑ

مشکلات:۔ جھاڑ۔ جھاڑی کا اسم مکبّر۔ بڑی بڑی جھاڑیاں

تشریح۔ چنبے کی بڑی بڑی جھاڑیاں سرو کی سی بلندی کے ساتھ یوں کھڑی تھیں کہ انہیں بجا طور خوشبو کے پہاڑ کہا جا سکتا تھا۔

کہیں زرد نسرین۔ کہیں نسترن عجب رنگ پر زعفرانی چمن

مشکلات۔ نسترن۔ سفید گلاب کا پودا۔ نہایت خوشبودار۔ زعفران۔ قیمتی خوبصورت نہایت خوشبودار پھول۔

تشریح:۔ کہیں زرد نسرین کے پھول اپنی عجب دکھا رہے تھے کہیں نسترن اپنا جوبن کا مظاہرہ کر رہا تھا اور کہیں زعفران پر مشتمل باغیچہ اپنی بہار دکھا رہا تھا۔

بڑی آب جو ہر طرف کو بہے کریں قمریاں سرو پر چہچہے

مشکلات:۔ آب جو۔ پانی کی ندی۔ قمریاں۔ ایک خوش آواز پرندہ

تشریح:۔ پھولوں کی اس خوبصورت جنت میں پانی کی چھوٹی سی ندی ہر طرف اٹھکیلیاں کر رہی تھی جبکہ قمریاں سرو کے درختوں پر بیٹھ کر چہچہا رہی تھیں۔

گلوں کا لب نہر پر جھومنا اسی اپنے عالم میں منہ چومنا

تشریح:۔ نہر کے کنارے پھول مست ہو کر جھوم رہے تھے اور نشے کی سی کیفیت میں ایک دوسرے کا منہ بھی چوم رہے تھے ہوا کے چلنے سے پھول ایک دوسرے کے قریب ہو جاتے ہیں اس کیفیت کو شاعر نے منہ چومنے سے تعبیر کیا ہے۔

وہ جھک جھک کے گرنا خیابان پر نشے کا سا عالم گلستان پر

مشکلات:۔ خیابان۔ کیاری

تشریح۔ پھول جھک جھک کر کیاریوں میں گرتے پڑتے تھے یوں لگتا تھا پورے باغ نے شراب پی لی ہے اور ہر پھول پر نشے کا عالم طاری ہے۔

لئے ہاتھ میں بیلچے مالیں چمن کو گئیں دیکھنے بھالنے

مشکلات۔ مالن۔ مالی کی مؤنث۔ جو باغ کی رکھوالی کرتی ہو۔

تشریح:۔ پھولوں پر یہ کیفیت تھی جبکہ مالنوں نے بیلچے سنبھالے اور باغیچے کے پھولوں اور

دوں کو دیکھنے بھالنے لگیں۔

کہیں تخم پاشی کریں گود کر
کہیں پنیری جماویں کہیں کھود کر

مشکلات: تخم پاشی۔ بیج بونا۔ پنیری۔ پودوں کی ابتدائی حالت جب کہ انہیں اکھاڑ کر کھیت یا باغ میں لگاتے ہیں۔

تشریح: یہ مالنیں کہیں مٹی کو خوب نرم کر کے پھولوں کے بیج بو رہی تھیں اور کہیں زمین کو کھود کر پودے (پنیری) لگا رہی تھیں۔

کھڑے شاخ در شاخ باہم نہال
رہیں ہاتھ جوں مست گردن میں ڈال

مشکلات: باہم۔ ایک دوسرے کے ساتھ نہال۔ پودے۔

تشریح: پودوں کی شاخیں ایک دوسرے میں اس طرح اُلجھی ہوئی تھیں، جس طرح شرابی ایک دوسرے کی گردن میں بانہیں ڈال کر جھومتے ہیں۔

لبِ جو پہ آئینے میں دیکھ قد
اکڑتا کھڑے سرو کا جد بہ قد

مشکلات: لبِ جو۔ نہر کے کنارے۔ جد بہ قد۔ ہر وقت۔ جب اور تب۔

تشریح: نہر کے کنارے سرو کا درخت پانی کے آئینے میں اپنا لمبا خوبصورت قد دیکھ کر اتنا مغرور ہو گیا ہے کہ اب وہ اکڑ کر رہ گیا ہے اور کسی وقت اِدھر اُدھر حرکت نہیں کرتا۔ وہ دوسروں کو بھی اپنا یہ حسن دکھانا چاہتا ہے اور خود بھی دیکھ دیکھ کے خوش ہو رہا ہے۔

خراماں صبا صحن میں چار سُو
دماغوں کو دیتی ہر اک گُل کی بُو

مشکلات: خراماں۔ آہستہ آہستہ چلنا۔ چار سُو۔ چاروں طرف۔

تشریح: باغ کے صحن میں صبح کی ٹھنڈی مست ہوا۔ صبا۔ چاروں طرف چل رہی ہے اور دماغوں تک ہر پھول کی خوشبو الگ الگ پہنچا رہی ہے۔

کھڑے نہر پر فاز اور قمقرے
لیے ساتھ مرغابیوں کے پرے

مشکلات: قاز، راج ہنس۔ قرقرے، بڑی بطخ۔ پرے: گروہ

تشریح: نہر کے کنارے راج ہنس اور قرقرے بھی کھڑے ہیں۔ ساتھ اُن کے مرغابیوں کے گروہ بھی ہیں۔

صدا قرقروں کی، بطخوں کی وہ شور
درختوں پہ بگلے منڈیروں پہ مور

تشریح: یہ قرقرے خوب چہک رہے تھے جب کہ بطخیں بے طرح سے غوغا مچا رہی تھیں۔ یہ منظر محض نہر کے کنارے ہی پر نہ تھا بلکہ درختوں پر بگلے بیٹھے چہلیں کر رہے تھے جب کہ منڈیروں پر مور جھنکار رہے تھے۔

چمن آتشِ گل سے دہکا ہُوا
ہَوا کے سبب باغ مہکا ہُوا

مشکلات: آتشِ گل۔ پھولوں کی آگ۔ پھولوں کے سُرخ رنگ کی نسبت سے یہ نام دیا جاتا ہے۔ دہکا ہُوا۔ سرخ ہُوا ہُوا۔

تشریح: باغ میں پھول اس افراط سے کھلے ہُوئے تھے کہ اُن کے رنگ سے باغ میں آگ سی لگی ہوئی محسوس ہوئی تھی اور فضا دہک اُٹھی تھی۔ ہَوا نے پھولوں کی خوشبو سے باغ کو مہکا دیا تھا۔

صبا جو گئی ڈھیریاں کر کے پھول
پڑے ہر طرف مولسریوں کے پھول

مشکلات: مولسری: ایک درخت کے خوشبودار پھول۔

تشریح: صبح کی ہَوا نے مولسری کے درخت سے بہت پھول گرا دیئے تھے وہ ڈھیریوں کی صورت میں جمع ہو گئے تھے، لیکن صبا اُنہیں اکٹھا کر کے ساتھ لے جانا بھول گئی تھی۔

دوا، دائیاں اور مغلانیاں
پھریں ہر طرف اس میں جلوہ کناں

مشکلات: دوا: بچوں کی پرورش کرنے والی خدمتگار، مغلانیاں: کپڑا سینے والی عورتیں، درزنیں۔ جلوہ کناں: اپنا جوبن، شباب دکھانے والی۔

تشریح: باغ میں نوجوان خوبصورت نوکرانیاں بھی اِدھر اُدھر چل پھر رہی تھیں۔ ان میں بچوں کی نگہداشت کرنے والی انائیں بھی تھیں، عورتوں کی خبر گیری کرنے والی دائیاں بھی اور کپڑے سینے والیاں بھی۔ ہر ایک اپنے حسن و رعنائی کے جلوے بکھیرتی ہوئی جاتی تھیں۔

خواصوں کا اور لونڈیوں کا ہجوم
محل کی وہ چہلیں وہ آپس کی دھوم

مشکلات: خواص: خدمت گار کنیزیں۔ چہلیں: آپس کا مذاق ٹھٹھا۔

تشریح: باغ میں خدمت گار کنیزوں اور لونڈیوں کا ہجوم بھی اِدھر اُدھر پھر رہا تھا وہ آپس میں ایک دوسرے سے شرارتیں اور مذاق ٹھٹھا بھی کرتی جاتی تھیں۔

تکلف کے پہنے پھریں سب لباس
رہیں رات دن شاہزادی کے پاس

تشریح: سب نے خوب زیب و زینت کے کپڑے پہن رکھے تھے اور شاہزادی کی خدمت میں دن رات گزارتی تھیں۔

کنیزانِ مہ رو کی ہر طرف ریل
چنبیلی کوئی اور کوئی رائے بیل

مشکلات: مہ رو: چاند کی سی صورت والی، بہت خوبصورت۔ ریل: ہجوم۔

تشریح: نہایت خوبصورت کنیزوں کا ہجوم محل میں مقیم تھا۔ اُن کے حسن کا یہ عالم تھا کہ کوئی چنبیلی کی مانند تھی اور کوئی رائے بیل کی طرح (یعنی ممکن ہے ان کے نام ہی پھولوں کی نسبت سے رکھے گئے ہوں اور انہی سے اُنہیں پکارا جاتا ہو۔)

رنگیلی کوئی اور کوئی شام روپ
کوئی چت لگن اور کوئی کام روپ

مشکلات: رنگیلی: شوخ، چنبیلی۔ خوبصورت۔ شام روپ۔ جس کی رنگت سیاہ لیکن نقش حسین ہوں۔ بلیک بیوٹی۔ چت لگن: دلفریب، خوش کن۔ کام روپ: معشوقہ، جسے دیکھ کر نفسانی خواہش بیدار ہو جائے۔

تشریح: اِن لونڈیوں اور کنیزوں کی صورتوں کے الگ الگ خصائص تھے کوئی شوخ

چیلی اور رنگین مزاج تھی، کسی کا رنگ سیاہ تھا لیکن پھر بھی بہت خوبصورت تھی، کوئی بڑی ہی دلفریب تھی اور کسی کو دیکھ کر دل میں بوس پرستی کے جذبات پیدا ہو جاتے تھے۔

کوئی کیتکی اور کوئی گلاب
کوئی مہ رتن اور کوئی ماہتاب

مشکلات: کیتکی: کیوڑے کی قسم کا پھول جسے ہندو شاعر بھورے کا معشوق سمجھتے ہیں۔ مہ رتن۔ چاند کے سے جوبن والی۔ ماہتاب۔ چاند۔

تشریح: کوئی کیتکی کی مانند تھی جس پر عاشق ہونے کو جی چاہتا تھا، کوئی گلاب کی طرح کھلی ہوئی تھی۔ کسی کا شباب چاند کو شرماتا تھا اور کسی کو دیکھ کر یوں احساس ہوتا تھا، جیسے چاند زمین پر اُتر آیا ہو۔

کوئی سیوتی اور ہنس مکھ کوئی
کوئی دل لگن اور تن سکھ کوئی

مشکلات: سیوتی: ایک قسم کا گلاب۔ دل لگن: دل کو بہلانے والی۔

تشریح: ان میں کوئی سیوتی کا پھول معلوم ہوتی تھی کوئی مسکراتی اور قہقہے لگاتی تھی اور کوئی دل کو بہلاتی اور جسم کو راحت پہنچاتی تھی۔ یاد رہے کہ یہ لونڈیوں کے نام بھی ہو سکتے ہیں، ہم نے ناموں کی نسبت سے بھی ان کی وضاحت کر دی ہے۔

کہیں اپنے پٹے سنوارے کوئی
اری اور رسیلی! پکارے کوئی

مشکلات: پٹے: زلفیں، رسیلی: رس بھری، مزیدار۔

تشریح: کہیں کوئی خوبصورت لونڈی بیٹھی اپنی زلفیں سنوار رہی تھی اور کہیں ایک دوسری کو رسیلی اور رسیلی کہہ کر بلا رہی تھی۔

کہیں چٹکیاں اور کہیں تالیاں
کہیں قہقہے اور کہیں گالیاں

تشریح: کہیں ایک دوسرے کی چٹکیاں بھر رہی تھیں، دوسری کو تکلیف سے منہ بسورتا دیکھ کر تالیاں بجا رہی تھی۔ کہیں قہقہے گونج رہے تھے اور کہیں وہ ایک دوسری کو گالیوں سے نواز رہی تھیں۔

ادا سے کوئی بیٹھی حقہ پیے
دم دوستی کوئی بھر بھر جیے

مشکلات: دوستی کا دم بھرنا: دوستی نباہنے کا وعدہ کرنا۔

تشریح: کوئی کنیز کہیں بیٹھی نازو ادا سے حقہ پی رہی تھی اور کہیں ایک دوسری سے عمر بھر کے لیے دوستی نباہنے کا وعدہ کر رہی تھی۔

کوئی حوض میں جا کے غوطہ لگائے
کوئی نہر پہ پاؤں بیٹھی ہلائے

تشریح: کوئی اچانک ترنگ میں آتی تھی اور ایک ادا کے ساتھ پانی کے حوض میں کود جاتی تھی جب کہ دوسری نہر میں پاؤں لٹکا کر لہک لہک کر انہیں ہلاتی جاتی تھی۔

کوئی اپنے طوطے کی لیوے خبر
کوئی اپنی مینا پہ رکھے نظر

مشکلات: مینا: ایک خوبصورت گانے والا پرندہ۔

تشریح: کسی نے طوطا پال رکھا ہے جب کہ دوسری نے مینا۔ دونوں اپنے اپنے پالتو پرندوں کی خبر گیری کر رہی ہیں۔

کسی کو کوئی دھول مارے کہیں
کوئی جان کو اپنی وارے کہیں

مشکلات: دھول۔ ہلکا تمانچہ۔ جان وارنا۔ قربان ہونا۔ عاشق ہونا۔

تشریح: کوئی دوسری کو پیار یا شرارت سے ہلکا تھپڑ رسید کر رہی تھی۔ جبکہ کسی جگہ دو لڑکیاں ایک دوسری پر جان قربان کرنے کے عہد کر رہی تھیں (شاہزادی کے اس باغ میں اب تک مرد کا کوئی ذکر نہیں آیا۔ اس لئے دھول مارنے اور جان وارنے کا معاملہ کنیزوں کے آپس کا ہے۔ اسے کسی مرد سے منسوب کرنا مناسب نہ ہوگا)

کوئی آرسی اپنے آگے دھرے
ادا سے کہیں بیٹھ کنگھی کرے

مشکلات: آرسی، منہ دیکھنے کا آئینہ۔

تشریح: کوئی کنیز نازو ادا سے اپنے سامنے آئینہ رکھ کر اپنی خوبصورت زلفوں میں کنگھی کر رہی تھی۔

مقابہ کوئی کھول مسی لگائے
لبوں پر دھڑی کوئی اپنی جمائے

مشکلات: مقابہ: سنگھاردان۔ مسی۔ منجن جسے عورتیں بطور سنگھار (میک اپ) استعمال کرتی تھیں۔ دھڑی جمانا۔ تہ جمانا۔

تشریح: کوئی کنیز سنگھاردان کھول کر ہونٹوں پر مسی لگا رہی تھی جس سے ہونٹ خوبصورت ہو رہے تھے اور کوئی اپنے ہونٹوں پر سرخی کی تہ جما رہی تھی۔

ہوا اِن گلوں سے دوبالا سماں
اسی باغ میں تھا وہ سروِرواں

مشکلات: سروِرواں: دراز قد خوبصورت عورت یا مرد کو کہتے ہیں۔ لفظی معنی، چلتا پھرتا سرو۔

تشریح: اِن چلتے پھرتے پھولوں یعنی کنیزوں کے سبب سے جو پھولوں کی مانند تھیں اور جن کے نام بھی پھولوں والے تھے، منظر بہت زیادہ دل کش و حسین ہو گیا تھا اور اِسی خوش منظر باغ میں وہ شاہزادی رہتی تھی جسے اس کے خوبصورت لمبے قد کی وجہ سے سروِرواں کہنا چاہیئے۔

جزو دوم

میر امن دہلوی

حالات زندگی

میر امن کے آبا و اجداد شہنشاہ ہمایوں کے زمانے سے مغلیہ دربار سے وابستہ تھے۔ میر امن مغل فرمانروا محمد شاہ کے عہد میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ اصل نام۔ میر امان تھا۔ لطف تخلص کرتے تھے۔

سلطنت دہلی کو زوال آیا تو ہر طرف افراتفری پھیل گئی۔ سورج مل جاٹ کی لوٹ مار اور احمد شاہ ابدالی کے حملے سے میر امن کا گھر اجڑ گیا اور ۱۷۹۱ء میں دہلی سے ہجرت کر کے پٹنہ (عظیم آباد) چلے گئے۔ یہاں وہ پینتیس چھتیس برس تک مقیم رہے اس طویل قیام کے بعد ۱۷۹۸ء میں کلکتہ پہنچے اور نواب دلاور جنگ کے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خاں کے اتالیق مقرر ہوئے دو سال تک یہ سلسلہ جاری رہا اسی زمانے میں انگریزوں نے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ انگریز افسروں کو اُردو پڑھائی جائے اور ساتھ ہی اُردو کتابیں بھی تیار کر کے چھاپی جائیں۔ ۱۹ اپریل ۱۸۰۱ء کو اس کالج میں ماتحت منشی کی حیثیت سے میر امن کا تقرر ہو گیا۔ یہاں تصنیف و تالیف اور ترجمے کا کام ان کے سپرد ہوا۔ ان کی سب سے زیادہ معروف تصنیف "باغ و بہار" ہے اس کی بنیاد فارسی کی مشہور داستان "چہار درویش" ہے مگر میر امن نے اسے عطا حسین خاں تحسین کی نوطرز مرصع کی بنیاد پر ۱۸۰۲ء میں مکمل کیا۔

میر امن ۱۲۱۷ ہجری میں کلکتے میں انتقال کر گئے۔ "باغ و بہار" کے علاوہ "گنج خوبی" بھی ان کی یادگار ہے۔ جو ایک فارسی کتاب "اخلاق محسنی" کا ترجمہ ہے۔

میر امن کا اسلوب بیان

میر امن اردو نثر کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ وہ دور تھا جب اردو نثر کی صحیح شکل واضح نہ ہوئی تھی۔ اردو نثر، فارسی نثر کا تتمہ بنی ہوئی تھی۔ علم و ادب کی زبان بالعموم فارسی تھی اس لئے نثر لکھتے ہوئے فارسی کی پیروی میں مسجع و مقفیٰ اسلوب اختیار کیا جاتا تھا۔ اس طرح عبارت بظاہر تو بڑی پُرتکلف اور خوبصورت نظر آتی، مگر مفہوم واضح نہ ہوتا تھا۔ فورٹ ولیم کالج کے مصنفوں نے عبارت کو سادہ بنانے کی کوشش کی تاہم اس میں روایف قافیے کا غلبہ بدستور موجود تھا۔ میر امن کا کارنامہ یہ ہے۔ کہ انہوں نے پہلی بار سلیس اور آسان زبان اختیار کر کے اردو کو عام لوگوں میں مقبول بنایا۔ ان کا اسلوب بیان فورٹ ولیم کالج کے تمام مصنفوں میں منفرد ہے۔

ان کے اسلوب بیان کی نمایاں خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

۱- سادگی اور سلاست میر امن کی زبان بہت آسان اور سادہ ہے وہ مشکل الفاظ اور پر تکلف انداز سے اجتناب کرتے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے "باغ و بہار" کی زبان کو اپنے وقت کی نہایت فصیح اور سلیس زبان قرار دیا ہے وہ لکھتے ہیں:

"اردو کی پرانی کتابوں میں کوئی کتاب زبان کی وضاحت اور سلاست کے لحاظ سے اس سے لگا نہیں کھاتی۔ اسی خصوصیت نے باغ و بہار کو وہ حیثیت بخشی ہے کہ یہ آج بھی اسی ذوق و شوق کے ساتھ پڑھی جاتی ہے۔ جیسا ڈیڑھ سو برس پہلے پڑھی جاتی تھی اور اسی لئے ڈاکٹر سید عبداللہ نے اسے "زندہ نثر" کہا ہے۔

۲- باتوں کا سا انداز میر امن کے ہاں باتیں کرنے یا کہنے کا فطری انداز پایا جاتا ہے۔ ان کی تحریر اس زمانے کے عام لوگوں کی زبان ہے وہ خود کہتے ہیں کہ مجھے ڈاکٹر جان گل کرسٹ نے حکم دیا کہ اس قصے کو ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں جو اردو کے لوگ ہندو مسلمان عورت مرد لڑکے بالے خاص و عام آپس میں بولتے چالتے ہیں۔ ترجمہ کرو۔ موافق حکم حضور کے میں نے بھی اسی محاورے میں لکھنا شروع کیا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔" میر امن کے ہاں سجع و قافیہ کا اہتمام ہے مگر بہت کم۔ ان کا اصل اسلوب باتوں کا سا ہے۔

۳- بے تکلفی اور بے ساختگی میر امن نے عوامی لب و لہجے اور محاورے کو اپنایا۔ اس لئے ان کے اسلوب میں وہی بے تکلفی اور بے ساختگی ہے جو عام انسانوں کی گفتگو میں ہوتی ہے ان کے ہاں ہر شخص کسی بناوٹ یا تصنع کے بغیر بات چیت کرتا ہے اور اس بے تکلفی نے میر امن کے کرداروں کے نقوش کو خوب خوب واضح کیا ہے۔

۴- دہلویت کا مرقع میر امن کی عمر کا کافی حصہ دہلی میں گزرا۔ انہیں اپنے دہلوی ہونے پر فخر تھا وہ خود کو "دلی کا روڑا" قرار دیتے ہیں۔ باغ و بہار دہلی کی زبان، تہذیب، ثقافت اور تمدن کا ایک جامع مرقع ہے۔ بادشاہوں کے دربار دل کا نقشہ، دعوتوں کے طعام، محلوں اور عمارتوں کا بیان، شادی بیاہ اور دیگر رسوم و آداب، مختلف کرداروں کی گفتگو اور ان کا طرز عمل، غرض ہر پہلو سے میر امن کی تحریر "دہلویت" کی نمائندگی کرتی ہے۔ دلی کی معاشرت اور اپنے عہد کی بھرپور عکاسی میر امن کے فن کی ایک نمایاں خوبی ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین کے الفاظ میں "میر امن نے دلی کی تہذیب کا غذ پر اتار کر رکھ دی ہے۔" اس طرح ہمیں باغ و بہار میں دلی کے در و دیوار اور اس کے اشخاص اور کرداروں کی بولتی چالتی جیتی جاگتی تصویریں نظر آنے لگتی ہیں۔

۵- کردار نگاری میں مہارت "باغ و بہار" کے اکثر کردار داستانوں کے روایتی کرداروں سے مختلف نہیں۔ مگر میر امن اپنے کرداروں کی نفسیات، ان کی ذہنی ساخت اور افتادِ طبع سے پوری طرح واقف ہیں۔ اس لئے وہ اپنے کرداروں کا ایسا بھرپور نقشہ پیش کرتے ہیں کہ

ان کی شخصیت قاری کے ذہن پر نقش ہو کر رہ جاتی ہے۔ مثلاً پہلے درویش کی بپتا کا کردار یا پنڈتوں اور نجومیوں کے کردار۔ اسی طرح خواجہ سنگ پرست کا کردار اور تیسرے درویش کے قصے میں کنجی کا کردار وغیرہ

۶۔ توازن اور اعتدال میر امن کے اسلوب میں اعتدال اور ٹھہراؤ کی ایک کیفیت موجود ہے انہیں نہ تو اپنی بات ختم کرنے کی جلدی ہوتی ہے اور نہ وہ بلا ضرورت طوالت اختیار کرتے ہیں۔ یکساں روانی ان کی تحریر کا وصف خاص ہے میر امن کے توازن پہ سب سے پہلے لائق تحسین ہے کہ انہوں نے عوامی لب و لہجہ اختیار کیا۔ مگر اسلوب کی ادبی شان بھی برقرار ہے اور حسب ضرورت تشبیہ و استعارہ اور سجع و قافیہ کا اہتمام بھی موجود ہے یہ اعتدال بہت کم لکھنے والوں کو نصیب ہوا ہے

۷۔ قدرتِ بیان میر امن کو زبان پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ ان کا ذخیرہ الفاظ بہت وسیع ہے وہ موقع محل کے مطابق مناسب الفاظ انتخاب کر کے ان کا برمحل استعمال کرتے ہیں۔ میر امن بادشاہ اور حاتمؔ عالم اور جاہل جوان اور بوڑھا اور مفاس دعام کی گفتگو کے درمیان فرق روا رکھتے ہیں۔ دوسرے درویش کے قصے میں لکڑہارے کی گفتگو اس کی ذہنی سطح کے مطابق ہے۔ پھر وہ کسی منظر یا کسی صورت حال کو ایسے مناسب الفاظ میں اور ایسی چابک دستی سے پیش کرتے ہیں کہ ہو بہو اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتی ہے۔ مثلاً ایک معشوق خوب صورت، کامنی سی مورت (جس کے دیکھنے سے ہوش جاتا رہے) گھائل، لہو میں تر بتر، آنکھیں بند کیے پڑی کلبلاتی ہے۔ آہستہ ہر نشہ ہلتے جاتے ہیں۔" مولوی عبدالحق کے الفاظ میں میر امن ہر کیفیت اور واردات کا نقشہ ایسی خوبی سے کھینچتا ہے کہ اس کے کمال انشا پر داد دینی پڑتی ہے۔

مندرجہ بالا خصوصیات کی بنا پر پروفیسر سید وقار عظیم کے بقول جو قبول عام باغ و بہار کے حصہ میں آیا ہے وہ اردو کی کسی اور داستان کو نصیب نہیں ہوا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میر امن دہلوی

خواجہ سگ پرست کی کہانی

تعارف اور پس منظر

"خواجہ سگ پرست کی کہانی" میر امن دہلوی کی معروف تصنیف "باغ و بہار" سے لی گئی ہے۔ اسے قصہ چہار درویش بھی کہا جاتا ہے۔ اصل قصہ فارسی میں تھا اردو میں اس کے متعدد ترجمے ہوئے۔ مگر میر امن کا ترجمہ زبان و بیان کے اعتبار سے سب پر فوقیت رکھتا ہے اور اسی لئے سب سے زیادہ مقبول ہوا۔

"باغ و بہار" اصل میں چار درویشوں اور بادشاہ آزاد بخت کی آپ بیتی ہے۔ ہر آپ بیتی میں متعدد ضمنی قصے بیان ہوئے ہیں خواجہ سگ پرست کی کہانی آزاد بخت کی داستان کا ضمنی قصہ ہے خواجہ سگ پرست نیشاپور کا سوداگر تھا۔ اس کے کتے کے پٹے میں سات سات مثقال وزن کے بارہ لعل لگے تھے اس نے اپنے دونوں بھائیوں کو بڑے بڑے پنجروں میں قید کر رکھا تھا۔ اور کتے کا جو ٹھا انہیں کھلاتا تھا۔ اس کا پس منظر خواجہ سگ پرست کی کہانی سے واضح ہوتا ہے۔

کہانی کا خلاصہ

میں فارس (ایران) کے ایک سوداگر کا بیٹا ہوں مقفل پنجرے میں دونوں میرے بڑے بھائی قید ہیں والد کے انتقال پر انہوں نے جائداد کی تقسیم چاہی۔ میں از راہ احترام بھائیوں کے حق میں جائداد سے دستبردار ہو گیا۔ دوسرے روز انہوں نے مجھے مکان سے بے دخل کر دیا۔ والد کا دیا ہوا کچھ روپیہ میرے پاس تھا۔ ایک الگ حویلی خرید کر رہنے لگا۔ تین سال گزر گئے۔ اللہ تعالیٰ نے میرے کاروبار میں برکت عطا کی۔ اور میں خوشحال ہو گیا۔ ایک روز چھٹی کا دن تھا۔ گھر میں بیٹھا تھا کہ غلام نے آکر بتایا کہ چوک میں ایک یہودی تمہارے بھائیوں کی سخت پٹائی کر رہا ہے۔ میں ننگے پاؤں دوڑا گیا۔ معلوم ہوا۔ بھائی یہودی کے قرض خواہ ہیں۔ اور عدم ادائیگی کے سبب وہ انہیں مار رہا ہے۔ میں روپے دے کر چھڑا لایا۔ حمام میں نہلوا نئے کپڑے پہنائے۔ کھانا کھلایا۔ مگر اس واقعے کے بارے میں کوئی بات نہ کی کہ کہیں بھائی شرمندہ نہ ہوں۔ ان سے پوچھ لیجیے میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟۔ کچھ عرصہ بعد میں نے بیس ہزار روپے کا سامان خرید کر دونوں بھائیوں کی تحویل میں دیا اور انہیں بخارا جانے والے ایک قافلے کے ساتھ بغرض تجارت روانہ کیا۔ ایک سال بعد پتہ چلا کہ ایک نے جوئے میں تمام مال ہار دیا ہے دوسرا ایک شراب فروش کی

لڑکی پر عاشق ہو کر اس کے دروازے پر پڑا ہوا ہے۔ میں تمہارا گیا اور بڑی تگ و دو سے انہیں ڈھونڈ کر گھر لے آیا۔ مگر شہر سے باہر ٹھہرایا۔ مشہور یہ کیا کہ میرے بھائی سفر سے آئے ہیں۔ کل ان کا استقبال کروں گا بدقسمتی سے اس روز ڈاکو سب مال اسباب لوٹ لے گئے۔ خیر ان ننگوں منگوں کو کپڑے پہنا کر گھر لایا۔ ہر طرح ان کی خاطر مدارت کی پر شرمندگی سے گھر میں ہی بیٹھے رہتے تھے۔ مگر تا بکے؟ ایک روز سامانِ تجارت تیار کر کے پھر سفر پر نکلے۔ اس بار میں خود بھی ان کے ساتھ تھا۔ کشتی میں چلے جا رہے تھے یہ کمبخت بھی میرے ساتھ تھا۔ دونوں بھائیوں نے سازش کر کے مجھے سمندر میں دھکا دے دیا۔ اپنی دانست میں وہ تھکانے لگا کر سارے مال و متاع پر قابض ہو گئے۔ مگر زندگی باقی تھی۔ کمبخت میرے ساتھ ہی سمندر میں کود پڑا اور یہ میری زندگی کا سبب بن گیا۔ آٹھ روز سمندر میں بہنے کے بعد ہم کنارے جا لگے ایک روز بے ہوش پڑا رہا پھر کتے کی آواز سے ہوش میں آیا اور بڑی مشکل سے ایک شہر تک پہنچا۔ سخت بھوک لگی تھی۔ مگر جیب میں کچھ نہ تھا۔ اچانک یہ دونوں بھائی نظر پڑے خوش ہوا کہ خدا نے آبرو رکھ لی مگر انہوں نے پہچانتے ہی مجھے مارنا شروع کر دیا اور الزام لگایا کہ یہ ہمارے بھائی کا نوکر تھا۔ اسے دریا میں گرا کر مال و اسباب لے گیا۔ ساتھ ہی جھوٹ موٹ رونے لگے۔ اتنے میں پولیس آ گئی اور مجھے پکڑ کر کوتوال کے پاس لے گئی۔ دونوں بھائی بھی میرے ساتھ چلے اور حاکم کو رشوت دے کر میری جان کے درپے ہوئے۔ حاکم نے مجھ سے دریافت طلب کی۔ میں مارے نقاہت اور بھوک کے کچھ نہ بول سکا۔ چنانچہ مجھے پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ یہ کمبخت اس وقت بھی میرے ساتھ تھا اور آگے پیچھے لوٹتا تھا۔ مجھے سولی پر لٹکانے والے تھے کہ بادشاہ کو قولنج کا دورہ پڑا۔ کسی بزرگ کے مشورے پر بادشاہ نے قیدیوں اور مجرموں کو رہا کرنے کا حکم دیا۔ میں بھی چھوٹ گیا۔ اس طرح میری جان بچی

مشکل الفاظ اور ان کے معانی

ص ۱۸۴ منجھلا: درمیانی قبلہ گاہ = مراد ہے والد صاحب — رحلت کی = انتقال کیا۔ تجہیز و تکفین کفن دفن — پھول اٹھنا (محاورہ) فاتحہ سوم ادا ہونا

چشم نمائی = جھڑکنا، متنبہ کرنا ص ۱۸۵ پیادہ = ہرکارہ۔ پیغام رساں — دارالشرع = عدالت شرعی تصرف: مراد ہے خرچ کرنے۔ فارغ خطی = دست برداری یا لاتعلقی کی تحریر — بود و باش۔ رہائش — سوغات = تحفہ۔ نج کی لونگی ذاتی مال — ناکندہ = چھوٹا سا، جس کے ابھی دودھ کے دانت ہوں

ص ۱۸۶ مشکیں باندھنا = رسیوں سے جکڑنا — تپی = چمڑی — تقصیر = قصور۔ غلطی۔ تعزیر۔ سزا

ص ۱۸۷ آویزہ = جمع — ضرب و شلاق = مار پٹائی — دست آویز = معاہدہ۔ تحریر۔ تمسک۔ لین دین کی تحریر — بدرا = روپوں کی تھیلی — کوفت = پریشانی — پال پرتل = خیمہ و دیگر سامان سفر۔ بار برداری =

سامان لے جانا۔

صفحہ ۱۸۸ جاروب کشی = جھاڑو دینا۔ قحبے = وہ (بہت سے لوگ) آ گ گا = چپلا۔ چھوکرا۔ بوزہ فروش شراب فروش۔ تہل کرنا۔ خدمت کرنا

زاد راہ۔ سفر کی ضروریات اور سامان وغیرہ۔ قصد = ارادہ۔ خجالت = شرمندگی۔ گرہست۔ بال بچے دار شخص۔ پوشاک = لباس۔ زاری کرنا = رونا

صفحہ ۱۸۹ خراب خستہ = بُری حالت۔ فدوی = نمکسار۔ بندہ۔ لوازمہ = ضروریات۔ پسوئی = چھوٹی کشتی۔ بارے = آخرکار (آج کل یہ لفظ متروک ہے) بن آئے۔ ممکن ہونا۔ متصرف = قابض۔ ہڑبڑا کر، گھبرا کر۔ لنگر اٹھایا = جہاز روانہ ہوا۔ مجذ مار = تیز بہاؤ

صفحہ ۱۹۰ نہوڑا = جھکا ہوا۔ یکبارگی = اچانک۔ کسو = کسی (آج کل یہ لفظ متروک ہے) سواد شہر = شہر کے آس پاس کا علاقہ۔ جوں توں = بڑی مشکل سے۔ اپنے تئیں = اپنے آپ کو

صفحہ ۱۹۱ عجم = ایران۔ فارس۔ نپٹ = بہت۔ شاد = خوش۔ پسارنا = پھیلانا۔ خورد خام کرنا = ذلیل کرنا۔ گھگھیانا = منت سماجت کرنا۔ گڑگڑانا خلقت لوگ۔ آبرو = عزت۔

صفحہ ۱۹۲ مقرر خوش ہے = بلاشبہ قابل ہے۔ سرمو = بال برابر، ذرہ برابر۔ تفاوت = فرق۔ وار = سولی۔ آڑے آنے مدد کرنے۔ کام آنے۔ طاقت گویائی = بولنے کی ہمت۔ رخ بقبلہ = کعبہ کی طرف منہ کر کے آڑے آنا = مصیبت کے وقت کام آنا تیوڑا کر گرا = بے ہوش ہو کر گرا۔ کی ۱۹۳ قولنج = ایک بیماری جس میں پیٹ میں سخت مروڑ اٹھتا ہے۔ بندی خانہ = قید خانے۔ مدار دھام = بھیڑ۔ طنابیں = رسیاں

پیراگراف کی تشریح

سوال ۱۔ حوالہ متن اور سیاق و سباق کے ساتھ مندرجہ ذیل پیراگراف کی تشریح کیجئے؛

"کہیں منجھلا بھائی ایک دن بڑے بھائی سے کہنے لگا کہ چھوٹے بھائی کی منت اٹھانے سے بڑی شرمندگی حاصل ہوئی۔ اس کا تدارک کیا کریں؟ بڑے نے جواب دیا کہ ایک صلاح دل میں ٹھہرائی ہے اگر بن آوے تو بڑی بات ہے۔ آخر دونوں نے مصلحت کر کے تجویز کی کہ اسے مار ڈالیں اور اسکے مال و اسباب پر قابض و متصرف ہوں۔"

جواب: حوالہ متن یہ عبارت خواجہ سگ پرست کی کہانی سے لی گئی ہے جو باغ و بہار کا ایک ضمنی قصہ ہے اس کے مصنف میر امن دہلوی ہیں۔

سیاق و سباق خواجہ سگ پرست نے باپ کی جائداد بڑے بھائیوں کے حوالے کر دی اور الگ رہنے لگا۔ بھائیوں نے نالائقی سے جائداد ضائع کر دی اور ایک یہودی کے مقروض ہو گئے خواجہ نے رقم ادا کر کے یہودی کی مار سے بچایا اور مال و اسباب دے کر انہیں ایک تجارتی قافلے کے ساتھ

بخارا روانہ کیا۔ ایک نے جوئے میں مال ہارا دیا۔ دوسرا شراب فروش کی لڑکی پر عاشق ہو کر اس کی چوکھٹ پر رہنے لگا۔ خواجہ سنگ پرست اس بار بھی دونوں کو گھر لے آیا۔ تیسری بار وہ سامانِ سفر لے کر خود ساتھ چلا۔ سمندر کے سفر میں دونوں بھائی اس کے خلاف سازش کرنے لگے۔ یہ سطور اس موقع پر آئی ہیں

تشریح دونوں بھائی سمجھتے تھے کہ چھوٹے بھائی نے متعدد بار ہماری جان بچائی ہے۔ اور ہم اس کے احسان تلے دبے ہوئے ہیں اس لئے اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہیئے۔ ورنہ عمر بھر اس کے سامنے آنکھ نہ اٹھا سکیں گے۔ اس سلسلے میں باہمی صلاح مشورہ ہونے لگا۔ چھوٹے بھائی نے کہا، اس شرمندگی سے بچنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ بڑے نے جواب دیا کہ میرے ذہن میں ایک ترکیب ہے۔ اگر اس پر عمل ممکن ہو تو اس سے نجات مل جائے۔ بالآخر چھوٹے بھائی (سنگ پرست) کو مارنے کی سازش مکمل ہو گئی۔ طے یہ پایا کہ اسے سمندر میں گرا کر مار ڈالا جائے۔ اس طرح اس کا جملہ مال و متاع اور اسباب تجارت بھی ہاتھ آ جائے گا۔ چنانچہ بعد میں اس تجویز کو بروئے کار لا کر خواجہ سنگ پرست کو سمندر میں دھکا دے دیا گیا۔

حیدر بخش حیدری

حالاتِ زندگی

نام حیدر بخش تخلص، حیدری والد کا نام ابوالحسن ان کے باپ داد نجف اشرف (عراق) سے ہجرت کر کے ہندوستان پہنچے تھے۔ کچھ عرصہ دہلی میں رہے پھر ناسازگار حالات کے باعث بنارس چلے گئے۔ حیدری نے نواب ابراہیم خاں سے مروجہ علوم کی تحصیل کی۔ پھر انہیں ایک بہت بڑے عالم قاضی عبدالرشید صاحب کے ساتھ کچھ عرصہ گزارنے کا موقع ملا۔ حیدری نے قاضی صاحب سے بھی اکتساب فیض کیا۔ مولوی غلام حسین غازی پوری سے تفسیر، حدیث اور فقہ کی تعلیم پائی۔

فورٹ ولیم کالج قائم ہوا تو قسمت آزمائی کے لئے حیدری نے بھی کلکتے کا رخ کیا اور مہر و ماہ کے نام سے ایک عریضہ لکھ کر کالج کے پرنسپل ڈاکٹر جان گل کرسٹ کو دکھایا۔ پرنسپل نے حیدری کی قصہ نویسی سے متاثر ہو کر انہیں چالیس روپے ماہوار پر منشی رکھ لیا۔ ان کی ملازمت ۲۴ مئی ۱۸۰۱ء کو شروع ہوئی

فورٹ ولیم کالج کی ملازمت کے دوران میں انہوں نے ڈاکٹر گل کرسٹ کی فرمائش پر معروف فارسی قصے حاتم طائی کا اردو ترجمہ کیا۔ انہوں نے اپنی طرف سے قصے میں بعض اضافے بھی کئے اور کتاب کا نام آرائش محفل رکھا۔ انہوں نے پانچ دوسری کتابوں کے ترجمے کئے۔ علاوہ ازیں ایک مثنوی، ایک تاریخ۔ ایک تذکرہ اور نظم و نثر کے دو انتخاب ان کی یادگار ہیں۔ کل تصانیف کی تعداد گیارہ ہے شاعر تھے اور فورٹ ولیم کالج کے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے ایک طویل عرصے تک فورٹ

ولیم کالج سے وابستہ رہے۔ ۱۸۴۳ء میں انتقال کیا۔

چند تصانیف: آرائشِ محفل، قصہ مہر و ماہ، تاریخ نادری تذکرہ گلشنِ ہند، گلِ مغفرت، گلدستہ حیدری، مثنوی ہفت پیکر۔ توتا کہانی۔ گلزار دانش، قصہ لیلیٰ مجنوں

حیدری کی نثر پر تنقیدی نوٹ

حیدر بخش حیدری نے فورٹ ولیم کالج کی ملازمت کے دوران میں متعدد کتابیں لکھیں۔ گلزارِ دانش محفل ان میں نسبتاً زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور ان داستانوں میں اسے ایک خاص مقام حاصل ہے اس کا شمار اردو کی معروف و مقبول داستانوں میں ہوتا ہے۔ "آرائشِ محفل" پہلی بار ۱۸۰۱ء میں شائع ہوئی حیدری نے اس میں اپنی طرف سے کئی اضافے بھی کئے اس کے متعلق وہ خود لکھتے ہیں۔ اس میں اپنی طبیعت سے جہاں موقع مناسب پایا۔ وہاں زیادتیاں کیں تاکہ قصہ طولانی ہو جائے اور سننے والوں کو خوش آوے"

آرائشِ محفل" میں حیدری کی تحریر کے مندرجہ ذیل پہلو اہمیت رکھتے ہیں۔

۱۔ طلسماتی فضا "آرائشِ محفل" ایک روایتی داستان ہے جس میں طلسمات کی ایک عجیب و غریب دنیا آباد ہے۔ مافوق الفطرت عناصر کی کثرت ہے۔ جادو کے سبب ہر لمحہ ایک نئی صورت حال سامنے آتی ہے اور قاری مبہوت ہو کر قصہ پڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس طلسماتی ماحول اور فضا نے کہانی کی دلچسپی کو بڑھا دیا۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حیدری کی تحریر کی دلکشی کا ایک نمایاں عنصر داستان کی طلسماتی فضا ہے۔

۲۔ زبان کی سادگی فورٹ ولیم کالج کے ذریعے اردو نثر میں سادہ نویسی کی جو تحریک شروع ہوئی "آرائشِ محفل" میں اس کے اثرات خاصے نمایاں ہیں اس میں شبہ نہیں کہ حیدری کی نثر سادگی اور سلاست میں "باغ و بہار" کو نہیں پہنچی تاہم وہ اردو کی روایتی مسجع و مقفیٰ نثر سے بھی مختلف ہے ان کے ہاں رعایتِ لفظی ہے اور وہ عبارت آرائی کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کے اسلوب میں سادگی اور سلاست موجود ہے ڈاکٹر گیان چند جین اس سلسلے میں لکھتے ہیں: "بالکل بول چال کی زبان ہے۔ روزمرہ سے کہیں علیحدہ نہیں ہے۔ ابتدا سے آخر تک یہی حال ہے"

۳۔ لطافت اور ادبیت ان کی تحریر ادائے معنی کے عام روزمرہ کے مطابق ہے اور اسی لئے عام فہم بھی ہے۔ اس کے ساتھ ہی حیدری نے حسبِ ضرورت اور حسبِ موقع فارسی تراکیب اور محاوروں کے استعمال سے گریز نہیں کیا مگر فارسی روزمرہ کے ان اثرات سے تحریر میں کسی طرح کی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔ کیونکہ حیدری نے فارسی کی وہی ترکیبیں اور محاورے اختیار کئے ہیں۔ جو اردو زبان کے مزاج کے موافق

ہیں۔ ڈاکٹر محمد اسلم قریشی کے بقول "حیدری کا اسلوب سادہ، صاف اور رواں ہونے کے علاوہ بے کیف اور ادبیت سے کورا بھی نہیں ہے۔ اس میں جہاں کہیں موقع بہم پہنچتا ہے۔ قافیہ، تشبیہ اور استعارہ غیر محسوس طور پر کھپ گیا ہے۔" اس طرح حیدری کی تحریر میں ادبیت کی ایک شان موجود ہے۔

۴۔ اخلاقی مقاصد

اردو داستانوں میں اخلاق آموزی کا پہلو بہت نمایاں ہے "آرائشِ محفل" میں بھی حاتم کی مہمات کا ایک اخلاقی مقصد واضح ہے کہ وہ تمام زندگی لوگوں کی خیر خواہی کرو اور حاتم کی عملی زندگی اس کا ثبوت مہیا کرتی ہے۔ حیدری کے دیگر کردار بھی اسی طرح کے اخلاقی نصب العین کے تابع ہیں۔ کتاب میں ہر جگہ پند نصائح ہیں اور اس طرح کی باتیں کہ "نیکی کر اور دریا میں ڈال"، "سچ کہنے میں ہمیشہ راحت ہے۔ بدی مت کر اگر کرے گا وہی پائے گا" وغیرہ

حیدر بخش حیدری

حمام باد گرد

تعارف اور پس منظر

حیدر بخش حیدری کا شمار فورٹ ولیم کالج کے اہم مصنفین میں ہوتا ہے۔ زیرِ مطالعہ کہانی "حمام باد گرد" حیدری کی معروف تصنیف "آرائشِ محفل" کے آخری حصے سے لی گئی ہے۔ اس داستان کا مرکزی کردار حاتم طائی ہے۔ یہ ایک تاریخی کردار ہے ——— یہ شخص عرب میں ہو گزرا ہے اس کا تعلق قبیلہ طے سے تھا۔ حاتم کی سخاوت ضرب المثل تھی۔ حاتم کا انتقال آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے نویں سال ہو گیا تھا۔ البتہ اس کا لڑکا ایمان لایا۔ آپ نے حاتم کی سخاوت کی وجہ سے اس کی تحسین فرمائی تھی۔ حاتم اپنی تاریخی شخصیت کی بنا پر داستانوں کا موضوع بن گیا۔ یہ وضاحت ضروری ہے کہ جو مہمات اس سے منسوب کی گئیں، وہ فرضی ہیں۔

یہی کا شاہزادہ حاتم طائی جو درجہ بھی، نیک، خدا ترس، جوان مرد، عالی ہمت اور خلقِ خدا کا خیر خواہ تھا۔ کوئی حاجت مند اس کے دروازے سے مرادیں پائے بغیر نہ لوٹتا۔ خوارزم کا شہزادہ منیر شامی، خراسان کے مرحوم سوداگر برزخ کی بیٹی حسن بانو کے عشق میں گرفتار ہو کر شادی کا خواہشمند ہوا۔ حسن بانو نے کہا جو شخص میرے سات سوالوں کا جواب مہیا کرے گا مجھ سے شادی کا حق دار ہو گا۔ سوال یہ ہیں۔

۱۔ ایک بار دیکھا ہے۔ دوسری دفعہ کی ہوس ہے۔
۲۔ نیکی کر اور دریا میں ڈال

۳۔ بدی کسی سے نہ کرا گر کرے گا تو وہی پائے گا۔
۴۔ سچ کہنے والے کے ہمیشہ ہی راحت آگے۔
۵۔ "کوہ ندا" کی خبر لائے
۶۔ وہ موتی جو مرغابی کے انڈے کے برابر بالفعل موجود ہے، اس کی جوڑی پیدا کرے۔
۷۔ ساتواں سوال یہ ہے کہ "حمام بادگرد" کی خبر لائے۔

منیر شامی جواہرات کی تلاش میں جنگلوں کی خاک چھانتا ہوا بھٹکتا رہا۔ ایک روز اتفاقاً حاتم طائی سے ملاقات ہو گئی جو جنگل میں شکار کھیلنے گیا تھا۔ منیر شامی کی داستان سن کر وہ اس کی مدد کے لئے کمربستہ ہو گیا۔ سات مہمات میں حاتم کو بے پناہ آلام و مصائب اور طلسمات و عجائبات کا سامنا کرنا پڑا مگر بالآخر ساتوں سوالوں کے جواب مہیا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ آخر کار حسن بانو کے ساتھ منیر شامی کی شادی بخیر و خوبی انجام پائی۔ "حمام بادگرد" کے عنوان سے جو کہانی ہماری کتاب میں شامل ہے وہ "آرائش محفل" کے آخری حصے سے لی گئی ہے اور اس کا تعلق ساتویں سوال سے ہے اصل کتاب میں حمام بادگرد کی مہم ایک طویل داستان پر مبنی ہے اس کے بعض حصوں کو حذف کر کے اس کا مختصر سا ملخص حصہ ہماری کتاب میں شامل ہے جو اس وقت ہمارے زیر مطالعہ ہے۔

کہانی کا خلاصہ

حاتم نے شہر سے نکل کر جنگل کی راہ لی۔ گھومتے گھومتے ایک شہر کی فصیل کے پاس جا پہنچا جہاں اس کی ملاقات ایک بوڑھے شخص سے ہوئی وہ حاتم کو گھر لے گیا۔ کھانے کے بعد حاتم نے بتایا منیر شامی حسن بانو سے شادی کا خواستگار ہے اور میں اس کی مدد کے لئے چھ سوالوں کے جواب مہیا کرنے کے بعد ساتویں سوال کی تلاش میں ہوں اور یہ سوال حمام بادگرد سے متعلق ہے۔ بوڑھا شخص حاتم کے جذبہ خیر خواہی سے متاثر ہوا۔ پھر افسردہ ہو کر کہنے لگا۔ وہاں جانے کا مطلب اپنی جان کا ضیاع ہے راستے میں بادشاہ حارث کی راج دھانی تلطان واقع ہے اس کی سرحد سے گزرنے والے اکثر قتل ہو جاتے ہیں۔ بعض کی جان بچ جاتی ہے۔ بہرحال حاتم وہاں سے رخصت ہو کر حارث شاہ کے پاس پہنچا اور اس کا رقعہ لے کر حمام بادگرد کے دربان سے ملا۔ حمام کے دروازے پر عبرانی زبان میں لکھا تھا کہ کیومرث کے دور کے اس جادو خانے سے کوئی شخص زندہ سلامت بچ کر واپس نہیں آسکتا۔ حاتم اپنے ساتھیوں سے رخصت ہو کر حمام میں داخل ہو گیا۔ دس بارہ قدم چلا ہو گا تو خود کو ایک ویرانے میں پایا۔ ادھر ادھر بھٹکتے ہوئے ایک شخص سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے فضل سے آئینہ نکال کر حاتم کو دکھایا اور پھر اسے ساتھ لے کر حمام میں نہانے چلا۔ دو تین کوس چل کر حاتم حمام میں داخل ہوا اور ایک حوض میں اتر کر نہانے لگا اور ایک بڑے سے لگن کے ذریعے تیزی سے پانی سر پر ڈالا تو ایک تراتے سے اندھیرا چھا گیا۔ تاریکی دور ہوئی تو حاتم نے خود کو ایک بند گنبد میں کھڑا پایا۔ پانی بڑھتا گیا اور حاتم ڈوبنے لگا تو اس نے ایک رہبر کا سہارا

لیا آخر کار پھر جنگل میں پہنچ گیا۔ ایک سمت خوب صورت عمارت نظر آئی۔ حاتم اس کے باغ میں داخل ہوگیا اور پھل توڑ کر کھانے لگا۔ سو من پھل کھا گیا مگر پیٹ نہ بھرا۔ ایک بارہ دری کے قریب چند برہنہ اور نیم برہنہ پتھر کے آدمی کھڑے تھے وہیں پنجرے میں بند ایک طوطی نظر آئی۔ طوطی نے حاتم کو خبردار کیا کہ یہاں سے بسلامت واپسی مشکل ہے۔ یہ کیومرث شاہ کا جادو خانہ ہے ایک بار بادشاہ کو شکار کے دوران میں یہاں تین مثقال وزن کا الماس ملا جو بادشاہ نے طوطی کو نگلوایا اور طلسم حمام باد گرد بنوایا کرسی پر تیر کمان رکھے ہیں۔ طوطی کے سر پر تیر سے ٹھیک نشانہ لگانے والا شخص ہی اس جادو خانے سے رہائی پا سکتا ہے حاتم نے خدا کا نام لے کر کمان اٹھائی۔ پہلا تیر خطا ہونے پر حاتم گھٹنوں تک اور دوسرا تیر خطا ہونے پر ناف تک پتھر کا ہوگیا۔ مگر اللہ اکبر کہہ کر تیسرا تیر چلایا جو نشانے پر بیٹھا۔ طوطی مر گئی اور زبردست طوفان آیا بے پناہ شور مچا کے خاتمے پر حاتم کے حواس بجا ہوئے تو سب چیزیں غائب تھیں صرف ایک الماس زمین پر پڑا چمک رہا تھا اور پتھر کے آدمی زندہ ہو چکے تھے حاتم نے الماس اٹھایا اور کئی ماہ کے سفر کے بعد شاہ آباد پہنچ کر میر شامی سے ملا

مشکل الفاظ و محاورات ـــ معانی و تشریح

ص ۱۹۵ شہر پناہ = فصیل۔ قدیم دور میں شہر کی حفاظت کے لئے ایک بلند اور مضبوط دیوار بنائی جاتی تھی ضیافت = دعوتِ طعام = حمام باد گرد = نہلانے کی جگہ، جس کی بنیاد جادو پر تھی۔ اس کا ذکر پرانی داستانوں میں ملتا ہے۔ خانماں برباد = تباہ و برباد شخص۔ کارواں سرا = مسافر خانہ۔ سرائے۔ عند اللہ = خدا کی رضا کیلئے

ص ۱۹۶ آفرین = شاباش۔ شقہ = خط۔ رقعہ۔ عبرانی = ایک قدیم زبان جسے زمانہ حال میں یہودیوں نے زندہ کیا اور آج کل عبرانی (HEBREW) نام نہاد اسرائیل کی سرکاری ہے۔ سرگرداں = پریشان۔ لق و دق = ویران۔ اضطراب = بے چینی۔ سمت = طرف

ص ۱۹۷ طاس = بڑا برتن۔ لگن۔ تراقا = دھماکہ ہوا۔ ساعت = لمحہ، تھوڑی دیر۔ ماندہ = تھکا ہوا۔ شل ہونا = بے حس و حرکت۔

ص ۱۹۸ برہنہ = ننگا۔ مثقال = قدیم زمانے کا ایک وزن جو ساڑھے چار ماشے کے برابر تھا (سونے کے ایک سکے کا نام بھی مثقال ہے) جواہر نگار = جس پر قیمتی موتی اور پتھر لگے ہوئے تھے۔ جست = چھلانگ

ص ۱۹۹ موقوف ہوگیا = ختم ہوگیا۔ ٹھاٹھ = شان و شوکت۔ ماخوذ = اخذ کیا گیا۔ لیا گیا

پیراگراف کی تشریح

سوال ۱۔ مندرجہ ذیل اقتباس کی تشریح لکھیے۔ عوالہ متن اور سیاق و سباق کی وضاحت بھی ضروری ہے

= ایک ساعت کے بعد آندھی رفع ہوگئی۔ ابر جا تا رہا۔ شور و غوغا موقوف ہوگیا۔ حاتم کے حواس بجا ہوئے تو اس نے دیکھا کہ نہ وہ حمام ہے نہ وہ باغ نہ وہ کرسی نہ وہ پنجرہ، نہ وہ طوطی۔ مگر ایک الماس

زمین پر پڑا ہوا تازہ سا چمک رہا ہے۔"

جواب ۱۔ حوالہ متن یہ اقتباس حیدر بخش حیدری کی داستان "آرائش محفل" کے ایک قصے "حاتم با لوگرد" سے لیا گیا ہے۔

سیاق و سباق میر شامی۔ جن بانو سے شادی کا خواہاں تھا۔ اس کے سات سوالوں کا جواب مہیا کرنے سے عاجز۔ حاتم اس کی مدد پر کمربستہ ہوا۔ جب وہ حاتم با لوگرد کی ساتویں مہم پر نکلا تو شاہ حارث کا رقعہ لے کر حمام میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ وہاں حاتم میں نہانے لگا پھر مختلف طلسماتی مرحلوں سے گزرتا ہوا پنجرے میں بند طوطی کے پاس پہنچا۔ جس کے سامنے تیر کمان رکھا تھا کچھ پتھر کے انسان بھی نظر آتے۔ حاتم کے تیسرے تیر سے طوطی کا خاتمہ ہو گیا۔ اس پر چاروں طرف تاریکی چھا گئی۔ حاتم بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ اس موقع پر تشریح طلب عبارت آئی ہے۔

تشریح کچھ دیر بعد تاریکی چھٹ گئی۔ طوفان تھم گیا اور شور بھی ختم ہو گیا۔ حاتم کو ہوش آیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سارا نقشہ ہی بدلا ہوا ہے۔ نہ تو حاتم کا کہیں نام و نشان ہے اور نہ باغ کا پنجرہ اور طوطی بھی غائب ہیں۔ البتہ تین مثقال وزن کے جس الماس کے بارے میں سنا تھا کہ یہ بادشاہ نے یہ الماس طوطی کو تنگوا دیا تھا وہ زمین پر پڑا تھا۔ اس غیر معمولی پتھر کی چمک دمک ایک روشن ستارے کی طرح تھی۔

بعد میں حاتم اس الماس کو لے کر کافی مسافت طے کر کے میر شامی کے پاس پہنچ گیا۔

سرور کے حالاتِ زندگی

نام۔ رجب علی بیگ۔ تخلص۔ سرور قدس سرہ، ۱۷۸۵ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے زمانے کے دستور کے مطابق عربی فارسی اور مروجہ علوم کی تحصیل کی۔ خوشنویسی لکھنؤ کے ایک باکمال خطاط حافظ ابراہیم سے سیکھی۔ سرور کو موسیقی، نجوم اور سپہ گری سے بھی شغف تھا۔ جوانی میں ہی شعر کہنے لگے اس فن میں انہوں نے میر سوز کے شاگرد آغا نوازش حسین خاں کا تلمذ اختیار کیا۔ لیکن شاعری میں زیادہ نمایاں نہ ہو سکے اس لئے نثر کی طرف متوجہ ہوئے

۱۸۱۲ء میں سرور کی شادی ہو گئی۔ غازی الدین حیدر کے دور میں ۱۸۲۴ء میں انہیں بادشاہ کے حکم سے لکھنؤ کو خیرباد کہنا پڑا وہ کان پور چلے گئے۔ لکھنؤ کی یہ جدائی ان پر بہت شاق گذری۔ جلاوطنی کے زمانے میں انہوں نے فسانہ عجائب لکھنی شروع کی اور ۱۸۲۵ء میں اسے مکمل کیا۔ اس اعتبار سے یہ تصنیف ان کے قیام کانپور کی یادگار ہے۔

غازی الدین حیدر کی وفات پر ان کا بیٹا نصیر الدین حیدر تخت نشین ہوا۔ سرور نے ان کی مدح میں ایک قصیدہ لکھ کر واپس لکھنؤ آنے کی اجازت چاہی۔ بادشاہ نے اجازت دے دی۔ واپس لکھنؤ آ گئے اور یہاں ملازمت کا بندوبست بھی ہو گیا۔ مگر محمد علی شاہ کی وفات پر بیروزگار ہو گئے۔ چند برس اسی پریشانی میں گزرے۔ پھر واجد علی شاہ نے پچاس روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ مگر راحت کا یہ دور مختصر تھا۔ کیونکہ بادشاہ کے جس مصاحب کے ذریعے وظیفہ جاری ہوا تھا۔ وہ لکھنؤ سے جلاوطن کر دیئے گئے سرور کا وظیفہ بھی بے قاعدہ ہو گیا۔ بعض اوقات مہینوں گزرنے پر بھی ایک پیسہ نہ ملتا۔ ۱۸۵۴ء میں دہلی اور میرٹھ کا سفر کیا۔ اس سفر میں پہلی بار مرزا غالب سے ملاقات ہوئی۔ واپسی پر انہیں یکے بعد دیگرے متعدد صدموں سے دوچار ہونا پڑا۔ استاد آغا فرحت کا انتقال ہو گیا اور اہلیہ سخت بیمار ہو گئیں۔

۱۸۵۶ء میں بنارس گئے تو وہاں کے حاکم سے سرور سے بہت اچھا سلوک کیا۔ اگلے ہی برس یعنی ۱۸۵۷ء میں ہنگامے شروع ہو گئے جن میں سرور کے کچھ عزیز مارے گئے اس پر طرہ یہ کہ آمدنی کا ذریعہ ختم ہو گیا بعض مخلص دوست بھی کچھ مدد کو یاد کرتے تھے۔ سرور کی باقی زندگی مصائب میں گذری۔ اہلیہ فوت ہو گئیں تو رشتہ داروں نے گھر کا سامان ٹھکانے لگا دیا۔ بہت سے عزیزوں کی کفالت ان کے ذمے تھی۔ جہاں جو پٹیالہ نے کسی قدر مدد کی مگر مستقل ذریعہ آمدنی نہ تھا۔ پریشان اور دل برداشتہ حوادث زمانہ سے نبرد آزما رہے مگر تا بکے۔ آخر کار اپریل ۱۸۶۹ء میں بنارس میں دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔

تصانیف ۱۔ فسانۂ عجائب (۲)، فسانۂ عبرت (۳)، سرور سلطانی (۴)، شگوفۂ محبت ۵۔ گلزار سرور (۶)، شبستانِ سرور (۷)، انشائے سرور (۸)، شررِ عشق (۹)، چند حکایاتِ مختصر و طویل۔

سرور کا اسلوب بیان

رجب علی بیگ سرور نے یوں تو بہت سی کتابیں تصنیف کیں مگر ان کی شہرت کی بنیاد "فسانۂ عجائب" ہے۔ یہ داستان مختصر ہونے کے باوجود لکھنوی دبستان کی نمایندہ سمجھی جاتی ہے۔ "فسانۂ عجائب" کو سرور کے اسلوب کا شاہکار کہا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سرور کی ہنر نگاری اور انشا پردازی اس کتاب میں پورے عروج پر ہے۔ سرور کے بیشتر نقاد اس پر متفق ہیں کہ فسانۂ عجائب کی عظمت و اہمیت کا سب سے بڑا سبب اس کا مخصوص اسلوب اور طرزِ بیان ہے۔ ان کے اسلوب بیان کے بعض نمایاں پہلو یہ ہیں:

۱۔ تکلف اور رنگینیٔ بیان تکلف اور تصنع لکھنوی زندگی کی بنیادی خصوصیت تھی۔ سرور اسی تہذیب کے پروردہ تھے۔ چنانچہ ان کے ہاں لکھنوی مزاج کا تکلف، تصنع اور مرصع کاری بدرجۂ اتم موجود ہے۔ انہوں نے قدم قدم پر رعایتِ لفظی اور دیگر صنائع بدائع کا سہارا لیا۔ مبالغہ آرائی، مشکل الفاظ و محاورات عربی فارسی اقوال و ضرب الامثال اور اردو فارسی اشعار کی کثرت

نے جہاں سرور کے اسلوب کو رنگینیٔ عطا کی وہاں عبارت کو بوجھل، پیچیدہ اور پُرتصنع بھی بنا دیا بہرحال ان کی تحریر لکھنؤ کے مخصوص اندازِ نگارش کا دلکش نمونہ ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری کے خیال میں "زبان و بیان کی سحرکاری و صناعی کے اعتبار سے فسانۂ عجائب کو قلعہ ہوشربا پر فوقیت حاصل ہے"۔

۲۔ قافیہ آرائی قدیم داستانوں میں لطفِ بیان اور اسلوب کی دلکشی کے لئے سجع و قافیہ کا اہتمام ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اہل لکھنؤ تو قافیہ آرائی کے بغیر لقمہ نہ توڑتے تھے۔ آپس کی روزمرہ بات چیت میں بھی قافیے لانا تکلف پسند طبائع کا خاصہ تھا۔ سرور نے بھی قافیہ پیمائی کا خوب خوب اہتمام کیا ہے۔ عبارت پیچیدہ ہو یا سادہ، فسانۂ عجائب کا کوئی صفحہ اور مقام اہتمامِ قافیہ سے خالی نہیں ہے ایک مثال دیکھئے "یہ قسمت الٹ گئی۔ شہزادے سے چھٹ گئی۔ خیر اب جو ہو سو ہو۔ تم یہیں سرور ہو اگر فرشتہ آئے بامنہ پائے۔ یہ خبر سن کر وہ ڈرے اکیلے اور خیمے میں جا پڑے۔ اسے کس کا ڈر تھا۔ اس کا تو گھر تھا"۔ سرور ہم قافیہ لفظوں کے قرب اور کہیں ان کے بُعد سے ترنم اور آہنگ کی دل نواز کیفیتیں پیدا کرنے میں کامیاب ہوتے۔

۳۔ مرقع نگاری سرور کے اسلوب کا ایک نمایاں پہلو ان کی کامیاب مرقع نگاری ہے۔ انہوں نے انسانی احساسات و جذبات اور نفسی کیفیتوں کی ترجمانی کی ہے معاشرت اور تمدن کے نقشے کھینچے ہیں۔ مناظرِ فطرت اور مظاہرِ قدرت کی نگہی مصوری کی ہے اور سراپا نگاری کے نمونے بھی پیش کئے ہیں۔ فسانۂ عجائب میں لکھنؤ کے کوچہ و بازار کی مصوری سرور کا بہترین مرقع ہے اسی طرح انجمن آرا سے جان عالم کی وطن کو روانگی کا منظر دکھانے میں سرور نے مہارتِ مرقع نگاری کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ سامرہ کی سراپا نگاری اتنی لاجواب ہے کہ اسے سرور کی مرقع نگاری کا شاہکار کہنا چاہیئے۔

۴۔ لکھنوی تہذیب و ثقافت کی عکاسی سرور کی عمر کا بیشتر حصہ لکھنؤ میں گذرا تھا۔ انہیں لکھنؤ سے قلبی تعلق تھا۔ طبعاً وہ زندہ دل شخص تھے چنانچہ "فسانۂ عجائب" کی فرضی داستان میں بھی لکھنؤ اور اس کی مخصوص تہذیب و ثقافت کا عکس واضح طور پر نظر آرہا ہے۔ سب سے خوبصورت تصویر سرور کا بیانِ لکھنؤ ہے۔ پھر ملکہ مہر نگار، شہزادہ جان عالم اور انجمن آرا کے لباس، گفتار و کردار، وضع نشست و برخاست میں لکھنؤ کا روایتی رکھ رکھاؤ وضع داری، نفاست اور حفظِ مراتب جھلک رہا ہے۔ جان عالم اور انجمن آرا کی شادی کی تفصیل پانچ چھ صفحوں میں بیان کی گئی۔ برات کی دھوم دھام، رسوم و رواج، جہیز کی جزئیات سامان کی تفصیل، سب کچھ بعینہٖ وہی ہے جو لکھنوی ثقافت اور تمدن سے متفق ہے۔ غرض باغات کا بیان ہو یا مختلف کرداروں کی گفتگو۔ رسوم و رواج کا ذکر ہو یا کسی تقریب کا ذکر، "فسانۂ عجائب" کے مصنف نے بقول سید وقار عظیم "لفظاً و معناً ایک خاص معاشرے۔ ایک خاص

معاشرے، ایک خاص تہذیب اور بعض حیثیتوں سے ایک اہم تہذیب کی روح کو مقید کر کے اسے محفوظ کر لیا ہے۔"

۵۔ کردار نگاری "فسانہ عجائب" کی ترتیب و تعمیر میں بہت سے کرداروں کا بھی دخل ہے یہ ایک طلسماتی قصہ ہے پھر سرور نے لکھنوی اختراع طبع کی وجہ سے مبالغے سے کام لیا ہے اس لئے وہ کرداروں کی انفرادیت پر خاطر خواہ توجہ نہیں دے سکے۔ اس کے باوجود داستانوں کے مثالی کرداروں کی حیثیت سے انہوں نے جان عالم، ماہ طلعت، انجمن آرا، فرخ زاد اور ملکہ مہر نگار کے کرداروں کو چابک دستی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ خصوصاً ملکہ مہر نگار داستان کا بے حد جاندار اور دلکش کردار ہے۔ اس کا انسانی اور فطری پہلو زیادہ نمایاں ہے اور وہ حقیقی زندگی سے قریب تر ہے۔

الغرض رجب علی بیگ سرور نے اپنے مخصوص اسلوب کی بدولت ایک خاص عہد کے لکھنؤ کو زندہ جاوید بنا دیا۔ ان کی اس داستان کو لکھنؤ کے نثری نمونے کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے جس طرح "باغ و بہار" دہلویت کی نمائندگی کرتی ہے اس طرح "فسانہ عجائب" لکھنویت کی۔

رجب علی بیگ سرور

شہزادہ جان عالم کی سواری

تعارف اور پس منظر

یہ کہانی لکھنؤ کے معروف نثار مرزا رجب علی بیگ سرور کی طبع زاد داستان "فسانہ عجائب" سے ماخوذ ہے۔ سرور نے اپنی تحریر میں لفظی آرائش اور سجع و قافیے کا اہتمام کر کے اسے لکھنوی انداز نگارش کا نمائندہ بنا دیا۔ داستانوں میں "فسانہ عجائب" حقیقی معنوں میں دبستان لکھنؤ کا ادبی شاہکار ہے۔

شہزادہ جان عالم اور انجمن آرا داستان کے مرکزی کردار ہیں۔

"شہزادہ جان عالم کی سواری" کے عنوان سے جو تحریر ہماری کتاب میں شامل ہے وہ داستان کا ابتدائی حصہ ہے۔ شہزادہ جان عالم کی شادی چودہ برس کی عمر میں ماہ طلعت سے ہو گئی۔ شادی کے بعد جلد ہی وہ قصہ پیش آیا جو ہمارے زیر مطالعہ ہے۔

کہانی کا خلاصہ

شادی کے بعد شہزادہ جان عالم کو سیر و تفریح اور شکار کے لئے باہر جانے کی اجازت مل گئی۔ ایک روز اس کی سواری بازار سے گزری۔ شہزادے نے دیکھا کہ ایک بوڑھا شخص پنجرے میں طوطا لئے کھڑا ہے اور طوطا دلچسپ باتیں کر رہا ہے۔ طوطے نے جان عالم کو دیکھتے ہی اپنے مالک بوڑھے سے مخاطب

ہو کر کہا۔ اگر شہزادہ مجھے خریدے تو تمہارے دن پھریں گے۔ غربت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ یہ سن کر جان عالم نے فی الواقع طوطا ایک لاکھ روپے میں خرید لیا۔ بڑھئے کو خلعت بھی عطا کی۔

طوطے نے اپنی دلچسپ باتوں اور عجیب و غریب حکایتوں سے جان عالم کا دل موہ لیا۔ وہ اسے ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا البتہ دربار میں جاتے وقت ماہ طلعت کو سونپ جاتا۔ ایک روز ماہ طلعت نے غسل کے بعد بناؤ سنگھار کر کے آئینہ دیکھا تو اسے اپنے کمال حسن کا احساس ہوا۔ ماہ طلعت کی سہیلیاں اور لونڈیاں بھی اس کے حسن و جمال کی تعریف کرنے لگیں۔ اس نے طوطے سے بھی اپنی خوبصورتی کی داد چاہی۔ طوطے نے بے دلی سے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ماہ طلعت کو یہ برا لگا کہ طوطے نے اس کی کھل کر کیوں تعریف نہیں کی کہنے لگی۔ تم ہمارا مرتبہ نہیں سمجھے ہو طوطے نے کہا ذرا آئینے میں اپنی شکل تو دیکھو۔ اب تو ماہ طلعت سیخ پا ہو گئی۔ اتنے میں جان عالم آ پہنچا پوچھا خیر تو ہے۔ طوطے نے کہا اگر مزید تھوڑی دیر تک آپ نہ پہنچتے تو شہزادی کے غصے کے ہاتھوں میرا تو کام تمام ہو گیا تھا۔ ادھر ماہ طلعت بگڑ کر بولی طوطا اگر میری بات کا صاف جواب نہ دے گا تو اس کی خیر نہیں۔ طوطے نے کہا جناب شہزادی کو مجھ سے یہ شکایت ہے کہ میں نے ان کے حسن و جمال کی تعریف سے گریز کیا ہے۔ جان عالم نے ماہ طلعت کو سمجھایا کہ طوطا بے چارہ ایک جانور ہے اس کی بات کا برا ماننا عقل مندی نہیں۔ اس پر میاں مٹھو ناراض ہو گیا اور کہنے لگا اگر میں سچی بات کہہ دوں تو آپ ہی میری گردن مروڑ دیں گے اور پھر میری بات سے خود آپ کو شاید طویل سفر درپیش ہو گا۔ بڑی پریشانی اٹھانی پڑے گی۔ اب تو جان عالم کا تجسس بڑھ گیا۔ اس نے بہ اصرار کہا سب احوال مفصل کہہ سنا۔ نتیجہ خواہ کچھ ہو۔

طوطے نے شہزادے کے اشتیاق کو دیکھتے ہوئے قصے کا آغاز اس طرح کیا۔ شمال میں ایک طویل مسافت پر ایک ملک واقع ہے۔ عجائب زرنگار۔ نہایت عمدہ شہر ہے۔ وہاں کے مرد و زن خوبصورت مکانات عالی شان اور آبادی کثرت سے ہے وہاں کی شہزادی کا نام انجمن آرا ہے۔ اس حسین جمیل کہ الفاظ کے ذریعے اس کے حسن کا بیان ممکن نہیں، کم از کم میری زبان تو عجز بیان کی معترف ہے لونڈیاں خواصیں اور کنیزوں کی ایک فوج ظفر موج ہر وقت اس کی خدمت کے لئے کمر بستہ رہتی ہے اور یہ لونڈیاں ہی اس قدر خوبصورت ہیں کہ ہماری شہزادی ماہ طلعت صاحبہ کا ان سے کیا موازنہ۔ یہ اگر انصاف کی نظر سے انہیں دیکھیں تو مارے شرمندگی کے چلو بھر پانی میں ڈوب مریں۔ اس پر ماہ طلعت روٹھ بھی محجوب ہوئی وہ پنجرا اٹھا کر دیوان خانے میں جا بیٹھا اور طوطے کی زبانی مزید حالات سننے لگا۔

مشکل الفاظ و محاورات۔ معانی اور تشریح

صفحہ ۲۰۲ بلبل نوا سنج۔ گیت گانے والا بلبل۔ شاہ عالی مقدار۔ صاحب اقتدار بادشاہ۔ گاہ گاہ۔ کبھی کبھی شام و پگاہ۔ صبح و شام۔ کہنہ و پرانی چیزیں بیچنے کا بازار۔ ابنوہ کثیر۔ بڑا ہجوم۔ جم غفیر۔ بے پناہ خلعت فاخرہ۔ تحسین و آفرین۔ تعریف و توصیف اور شاباش دینے کے لئے پر شور آواز۔ مرد پیر۔ بوڑھا

شخص۔ نحیف۔ کمزور۔ بن۔ عمر۔ ضعیف۔ کمزور۔ ساکنان جناں۔ باغ بہشت کے رہنے والے
کوکب بخت۔ قسمت کا ستارا۔ برج۔ گنبد۔ آسمان میں کل بارہ برج ہیں (یہ بات فرض کر لی گئی ہے)
تیرہ۔ تاریک۔ سیاہ (برج تیرہ سے مراد ہے بدقسمتی) حاتم ستارہ۔ حاتم طائی جیسا سخی) ابر گہربار۔
موتی برسانے والا بادل۔ مشت۔ مٹھی۔ ذرہ بے مقدار۔ بے حیثیت ذرہ بالکل معمولی۔ کارگاہ ثبات۔
دنیا کا کارخانہ۔ پر ثمر۔ مال و دولت سے بھرپور۔ تخن ہوشربا۔ ہوش اڑانے والی بات۔ کلمہ حیرت افزا
حیرت میں اضافہ کرنے والی بات۔

صفحہ ۲۰۳ سحر بیان۔ جادو بیان۔ دلچسپ باتیں کرنے والا۔ خلعت۔ قیمتی لباس۔ دولت سرا۔ سرکاری محل
سخنان۔ سخن کی جمع۔ بات۔ قصص۔ قصہ کی جمع۔ حکایات غریب۔ عجیب کہانیاں۔ خمیازہ مرغوب
خمس شکل میں کئی پسندیدہ نظمیں (جن کا ہر بند پانچ مصرعوں پر مشتمل ہو) بشوق گفتار (باتیں کرنے کے شوق میں
مکلف۔ پر تکلف۔ خوبصورت۔ پیراستہ۔ بناسنورا۔ نخوت۔ تکبر۔ خواصوں۔ خواص کی جمع۔ کنیز۔ لونڈیاں
جلیس۔ ہمسایہ۔ دم ساز۔ ساتھی۔ محرم راز۔ رازدار۔ بہت قریبی۔ دیدہ ہو۔ دیکھا ہو۔ نہ شنیدہ ہو۔ نہ دیکھا اور نہ سنا ہو
بایں کثرت مخلوقات۔ اس قدر زیادہ انسانوں کے باوجود۔ ہم سر۔ برابری کرنے والا۔ جن و بشر۔ جن اور
انسان۔ جمگھٹا۔ شان و شوکت۔ چمک دمک۔

صفحہ ۲۰۴ ذی شعور۔ صاحب عقل۔ مرغ خوش خو۔ اچھی عادات والا پرندہ (مرغ کے معنی پرندہ کے ہیں۔ کوئی سا
پرندہ)۔ طائر سرخ رو۔ سرخ چہرے والا پرندہ (یعنی وہ طائر جس کی چونچ سرخ ہوتی ہے) بذلہ سنج۔ جس کی باتوں
میں مزاح کی چاشنی ہو۔ لطیفہ گو۔ سچ مچ۔ بناوٹ۔ شان و شوکت۔ تیرے طائر وہم خیال سے گزری ہے۔
تمہارے تصور میں آئی ہے۔ نیرنگی چرخ کج رفتار۔ ٹیڑھی چال والے آسمان کی جادوگری۔ مراد ہے انقلاب
زمانہ۔ فتنہ پردازی۔ مصیبت برپا کرنا۔ گردوں دوار۔ گردوں دوار۔ الٹا آسمان (آسمان الٹے پیالے کی مانند ہے)
حیراں۔ ظاہر۔ کبیدہ خاطر۔ افسردہ دل۔ پریشان۔ مضمحل۔ تھکا ہوا۔ سست۔ بے اعتنائی۔ بے نیازی
بے توجہی۔ رندی۔ عادت۔ طرہ یہ کہ۔ لغوی اعتبار سے طرہ کے کئی معنی ہیں۔ انوکھی بات۔ زلف۔ ٹوپی کا
پھندنا وغیرہ۔ یہاں مراد ہے۔ مزید یہ کہ۔ جورو۔ بیوی۔ برہم۔ غصہ۔ غضب۔ غصہ۔ کانون۔ انگیٹھی جہاں
آگ جلتی ہے (چونکہ شہزادی کے سینے میں بھی غصے کی آگ بھڑک رہی تھی اس لئے اسے انگیٹھی کہا ہے)
واہی۔ بے ہودہ۔ فضول۔ اپنا منہ ملاحظہ کرد۔ اپنی حیثیت کو دیکھو۔ حیص بیص۔ بحث و مباحثہ۔ تکرار
سوال جواب۔ چشم پر آب۔ آنسو بھری آنکھ کے ساتھ۔ بامثل کباب۔ ایسے دل کے ساتھ جو غصے سے
جل بھن کر کباب ہو گیا ہو۔ غیظ۔ غصہ۔ خیر باشد۔ خیر تو ہے۔ نوا تمہ۔ برائی ہی برائی ہے (یعنی معاملہ خراب ہے
چندے۔ کچھ قدرت۔ حیات مستعار۔ عارضی زندگی۔ طائر روح۔ بدن کا پرندہ۔ مراد ہے انسان
کی روح۔ گربہ مقصب شہزادی۔ شہزادی کے غصے کی بلی۔ مجروح۔ زخمی۔

صفحہ ۲۰۵ محقق۔ پریشان۔ الجھن

نکتہ: بہ لفظ بالعموم عورتیں کسی ناپسندیدہ شخص کو بیزار کرنے کے لئے بولتی ہیں۔ اجل رسیدہ = جسے موت آنے والی ہو۔ قبیح = ناپسندیدہ۔ قابل نفرین = کشتنی۔ واجب القتل۔ سوختنی = جلا دینے کے قابل۔ گردن زنی گردن اڑا دینے کے لائق۔ تاب نہ آنی = برداشت نہ ہو سکی۔ دانست = سمجھ۔ ہم سر = برابر کا۔

ص ۲۰۱ فَضَّلْنَا بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ = ہم نے تم کو ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر مرتبہ عطا کیا۔ سرور نے اسے فرمانِ خداوندی کہہ کر پیش کیا ہے۔ مگر قرآن پاک میں جو آیت ہے اس میں بعضکم نہیں بلکہ بعضہم ہے)

راستی = سچ۔ کج = ٹیڑھی۔ گدا = فقیر۔ رنجور = افسردہ۔ رنجیدہ۔ رانج بٹ۔ بادشاہ کی ضد۔ تریا ہٹ عورت کی ضد۔ بالک ہٹ = بچے کی ضد۔

دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز۔ ایسا جھوٹ جس کا مقصد اصلاح ہو۔ اس سچ سے بہتر ہے جس سے فتنہ و فساد پیدا ہو۔ دشت نوردی = جنگل کی خاک چھاننا۔ سیر بیاباں = ویرانوں میں بھٹکنا۔ غریب الوطنی۔ مسافر۔ پردیسی۔ کوچہ گردی۔ گلیوں میں پھرنا۔ ایذائے غربت = پردیس کی تکلیف۔ سفر = دورخ۔ مقدرہ قسمت۔ چاک۔ پھٹا ہوا۔ رفو کرنا = مرمت کرنا۔ سینا = سلنا۔ سوئی۔ برس دن، سال بھر۔ مرقع = قطعات کی کتاب۔ مانی و بہزاد = قدیم زمانے کے دو معروف مصور انا نقاش۔

دبیر دہقان فلک = آسمان کا بڑا کسان۔ مزرع عالم = دنیا کی کھیتی عقل باریک بینا = باریک چیزوں کو دیکھنے والی چیز طرح دار = خوبصورت۔ گوہر = ایک چمکدار جوہر۔ جو شیشے کی طرح ہوتا ہے اور زمین سے نکلتا ہے۔ مرغوب = پسندیدہ۔ عمدہ

دنگ = حیران صفحہ = چہرہ روشنی = بدر کامل = چودھویں کا چاند۔ کاہیدہ = گھٹا ہوا۔ ہلال = پہلی تاریخ کا چاند۔ دہان = منہ۔ طلاقت = عمدگی سے بیان کرنے کی صلاحیت۔ تیز زبانی۔ شمہ = ذرہ برابر شکل و شمائل = شکل و صورت (شمائل کے معنی عادات و سیرت کے ہوتے ہیں) زہرہ جبیں = خوبصورت فرخ لعبتان دلبران چین = لعبت کے معنی ہیں عورت یا تصویر۔ لعبتان جمع ہے۔ یعنی فرنگ اور چین کی حسین عورتوں کے لئے باعث فخر صناعی = بناوٹ۔ تخلیق۔ تاج دلبری = دل لبھانے والا تاج۔ برسر = سر پر پہنا ہوا۔ ماہرو = چاند جیسے چہرے والی یعنی بہت خوبصورت۔ عنبریں مو = خوشبودار بالوں والی سرگروہ خوبان جہاں = جنت کی حوروں کی سردار۔ جان جاناں = محبوب کی جان۔ چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا = تھوڑے سے پانی میں ڈوب کر مرجانا۔ جب کسی کو شرمندہ کرنا ہو تو کہتے ہیں۔ محجوب = شرمندہ دم سرد = ٹھنڈی سانس۔

ڈپٹی نذیر احمد دہلوی

مصوح اور چھوٹے بیٹے سلیم کی گفتگو

تعارف اور پس منظر

ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، سرسید احمد خاں کی علی گڑھ تحریک کے اہم ارکان میں سے ہیں۔ وہ عربی فارسی کے جید عالم، بلند پایہ انشا پرداز اور صاحب طرز ادیب ہیں۔ زیر مطالعہ قصہ ان کے ناول "توبۃ النصوح" سے لیا گیا ہے۔ اس ناول کا موضوع تربیت اولاد ہے۔

ایک بار دہلی میں ہیضے کی وبا پھوٹ پڑی۔ نصوح بھی اس کی زد میں آکر بستر علالت پر دراز ہو گیا حالت ایسی خراب ہوئی کہ موت سامنے نظر آنے لگی۔ معالج کی خواب آور دوا سے وہ سو گیا۔ خواب میں نصوح نے دیکھا کہ وہ میدان حشر میں اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے اعمال کی جواب دہی کے لئے موجود ہے بیدار ہوا تو سخت خائف تھا۔ اپنی غفلت پر نادم ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے صحت دی نصوح نے نہ صرف اپنے نفس کی اصلاح کی بلکہ سارے خاندان کی اصلاح پر کمربستہ ہوا۔ اس کی بیوی فہمیدہ اصلاح خاندان کی مہم میں اس کی معاون بن گئی۔ میاں بیوی دونوں باقاعدگی سے نماز بھی پڑھنے لگے۔ چھوٹے بچوں کو سمجھا بجھا کر تو راہ راست پر لے آئے مگر بڑے لڑکے سلیم کی عادات پختہ ہو چکی تھیں۔ اس لئے اسے راہ راست پر لانے میں بڑی مشکلات پیش آئیں۔

ہماری کتاب میں ناول کی فصل چہارم کا ایک حصہ شامل ہے جس میں نصوح اور اس کے چھوٹے بیٹے سلیم کے درمیان مباحثہ خیال ہوتا ہے۔

کہانی کا خلاصہ

ایک صبح نصوح کا چھوٹا بیٹا سویا ہوا تھا کہ ملازمہ نے آجگایا کہ والد صاحب (میاں نصوح) بلا رہے ہیں۔ سلیم بہت فکر مند ہوا۔ پہلے ماں کو ساتھ لے جانا چاہا۔ پھر ڈرتا ڈرتا والد کے پاس پہنچا۔ انہوں نے پیار سے پاس بٹھا کر سکول جانے کے بارے میں پوچھا تو سلیم نے بتایا کہ کوئی گھنٹہ بھر بعد جاؤں گا۔ اور یہ کہ اکثر اکیلا ہی سکول جاتا ہوں کیونکہ چھوٹے بھائی جان علی الصبح کسی دوست کے ہاں جا کر امتحان کی تیاری کرتے ہیں۔ گھر میں تو بڑے بھائی جان ہر وقت شطرنج کی محفل جمائے رہتے ہیں اس لئے مطالعہ مشکل ہے۔ باتوں باتوں میں سلیم نے بتایا کہ مجھے کھیل سے نفرت ہو گئی ہے اور اس کا

سبب یہ ہے کہ ہمارے ہی محلے میں چار غریب جاتی ہیں آپ نے بھی انہیں نبل میں کتابیں دابے گلی میں آتے جاتے دیکھا ہوگا یہ نہایت سلیقے ہوتے خاموش طبع اور با اخلاق لڑکے ہیں۔ سکول میں وقفہ ہو تو یہ کھیل کود کے بجائے نماز کے لئے مسجد چلے جاتے ہیں۔ ان میں منجھلا لڑکا میرا ہم جماعت ہے ایک روز مجھے سبق یاد نہ تھا۔ مولوی صاحب ناراض ہوتے اور اس لڑکے کی طرف اشارہ کر کے فرمایا۔ اس کے پاس جا کر یاد کر لیا کرو۔ اس نے حامی بھر لی۔ میں ان کے گھر گیا اور ایک طرف بیٹھ گیا۔ ان کی نانی اماں نے مجھے پیار سے بلا کر سمجھایا کہ بڑوں کو سلام کرنا چاہیئے۔ میں نے شرمندہ ہو کر سلام کیا۔ اس روز سے میرا ان کے ہاں آنا جانا ہے ان کی نصیحتوں کا یہ اثر ہوا ہے کہ کھیل سے میرا دل اچاٹ ہو گیا ہے۔

میاں نصوح نے مزید تفصیل پوچھی تو سلیم نے بتایا کہ ایک روز ان کے گھر کے سامنے گلی میں کھیل کھیل میں کنجڑے کے لڑکے سے لڑائی ہو گئی۔ گالم گلوچ کے بعد میں نے اسے زمین پر گرا کر پیٹا۔ اس پر نانی اماں، حضرت بی سخت ناراض ہوئیں اور فرمایا کہ تو تو ہاتھ سے گیا۔ تیرا اثر میرے لڑکوں پر بھی پڑے گا۔ حضرت بی نے مجھے بڑی دل سوزی کے ساتھ سمجھایا کہ لڑائی اور گالم گلوچ نہایت پست حرکات ہیں اور اس سے انسان کو عزت حاصل نہیں ہوتی ہے اس پر میں شرمندہ ہو کر رونے لگا تو وہ بھی آبدیدہ ہو گئیں۔ پھر انہوں نے مجھے آئندہ ایسے طرز عمل سے باز رہنے کی تلقین کی۔ ایک روز انہوں نے مجھ سے میرے وقت کا حساب پوچھا اور جب انہیں پتہ چلا کہ میں نماز نہیں پڑھتا تو بہت رنجیدہ ہوئیں مجھے بہت سمجھایا اور نماز سکھائی۔ افسوس کہ اب کئی ماہ سے ان کے گھر میرا جانا چھوٹ گیا ہے۔ میاں نصوح نے یہ اصرار اس کی وجہ پوچھی سلیم کہنے لگا حضرت بی نے مجھے سر کے بال منڈوانے کو کہا تھا کیونکہ بال بنانے سنوارنے میں بہت وقت صرف ہوتا ہے۔ میں نے حجام سے بال منڈوانے چاہے تو بھائی جان بہت خفا ہوئے۔ زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ حضرت بی اور ان کے نواسوں کو بھی برا بھلا کہا۔ یہ کہتے ہوئے سلیم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

مشکل الفاظ محاورات۔ معانی اور تشریح

صفحہ ۲۰۸ | بالاخانہ: اوپر کا کمرہ۔ کوٹھا۔ طلب: بلاوا

صفحہ ۲۰۹ | گنجفہ: ایک کھیل کا نام جو تاش کی طرح کھیلا جاتا ہے۔ شطرنج: ایک مشہور امیرانہ کھیل جس میں چھ مہرے ہوتے ہیں۔ مہرہ: شطرنج کا گھونگا

صفحہ ۲۱۰ | مبتدی: ابتدا کرنے والا۔ نو آموز

صفحہ ۲۱۱ | پھٹڑی: وہ جوتا جس میں ایڑی نہ ہو۔ چولیاں: اوپر کے دھڑ کا کپڑا۔ کوڑیوں لڑکے:

بے شمار لڑکے۔ بڑی تعداد میں | آوازے کسنا: چھیڑنا

صفحہ ۲۱۲ | آموختہ: سبق | بسر و چشم: بڑی خوشی سے۔ قبلہ رو: قبلہ کی طرف منہ کرکے۔ زمین میں گڑ گیا: بہت شرمندہ ہوا

صفحہ ۲۱۳ | گرفت: پکڑ۔ پیٹھ دینا: زمین پر دے مارنا۔ چاروں شانے چت: پیٹھ کے بل گرنا یا گرانا۔ گتے: رگڑے۔ چیدہ باز: بے ایمان۔ خم ٹھونک کر: لڑنے پر تیار ہونا۔ گتھ جانا۔ بھڑ جانا۔

صفحہ ۲۱۴ | کنجڑا: سبزی فروش۔ طیش: غصہ۔ فرد ہونا: ختم ہونا۔ سر نگوں: سر نیچا کرکے۔ افسردہ۔ شرمندہ۔ گن: عادات۔ کرتوت: بے سود: بے کار بے فائدہ۔ کھٹکا: خطرہ۔ غدشہ۔ خو بو: عادت۔ شمہ: ذرہ۔

صفحہ ۲۱۵ | باک: ڈر۔ خوف۔ تامل: خوف۔ جھجک۔ سر ہونا: پیچھے پڑ جانا۔ یک نہ شد دو شد: ایک نہ ہو، دو ہو گئے۔ ایک مصیبت یا شرارت کے ساتھ دوسری مصیبت یا شرارت کے موقع پر بولتے ہیں)

دروغ گو یم بروئے تو: تمہارے سامنے جھوٹ بولتا ہوں۔ لچھن: چال چلن۔ عادات

صفحہ ۲۱۶ | زبوں: غریب۔ ندامت: شرمندگی۔ شہرہ: شہرت۔ عزت۔ آبدیدہ۔ آنکھوں میں آنسو آنا

صفحہ ۲۱۷ | چبینے: دانے، عموماً چنے کے۔ انگوٹھا: ایک قسم کی اچکن آج کل اس کا رواج نہیں رہا۔

دردر: گھر گھر۔ دربدر۔ کاترا: کانا۔ یک چشم۔

صفحہ ۲۱۹ | استغفر اللہ: میں اللہ کی مغفرت اور بخشش چاہتا ہوں (جب کسی کام کے ہونے یا کرنے کے متعلق دریافت کیا جائے اور انکار میں جواب دینا تو اکثر یہ کلمہ بولتے ہیں۔ کسی چیز کے ذکر پر نفرت کے اظہار کے لیے بھی بولتے ہیں) غیبت: کسی کی غیر حاضری میں کوئی ایسی بات کہنا جو متعلقہ شخص کو ناپسند ہو چغلی: جھوٹ

صفحہ ۲۱۹ | پرست کندہ: صاف صاف بے لاگ۔ منفعت: فائدہ۔ نفع۔ بزرگ داشت: خبر گیری نگہداشت خلیفہ: حجام

پیراگراف کی تشریح

سوال:۔ مندرجہ ذیل پیراگراف کی تشریح کیجیے۔ حوالہ متن اور سیاق و سباق بھی لکھیے

"کوئی شخص دین اور دنیا دونوں میں اس وجہ سے عزت نہیں پا سکتا کہ اس کے باپ دادا عزت دار تھے۔ آدمی کو عزت اپنی عادات اور مزاج سے ہے کیا تم کہہ سکتے ہو کہ یہ عادتیں جو تم نے سیکھی ہیں۔ عزت حاصل کرنے کی ہیں، ہرگز نہیں، یہ سن کر مجد کو اس قدر شرمندگی ہوئی کہ میں رونے لگا اور حضرت بی بھی آبدیدہ ہوئیں"

جواب: حوالہ متن | یہ سطور نصوح اور چھوٹے بیٹے سلیم کی گفتگو سے لی گئی ہیں جو ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کے ناول "توبۃ النصوح" کا مرکزی قصہ ہے

سیاق و سباق | یہاں نصوح پہنچے کی دعا میں بیمار ہوتے۔ اس دوران میں ایک روز خواب میں

میدانِ حشر میں بارگاہ خداوندی میں پیش ہوتے۔ بیدار ہوتے ہی انہوں نے اپنی اور اپنے خاندان کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ ایک روز علی الصبح چھوٹے بیٹے سلیم کو بلایا۔ اشارۃً گفتگو میں پتہ چلا کہ محلے کی ایک بزرگ اور دیندار خاتون حضرت بی بی کی کوششوں سے سلیم کی کافی حد تک اصلاح ہو چکی ہے مگر یہ کیوں کر ہوا؟ سلیم نے اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے بتایا کہ ایک روز میں نے ایک لڑکے سے لڑائی کی اور گالم گلوچ بھی تو حضرت بی نے کس طرح مجھے نصیحت کی۔ اس موقع پر یہ سطور آئی ہیں

تشریح حضرت بی نے سلیم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ انسان کی عزت اور ذلت کا انحصار اس کے اعمال ہیں نہ کہ محض اس کے باپ دادا یا ان کا نام۔ جیسا بھی کسی کا طرزِ عمل ہوگا، لوگوں سے میل جول اور لین دین ہوگا۔ عادات و اطوار ہوں گے۔ اسی کے مطابق لوگ اس کی عزت کریں گے پھر حضرت بی نے سلیم سے پوچھا کہ اب تم ہی بتاؤ کہ تم نے جن عادات کو اپنا رکھا ہے اور ظاہر ہے یہ عادات بری اور قابلِ مذمت ہیں۔ کیا ان کی وجہ سے تم لوگوں کی نظروں میں عزت حاصل کر سکتے ہو؟ پھر خود ہی حضرت بی نے جواب دیا کہ ایسا ہرگز ممکن نہیں۔ اب سلیم کیا جواب دیتا۔ بولتا بھی تو کس منہ سے۔ سخت شرمندہ ہوا اور سامنے ندامت کے رونے لگا۔ محبت اور دردمندی کے سبب حضرت بی کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

خواجہ حسن نظامی

حالاتِ زندگی

حسن نظامی ۲۵ دسمبر ۱۸۷۸ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید عاشق علی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی درگاہ کے خادموں میں شامل تھے، بارہ برس کی عمر تھی کہ حسن نظامی کے والدین فوت ہو گئے اس لئے ان کا ابتدائی زمانہ عسرت اور تنگ دستی میں گذرا۔ دینی علوم مولانا رشید احمد گنگوہی سے حاصل کئے۔ لکھنے کا شوق بچپن سے تھا۔ چنانچہ مختلف اخبارات و رسائل میں ان کے مضامین کثرت سے شائع ہونے لگے۔ یہی مضمون نگاری حسن نظامی کی شہرت کا باعث ہوئی۔ انہوں نے خود بھی متعدد رسائل جاری کئے۔ جن میں سب سے مشہور رسالہ "منادی" تھا۔ یہ رسالہ خواجہ صاحب کی وفات تک جاری رہا۔

خواجہ حسن نظامی نے مختلف موضوعات پر لکھا ہے، ۱۸۵۷ء سے متعلق ان کی تصانیف کی تعداد دس گیارہ ہے۔ جن میں دہلی کے شرفاء اور شاہی خاندان کی تباہی کے عبرتناک واقعات بیان کئے گئے ہیں، ان کی تحریر بہت سادہ، رواں اور پُرتاثیر ہے۔

خواجہ حسن نظامی کے مریدوں کا حلقہ بھی بہت وسیع تھا۔ ایک طرف تاریخ ادب میں

ان کا شمار صاحب طرز ادیبوں میں ہوتا ہے، تو دوسری طرف اہل تصوف میں بھی وہ عزت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔

۲۱ جولائی ۱۹۵۵ء میں دہلی میں انتقال کیا۔ چھوٹی بڑی تصانیف کی تعداد ایک سو سے زائد ہے۔

خواجہ حسن نظامی

شہزادی کی بپتا

تعارف اور پس منظر

خواجہ حسن نظامی کا شمار اردو کے صاحب طرز ادیبوں میں ہوتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں دہلی پامال ہوئی۔ اہل شہر خصوصاً شاہی خاندان کے لوگوں کو در بدر کی ٹھوکریں کھانی پڑیں اور ناز و نعم میں پلے ہوئے انسان دو وقت کی روٹی کے محتاج ہو کر بھیک مانگنے لگے۔ خواجہ حسن نظامی نے ایسے بے شمار عبرت انگیز واقعات کو جمع کر کے افسانوی انداز میں قلم بند کیا ــــ "شہزادی کی بپتا" اس سلسلے کی ایک دردناک آپ بیتی ہے۔

مشکل الفاظ و محاورات ــــ معانی اور تشریح

ص ۲۶۱ غدر: بغاوت۔ بے وفائی۔ ہنگامہ ــــ ۱۸۵۷ء میں ہندوستان کے باشندوں نے انگریزوں کے خلاف آزادی کی جنگ لڑی، انگریز نے اسے غدر کا نام دیا۔ ظلِ سبحانی: اللہ تعالیٰ کا سایہ مراد ہے بادشاہ ــــ قدیم زمانے سے یہ تصور چلا آ رہا تھا کہ بادشاہ اللہ تعالیٰ کا نائب اور خلیفہ ہوتا ہے اس لحاظ سے اسے خدا کا سایہ کہا جانے لگا۔ چہیتے: لاڈلے آقا بھائی، بڑا بھائی مغلانیوں: شاہی گھرانوں میں بچوں کی نگہداشت اور تعلیم و تربیت کرنے والی عورتیں جن کا تعلق مغل خاندان سے ہوتا ہے ص ۲۶۲ حضور والا: مراد ہے بادشاہ + نسبت عشر گئی: منگنی ہو گئی۔ شرعی نامحرم: وہ مرد جن سے عورتوں کو شرعاً پردہ کرنا لازم ہے خیال رہے کہ شوہر، باپ، شوہروں کے باپ، بیٹے، شوہروں کے بیٹے، بھائی، بھتیجے بھانجے ماموں، چچا، بھائی، چچا، ماموں کے سوا عورت کے لئے تمام مرد نامحرم ہیں، مجرا: ادب کے ساتھ سلام کرنا۔ قرینہ: سلیقہ۔ مرحمت فرمانا: عطا کرنا۔ دینا۔ اوسان خطا ہونا: ہوش اڑ جانا، ص ۲۶۳ خواجہ سرا: وہ غلام جو نامرد ہو اور گھر میں آ جا سکے، بے خودی: ایسی حالت جب انسان پورے ہوش و حواس میں نہ ہو۔ کوچ: رخصت۔ سنگین: لوک دار

ص ۲۲۴

چھری جو بندوق پر چڑھائی جاتی ہے۔ سپر: ڈھال۔ دلاسا: تسلی، سہارا۔ دلداری: تسلی قدیمی نمک خوار، پرانا ملازم۔ دوبھر ہو گیا: مشکل ہو گیا۔ مُوا: نامراد، کم بخت۔ ناظر: ملازم خواجہ سرا۔ پالکی: ڈولی، جس میں اگلے زمانے میں امراء یا خواتین بیٹھ کر باہر نکلتے تھے دم بخود: حیران۔ آپے سے باہر ہونا: سخت غصہ آنا۔ بے ترسی: بے رحمی، دکھیا: غم زدہ

سبق کا خلاصہ

غدر کو پچاس برس گذر چکے ہیں مگر یہ کل کی بات لگتی ہے۔ میرا نام سلطان بانو ہے۔ اور آخری مغل فرمانروا بہادر شاہ ظفر کی پوتی ہوں ـــــ (میرے ابا مرزا قریش، بادشاہ کے ہونہار فرزند تھے) ـــــ بھائی یاور شاہ سے دو برس چھوٹی اور بہن نازبانو سے چھ سال بڑی ہوں ـــــ مختلف علوم و فنون میں ہماری تعلیم و تربیت کے لئے متعدد اساتذہ مقرر تھے۔ بادشاہ سلامت مجھ پر خصوصی کرم فرماتے اور صبح کھانے پر بلائی جاتی ـــــ مرزا سہراب سے میری منگنی ہو گئی تو میں شاہی دسترخوان پر جاتے ہوئے شرماتی کیونکہ میرے منگیتر بھی آتے تھے۔ لیکن بادشاہ کا حکم تھا اس لئے مجبوراً جانا پڑتا۔ جب بادشاہ سلامت کوئی خاص کھانا عنایت فرماتے تو حسب قاعدہ اپنی جگہ سے اٹھ کر تین سلام بجا لانے پڑتے، ایسے موقعوں پر بڑی مشکل محسوس ہوتی ـــــ کیا زمانہ تھا۔

غدر میں بادشاہ سلامت کو مقبرۂ ہمایوں میں گرفتار کر لیا گیا تو مجھے ایک خواجہ سرا بلا لے گیا۔ دریائی دروازے سے باہر ابا جان افسردہ خاطر اور خاک بسر کھڑے تھے۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔ کہنے لگے بیٹا، یاور اللہ کو پیارا ہو گیا، ہم بھی رخصت ہوتے ہیں۔ میں چیخ مار کر رونے لگی۔ ابا جان گھوڑے سے اتر کر ہم دونوں کو پیار کرنے لگے مجھے نصیحت کی کہ میں چھوٹی بہن کا خیال رکھوں۔ نازبانو کو صبر و شکر کی تلقین کی۔ پھر ہمیں ملازم کے سپرد کر کے گھوڑے پر سوار جنگل کی طرف نکل گئے۔ ہم وہاں سے چلے۔ نازبانو کے لئے پیدل چلنا دوبھر تھا کیونکہ عادت نہ تھی۔ اس کے پاؤں میں کانٹا چبھ گیا، اس نے پالکی منگانے کو کہا۔ خواجہ سرا کا رویہ غیر ہمدردانہ تھا۔ نازبانو نے اسے ڈانٹا تو اس بے درد نے بے رحمی سے ایک تھپڑ مارا۔ ہم رونے لگے اور وہ کہیں چلا گیا۔

ہم دونوں بڑی مشکلوں سے درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء پہنچیں، جہاں دہلی شہر کے اور خاص طور پر شاہی خاندانوں کے بہت سے مصیبت زدہ لوگ جمع تھے، مگر افراتفری اور نفسا نفسی کی حالت تھی۔ میری بہن نازبانو تو وہاں میں خدا کو پیاری ہو گئی ـــــ

ہیں مصائب کا سامنا کرتی رہی ـــــ انگریزی حکومت نے پانچ روپے ماہوار وظیفہ مقرر کیا تھا، جواب تک مل رہا ہے۔

اہم اقتباس کی تشریح

سوال۔ مندرجہ ذیل اقتباس کی تشریح، حوالۂ متن اور سیاق و سباق کے حوالے سے کیجیے:

"اب لوگ میری تلاش میں ہیں۔ میں بھی دو چار گھڑی کا مہمان ہوں، تم ماشاء اللہ جوان اور سمجھدار ہو، اپنی چھوٹی بہن کو دلاسا دو اور خود آنے والی مصیبتوں پر صبر کرو۔ خبر نہیں اس کے بعد کیا پیش آنے والا ہے۔ جی تو نہیں چاہتا کہ تم کو تن تنہا چھوڑ کر کہیں جاؤں۔ پر ایک نہ ایک دن تم کو بن باپ کا بننا پڑے گا۔ نازبانو ابھی بچہ ہے۔ اسکی دلداری کرنا اور نیکی سے زندگی بسر کرنا ـــــ"

جواب: حوالۂ متن یہ عبارت "شہزادی کی بپتا" سے لی گئی ہے، اس کے مصنف خواجہ حسن نظامی ہیں۔

سیاق و سباق یہ کہانی آخری مغل فرمانروا بہادر شاہ ظفر کی پوتی اور مرزا قریش بہادر کی بیٹی سلطان بانو کی داستانِ غم پر مشتمل ہے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے پہلے شاہی خاندان، لال قلعے کے اندر خوشحالی اور آسودگی کی زندگی بسر کر رہا تھا زمانے نے ایسا پلٹا کھایا کہ انگریزوں نے غلبہ پانے کے بعد، بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کر لیا۔ ان کے لڑکے (اور سلطان بانو کے والد مرزا قریش) انقلابیوں کے ساتھ شامل ہو کر فرنگیوں کے خلاف برسرِ پیکار ہو گئے ـــــ انہیں اندازہ ہو گیا کہ اب زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں۔ انگریز ان کی تلاش میں تھے۔ روپوش ہونے سے پہلے انہوں نے اپنی دونوں بیٹیوں کو بلایا۔ پہلے تو انہیں بتایا کہ تمہارا بھائی یاور مارا گیا ہے اور اب میری زندگی بھی خطرے میں ہے اور پھر انہیں نصیحتیں کرنے لگے ـــــ تشریح طلب سطور اس موقع پر آئی ہیں۔

تشریح سلطان بانو اور نازبانو کے والد مرزا قریش نے اپنی بیٹیوں کو بتایا کہ انگریز اور ان کے جاسوس ان کی تلاش میں ہیں اور بظاہر بچ نکلنے کے امکانات کم ہیں۔ خطرہ سر پہ منڈلا رہا ہے، کچھ پتہ نہیں، کتنی زندگی باقی ہے ـــــ پھر سلطان بانو کو جو دونوں بہنوں میں بڑی تھی۔ مخاطب کر کے کہا کہ تم نہ صرف خود مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنا بلکہ اپنی چھوٹی بہن کی دلداری بھی تمہیں ہی کرنی ہوگی ـــــ اور تم ہی اس کی سرپرست ہو گی۔ تمہیں جدا کرنے کو جی تو نہیں چاہتا مگر ایک نہ ایک دن تمہیں باپ کی ابدی جدائی برداشت کرنی پڑے گی۔ یہ صدمہ بہرحال تمہیں اٹھانا ہے اور اس کے

چودھری افضل حق

ایک خادمِ خلق کی کہانی

تعارف اور پس منظر

چودھری افضل حق مرحوم ایک سیاسی لیڈر تھے۔ تحصیل علم کے بعد پنجاب پولیس میں ملازم ہوئے۔ مگر یہ ملازمت ان کی طبعی افتاد کے حسب حال نہ تھی اس لیے اسے ترک کر دیا۔ اور سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ تحریکِ خلافت کے سرگرم کارکن رہے ایک مشہور سیاسی جماعت "مجلس احرارِ ہند" کے بانی تھے۔ کئی بار سال ہا سال قید و بند کی صعوبتوں میں گزارے۔ اپنی ہی زندگی کے تجربات اور نظریات کو اپنی مشہور تصنیف "زندگی" میں بڑے انوکھے اور دل کش انداز میں پیش کیا ہے۔ "دین اسلام" "محبوبِ خدا" اور "جواہرات" ان کی دیگر تصانیف ہیں۔ ان میں سے "جواہرات" افسانوں کا مجموعہ ہے۔

ان کی تمام تصانیف اصلاحی اور بامقصد ہیں اس لیے فنی نقطۂ نظر سے اردو ادب میں ان کو اونچا مقام حاصل نہیں ہے۔ تاہم "زندگی" میں ان کی تحریر اور پیش کش کا انداز رومانی اور رنگین ہے۔ اس تصنیف میں انہوں نے ایک شخص کی کہانی بیان کی ہے جو بے راہروی اور عیش پرستی کے راستے پر نکل کر ذلت اور رسوائی کا شکار ہوتا ہے۔ عبرت سے کرتا نجات کی کوشش کرتا ہے۔ ایک دن مصلے پر سو جاتا ہے خواب کی حالت میں وہ دیکھتا ہے کہ موت کے بعد وہ عذاب قبر، جہنم، اعراف بہشت، بہشت بریں وغیرہ مقامات پر جاتا ہے۔ اور اپنے اعمال کی سزا و جزا پاتا ہے۔ مختلف مقامات پر اُسے جو لوگ نظر آتے ہیں۔ ان میں کچھ لوگ اُسے اپنی بپتا سناتے ہیں۔ چنانچہ عالم مثال میں پاک روحوں کی گفتگو سنتا ہے۔ کئی روحیں اپنی دنیاوی زندگی کی کہانیاں سناتی ہیں۔ ان سب کہانیوں کا مقصد یہ ہے کہ لوگ ان کہانیوں سے عبرت لے کر اپنی اصلاح احوال کریں۔ انہی میں سے ایک کہانی "ایک خادمِ خلق کی کہانی" کے عنوان سے ہمارے نصاب میں شامل ہے۔ خدمت خلق میں جان دینے

والے کی پوری کہانی میں تو موت کے بعد کے حالات بھی درج ہیں نصاب میں اس کی موت تک کا منظر پیش کیا گیا ہے۔

مشکل الفاظ و محاورات ـــــ معانی اور تشریح

ص ۲۲۶ چیس بہاریں : پچیس سال ـــ مست شباب : جوانی کے نشے میں مست ـــ خوش نما : خوب صورت ـــ دل پسند : دل کو پسند آنے والی ـــ دل کھول کر برسنا : خوب زور سے برسنا۔ مطلع : آسمان۔ بالائی حصہ : اوپر کی منزل۔ اوپر کا حصہ ـــ مست سرود : راگ میں مست۔ افق مشرق : مشرقی آسمان قوس قزح : دھنک۔ سات رنگی کمان جو بارش کے بعد آسمان پر نمودار ہوتی ہے۔

ص ۲۲۷ مشغلِ طرب : فرحت و انبساط کا مشغلہ یعنی گانا بجانا ـــ نکھار : صفائی۔ خوب صورتی طغیانی : سیلاب ـــ پاٹ : چوڑائی ـــ گرداب : پانی کا بھنور۔ کچھ پیش نہ گئی : کچھ زور نہ چلا ـــ ہمہ تن متوجہ : پوری توجہ کے ساتھ ـــ افراطِ اضطراب : بے چینی کی زیادتی ـــ میلوں کا پاٹ : میلوں کی چوڑائی ـــ بانسوں کی گہرائی۔ کئی بانسوں کے برابر گہرائی۔ ہاتھ پاؤں مارنا : کوشش کرنا ـــ تجدھار : بیچ کی دھار۔ بیچ دریا ـــ مصلحت : بھلائی۔ فرطِ رحم : رحم کی زیادتی ـــ بارِ عزیز : پیارا بوجھ ـــ جگر پاش : جگر کو ٹکڑے کرنے والی

ص ۲۲۸ ـــ ترحم : رحم۔ ترس ـــ تیر کی طرح : تیزی سے۔ مشاق : ماہر ـــ شہ زور : طاقت والا۔ دریا دل : سخی ـــ روپیہ پانی کی طرح بہانا : فضول خرچی کرنا ـــ اطمینانِ قلب : دلی سکون۔ وفورِ مسرت : خوشی کی زیادتی۔ بہت زیادتی خوشی ـــ آب دیدہ ہونا : آنکھوں میں آنسو آجانا۔ ص ۲۲۹ یارانہ رہا : محبت نہ رہی ندامت : شرمندگی ـــ بوجھ پہاڑ معلوم ہونا : بہت ہی زیادہ بوجھ ہونا۔ جان ہے تو جہان ہے : دنیا کے سارے مزے جیتے جی کے ہیں ـــ گنوائی : ضائع کی۔ ہتھوار : شجاعت۔ دم ٹوٹنا : سانس اکھڑنا۔ حالتِ نزع میں ہونا ـــ قبل : پہلے۔ روئے زمین پر : زمین کی سطح پر۔ زمین پر ـــ فاسق و فاجر : فسق و فجور میں مبتلا۔ نہایت ہی بدکار۔

وہم بھی نہ گزرا تھا : کبھی خیال تک بھی نہ آیا تھا ـــ خادمِ خلق : مخلوقات کی خدمت کرنے والا۔ انسانیت کی خدمت کرنے والا۔ سماجی کارکن

سبق کا خلاصہ

ایک امیر زادہ عیش پرست مرنے کے بعد عالم امثال میں شہیدوں کی صف میں شامل ہوا۔ وہ اپنی شاندار موت کا حال یوں بیان کرتا ہے:۔ مجھے عیش و عشرت کے سارے سامان مہیا تھے۔ ایک دن میں نغمہ و سرود سے دل بہلا رہا تھا کہ اچانک آسمان پر کالی گھٹا چھا گئی، بادل خوب دل کھول کر برسا ہر طرف جل تھل کا سماں ہو گیا۔ میں اپنے عالی شان مکان کی اوپر کی منزل سے یہ نظارہ دیکھ رہا تھا کہ چڑھے ہوئے دریا میں ایک چھوٹی سی کشتی ڈگمگانے لگی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ڈوب گئی۔ کچھ مسافر ہاتھ پاؤں مارنے لگے کچھ غوطے کھانے لگے میں یہ منظر دیکھ رہا تھا اور دریا میں کود پڑا۔ کچھ مسافروں کی جان بچانے میری امداد کو میرا نوکر گل نواز بھی آ گیا۔ ڈوبوں کو مدد دے کر کنارے پہنچا کر ہم دوبارہ وسط دریا میں گئے کہ دوسروں کو بھی بچائیں۔ میں نے ایک ڈوبتے آدمی کو اٹھایا۔ ساحل کے نزدیک آ کر میرا دم ٹوٹ گیا وہ مجھ سے چھوٹ گیا۔ میں غوطے کھانے لگا۔ جس کو بچانے کی کوشش کی تھی وہ ساحل پر جا لگا اور میں ساحل سے دور ہوتا گیا۔ کنارے سے سب لوگ مجھے ڈوبتا دیکھ کر پریشان تھے۔ میں اپنی اس شاندار موت پر حیران تھا کہ سبحان اللہ! مجھ جیسے بدکار کو ایسی شاندار موت نصیب ہوئی۔ میرا نوکر مجھے بچانے کو گود اگر میں لہروں کی نذر ہو گیا۔"

اہم اقتباس کی تشریح

سوال: مندرجہ ذیل عبارت کی تشریح متن اور سیاق و سباق کے حوالے سے کیجئے:۔

"میں وفور مسرت میں کہنے لگا: "گل نواز! ساحل پر پہنچتے ہیں۔ تجھ کو اتنی دولت دوں گا۔ کہ تیری اولاد بیٹھی کھائے گی"۔ یہ سن کر وہ رویا۔ اسے دیکھ کر میں آب دیدہ ہو گیا۔ دونو کو پریشانی۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو انعام کی خاطر جان خطرے میں ڈال دیتے ہیں۔ بہادر اور شریف کے لئے کوئی انعام کا لالچ بھی کیوں کر ہو سکتا ہے اسے افسوس ہوا کہ میں نے اسے ایسا سمجھا مجھے شرم آئی کہ میں نے کیا کہہ دیا۔"

جواب: حوالۂ متن: یہ عبارت "ایک غلام خلق کی کہانی" سے لی گئی ہے۔ جو چودھری افضل حق کی کتاب "تذکرہ" سے ماخوذ ہے۔

سیاق و سباق جب امیر زادہ ڈوبتے ہوئے لوگوں کو بچانے کی دوسری کوشش میں ایک ڈوبتے آدمی کو اٹھاتا ہے۔ اور اس کا ذکر دوسرے آدمی کو اٹھاتا ہے۔ تو امیر زادے کے دل میں سکون اور فرحت پیدا ہوتی ہے۔ جس کے متعلق وہ کہتا ہے کہ دولت دنیا سے میں اسے نہیں خرید سکتا تھا۔ اسی خوشی کے عالم میں اس کے منہ سے جو الفاظ نکلتے ہیں۔ یہ عبارت اسی موقع سے تعلق رکھتی ہے۔

تشریح ڈوبتے لوگوں کی جانیں بچاتے ہوئے میرے دل کو وہ سکون اور اطمینان نصیب ہوا جسے میں دولت سے کبھی نہیں خرید سکتا تھا۔

مجھے اس کام سے اتنی زیادہ خوشی ہوئی کہ اس خوشی کی ترنگ میں میں نے اپنے ملازم سے کہا۔ یہاں سے فارغ ہو کر میں تمہیں مال و دولت سے یوں مالا مال کر دوں گا کہ تمہاری آئندہ نسلیں بھی آرام سے بیٹھی کھائیں گی۔ نوکر یہ جملے سن کر رونے لگا۔ اس کا رونا افسوس کا رونا تھا کہ کہا میری اس خدمتِ خلق کا صلہ بھی کچھ ہے کہ دولت کا خیال آ جائے۔ خدمتِ خلق بذاتِ خود ایک انعام ہے وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھا کہ جو انعام اور صلے کے لالچ میں جان خطرے میں ڈالتے ہیں۔ اس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر یہ کام محض خدمتِ خلق کے جذبے سے کیا تھا۔ مالک کی بات سن کر اسے دیکھ کر جو اکہ میرا مالک میرے متعلق یہ گمان رکھتا ہے کہ میں انعام سے خوش ہو جاؤں گا۔ اس لیے وہ رونے لگا۔ اُسے روتا دیکھ کر مالک کو اپنی بے جا بات کا فوراً احساس ہو گیا۔ اس لیے اس کی آنکھوں میں بھی ندامت کے آنسو آ گئے۔ ہم دونوں پریشان سے ہو گئے وہ اس خیال سے کہ میں اُسے لالچی سمجھا۔ میں اس خیال سے کہ میں نے جاں فروش کا دل دکھایا۔

غلام عباس

حالاتِ زندگی

غلام عباس ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم لاہور میں حاصل کی سکول کے زمانے ہی سے لکھنے لکھانے کا شوق تھا۔ مولوی طالب علی صاحب نے، جو سکول میں غلام عباس کے استاد تھے، ان کی حوصلہ افزائی کی۔ نویں جماعت میں تھے کہ ایک ڈرامہ لکھا۔ اس سے ان کی تحریری صلاحیتیں نکھر کر سامنے آ گئیں۔ والد نوعمری میں انتقال کر گئے مگر غلام عباس نے نامساعد حالات کے باوجود ہمت نہ ہاری۔

۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۶ء تک بچوں کے رسالے "پھول" کے مدیر رہے۔ دوسری جنگِ عظیم

کے زمانے میں آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہو گئے۔ اس دوران میں لکھنے کا سلسلہ جاری رہا۔ انہوں نے افسانے پر خاص توجہ دی اور اپنی خداداد صلاحیتوں کی بدولت اردو افسانہ نگاروں میں بہت جلد ایک ممتاز مقام پیدا کر لیا۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "آنندی" ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ یہ افسانے ان کے قیامِ دلی کی یادگار ہیں۔ بعد میں اُن کے افسانوں کے دو اور مجموعے "جاڑے کی چاندنی" اور "کن رس" بھی شائع ہوئے۔ انہوں نے ایوب خاں کی خودنوشت کا اردو، ترجمہ بھی کیا۔

ریڈیو پاکستان کے رسالے "آہنگ" کے مدیر بھی رہے۔ انہوں نے "ماہِ نو" کراچی میں ایک قسط وار ناول بھی لکھا۔

غلام عباس کی افسانہ نگاری

غلام عباس اردو ادب کے منفرد افسانہ نگار ہیں ـــــ وہ کسی ادبی گروپ سے وابستہ نہیں بلکہ انہوں نے اپنے فن کے بل بوتے پر اپنی حیثیت منوائی اُن کے افسانوں میں بڑی جان ہے۔ ان کے افسانوں کا سب سے پہلا مجموعہ "آنندی" شائع ہوا تھا۔ پھر جاڑے کی چاندنی" اور آخر میں "کن رس" چھپا ـــــ اُن کے افسانے اگرچہ تعداد میں زیادہ نہیں تاہم معیار کے اعتبار سے وہ بہت بلند پایہ ہیں کیونکہ فن افسانہ نگاری پر انہیں بڑی گرفت حاصل ہے۔

غلام عباس کے افسانوں میں سکون، ٹھہراؤ اور اطمینان کی کیفیت ملتی ہے اُن کے ہاں تندی و تیزی نہیں بلکہ نرم روی ہے۔ وہ افسانے کی اٹھان اور تعمیر میں جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کرتے بلکہ بڑے سلیقے اور مستقل مزاجی کے ساتھ افسانہ کا ماحول تیار کرتے اور گرد و پیش کی تصویر کھینچتے ہیں۔ اُن کے نزدیک کسی انسان کے لیے ماحول سے الگ تھلگ زندگی بسر کرنا ممکن ہی نہیں۔ وہ اپنے کرداروں کے ظاہری حلیے، حرکات و سکنات اور چال ڈھال کی پوری تفصیل بیان کرتے ہیں۔ تاکہ قاری پر اُس کی شخصیت کا تاثر واضح اور مکمل ہو۔ اس کے بعد کہانی کا عمل شروع ہوتا ہے جو کبھی گفتگو کے ذریعے اور کبھی مزید تفصیلات کے سہارے آگے بڑھتا ہے ـــــ غرض غلام عباس کو افسانے کا تانا بانا بننے میں کمال حاصل ہے۔ اور وہ محبت میں دلچسپی، سرد و سکون اور پورے انہماک سے کام لیتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں ان کے افسانوں کا معیار بہت بلند ہے۔

غلام عباس کے افسانوں کے کردار معاشرے کے مختلف طبقات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ وہ ٹائپ کردار ہیں مگر ان میں یکسانیت یا جمود نہیں بلکہ وہ مسلسل حرکت پذیر رہتے ہیں۔ ان کے

ٹائپ کرداروں میں "اوور کوٹ" کا خوش پوش مہمار جاڑے کی چاندنی "کہ رس" کا گویتا رکن رس اور "فینسی ہیر کٹنگ سیلون" کا ملٹی رجاڑے کی چاندنی) قابل ذکر ہیں۔

غلام عباس کو جزئیات نگاری اور بیان پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ وہ کسی کردار یا ماحول کی تصویر ایک ماہر فوٹو گرافر کی طرح کھینچتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی جزئیات ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوتیں۔ بلکہ یہ جزئیات اُن کے افسانوں کے ماحول کو بہتر اور واضح بناتی ہے۔ ان کے افسانوں میں تفصیل اور جزئیات پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ قاری کی انگلی پکڑے اُسے ساتھ ساتھ لیے پھر رہے ہیں۔

غلام عباس کے کرداروں میں ایک عجیب و غریب تنوعیت یا دُہرا پن پایا جاتا ہے۔ اُن کا ظاہری چہرہ اکثر دکھاوے کے لئے ہوتا ہے۔ اور باطنی چہرہ، دل کی اصلی حالت کا آئینہ دار ہوتا ہے ——— یہ دُہرا پن بعض اوقات جدید و قدیم کے ٹکراؤ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

غلام عباس کے بلند پایہ افسانوں میں "آنندی" ——— "جواری" ——— "کتبہ" ——— "اوور کوٹ" ——— "اس کی بیوی" ——— "بردہ فروش" ——— "فینسی ہیر کٹنگ سیلون" "اوور کوٹ" وغیرہ شامل ہیں ——— اُردو کے معروف شاعر ن۔ م راشد کے بقول اُردو ادب کے اس دور میں جب اکثر ادیب محض جوش و خروش کے سہارے زندہ ہیں۔ خواہ وہ سیاسی عقائد کی حمایت یا مخالفت میں یا جنسی نظریات کے اظہار کی صورت میں نمودار ہو، غلام عباس ہی غالباً وہ واحد افسانہ نگار ہے جس کا فن انسانی زندگی کے رنگا رنگ مسائل کو حاوی کرتا ہے۔ جسے زندگی سے گہری محبت ہے۔ اتنی گہری محبت کہ نہ وہ اس کے پیچھے اندھا دھند بھاگتا ہے، نہ اُسے ننگا کرتا ہے۔ نہ اپنی انا سے اُسے مرعوب کرتا ہے بلکہ زندگی کو اپنا محرم راز جانتا ہے۔ اُس سے سرگوشیاں کرتا ہے اور اس کی سرگوشیاں سنتا ہے ——— "

غلام عباس

کتبہ

تعارف اور پس منظر

غلام عباس اردو کے معروف افسانہ نگار ہیں۔ "آنندی" ان کا سب سے مشہور افسانہ ہے۔ ان کے پہلے افسانوی مجموعے کا نام "آنندی" ہے۔ اس کے بعد ان کے دو اور افسانوی مجموعے "جاڑے کی چاندنی" (۱۹۶۰ء) اور "کن رس" (۱۹۶۹ء) بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ہمارے نصاب میں ان کا افسانہ "کتبہ" شامل ہے۔ جو ان کے پہلے افسانوی مجموعے میں سے لیا گیا ہے۔

مشکل الفاظ و محاورات — معانی اور تشریح

ص ۲۳۰ کتبہ: وہ عبارت جو تختیوں پر یا دروازوں پر لکھی یا کھدوائی جاتی ہے۔ پُر فضا: خوش منظر، بارونق — وضع: شکل — کم و بیش: لگ بھگ — چہل پہل: رونق۔ گہما گہمی: رونق — روپ: صورت، بھوانگ ص ۲۳۱ خس و خاشاک: کوڑا کرکٹ سائے لمبے ہونا: شام پڑنا — پیشہ: گرمی، حرارت — معمولی: وہ کام جو روزمرہ کیا جائے — اثاثہ: سرمایہ، گھر کا سامان ص ۲۳۲ ٹائپ: مخصوص قسم کے آدمی — توند: پیٹ گتھیاں سلجھانا: عقدہ حل کرنا، مسئلہ حل کرنا — یکسوئی: دل جمعی، فرصت — گرہستی کے کام: عیال داری کے کام، گھر کے کام — بدقطع: بدشکل، بدصورت — خراماں خراماں: ٹہلتے ٹہلتے — طمانیت: دل جمعی، اطمینان ص ۲۳۳ مسیں بھیگنا: مونچھوں کا اگنا — جہاں دیدہ: تجربہ کار — گھاگ: پرانا تجربہ کار — بیش تر: زیادہ تر — گدی: گردن کا پچھلا حصہ، خم: جھکاؤ، موڑ — کے: کتنے — کند استرا: وہ استرا جو تیز نہ ہو — مہین: باریک۔ نالاں: شاکی — کہنہ فروش: پرانا اور استعمال شدہ مال بیچنے والا — قماش: قسم۔ مول تول کرنا: قیمت چکانا ص ۲۳۴ صورت مسخ ہونا: شکل بگڑ جانا — ظروف: جمع ظرف کی، برتن — جراحی کے آلات: وہ آلات جن سے زخموں وغیرہ پر چیر پھاڑ کا عمل کیا جاتا ہے۔ نفاست: عمدگی — دام: قیمت، کنگلا: مفلس، نادار۔ ص ۲۳۵ مصرف: استعمال۔ سانجے کا مکان: وہ مکان جس میں کئی لوگوں کا حصہ ہو — نام کندہ کرانا: نام کھدوانا۔ نصب کرنا: لگا دینا بے مصرف: بے کار ص ۲۳۶ سعی لاحاصل: بے نتیجہ کوشش

خوش آئند: پسندیدہ — چابک دستی: ہوشیاری، فن کاری — جلی: روشن — حجاب: شرم، حیا — مسلّط: چھائے ہوئے ص ۲۳۷ سبز باغ دکھانا: دھوکا دینا — ہیجان: دل چسپ ہنگامہ — نگاہِ لطف و کرم: مہربانی کی نگاہ — مگن: محو — مست — ص ۲۳۸ بطیئۂ غیبی خدا کی جانب سے انوکھی بات — کڑی محنت: سخت محنت — جان کھپانا: سخت محنت کرنا اضافہ: زیادتی — پے در پے: مسلسل، ایک بعد دیگرے ص ۲۳۹ مژدہ: خوش خبری ص ۲۴۰ افسردگی: غم — ابتر: بُری — آلکس: کاہلی، سستی — افسروں کے تیور: افسروں کے مزاج، افسروں کا رویہ — راہِ راست پر لانا: سیدھا کرنا — مندا ہونا: کساد بازاری، کاروبار کا چل چلاؤ نہ رہنا ص ۲۴۲ پٹی سے لگی بیٹھی رہیں: تیمارداری کرتی رہیں اغاثہ: آرام، کسر — ترمیم: تبدیلی — محویت: مگن ہونا۔ خیالات میں ڈوب جانا

سبق کا خلاصہ

یہ ایک کلرک کی داستان ہے، جس کا نام شریف حسین ہے۔ اس کی بیوی بچوں سمیت میکے گئی ہوئی تھی۔ ایک تو فارغ تھا دوسرے گھر کے بارے میں بے فکری تھی۔ چنانچہ وہ جامع مسجد کے پاس کباڑیوں کے ہاں چلا گیا۔ سنگِ مرمر کی ایک تختی کی قیمت پوچھ لی۔ آگے چلا تو دکاندار نے اس کی منہ بولی قیمت پر دے دی۔ بادلِ نخواستہ لے گیا مگر مصرف نظر نہ آتا تھا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ میری ترقی ہو گی۔ تو اسے کتبہ کے طور پر مکان کے دروازے پر نصب کروں گا۔ سنگ تراش کے ہاں سے نام کندہ کرایا۔ مگر ترقی نہ ہوئی۔ البتہ کتبہ نے اس کی سوئی ہوئی خواہش پھر جگا دی۔ دفتر کے حالات نے آہستہ آہستہ کئی سالوں میں اس کی خواہش کو پھر ہمیشہ کے لیے سلا دیا۔ کئی بار کے لیے عارضی ترقی ملی تو پھر یہ خواہش بھڑکی۔ مگر اس کے بعد زندگی کی دیگر ذمہ داریوں نے مہلت نہ دی کہ یہ خواہش پھر جاگے، دو بیٹے ملازم ہو گئے تو خوش حالی نصیب ہوئی۔ لڑکوں کی شادیاں کیں۔ ترقی کی حسرت دل میں لے کر ریٹائر ہو گیا، کاروبار کی سوجھی مگر ہمت نہ پڑی، مسجد کی طرف دھیان لگایا۔ بالآخر عمر کے تقاضے سے چلنا پھرنا کم ہو گیا۔ ایک روز سویوں میں رات کو نکلا۔ نمونیا ہوا۔ اس مرض سے چند روز میں اللہ کو پیارا ہوا۔ ایک دن اس کا بڑا لڑکا پرانا سامان دیکھ رہا تھا کہ یہ کتبہ برآمد ہوا۔ اس نے اس کے دل میں باپ کی یاد تازہ کر دی۔ وہ سوچ میں گم ہوا۔ اچانک ہی وہ اٹھا، سنگ تراش کے ہاں سے کتبے میں ضروری ترمیم کر دی اور اگلے دن یہ کتبہ اپنے باپ کی قبر پر نصب کر دیا۔

اہم اقتباس کی تشریح

سوال: متن اور سیاق و سباق کے حوالے سے مندرجہ ذیل عبارت کی تشریح کیجیے:

"شریف حسین کو اپنے آپ پر غصہ آیا کہ میں نے بارہ آنے کیوں نہ کہے۔ اب لوٹنے کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ قیمت ادا کرنے سے پہلے اس نے مورچی ٹکڑے کو الٹ کر دوبارہ دیکھا بھالا کہ اگر ذرا سا بھی نقص نظر آئے تو سودے کو منسوخ کر دے مگر وہ ٹکڑا بے عیب تھا، نہ جانے کباڑی نے اسے اس قدر سستا بیچنا کیوں قبول کیا تھا۔"

جواب: حوالۂ متن یہ عبارت "کتبہ" سے لی گئی ہے۔ جس کے مصنف غلام عباس ہیں۔

سیاق و سباق بیوی میکے چلے جانے کی وجہ سے شریف حسین کو فراغت تھی۔ وہ دفتر سے سیدھا جامع مسجد گیا وہاں کباڑی کے پاس ایک پرانی تختی سنگِ مرمر کی دیکھی۔ یونہی قیمت پوچھ لی۔ دکاندار نے ۳ روپے قیمت بتائی۔ اگرچہ قیمت بہت کم تھی۔ مگر یہ تو خریدار نہ تھا، آگے چل دیا۔ دکاندار نے بلایا، آپ کیا دیں گے۔ اس نے اپنی طرف سے ایک روپیہ قیمت بتائی۔ سیاق دکاندار کو قابل قبول نہ ہو گی، مگر دکاندار اس پر راضی ہو گیا۔ شریف حسین یہ تختی خریدنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر اب بات ٹل بھی نہیں سکتی۔ یہ عبارت اسی موقعے سے لی گئی ہے۔

تشریح شریف حسین کے پاس اس تختی کو خریدنے کی گنجائش نہ تھی وہ ایک کلرک تھا۔ اس کی جیب میں کل پانچ روپے تھے جن پر کئی دن گزارہ کرنا تھا مگر اپنے منہ سے نکلی ہوئی بات پر پکڑا گیا۔ اور تختی لینا پڑ گئی۔ اپنے آپ کو کوستا تھا کہ اور بھی کم قیمت کیوں نہ بتائی کیوں نہ بارہ آنے قیمت لگائی کہ دکاندار سودے پر آمادہ نہ ہوتا۔ اب دکاندار کے بلاوے پر واپس آئے بغیر چارہ نہیں تھا اور یہ بے کار چیز اسے خریدنا پڑ رہی تھی۔ مگر قیمت ادا کرنے سے پہلے اس نے ایک بار پھر اس تختی کو الٹ پلٹ کر دیکھا کہ اس میں کوئی عیب نظر آئے تو اس بہانہ سے سودا منسوخ کر سکوں۔ مگر وہ ٹکڑا تو عیب سے بالکل خالی نکلا۔ تاہم وہ دل ہی دل میں حیران تھا کہ یہ ٹکڑا دکاندار نے اتنا سستا کیوں بیچ دیا ہے۔ شریف حسین کو ایک طرف تو اس کے سستا ہونے پر تعجب تھا۔ دوسری طرف اپنے لئے یہ بے کار کی چیز خریدنے پر بارہ آنے کے نقصان پر دکھ تھا۔

حشر کاشمیری

رستم سہراب

تعارف اور خلاصہ آغا حشر کاشمیری اردو کے معروف ڈراما نویس تھے "رستم و سہراب" ان کا معروف ڈراما ہے۔ اس ڈرامے کی کہانی مشہور ایرانی شاعر فردوسی کے شاہنامہ سے ماخوذ ہے۔

سہراب، رستم کا بیٹا تھا۔ رستم ایران کی فوج میں شامل تھا اور توران کے خلاف لڑ رہا تھا۔ اُسے علم نہ تھا کہ توران کی طرف سے لڑنے والا اُس کا مدِ مقابل سہراب اُس کا اپنا لختِ جگر ہے کیونکہ اُس نے اپنے بیٹے کو کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کی پیدائش سے پہلے ہی گھر سے رخصت ہو کر فوج میں شامل ہو گیا تھا۔ سہراب نے میدانِ جنگ میں رستم کو دیکھا تو اُس کے اندر وہ ساری نشانیاں موجود تھیں جو اس کی والدہ تہمینہ نے اُس کے والد کے متعلق بتائی تھیں اسی لیے وہ بار بار رستم سے کہتا تھا کہ مجھے اپنا نام بتاؤ۔ کوئی غیبی طاقت اس کے کان میں کہہ رہی تھی کہ یہ تیرا باپ ہے۔ شاید یہی سبب تھا کہ وہ اپنے باپ کے مقابلے میں پوری قوت اور طاقت اور جوش و خروش کے ساتھ نہ لڑ سکا اور باپ کے ہاتھوں مارا گیا۔ رستم نے ہلاک وار کرنے کے بعد سہراب کے بازو پر وہ مُہرہ دیکھا جو اُس نے سہراب کی پیدائش سے پہلے اپنی بیوی کو دیا تھا اور ہدایت کی تھی کہ لڑکا پیدا ہُوا تو اِس نشانی اس کے بازو پر باندھ دینا۔ تب اُسے اپنی حماقت کا افسوس ہُوا مگر پانی سر سے گزر چکا تھا۔

ہماری کتاب میں حشر کے مکمل ڈرامے "رستم و سہراب" کے باب کا چھٹا سین شامل کیا گیا ہے۔ جس کا عنوان ہے "میدانِ جنگ"۔

مُشکل الفاظ و محاورات ۔ معانی و تشریح

ص ۲۴۷ قہر و غضب: غصہ اور عذاب۔ سجدہ ہائے نیاز: عاجزی سے کیے جانے والے سجدے۔ میری شرم رکھ: میری عزت رکھ ص ۲۴۸ دلیر: بہادر۔ پیرہن: قمیص، لباس ص ۲۴۹ اجل: موت

لغات میں: خاک میں ص ۲۵۰ پاش پاش: ٹکڑے ٹکڑے۔ سام نریمان: سہراب کے آباؤ اجداد کے نام۔ خاندان کا چراغ بجھا دیا ہے: خاندان کی نشانی مٹا دی ہے۔ تہمہ: کوڑی، منکا، گوٹ۔ خونخوار: ظالم۔ خون پینے والا۔ موذی: تکلیف اور ایذا پہنچانے والا ص ۲۵۱ فغاں: فریاد۔ ہو مان۔ بار ماں: توران کے سرحدی۔ ہجیر: قلعہ سپید کا محافظ ص ۲۵۲ قضا: موت۔ کوکھ: پیٹ، بطن۔ دُہائی: فریاد

سیٹے : ناقص، کم تر ص ۲۵۳ گہوارہ : جھولا، پنگھوڑا۔ زال : رستم کے خاندان کا ایک بزرگ مرد۔
رودابہ : رستم کے خاندان کی ایک بزرگ عورت ۔ گل شاداب : تر و تازہ پھول ۔ مراد ہے بیٹا سہراب۔
ص ۲۵۴ چور چور : ٹکڑے ٹکڑے ۔ ذرہ ذرہ ۔

آغا حشر کے حالات زندگی

آغا حشر کے آباؤ اجداد کشمیر کے رہنے والے تھے ۔ وہاں سے ہجرت کر کے امرتسر آ بسے اُن کے والد آغا سید غنی شاہ کشمیری وہاں شال کا کاروبار کرتے تھے ۔ ۱۸۶۸ء میں امرتسر سے بھی رخصت ہوئے اور بنارس میں رہنے لگے ۔ وہ بڑے متشرع اور عربی و فارسی کے فارغ التحصیل آغا حشر بنارس میں ۳ اپریل ۱۸۷۹ء کو پیدا ہوئے ۔ پیدائشی نام سید محمد شاہ رکھا گیا ۔
قرآن پاک اور عربی و فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے والد اور نانا سے حاصل کی ۔ اس کے بعد بنارس کے جے نرائن حسن اسکول میں داخل ہوئے ۔
حشر کے والد چاہتے تھے کہ اُن کا بیٹا ایک عالم دین بنے ۔ مگر ابتدا سے ہی ان کی طبیعت اس طرف مائل نہ تھی ۔ لڑکپن میں ایک بار دیکھا دیکھی انگریزی وضع کے بال بنوا لیے ۔ والد صاحب کو پتہ چلا تو قینچی سے سر کے سارے بال کاٹ کر پھینک دیئے ۔ آغا غنی شاہ بیٹے کی تربیت کا خاص خیال رکھتے تھے ۔ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا ۔
حشر کی عمر اٹھارہ برس ہوگی ۔ بنارس میں الفریڈ تھیٹریکل کمپنی آئی ۔ اس کے ڈرامے دیکھ کر انہیں بھی ڈراموں کا شوق پیدا ہوا ۔ ۱۸۹۵ء میں انہوں نے منشی احسن لکھنوی کے انداز میں "آفتاب محبت" کے نام سے ایک ڈرامہ لکھا جسے تھیٹریکل کمپنی نے قبول نہ کیا ۔ مگر بنارس کے ایک رئیس نے بطور انعام معاوضہ دے کر شائع کر دیا ۔ اُن کا ڈرامے کا شوق اتنا بڑھا کہ ۱۹۰۰ء میں تعلیم کو ادھورا چھوڑ کر، گھر والوں کی مرضی کے خلاف بمبئی پہنچ گئے ۔ وہاں پہلے وہ الفریڈ تھیٹریکل کمپنی میں ملازم ہو گئے ۔ اس کے بعد انہوں نے مختلف کمپنیوں میں ملازمت کی ۔ ۱۹۰۵ء میں دربار دہلی کے موقع پر الفریڈ کمپنی کے لیے "ٹائیگر سیریز" لکھا اور دہلی گئے ۔ یہ ڈرامہ بے حد کامیاب و مقبول ہوا ۔ انہوں نے بمبئی میں قیام کے زمانے میں "البلاغ" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا ۔
کچھ عرصے بعد اُن پر تبلیغ اور مناظرے کا دورہ پڑا ۔ انہوں نے آریہ سماجی فرقوں کے خلاف مناظروں میں اور بحثوں میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا ۔ وہ بڑے شیریں بیاں مقرر تھے ۔ اس میدان میں انہیں خاصی شہرت ہوئی ۔ اس زمانے کا ذکر کرتے ہوئے آغا حشر لکھتے ہیں ۔ "وہ زمانہ تھا بھی عجیب

ڈرامے بھی لکھتا تھا اور شراب بھی پیتا تھا۔ نہ کبھی نماز پڑھی نہ روزہ رکھا۔ لیکن دینی معاملات سے دل گداز تھا۔ آریہ اور عیسائی اسلام پر اعتراض کرتے تھے۔ میں اور ابوالکلام (آزاد) جواب دیتے تھے۔ اس شوق میں مختلف مذاہب کی کتابیں پڑھیں۔ آریوں اور عیسائیوں کے رد میں رسالے لکھے۔ مناظرے کیے اور جس دنگل میں اُترا فتح پائی۔" ۱۹۱۱ء میں ان کی شادی ہوگئی۔ مگر پانچ سال بعد ہی اہلیہ نے لاہور میں انتقال کیا۔ انھیں سخت صدمہ پہنچا۔

آغا حشر کچھ عرصہ کلکتہ میں بھی قیام پذیر رہے۔ عمر کے آخری دور میں لاہور آ گئے تھے۔ ذیابیطس کے مریض تھے۔ شراب بھی بہت پیتے تھے۔ ۲۸ اپریل ۱۹۳۵ء کو لاہور میں انتقال کیا۔

تصانیف آغا حشر کی کل تصانیف دو درجن سے زائد ہیں۔ بعض مشہور ڈراموں کے نام یہ ہیں۔ اسیر حرص۔ میٹھی چھری۔ شہید ناز۔ رستم و سہراب۔ خواب ہستی۔ یہودی کی لڑکی۔ آنکھ کا نشہ۔ ترکی حور۔ خوبصورت بلا۔ عورت کا پیار۔

اہم اقتباسات کی تشریح

سوال ۱: مندرجہ ذیل پیراگرافات کی تشریح سیاق و سباق کے حوالے سے کیجیے۔

"میرا دل تیری موت دیکھنے سے راضی نہیں ہوتا۔ ایک غیبی آواز بار بار مجھے اس جنگ سے روک رہی ہے۔ اگر ایران کی گود بہادر فرزندوں سے خالی نہیں ہے۔ تو جا اور اپنے عوض کسی اور ایرانی دلیر کو بھیج دے۔ میں تجھے زندگی اور سلامتی کے ساتھ لوٹ جانے کی اجازت دیتا ہوں۔"

جواب بحوالہ متن یہ عبارت آغا حشر کاشمیری کے ڈرامے "رستم و سہراب" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق رستم اور سہراب، باپ اور بیٹا جنگ کے دوسرے روز ایک دوسرے کے خلاف لڑائی کے میدان میں صف آرا ہیں۔ رستم ایرانیوں کی طرف سے لڑ رہا ہے اور سہراب تورانیوں کی طرف سے۔ دونوں ایک دوسرے کی حقیقت سے ناواقف ہیں۔ سہراب کو شک گذرتا ہے کہ یہ شاید میرا والد ہے مگر اس کی تصدیق کا کوئی ذریعہ نہیں۔

تشریح تشریح طلب عبارت، سہراب کے الفاظ ہیں۔ یہ الفاظ رستم کو مخاطب کر کے کہے گئے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اے شیر دل بوڑھے! اگرچہ میدانِ جنگ میں تمہارے خلاف ہتھیار اُٹھانے اور تم پر حملہ کرنے کو، خدا جانے کیوں، میرا دل نہیں چاہتا۔ کوئی اندرونی قوت یا چھٹی حس مجھے مجبور کر رہی ہے کہ میں تمہارے مقابلے سے دستبردار ہو جاؤں۔ اگر مجھے

لڑنا ہی ہے تو بہتر ہے کوئی اور ایرانی بہادر شخص میرے سامنے آئے ـــــ میں بخوشی خاموش ہوں کہ تم بسلامت میدان سے نکل جاؤ ـــ میرے ہاتھ تمہارے خون سے رنگین ہونے سے محفوظ رہیں۔

سوال ۱۔ درج ذیل عبارت کی تشریح کیجیے۔ سیاق و سباق کا حوالہ ضروری ہے۔

"تو نے اُلفت سے، نرمی سے، منت سے کتنی مرتبہ میرا نام پوچھا۔ اس محبت و عاجزی کے ساتھ پوچھنے پر لوہے کے ٹکڑے میں بھی زبان پیدا ہو جاتی ہے۔ پتھر بھی جواب دینے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔ لیکن اس دو روزہ دُنیا کی جھوٹی شہرت اور اس فانی دُنیا کے فانی غرور نے میرے ہونٹوں کو ہلنے کی اجازت نہ دی۔"

جواب و حوالۂ متن | یہ عبارت ڈرامہ "رستم و سہراب" کے باب ۱۲ سے لی گئی ہے۔ اس حصے کا عنوان ہے "میدانِ جنگ" ـــ اس ڈرامے کے لکھنے والے آغا حشر کاشمیری ہیں۔

سیاق و سباق | لڑائی کے دوسرے روز میدانِ جنگ میں رستم اپنے بیٹے سہراب کے خلاف برسرِ پیکار تھا۔ وہ ایرانیوں کی طرف سے تورانیوں کے خلاف لڑ رہا تھا۔ باپ اور بیٹا ایک دوسرے کی اصلیت سے آگاہ نہ تھے۔ سہراب کو شک پڑتا تھا کہ میرا مدِ مقابل شاید میرا باپ رستم ہے۔ وہ بار بار اس سے نام پوچھتا تھا مگر رستم اپنی شخصیت کی عظمت اور اسرار قائم رکھنے کے لیے نام بتانے سے گریزاں رہا۔ رستم غالب آیا، اس نے سہراب کے سینے میں خنجر گھونپ دیا لیکن جب سہراب کے بازو پر اپنا دیا ہوا مہرہ دیکھا تو سمجھ گیا کہ اپنے بیٹے کا قاتل ہوں ـــــ اُسے بڑا دُکھ ہوا ـــــ یہ سطور اس موقع پر آتی ہیں۔

تشریح | ان سطور میں رُستم اپنی غلطی بلکہ حماقت کا اعتراف کرنے کے ساتھ خود کو ملامت بھی کرتا ہے ـــ اس کا خطاب اپنے پیارے بیٹے (جسے اب وہ پہچان چکا ہے) سہراب کی طرف ہے۔ کہتا ہے تو نے ہر طریقے سے میرا نام معلوم کرنے کی مقدور بھر کوشش کی اور اس سلسلے میں تیری التجاؤں میں ایسی محبت، نرمی، عاجزی اور خوشامد تھی کہ اگر پتھروں سے التجا کی جاتی تو وہ بھی جواب دیتے۔ لوہے کے کسی ٹکڑے کے سامنے ایسی درخواست پیش کی جاتی تو ممکن تھا کہ بے اثر جاتی ـــــ مگر مجھے اپنی سخت دلی پر افسوس ہے، میں نے محض اپنی نام نہاد شہرت کو برقرار، اپنی مادرائیت کو قائم اور اپنی جھوٹی شخصیت کے بھرم کو قائم رکھنے کی خاطر اپنا نام تم سے چھپائے رکھا جس کے نتیجے میں اتنا بڑا حادثہ رونما ہو گیا۔

آغا حشر کی ڈرامہ نگاری

سوال: آغا حشر کی ڈرامہ نگاری پر ایک تنقیدی نوٹ لکھیے۔ یا
آغا حشر کی ڈرامہ نگاری کی خصوصیت بیان کیجیے۔

جواب: آغا حشر کاشمیری کو عام طور پر "ہندوستان کا شیکسپیئر" کہا جاتا ہے۔ ممکن ہے اس رائے میں مبالغہ ہو تاہم حشر کے عظیم فن کار اور ایک عظیم ڈراما نویس ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ ڈرامے کی دنیا میں جو شہرت اور ناموری آغا حشر کے حصے میں آئی وہ امانت لکھنوی کے بعد آج تک کسی کے حصے میں نہیں آئی۔ اُن کے دور کے عوام ہی ان کے ڈراموں پر فریفتہ نہ تھے۔ خواص بھی دیسی ہی دلچسپی سے دیکھتے اور پسند کرتے تھے۔ ڈرامے کی کمپنیاں اُن کے ڈرامے منہ مانگے داموں پر خریدتی تھیں۔ اور جو کمپنی حشر کا ڈراما اسٹیج کرتی، اُس کے دن پھر جاتے۔

حشر کی مقبولیت اور شہرت میں اس کے فن کو بڑا دخل ہے۔ وہ ایک ذہین، طبّاع اور اور جدت پسند فن کار تھے۔ انہوں نے اپنے فن کی بدولت ڈرامہ نگاری کی تاریخ میں ایک منفرد مقام حاصل کیا ـــــ ان کی ڈراما نگاری کی اہم خصوصیات اور نمایاں پہلو حسب ذیل ہیں۔

(۱) تدریجی ارتقاء آغا حشر نے ڈرامے کے میدان میں قدم رکھا تو ڈرامے کے اسٹیج پر ایسے ڈرامے پیش کیے جا رہے تھے جس تکلف اور تصنع کا غلبہ تھا۔ ڈرامے کا مکالمہ گانے میں ہوتا تھا۔ چنانچہ عوام کے مذاق کے پیش نظر حشر نے بھی ڈرامہ نگاری کے قدیم انداز کو اپنایا مگر اس میں بعض اصلاحی رجحانات داخل کیے۔ آہستہ آہستہ وہ اپنے ڈراموں میں عوام کی ذہنی اصلاح کے عناصر بڑھاتے گئے۔ دوسرے دور میں اُن کے ڈراموں میں تکلف و تصنع کم ہو گیا اور تیسرے دور میں اور بھی تبدیلی آگئی۔ اس طرح وہ عوامی ذوق بھی تبدیل کرنے میں خاصے کامیاب ہوئے یہ اُن کی فنکاری کا بڑا ثبوت ہے اور اس سے ان کی ڈراما نگاری میں تدریجی ارتقاء کا پتہ چلتا ہے۔ اُن کے ابتدائی ڈراموں مثلاً اسیر حرص یا خوبصورت بلا میں قافیہ پیمائی، لفظی شعبدہ بازی اور گانوں کا غلبہ ہے۔ دوسرے دور کے ڈراموں مثلاً آنکھ کا نشہ وغیرہ میں تصنع اور مقفّٰی عبارت کم ہے ـــــ تیسرے دور کے ڈراموں میں یہ چیزیں اور بھی کم نظر آتی ہیں ـــــ غرض "عمر کے ساتھ جوں جوں ان کا تجربہ اور اپنے اوپر اعتماد بڑھا ان کے ڈراموں کی زبان میں نمایاں فرق پڑتا چلا گیا۔"

۲۔ ڈرامہ نگاری میں جدت اگرچہ حشر نے ابتدائی دور میں ڈرامہ نگاری کے قدیم طرز کو اپنایا مگر بعد میں اُن کے فن میں مسلسل تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ ان کے

آخری دور کے ڈرامے ڈرامہ نگاری کی تاریخ میں ایک نئے باب کا نقطہ آغاز ہیں۔ انہوں نے ڈرامے کے مروجہ انداز میں بڑی جدتیں اور انقلابی تبدیلیاں پیدا کیں۔ مثلاً ڈرامے سے گانے کی کثرت کو ختم کر دیا۔ "عشق و فرض" میں ایک بھی گانا نہیں۔ دوسرے انہوں نے ڈرامے میں کامک کا حصہ علیحدہ کر دیا۔

(۳) اصلاحی مقاصد حشر نے آخری دور کے ڈراموں میں سماجی برائیوں اور کمزوریوں کی اصلاح کی کوشش کی مثلاً "دل کی پیاس" میں آزادیٔ نسواں اور تعلیم کے غلط مفہوم کے نقصانات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ انہوں نے اپنے ڈراموں میں ایسی عورت کو خراج عقیدت پیش کیا ہے جو نیک خصلت، پاکیزہ اور وفا شعار ہے۔ مولانا ظفر علی خاں کے الفاظ میں "حشر نے جتنے ڈرامے لکھے، سب اخلاقی تھے"۔

(۴) ادبی خوبیاں حشر اپنے دور کے بہترین انشا پرداز تھے۔ انہیں زبان و بیان پر بڑا عبور حاصل تھا۔ ان کے ڈراموں میں بہت سی ادبی خوبیاں پوشیدہ ہیں۔ ان کی نثر میں سلاست اور روانی ہے۔ اکثر مکالمے بڑے فصیح و بلیغ اور برمحل ہیں۔ تشبیہات و استعارات میں بھی انہوں نے جدت سے کام لیا ہے۔ ان کے اکثر ڈرامے ان کی قدرت بیان کا شاہکار ہیں۔ انہیں اپنے تمام ڈراموں میں "ترکی حور" بے حد عزیز تھا۔ جس کے بارے میں ان کی اپنی رائے یہ تھی "ترکی حور کی زبان کو ژ و تسنیم کی دھلی ہوئی زبان ہے"۔ عبدالمجید سالک کے بقول "وہ فارسی آمیز اور پرشوکت نثر اور ہندی آمیز اور دلآویز نثر یکساں مہارت اور وثوق سے لکھتے ہیں"۔

(۵) سیرت نگاری آغا حشر نے اپنے ڈراموں میں سیرت اور کردار کے انتہائی بلند پایہ مرقعے پیش کئے ہیں۔ انہوں نے رستم، سہراب اور تہمینہ کی سیرت کی ایسی خوبصورت تصویریں کھینچی ہیں کہ ان کے اصلی کردار کا حقیقی نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ سہراب کے کردار میں اس کی ذہنی کشمکش، قوتِ فیصلہ، ضبط، عزم و ثبات اور کیفیاتِ عشق فطری انداز میں جلوہ گر ہوئی ہیں۔ گرد آفرید محبت و وفا، عصمت و عفت، ایثار و حب الوطنی کا پیکر ہے۔ غرض ان کے سارے کردار حشر کی فنکاری کا بے مثل نمونہ ہیں۔ اسی لئے ان کے متعدد کردار ضرب المثل کے طور پر مشہور ہیں۔

(۶) مکالمے میں انفرادیت حشر سے پہلے ڈراموں کے مکالمے ابتذال اور پھر قسم کے فقروں پر مشتمل ہوتے تھے یا بازاری گانوں پر۔ حشر نے مکالمے میں ایسی انقلابی تبدیلیاں پیدا کیں۔ کہ اُسے اعلیٰ درجے کے ادبی مکالمے کے قریب پہنچا

دیا۔ ان کی فطری خطابت اور طبعی شگفتگی نے مکالمہ نگاری میں اپنے جوہر دکھائے ہیں ـــ ان کے مکالموں میں روانی، شوخی، لطافت، برجستگی کے ساتھ ادبیت کی شان بھی برقرار ہے اور اور یہ اُن کے فن کا کمال ہے۔

(۷) عورت کے مختلف رُوپ — حشر کے ڈراموں میں "عورت" سب سے اہم کردار ہے۔ اُنہوں نے اسے مختلف رنگ و رُوپ میں پیش کیا ہے۔ اُن کے خیال میں عورت کا اصلی جوہر وفا شعاری، شرم و حیا اور حُسن و سلیقہ ہے۔ انہوں نے عورت کی مکروہ اور گھناؤنی زندگی کا رُوپ بھی دکھایا ہے۔ دراصل عورت کے مختلف رُوپ پیش کر کے وہ اس کی مظلومیت کو اُجاگر کرنا چاہتے تھے۔ ڈرامے میں عورت کی پیش کش سے اُن کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ طبقہ نسواں کی اصلاح ہو۔

(۸) ایک قادرالکلام شاعر — آغا حشر ایک قادرالکلام شاعر تھے۔ ڈرامے کی قدیم روایت کی ایک ضرورت یہ تھی کہ ضرورت بلاضرورت مختلف کردار سے شعر اور گانے گوائے جائیں ـــ حشر نے اوّل تو گانوں کو کم کیا ـــ تاہم ڈراموں میں ان کے اشعار بہت بلند پایہ ہیں۔ انہیں غزل اور نظم دونوں پر زبردست قدرت حاصل تھی۔ اُن کے ہندی گانوں کا تو جواب نہیں۔ وہ فی البدیہہ شعر کہتے تھے۔ اُنہوں نے لاہور کے جلسوں میں شکریۂ یورپ" اور "موجِ زمزم" نظمیں پڑھ کر بدست خراج تحسین وصول کیا۔

(۹) بعض خامیاں — آغا حشر کے بعض ڈراموں میں بہت سی خامیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ مثلاً مکالموں کی طوالت، بات بات پر اشعار اور وہ بھی گھٹیا قسم کے۔ بازاری قسم کا مزاح، تمسخر اور پست مذاق ـــ لیکن یہ نقائص حشر کے ہاں اپنے ہمعصروں کی نسبت بہت کم ہیں۔ اور ان کا سبب بھی زمانے کا تقاضا اور عوام کا پست مذاق ہے۔ اُن کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اس فروق کو بدلا اور اپنی انفرادیت منوالی۔

غرض آغا حشر، ڈرامے کی دُنیا میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے ڈرامے سے اپنی طبعی مناسبت کے سبب اس میدان میں ایسے ایسے لاجواب نمونے پیش کیے جو اُن کی عظمت کا ثبوت ہیں اور انہیں زندہ جاوید رکھنے کے لیے کافی ہیں۔ پروفیسر سید وقار عظیم کے الفاظ میں "حشر کے ڈراموں کی ساری داستان فنی ارتقا کی بڑی دلکش اور دل نشین داستان ہے اور ڈرامے میں بلکہ بیسویں صدی کے ہندوستانی ڈرامے میں فن اور اسٹیج کی جتنی روایتیں اس وقت عام ہیں اُن پر رنگِ حشر کی مہر ثبت ہے۔"

امتیاز علی تاج کے حالات زندگی

امتیاز علی تاج کے والد شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی اپنے دور کی ممتاز شخصیت تھے۔ انہوں نے ۱۸۹۸ء میں عورتوں کا مشہور رسالہ "تہذیب نسواں" جاری کیا اور ۱۹۰۹ء میں تاج کی ۹ ویں سالگرہ کے روز بچوں کے رسالے "پھول" کا اجرا عمل میں آیا۔

تاج ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۰ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کینرڈ سکول اور سنٹرل ماڈل سکول لاہور میں پائی۔ ۱۹۱۵ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ طالب علمی کے زمانے میں ہی انہوں نے "کہکشاں" نام کا ایک ادبی جریدہ جاری کیا۔ کالج کے زمانے میں انہوں نے کالج کے متعدد ڈراموں میں حصہ لیا۔ ۱۹۲۲ء میں بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔

امتیاز علی تاج نے اپنا معروف ڈرامہ "انارکلی" ۱۹۲۲ء میں تحریر کیا مگر اس کی اشاعت کی نوبت دس سال بعد ۱۹۳۲ء میں آسکی) ۱۹۳۲ء میں مدراس کے سید محمد اسمٰعیل صاحب کی صاحبزادی حجاب اسماعیل سے ان کی شادی ہو گئی۔ انہوں نے اپنی تحریروں کی بدولت "حجاب امتیاز علی" کے نام سے ادبی حلقوں میں شہرت حاصل کی۔ اگلے سال تاج کے والد مولوی ممتاز علی کا انتقال ہو گیا۔ والدہ محمدی بیگم ۱۹۰۸ء میں ہی فوت ہو چکی تھیں۔

والد کی وفات پر انہوں نے "پھول" کی ادارت سنبھالی اور دارالاشاعت پنجاب کو نئی بنیادوں پر استوار کیا۔ اس اشاعتی ادارے میں وہ اپنے والد مرحوم کی زندگی میں ہی ان کے کام کر رہے تھے۔ ۱۹۴۹ء میں "پھول" اور "تہذیب نسواں" بند ہو گئے اور دارالاشاعت پنجاب کی اشاعتی گرمیاں بھی ماند پڑ گئیں۔

۱۹۵۸ء میں وہ مجلس ترقی ادب لاہور کے ڈائریکٹر (ناظم) مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۱ء میں "ستارۂ امتیاز" عطا ہوا۔ ۱۹۶۵ء میں ڈرامے پر ریسرچ کے صلے میں دس ہزار روپے اور صدارتی اعزاز ملا۔ عمر کے آخری دس بارہ سال میں انہوں نے اردو کلاسیکی ڈراموں کو حواشی اور تنقیدی تبصروں کے ساتھ مرتب کیا۔ ۱۸ اپریل ۱۹۷۰ء میں رات کے دو بجے کسی نامعلوم شخص نے ان پر قاتلانہ حملہ کیا۔ ۲۰ اپریل ۱۹۷۰ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔

سید امتیاز علی تاج

آرام اور سکون

تعارف اور پس منظر

امتیاز علی تاج اردو ڈرامہ نگاری میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی دور میں "انارکلی" جیسا

شاہکار ڈرامہ تخلیق کیا۔ اس کے بعد انہوں نے بے شمار ڈرامے لکھے اور بہت سے مغربی ڈراموں کے تراجم کئے۔ انہوں نے اردو کے کلاسیکی ڈراموں کی تدوین و تحقیق بھی کی جو ان کا آخری ادبی کارنامہ ہے۔

ہمارے نصاب میں ان کا ڈرامہ "آرام و سکون" شامل ہے۔ یہ ایک ریڈیو ڈرامہ ہے۔ تاج نے سٹیج ڈراموں کے ساتھ ساتھ بہت سے ریڈیو ڈرامے بھی لکھے۔ اس ڈرامے میں بیگمات کی گھر میں ہنگامہ آرائی کو عمدہ مزاحیہ انداز میں پیش کیا گیا ہے جس سے گھر کا امن و سکون غائب ہو جاتا ہے

مشکل الفاظ و محاورات۔ معانی اور تشریح

ص ۲۵۵

تردد: فکر، اندیشہ، پریشانی۔ نصیب دشمناں: بدشگون کا حکم ہے۔ یعنی دشمنوں کو نصیب ہو۔
بے طرح: بے حد۔ مطلق: بالکل۔ اعصاب: عصب کی جمع، پٹھے۔ تقویت: طاقت۔
پرندہ پر نہ مارے گا: کوئی نزدیک نہ پھٹکے گا۔ بدن ٹوٹنا: اعضا شکنی ہونا، جسم میں درد ہونا۔
کان پر جوں نہ رینگنا: ذرا بھر اثر نہ ہونا۔ سر کھجانے کی فرصت نہیں: بہت مصروف ہونا۔
اُلجھن: کش مکش، پریشانی۔ یک نہ شد دو شد: ایک مصیبت کے بعد دوسری مصیبت۔

سبق کا خلاصہ

میاں بیمار ہیں۔ بیگم ڈاکٹر کو بلواتی ہیں۔ ڈاکٹر کی رائے میں زیادہ کام کی وجہ سے وہ تھک گئے ہیں۔ آرام کی ضرورت ہے۔ دوا کی ضرورت نہیں۔ بیگم ڈاکٹر سے درخواست کرتی ہے کہ انہیں سمجھائیں۔ یہ ہر وقت کام میں مصروف رہتے ہیں، میرے کہنے سے نہیں مانتے۔ ڈاکٹر کے چلے جانے کے بعد بیگم کی ہنگامہ آرائی جاری رہتی ہے۔ میاں کراہ رہے ہیں کہ مجھے آرام و سکون کی ضرورت ہے۔ بیگم کبھی کھانے کا پوچھتی ہیں۔ کبھی نوکر کو بلند آواز سے کوسنے دیتی ہیں۔ میاں کھل کر بیگم کی ہنگامہ آرائی پر احتجاج نہیں کر سکتے۔ کراہتے ہیں۔ وہ پھر ان کے سکون میں مخل ہوتی ہے کہ تکلیف بڑھ گئی کیا؟ پڑوس میں گانے کی آواز آتی ہے۔ میاں کہتے ہیں کہ انہیں منت سماجت کر کے چپ کراؤ۔ بچہ اپنے بے ڈھب کھلونے کی آواز پیدا کرتا ہے۔ بیگم پھر چیخنے لگ جاتی ہے کہ انہیں آرام کی ضرورت ہے۔ بچے کو مار پڑتی ہے وہ رونے لگتا ہے۔ میاں اور کراہتے ہیں۔ دروازے پر سقہ دستک دیتا ہے۔ میاں پریشان ہوتے ہیں۔ تنہائی کی درخواست کرتے ہیں۔ بیگم کو کسی سہیلی کا فون آتا ہے۔ میاں کہتے ہیں کہ پھر فون کر لینا۔ وہ اصرار کرتی ہیں کہ بیگم کو بلا دو۔ آخر میں ایک فقیر سوال کرتا ہے۔ میاں بہت پریشان ہوتے ہیں۔ شیروانی اور ٹوپی مانگتے ہیں کہ میں دفتر جا رہا ہوں۔ بیگم کے پوچھنے پر کہتے ہیں کہ آرام و سکون کے لیے۔

اہم اقتباس کی تشریح

سوال: متن اور سیاق و سباق کے حوالے سے مندرجہ ذیل عبارت کی تشریح کیجئے۔

"ننھا ہے آپ کا۔ عید کے روز میلے میں سے یہ کھلونا گاڑی لے آیا تھا۔ نہ اس کمبخت کا دل اس سے بھرتا ہے۔ نہ وہ کم بخت ٹوٹتی ہے۔ اسے میں نے کہا ننھے! انہیں مانے گا نامراد؟ چھوڑ اپنی اس پٹ پٹ کو۔ جب دیکھو لیے لیے پھر رہا ہے۔ صاحبزادے کا دل کسی طرح پُر ہونے میں نہیں آتا۔ چولھے میں جھونک دوں گی اس کم بخت کو۔ اتنا خیال بھی نہیں آتا کہ ابا بیمار پڑے ہیں۔ شور و غل سے ان کی طبیعت گھبراتی ہے۔"

جواب: حوالہ متن یہ عبارت "آرام و سکون" سے لی گئی ہے۔ جس کے مصنف ہیں سید امتیاز علی تاج۔

سیاق و سباق میاں بیمار ہیں۔ آرام و سکون کی ضرورت ہے۔ مگر بیوی مسلسل شور و غل کیے جا رہی ہے۔ کوئی شور کرے تو اتنا شور و غل مچاتی ہے کہ پہلا غل اس کے مقابلے میں ہیچ ہوتا ہے۔ میاں کراہ رہے ہیں کہ اچانک ننھے نے اپنی کھلونا گاڑی کو چلانا شروع کر دیا۔ میاں پوچھتے ہیں کہ یہ کیا کھٹ پٹ شروع ہو گئی۔ بیوی غلطا ہر بچے کو کوستی ہے مگر بچے سے بھی زیادہ شور خود مچایا کرتی ہے۔ یہ عبارت اسی موقع سے تعلق رکھتی ہے۔

تشریح بچے کی کھلونا گاڑی کی آواز پر میاں پوچھتے ہیں کہ یہ شور کیسا ہے۔ تو بیوی جواب دیتی ہے کہ یہ آپ کا ننھا کھلونا گاڑی چلا رہا ہے جو وہ عید کے موقع پر میلے سے خرید لایا تھا۔ کم بخت اس گاڑی کو ہر وقت چلاتا رہتا ہے اس کا دل اس سے بھرتا ہی نہیں ہے۔ بیوی گاڑی کو اور بچے کو کوسنے دیئے جا رہی ہے۔ میاں نے تو گاڑی کے شور پر احتجاج کیا تھا۔ بیوی کی وضاحت کے شور نے اس شور کو مات کر دیا۔ اب میاں کو سکون کہاں سے ملے! بیوی مسلسل چیخے چلی جا رہی ہیں کہ کم بخت بچے کو یہ خیال بھی نہیں آتا کہ ابا شور و غل سے گھبراتے ہیں۔ وہ اس کم بخت گاڑی کو چلائے جا رہا ہے۔ پھر وہ ننھے کو اپنی ہنگامہ خیز زبان میں منع کرتی ہیں کہ نامراد ننھے! اس گاڑی سے کھیلنا بند کر دے۔ جب دیکھو اس سے کھیلتا نظر آتا ہے تیرا جی ہی اس سے نہیں بھرتا ہے۔

میاں نے ایک شور پر گھبراہٹ کا اظہار کیا تھا۔ یہاں بیگم نے اس شور کو ختم کرنے کے لیے ایسا شور مچایا کہ میاں مزید کراہنے لگ گئے۔

مرزا ادیب کے حالاتِ زندگی

پیدائشی نام دلاور علی قلمی نام مرزا ادیب

مرزا ادیب ۴ اپریل ۱۹۱۴ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بھاٹی گیٹ کے ایک پرائمری اسکول میں ہوئی۔ اس کے بعد اسلامیہ ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔ یہاں انہیں شاعری کا شوق چرایا۔ اور شعر کہنے لگے۔ کچھ بعد دیگرے حامی، شجر اور برق تخلص اختیار کیا۔ میٹرک کے بعد اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ کالج کی علمی و ادبی فضا میں ان کی صلاحیتیں اور چمک اٹھیں۔ وہ کالج کے رسالے "کریسنٹ" کے مدیر مقرر ہوئے۔ اس دور میں مرزا ادیب شعر کے بجائے نثر کی طرف مائل ہوئے۔ انہوں نے کثرت سے ڈرامے اور افسانے لکھے۔

۱۹۳۵ء میں بی اے آنرز کا امتحان پاس کیا۔ مزید تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ کچھ عرصے بعد ماہنامہ "ادبِ لطیف" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۰ء میں بمبئی چلے گئے اور فلمی کام کرنے کے علاوہ ہفت روزہ "مصور" کی ادارت بھی کرتے رہے۔

۱۹۴۱ء میں واپس لاہور آ گئے اور ریڈیو سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۴۹ء میں ایک بار پھر "ادبِ لطیف" کی ادارت سنبھالی، جس کا سلسلہ ۱۹۶۲ء میں منقطع ہوا۔ کچھ عرصہ نمک پاکستان رائٹرز گلڈ کے جنرل سیکرٹری بھی رہے۔

ان کی زندگی میں دو چیزیں بے حد اہم ہیں۔ ایک ریڈیو اور دوسرے ادبِ لطیف"۔ "ادبِ لطیف" کی ادارت انہوں نے سترہ سال کی ریڈیو کی ملازمت کا عرصہ بھی خاصا طویل ہے۔ مستقل قیام لاہور میں ہے۔ مرزا ادیب کو ان کو کتاب "پس پردہ" پر آدم جی انعام بھی مل چکا ہے۔

تصانیف داستانیں: (۱) صحرا نورد کے رومان (۲) صحرا نورد کے خطوط۔
افسانوں کے مجموعے: جنگل (۲) کبل (۳) لادا (۴) دیواریں۔
ڈراموں کے مجموعے: (۱) لہو اور قالین (۲) آنسو اور ستارے (۳) ستون (۴) فصیلِ شب۔ (۵) شیشے کی دیوار (۶) پس پردہ۔
ڈائری: خوابوں کے مسافر۔
تنقید: فن اور فنکار۔ مرزا ادیب نے بچوں کے لیے بھی متعدد کہانیاں لکھی ہیں۔

مرزا ادیب کی ڈرامہ نگاری

مرزا ادیب نے شاعری، داستان اور افسانہ نگاری کی منزلوں سے گزر کر ڈرامہ نگاری کو اپنی ادبی زندگی اور فن کا مقصود قرار دیا۔ اگرچہ ایک افسانہ نویس کی حیثیت سے بھی انہوں نے بلند پایہ اور معیاری افسانے لکھے ہیں۔ تاہم ڈرامہ نگاری میں ان کا قدم رکھتا اردو ادب خصوصاً اردو ڈرامے کے لئے ایک نیک فال کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اردو ادب میں ڈرامہ ہی وہ واحد صنف ہے جس پر سب سے کم توجہ دی گئی ہے اور اسے دوسری اصناف نظم و نثر کے مقابلے میں لائق اعتنا نہیں سمجھا گیا اس پس منظر میں جب کوئی باصلاحیت فن کار ڈرامے کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اسے ادب کی خوش قسمتی ہی کہنا چاہیئے۔ اس اعتبار سے مرزا ادیب کی خدمات ناقابل فراموش ہیں

ان کے ڈراموں کے متعدد مجموعے مثلاً "آنسو اور ستارے" "لہو اور قالین" "ستون" "پس پردہ اور فصیل شب چھپ چکے ہیں۔ شیشے کی دیوار" نامی ایک بابی تمثیل بھی کتابی صورت میں شائع ہو گئی ہے اس کے علاوہ انہوں نے ریڈیو کے لئے بے شمار ڈرامے لکھے ہیں، مجموعی طور پر ان کے ڈرامے اردو ڈرامے کی تاریخ میں ایک قابل قدر اضافہ ہیں۔

مرزا ادیب کے ڈراموں میں بڑی سادگی اور فطری پن پایا جاتا ہے۔ ان کے سارے کردار ہماری روزمرہ کی زندگی اور اس کی مختلف النوع سرگرمیوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ ہمارے شب و روز کے حالات و واقعات کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان میں وہی فطری سادگی بے ساختگی اور بے تکلفی موجود ہے جو عام انسانوں زندگی کا جزو ہے۔

اردو ڈرامے میں مزاح کا معیار عام طور پر پست اور مبتذل رہا ہے۔ مرزا کے ڈراموں میں مزاح بڑا لطیف اور شگفتہ ہے۔ اس میں ابتذال کا شائبہ تک نہیں ہے۔ مرزا ادیب کے ڈراموں کے مجموعے "آنسو اور ستارے" کے بعض ڈراموں میں مزاح نگاری کی فرسودہ روش سے ہٹ کر کسی کردار یا واقعہ کے مختلف پہلوؤں سے مزاح پیش کیا گیا ہے اور اس میں ایک خاص سطح برقرار رہتی ہے۔

مرزا کے ڈراموں میں رومانویت بھی موجود ہے۔ مگر یہ ماورائی رومانویت نہیں بلکہ اس کا معیار و انداز وہی ہے جو معاشرے کے اکثر نوجوان کرداروں کا انداز ہوتا ہے۔ اس میں تصنع نام کو نہیں۔

مرزا ادیب کے اسلوب میں توازن، اعتدال اور ٹھہراؤ ہے۔ اس میں سطحی پن نہیں بلکہ ایک سنجیدہ ہوئی کیفیت پائی جاتی ہے۔ مرزا کا احساس بڑا شدید ہے۔ وہ ایک حساس فنکار کی طرح معاشرے کی برائیوں، بے اعتدالیوں اور ناہمواریوں کے خلاف بھرپور احتجاج کرتا ہے۔

مگر اس میں تلخی نہیں ہوتی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسے اپنے احساسات و جذبات پر کتنا قابو ہے۔ اس نظم و ضبط اور شائستگی نے مرزا کے فن کو نکھار بخشا ہے۔

ان کے ڈراموں کے مکالمے فطری، بے ساختہ اور جاندار ہوتے ہیں۔ یہ مکالمے مختصر ہونے کے باوجود تاثر کے اعتبار سے بھرپور ہوتے ہیں۔ جہاں تک ان کے کرداروں کا تعلق ہے وہ ٹائپ کردار اور یک رنگ محسوس ہونے کے باوجود انفرادیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ اکثر کردار شخصیت کے گوناگوں پہلوؤں کے مالک ہیں۔

مرزا ادیب فن کار کی آزادی کا قائل ہے۔ اس کے نزدیک اگر فن کار پر پابندی لگا دی جائے۔ اس کے افکار پر پہرے بٹھا دیئے جائیں تو یہ قدغن اس کے لیے موت کا پیغام ثابت ہوتی ہے "شیشے کی دیوار" میں مرزا نے اسی نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے۔

مرزا اپنے ڈراموں میں فن برائے فن کا قائل ہے۔ وہ کسی سیاسی نظریے کا مبلغ نہیں، ایک سیدھا سادا اور کھرا ڈرامہ نویس ہے۔ وہ انسان دوستی، امن اور عدل و انصاف پر یقین رکھتا ہے مگر ان اخلاقی قدروں کو ایک سیاسی نعرہ نہیں بناتا بلکہ اس کے نزدیک یہ ایسی مثبت قدریں ہیں۔ جن کی بقا انسانی بھلائی کے لیے اشد ضروری ہے۔

مرزا ادیب نے اپنی طویل ادبی زندگی میں بڑے بلند پایہ ڈرامے تخلیق کئے ہیں۔ اس نے اردو ڈرامے کے ذخیرے میں بیش قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ ڈرامہ نگاری کی تاریخ میں مرزا کی خدمات کے اعتراف سے انکار ممکن نہیں۔

میرزا ادیب

فن کار

تعارف اور پس منظر

میرزا ادیب اردو کے معروف افسانہ نویس اور ڈرامہ نگار ہیں۔ پہلے انہوں نے طویل عرصے تک افسانہ نگاری کی۔ اس کے بعد اسے یکسر ترک کر کے ڈرامے پر اپنی توجہ صرف کی۔ ان کے ڈراموں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ہمارے نصاب میں ان کا ڈرامہ "فن کار" شامل ہے جس میں ایک فن کار کی تنگدستی اور خوش فہمی کو نہایت عمدگی سے نمایاں کیا گیا ہے۔ یہ ایک یک بابی ڈرامہ ہے۔ مرزا عموماً ایک ہی ایکٹ کے ڈرامے لکھتے ہیں۔ وہ اپنے موضوع کو اس ایک ہی باب میں نہایت چابکدستی سے سمیٹ لیتے ہیں۔

مشکل الفاظ و محاورات ــ معانی اور تشریح

ص ۲۶۸ ورق گردانی، ورق الٹنا۔ ٹائیٹل، سرورق۔ اوقات کیا ہے، حیثیت کیا ہے۔

ص ۲۶۹ لٹیا ڈبونا، بات بگاڑنا۔ ہمت ہارنا۔ نقصان۔ پبلشر، کتاب چھاپنے والا۔ ماہوار:

بادشاہ اپنے لیے یہ ترکیب استعمال کرتے تھے۔ بگیں [ص ۲۷۰] رانی کا پہاڑ بنانا: بہت بڑھانا چڑھانا، بہت مبالغہ کرنا [ص ۲۷۱] ذریعہ معاش: روزی کا ذریعہ [ص ۲۷۲] کباڑخانہ: وہ جگہ جہاں ٹوٹا پھوٹا سامان رکھا جائے [ص ۲۷۳] تحمل، حوصلہ، برداشت، صبر۔ نڈھال: تھکا ہوا، کمزور [ص ۲۷۵] الدین کا چراغ: غیر معمولی ذریعہ، مافوق الفطرت طاقت۔ معمّا: پہیلی، پیچیدہ بات [ص ۲۷۶] آم کھانے سے مطلب یا پیڑ گننے سے، اپنے مطلب سے غرض رکھنی چاہیے۔ بے فائدہ باتوں سے کیا کام۔ اشد ضرورت: سخت ضرورت، شدید ضرورت۔ عقیدت مند: عقیدت اور ارادت رکھنے والے۔ عزت اور قدر کرنے والا [ص ۲۷۷] کرشمے: انوکھی باتیں، کرامات۔ ممدوح: وہ جس کی مدح یا تعریف کی جائے۔ [ص ۲۸۰] آویزے: بندے، کانٹے۔ دریا دلی: فیاضی، سخاوت، کھلا دل ہونا۔ [ص ۲۸۱] لہجہ تلخ ہونا: طرز کلام سخت اور کڑوا ہونا۔ عہد کرنا: وعدہ کرنا۔ پکا ارادہ کرنا پژمردہ پھول: مرجھائے ہوئے پھول۔ [ص ۲۸۴] امنگ: جذبہ۔ جوش [ص ۲۸۵] دری کی شکلیں: دری کی سلوٹیں۔ عزت افزائی: عزت بڑھانا، عزت کرنا۔ اہل درد: درد مند لوگ، انسانوں کے ہمدرد لوگ [ص ۲۸۷] اس داستان کی سیاحی میں مصروف ہیں: اس کام میں مصروف ہیں۔ اٹاثہ: پونجی۔ سبیل: راستہ۔ طریقہ۔ شانہ: کندھا [ص ۲۹۱] ہاتھ رنگنا: دھوکے یا رشوت کے ذریعے روپیہ اڑا لینا [ص ۲۹۳] کباب ہو گئی: غصے سے جل گئی۔

سبق کا خلاصہ

یہ ایک مصور کی سرگزشت ہے۔ جس کا نام سرفراز ہے۔ کسی پبلشر نے اپنی کتاب کے سرورق کی آرائش اس کے ذمے لگا رکھی ہے۔ مگر وہ پریشانی حالات میں ذہنی طور پر ایسا نہیں کر سکا۔ اس کی بیوی عصمت تنگ دستی کا مجسمہ بنی لحاف اوڑھے لیٹی ہے۔ اسے کھانسی ہے سر درد ہے۔ سرفراز اس کا حال پوچھتا ہے۔ وہ زچ ہو کر ٹائیفل کا پوچھتی ہے کہ تیار ہوا؟ کل دو روپے سات آنے میرے پاس ہیں۔ گھر کا خرچ کیسے چلے گا؟ سرفراز اس سے ایک کپ چائے مانگتا ہے۔ مگر بیوی اب پیٹ کے درد کا رونا بھی روتی ہے۔ غرہ گلاس اٹھا کر دکان پر جاتا ہے۔ دالان میں ایک لفافے میں سو روپے کے دس نوٹ پڑے ہیں۔ بیگم کو خوشخبری سناتا ہے کہ شاید کسی عقیدت مند نے میرے لیے دالان میں یہ لفافہ پھینکا ہے۔ عقیدت مند ایسا کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ رڈیارڈ کپلنگ کی مثال دیتا ہے۔ مگر بیوی کہتی ہے کہ یہ بات میری سمجھ سے باہر ہے۔ بیوی کا چہرہ مسرت سے چمک اٹھتا ہے۔ اب اس کی سب بیماریاں دور ہو جاتی ہیں۔ پڑوسن کو بلا کر مٹھائی اور دودھ منگوایا جاتا ہے۔ دو فرمایاں بیوی سابقہ تلخ کلامی کی ایک دوسرے

سے مغذرت چاہتے ہیں اور پروگرام بناتے ہیں کہ اس رقم کو کیسے خرچ کیا جائے۔ اس دوران میں اچھے موڈ میں سرفراز اپنا ٹائیٹل پیش کر لیتا ہے۔ مٹھائی اور دودھ آتا ہے۔ مگر ساتھ ہی دستک ہوتی ہے۔ تین آدمی اندر آتے ہیں۔ وہ چندہ کے بہانے سے آئے ہیں۔ سرفراز پچاس روپے چندہ کا وعدہ کرتا ہے کہ میں ایسا صرف ایک عقیدت مند کی مہربانی کی وجہ سے کر رہا ہوں۔ اس طرح بات کھلتی ہے اور وہ بھی سرفراز کر جاتے ہیں کہ یہ تیسرا آدمی بلک بلک کر رقم لے اڑا۔ ہم اس کے پیچھے جائیں گے۔ یہ کہتا تھا کہ میں نے رقم اس دالان میں پھینکی تھی۔ ہم اسی لفافے کی تلاش میں آئے بلکہ وہ لفافہ لے کر چلے جاتے ہیں۔ گھر پر پھر وہی افسردگی چھا جاتی ہے۔ عصمت کی ساری بیماریاں پھر واپس آ جاتی ہیں۔ وہ اُسے پھر نکھٹو اور بے وقوف ہونے کے طعنے دیتی ہے۔ اتنے میں پھر دستک آتی ہے۔ اب کے پبلشر آیا ہے۔ ٹائیٹل لے کر پچاس روپے دے گیا ہے۔ سرفراز بیگم کو بتاتا ہے کہ پبلشر پچاس روپے دے گیا ہے کچھ چیزیں تو آ ہی جائیں گی۔

اہم اقتباس کی تشریح

سوال: متن اور سیاق و سباق کے حوالے سے مندرجہ ذیل عبارت کی تشریح کیجیے؟

"بڑے آئے مصور۔ کس شان سے فرمانے لگے کہ ایک عقیدت مند نے عقیدت مندی کا ثبوت دیا ہے۔ توبہ اللہ! تو مجھے موت دے دے۔ چھوٹ جاؤں اس عذاب سے۔ کباب ہو گئی ہوں اس شخص کی حرکتیں دیکھ دیکھ کر۔ کیا مجال ہو کبھی عقلمندی کا کام کر جائے۔ (رونے لگتی ہے)۔ یہ گھر یونہی جہنم بنا رہے گا۔ میں اسی طرح تڑپتی رہوں گی۔"

جواب: حوالہ متن | یہ عبارت "فن کار" سے لی گئی ہے جس کے مصنف میرزا ادیب ہیں۔

سیاق و سباق کا حوالہ | جب خفیہ پولیس کے دونوں آدمی ملزم کو لے کر اور ایک ہزار روپے کا لفافہ لے کر چلے گئے۔ تو مرزا کی بیوی اس سے اُلجھ پڑی کہ تم نے ایسا کیوں کیا۔ سرفراز کہنے لگا کہ اگر میں ایسا نہ کرتا تو وہ مجھے گرفتار کر لیتے۔ اس پر بیگم پھر اُسے طعن آمیز جواب دیتی ہے اور رونے لگ جاتی ہے۔ یہ عبارت اسی موقع سے لی گئی ہے۔

تشریح | تم اپنے آپ کو بڑا عظیم مصور اور فن کار سمجھتے ہو۔ بڑے فخر سے خفیہ پولیس والوں کو بتانے لگے کہ میرے فن سے متاثر ہو کر میرے کسی عقیدت مند نے عقیدت مندی کا ثبوت دیتے ہوئے یہ ہزار روپے کا نذرانہ اس انداز سے پیش کیا ہے۔ یہ طعنے دینے کے بعد عصمت خدا سے دعا مانگنے لگی کہ یا اللہ مجھے موت دے دے۔ تاکہ میں اس اقتصادی

بدحالی اور خاوند کے احمقانہ رویے سے نجات پا جاؤں۔ ایک تو یہ مکھٹو ہے۔ دوسرے ایسی حرکات کا مرتکب ہوتا ہے کہ جل بھن کر کباب ہو گئی ہوں۔ کب تک اس کی احمقانہ حرکات برداشت کروں۔ آج تک اس نے عقلمندی کی کوئی بات بھی نہیں کی۔ اگر قسمت سے کام لیتا تو یہ ہزار روپے تو ہم ضرور کر سکتے تھے۔ یہ کہتے کہتے وہ رونے لگ گئی اور پھر طعن آمیز انداز میں کہنے لگی کہ میرے خاوند نے یہ گھر میرے لیے دوزخ بنا دیا ہے۔ اصلاح کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں زندگی بھر اس طرح تڑپتی رہوں گی۔ سکون اور راحت کبھی نہ ملے گی۔

میر تقی میرؔ

غزل (۱)

۱۔ اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا لہو آتا ہے جب نہیں آتا

میر کی زندگی درد و غم کا مجموعہ تھی چنانچہ وہ خود کہتے ہیں کہ ع

درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

اُن کی غزل میں اس درد و غم کی عکاسی موجود ہے۔ اس شعر میں کہتے ہیں۔ کہ میری آنکھوں سے آب نہیں بلکہ خون رواں ہے۔ میں ایسی ناکامیوں، محرومیوں اور دکھوں کا شکار ہوں کہ خون کے آنسو روتا ہوں۔ اس لیے میری آنکھوں سے ہر وقت خون کے آنسو رواں ہیں۔ ان آنکھوں سے پانی بہنے کی نوبت کیسے آئے جبکہ خون تھمتا ہی نہیں ہے لفظ لہو بمعنی لعاب متروک ہو چکا ہے۔ میر کے ہاں ایسے کئی الفاظ ملتے ہیں۔ جو اب اگرچہ متروک ہو چکے ہیں۔ تاہم ان کے کلام میں معیوب نظر نہیں آتے۔

۲۔ ہوش جاتا نہیں رہا لیکن جب وہ آتا ہے تب نہیں آتا

میر نے نہایت ہی سادہ انداز میں یہ کہنے کی کوشش کی ہے۔ کہ میں اپنے محبوب کی تاب نہیں رکھتا۔ اس کو آنکھوں کے سامنے دیکھ کر ہوش برقرار رکھنا بڑے حوصلے کی بات ہے جو مجھ میں نہیں۔ دیدارِ حسن بہت مشکل مقام ہے۔ حضرت موسیٰ نے بھی حسن حقیقی کے دیدار پر اصرار کیا تھا۔ مگر ایک جھلک بھی برداشت نہ کر سکے اور غش کھا کر گر پڑے میر کہتے ہیں کہ عام حالات میں میرے ہوش و حواس قائم ہوتے ہیں۔ مگر محبوب کی آمد پر میں ایسا بیخود ہو جاتا ہوں کہ ہوش کھو بیٹھتا ہوں۔ اثر لکھنوی کا یہ شعر بھی اسی

مضمون کا حامل ہے۔

مذاقِ دید کی تکمیل ہو تو کیوں کر ہو — کہ وہ ملے تو پھر اپنا نشاں نہیں ملتا

۳۔ صبر تھا ایک مونسِ ہجراں — سو وہ مدت سے اب نہیں آتا

مشکلات: مونس: غم خوار، ہمدرد ہجراں: جدائی، فراق

میر وہ محروم عشق ہیں کہ جن کے مقدر میں ہجر و فراقِ یار ہمیشہ کے لیے لکھ دیا گیا ہے میر اتنے مایوس ہیں کہ ہجر سے نجات کی ایسی کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ انہیں وصالِ یار کے مزے ملیں۔ ایسے حالات میں انسان صبر کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رکھتا، لیکن میر کا المیہ یہ ہے کہ صبر کا دامن بھی ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے "مدت" کا لفظ قابلِ غور ہے۔ اگر صبر کا دامن آج ہاتھ سے چھٹتا تو اور بات تھی۔ مگر یہ حادثہ مدت سے جاری ہے! ایسی حالت میں انسان کی بے چینی اور اضطراب قابلِ فہم ہے اُس ناقابلِ برداشت غمِ فراق کا جو اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ میر کا یہ شعر سراپا غمِ فراق ہے، ان کی چھوٹی بحر کی غزلوں میں قاری کو تحفظِ غم کے سوا کچھ بھی نہیں ملتا۔

۴۔ دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش — گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا!

دلِ انسانی خواہشات اور آرزوؤں کا منبع اور مسکن ہے۔ عام انسان اگر اپنی خواہشات کی تکمیل میں ناکام ہو جائے۔ تو وہ اس کی تلافی کی کوئی اور صورت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن عاشق کے لیے اس کی خواہشات اس کا سرمایۂ حیات ہیں کوئی بھی عاشق اس متاعِ حیات سے محروم نہیں ہونا چاہتا۔ چنانچہ جب اس کی کوئی خواہش ناکامِ تکمیل ہو کر حسرت و ارمان بن جاتی ہے۔ تو وہ بے اختیار رونے لگ جاتا ہے، عاشق کے رونے کے اور بھی کئی اسباب ہیں لیکن اس شعر میں گریہ کا سبب ایسی ہی کسی خواہش کی ناکامی ہے جسے شاعر متاعِ حیات سمجھتا ہے۔ اقبال نے ایسی خواہشوں اور اُمیدوں کے متعلق کہا ہے ؎

پھلا پھولا ہے یارب چمن میری امیدوں کا — جگر کا خون دے دے کر یہ بُوٹے میں نے پالے ہیں

۵۔ جی میں کیا کیا ہے اپنے اے ہمدم — پر سخن تا بہ لب نہیں آتا

مشکلات: ہمدم: ساتھی سخن: بات تا بہ لب آنا: لب پر آنا۔ کہہ دینا

عاشق خاموشی سے درد و غم برداشت کر رہا ہے۔ مگر اُس کے ساتھی نے اُس کے رویے میں تبدیلی پائی جس سے اُسے شبہ گزرا کہ یہ وبائے عشق میں مبتلا ہے۔ اس لیے از راہِ ہمدردی عاشق سے پوچھتا ہے کہ بتاؤ تو سہی۔ تمہارے دل میں کیا ہے؟ جواباً عشق

کہتا ہے کہ میرے دل میں طوفان بپا ہے۔ "کیا کیا" کی تکرار سے اس طوفان کی خوب غمازی ہوتی ہے۔ لیکن میں اس کا اظہار نہیں کر سکتا۔ یہ آداب عشق کی خلاف ورزی ہوگی جسے عشق کی دنیا میں کبھی روا نہیں کیا جاتا۔ شاعر لوگ اس کو ضبطِ غم اور ضبطِ گریہ بھی کہتے ہیں۔ جو عاشق کی حوصلہ مندی کا پیمانہ ہے۔ اسی غزل کے ایک اور شعر میں اسی مضمون کو میر نے یوں ادا کیا ہے ؎

حوصلہ شرطِ عشق ہے ورنہ ۔۔۔ بات کا ڈھب کسے نہیں آتا

غالب نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے ؎

ہے کچھ ایسی ہی بات کہ چپ ہوں ۔۔۔ ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

میر کے اس شعر میں "کیا کیا" تکرار الفاظ ہے، شعر میں صوتیت پیدا کرنے کی اس صورت سے میر نے اپنے کلام میں جا بجا خوب فائدہ اٹھایا ہے۔

غزل (۲)

۱۔ سرسری تم جہاں سے گزرے ۔۔۔ ورنہ ہر اک جہان دیگر تھا!

مشکلات: سرسری، بغیر غور کے، اچٹتی نظر سے، ہر جا، دنیا کے ہر گوشے میں ہر مقام پر، جہان دیگر، نئی دنیا، اور ہی منظر

دنیا میں عام لوگ سطحی نظر رکھنے والے اور ظاہر بیں ہوتے ہیں۔ وہ چیزوں کی تہ تک پہنچنے کی نہ تو صلاحیت رکھتے ہیں نہ ہی اس کی کوشش کرتے ہیں۔ میر نے اس شعر میں ایسے ہی عام لوگوں کو مخاطب کیا ہے۔ کہ اگر تم غور سے کائنات کا مطالعہ و مشاہدہ کرتے تو تمہیں وہ روشنی نصیب ہوتی۔ جس میں ہر جگہ اس جہاں کے پرے میں تمہیں جہانِ دیگر نظر آتا۔ میر نے اسی مضمون کو ایک اور شعر میں یوں بیان کیا ہے ؎

چشم ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر ۔۔۔ منہ نظر آتے ہیں دیواروں کے بیچ!

جو لوگ دنیا کو بنظر غائر دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ میر نے ان کی نسبت اس دنیا کو شہر کوراں کہا ہے یعنی اندھوں کا شہر ؎

یاں جہاں کہ شہر کوراں ہے ۔۔۔ سات پردے ہیں چشم بینا پر

"جہانِ دیگر" کا مضمون میر کے ایک اور شعر میں یوں باندھا گیا ہے ؎

ہوتا ہے یاں جہاں میں ہر روز شب تماشا ۔۔۔ دیکھا جو خوب تو ہے دنیا عجب تماشا

اس غزل کے پہلے شعر میں جہان کے لفظ کی تکرار اور جہان میں "ج" کی آواز کی تکرار سے اچھا صوتی اثر پیدا کیا گیا ہے۔

۲۔ دل کی کچھ قدر کرتے رہیو تم ! یہ ہمارا بھی ناز پرور تھا

مشکلات : ناز پرور : یعنی ناز پروردہ، نازوں کا پلا ہوا

محبوب کے متعلق روایت ہے کہ وہ عاشقوں کا دل لوٹ لے جاتا ہے یا یہ کہ عاشق خود ہی نقدِ دل پیش کر دیا کرتے ہیں۔ اس شعر میں اگرچہ اس بات کا ذکر نہیں ہے۔ لیکن شاعر ایسا کر چکنے کے بعد اپنے محبوب سے مخاطب ہو رہا ہے کہ براہِ کرم میرے پیش کردہ نقدِ دل کی قدر کرتے رہنا۔ اسے یوں ہی گنوا نہ دینا یہ بڑی قابلِ قدر متاع ہے ہے۔ اور میں نے اسے بڑے نازوں سے پالا ہے۔ نازوں سے پالنے کا مطلب یہ ہے کہ میں نے ہر طرح سے اس کی ناز برداری کی۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر بارہا خفت و ذلت بھی برداشت کی۔ مگر دل کی بات کبھی نہ ٹالی۔ ہمیشہ اس کی مدد مانی۔

غزل (۳)

۱۔ تجاہل، تغافل، تساہل کیا ! ہوا کام مشکل تو کل کیا !

مشکلات : تجاہل : نادانی، ان جان بننا۔ تغافل : غفلت۔ تساہل : سستی۔ غفلت

توکل : خدا پر بھروسہ کرنا۔ خدا پر چھوڑ دینا۔

اس شعر میں میر نے تغافل شعار انسان کے رویے پر طنز کی ہے کہ جب وہ دیکھتا ہے کہ کوئی کام مشکل ہے۔ اور میرے بس کا روگ نہیں۔ تو ان جان بن کر بے پروائی اختیار کر لیتا ہے حتیٰ کہ اپنی ذمہ داری سے غفلت اور کوتاہی کا مرتکب ہوتا ہے مگر خود فریبی ملاحظہ ہو۔ کہ اپنی کوتاہی کو تسلیم کرنے کی بجائے توکل کا سہارا لیتا ہے۔ کہ میں نے یہ کام خدا پر چھوڑ دیا ہے۔ وہ جو چاہے کرے۔ ہم اس کی رضا پر راضی ہیں۔ توکل کا یہ مفہوم وہ محض اپنی کوتاہیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے اختیار کرتا ہے۔ ورنہ توکل کا مفہوم تو یہ ہے کہ اپنی طرف سے پوری کوشش کی جائے۔ بلکہ اس میں کوئی کسر نہ چھوڑی جائے۔ اور پھر نتیجہ خدا پر چھوڑ دیا جائے۔

ع ۔ر توکل زانوئے اشتر ببند۔

میر اپنے اشعار میں موسیقیت اور ترنم پیدا کرنے کے لیے صوتی اثرات سے کام لیتے

ہیں۔ اس شعر میں تجاہل، تغافل، تساہل ہم وزن اور ہم قافیہ الفاظ ہیں پھر مشکل تو کل کر ان میں "ل" کی تکرار ہے جو بڑی نرم اور سریلی آواز ہے۔ اس طرح شعر میں ترنم پیدا ہو گیا ہے۔ اس شعر کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ عشق میں غم سے نجات حاصل کرنے کے لیے ہم نے اُسے بھلانے کی کوشش کی۔ غموں سے بے پروا ہونے کی کوشش کی۔ مگر جب کامیابی بہت مشکل نظر آئی تو معاملہ خدا پر چھوڑ دیا۔

۲۔ نہیں تاب لانا دلِ زار اب بہت ہم نے صبر و تحمل کیا

مشکلات: تاب لانا: برداشت کرنا دلِ زار: بدحال دل

عشق کی دُنیا میں صبر و ضبط بہت ضروری ہے۔ عاشق اگر خلافِ منشا اور خلافِ انصاف حالات دیکھے تو بھی احتجاج کا حق اُسے حاصل نہیں ہے پھر آزمائشوں کے ابتلا سے گزرنا بھی ضروری ہے جن کے دوران اُسے بہت صدمے پہنچتے ہیں حتیٰ کہ وہ زخموں سے چور ہو جاتا ہے۔ مگر ان سب باتوں کا علاج صرف اور صرف صبر ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ میرا دل ان بدحالیوں سے گزر گزر کر اب قوتِ برداشت کھو بیٹھا ہے۔ آخر ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ قوتِ برداشت کی بھی ایک حد ہے۔ ہم نے انتہائی صبر و تحمل سے کام لیا۔ جو کمالِ صبر ہے۔ مگر آلام بے انتہا ہیں۔ جنہوں نے انتہائے صبر کی حد عبور کر لی ہے۔ اب مزید برداشت کا حوصلہ نہیں رہا۔

۳۔ حقیقت نہ میرؔ اپنی سمجھی گئی شب و روز ہم نے تامل کیا

مشکلات: شب و روز: رات دن تامل: سوچ، غور

شعر کی سادگی اور روانی قابلِ داد ہے۔ الفاظ و معانی کے لحاظ سے یہ شعر سادگی کی اس حد تک چھو رہا ہے جہاں شعر سہل ممتنع کہلاتا ہے۔ ایسے اشعار میرؔ کے کلام میں عام ملتے ہیں۔ ایسے اشعار کے متعلق میرؔ نے خود کہا ہے ؎

کس نے سُن شعرِ میرؔ یہ نہ کہا کیا پھڑ، ہائے! کیا کہا صاحب!

میرؔ نے اعتراف کیا ہے کہ پوری زندگی اس سوچ اور فکر میں گزر گئی کہ میری ذات کی حقیقت کیا ہے! میں کون ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ میری منزل کیا ہے؟ مگر افسوس کہ میں اپنے آپ کو نہ پہچان سکا۔ اسی بات کو اقبال نے خودی کہا ہے۔ غور و فکر کا ذکر میرؔ اس لیے کرتے ہیں کہ اس کے ذریعے ہی عرفانِ ذات ممکن ہے وہ کہتے ہیں ؎

کام کیا آئیں گے یہ معلومات یہ تو سمجھے ہی نہ کہ کیا ہیں ہم
اپنی حقیقت پانے کے لیے عقل و حکمت کام نہیں آتے۔ بلکہ اس کے لیے تزکیۂ باطن کی ضرورت ہے اور غور و فکر کی ضرورت ہے۔

غزل (۴)

۱۔ آہِ سحر نے سوزشِ دل کو مٹا دیا اس باد نے ہمیں تو دیا سا بجھا دیا

مشکلات: آہِ سحر: صبح کی آہ۔ سوزشِ دل: دل کی جلن، عشق کی آگ۔ بادِ ہوا

میر کے دل میں عشق کی دھیمی سی آگ جل رہی ہے جیسے دیا روشن ہوتا ہے اور اس کی لو ہوتی ہے۔ دستور یہی ہے کہ صبحدم دیئے کو پھونک سے بجھاتے ہیں۔ اب صبح ہوئی تو میر اپنے دل کے جلتے ہوئے دیئے کو بجھانے کے لیے آہِ سحر کھینچتے ہیں یعنی پھونک مارتے ہیں۔ اس شعر میں شاعر نے دو خوبصورت تشبیہات استعمال کی ہیں۔ آہِ سحر کو باد سے اور دھیمے سلگتے ہوئے دل کو دیئے سے تشبیہ دی ہے۔ دراصل میر کہنا چاہتے ہیں کہ میں ساری رات دیا سا سلگتا رہا ہوں۔ جب دیئے سے دل کو تشبیہ دی تو دیئے کی زندگی شب بھر کی زندگی ہے۔ اس لیے دل کے دیئے کو بھی شب بھر کی زندگی دی اور صبحدم جیسے دیا بجھا دیا جاتا ہے آہِ سحر سے اُسے بجھانے کا اہتمام کیا۔

ایک اور شعر میں اسی طرح کی تشبیہ یوں دی ہے ؎

روشن ہے اس طرح دلِ ویراں میں ایک داغ
اجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک

میر کے اشعار میں عوام کا ماحول صاف صاف نظر آتا ہے۔ چنانچہ یہ شعر اس کی مثال ہے۔ دیا ان لوگوں کی دنیا سے تعلق نہیں رکھتا۔ جو دن کو کافوری شمعیں جلاتے ہیں۔ بلکہ یہ ان مفلسوں اور ناداروں کی متاع ہے جن کے دیئے روغن نہ ہونے کے سبب شام ہی کو بجھ جاتے ہیں۔

۲۔ اس موج خیز دہر میں ہم کو فضا نے آہ! پانی کے بلبلے کی طرح سے مٹا دیا

موج خیز: موج پیدا کرنے والا۔ ہنگامہ خیز فضا: تقدیر دہر: زمانہ۔

یہ دنیا ایک ہنگامہ خیز جہان ہے۔ جہاں ہمہ وقت طوفان بپا ہو رہے ہیں۔ حادثات و واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ میں زمانے کی اس رواروی کا ساتھ نہیں

دے سکتا۔ اس لیے تقدیر نے مجھے کچل دیا ہے، جس طرح پانی کی لہریں اپنے تموج سے پانی کے بلبلے کو مٹا دیتی ہیں۔ اسی طرح طوفانی زمانے کی لہروں نے اپنے تموج سے میری ہستی کو مٹا دیا ہے کہ میں بھی بلبلے کی طرح نہایت عارضی ہستی رکھتا تھا۔ اس شعر میں میر نے اپنی ذات اور اپنے وجود کو فانی اور عارضی ہونے کے سبب پانی کے بلبلے سے تشبیہ دی ہے۔ ایک اور شعر میں ایسی ہی تشبیہ یوں دی ہے ؎

ہستی اپنی حباب کی سی ہے ٭ یہ نمائش سراب کی سی ہے

۴۔ سب شورِ مادمن کو لیے سر میں مر گئے ٭ یاروں کو اس فسانے نے آخر سلا دیا

شورِ مادمن: تکبر اور غرور کا سودا، نہیں ہی میں ہوں، کا احساس فسانہ: جھوٹی داستان میر نے اس شعر میں یہ حقیقت بیان کی ہے کہ یہ کائنات اور موجودات سب افسانہ اور بے حقیقت ہیں۔ اور ہمارا فریبِ نظر ہیں۔ یہ مسئلہ وحدت الوجود کا مسئلہ ہے کہ کائنات کا کوئی وجود نہیں۔ یہ ہمارے حواس کا دھوکا ہے۔ مگر میر نے اس شعر میں رمزیت اور ایمائیت کا کمال دکھایا ہے۔ یہی وہ اندازِ بیان ہے جس پر کسی شاعر نے کہا تھا ؎ میر کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں۔ دستور ہے کہ رات کو لوگ داستان سنتے سنتے سو جاتے ہیں۔ داستان جھوٹا فسانہ ہوتی ہے۔ میر نے موت کی نیند سونے والوں کے حوالے سے اس پوری دنیا کو فسانہ یا داستان قرار دیا کہ بڑے بڑے لوگ اس دنیا میں آئے۔ جن کا گمان تھا کہ ہیچ مادیگرے نیست۔ مگر کائنات کا فسانہ سنتے سنتے ہمیشہ کی نیند سو گئے۔ فسانے میں بھی بے حقیقت اور جھوٹے واقعات ہوتے ہیں اور لوگوں نے زندگی میں بھی کائنات میں جھوٹے اور بے حقیقت واقعات دیکھے۔ کیونکہ کائنات بذاتِ خود بے حقیقت چیز ہے حتیٰ کہ اس افسانے میں مبتلا ہو کر وہ ہمیشہ کی نیند سو گئے یعنی مر گئے۔

میر نے اسی مضمون کو اس شعر میں براہِ راست ادا کیا ہے ؎

چار دیواریٔ عناصر میر ٭ خوب جاگہ ہے پر بے بنیاد

مجلسوں کی مجلسیں برہم ہوئیں ٭ لوگ جب بل مارتے یکدم گئے

۴۔ آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں ٭ مشتِ غبار لے کے صبا نے اڑا دیا

مشکلات: آوارگانِ عشق: آوارہ عاشق لوگ۔ نشاں: پتہ۔ مشتِ غبار: مٹھی بھر خاک۔

تشبیہ پیش کرنے کا کیا عمدہ انداز ہے۔ یہاں آوارہ عاشقوں کو اڑتی ہوئی خاک سے تشبیہ دی ہے۔ مگر کیا ڈرامائی انداز ہے۔ مکالمہ کا انداز۔ بالواسطہ تشبیہ کی بہت عمدہ مثال ہے میر کے ہاں تشبیہات کا یہ انداز دیگر اشعار میں بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً

کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات کلی نے یہ سُن کر تبسم کیا

شعر کا مفہوم تو بس اتنا ہی ہے کہ بیچارے آوارہ عاشق خاک کی طرح اڑتے پھرتے ہیں یعنی جنونِ عشق میں خاک ہو گئے ہیں یا یہ کہ خاک چھانتے پھرتے ہیں۔ مگر بات کہنے کا انداز بہت ہی دلکش ہے۔ آوارگی کی نسبت سے غبارِ صبا اور اڑنے کا ذکر بہت ہی مناسب ہے، اسے صنعت مراعاۃ النظیر کہتے ہیں۔

"میں نے" کی بجائے "میں" کا استعمال یعنی علامت فاعل کو حذف کر دینا میر کا خاص انداز ہے۔ اب یہ طریقہ متروک ہے۔

غالب نے میر کے اسی انداز کی تقلید اس شعر میں کی ہے ؎

مجھ سے کہا جو یار نے جاتے ہیں ہوش کس طرح دیکھ کے میری بیخودی چلنے لگی ہوا کہ یوں

۵۔ کیا کچھ نہ تھا ازل میں نظالع جو تھے درست ہمکو دلِ شکستہ قضا نے دلا دیا!

مشکلات: ازل: وقت کا وہ نقطۂ آغاز جس کا تعین نہیں ہو سکتا۔ آغاز۔ طالع: ستارہ بخت

دلِ شکستہ: ٹوٹا ہوا دل۔ ناکامیوں کا شکار دل قضا: تقدیر

قسام ازل نے جب کائنات میں بخت تقسیم کیا۔ تو اُس کے پاس سب کچھ موجود تھا جو مجھے عطا ہو سکتا تھا۔ مگر میری قسمت کے ستارے ہی درست نہیں تھے۔ ان کی منحوس چالوں کی بدولت اتنے بڑے قدرتی ذخیرے میں سے تقدیر نے مجھے ایک ٹوٹا ہوا دل بخشا۔ اس طرح ازل سے ہی بدبختی اور ناکامی میری تقدیر میں لکھ دی گئی ہے۔ اگر میرے طالع درست ہوتے۔ تو مجھے بھی بہت کچھ مل جاتا۔ ناکامیوں، محرومیوں کی بجائے میرا دامن حیات بھی کامیابیوں اور مسرتوں سے بھرا ہوتا۔ شاعر نے بالواسطہ طریقہ سے قسامِ ازل پر طنز کی ہے۔ اور ذمہ دار اپنی قسمت کو ٹھہرا دیا ورنہ وہ کہنا یہ چاہتا ہے کہ ؎

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی

۶۔ تکلیف دردِ دل کی عبث ہمنشیں نے کی دردِ سخن نے میرے سبھوں کو رُلا دیا

مشکلات: تکلیف کرنا: تشریف لانا۔ تکلیف اٹھانا۔ عبث: فضول، ہم نشین:

ساتھی، ہم درد۔ درد سخن: درد انگیز کلام دردِ دل: ہم دردی۔
مجھے روتا دیکھ میرے ساتھی نے میرے ساتھ ہمدردی کی۔ اور دل جوئی کے انداز میں میرا حال دل پوچھا۔ اب میرا حال یہ ہے کہ جس کو بھی سناتا ہوں وہی رونے لگ جاتا ہے۔ میری باتوں میں اتنا درد ہے اور میری کہانی اتنی غم انگیز ہے کہ میرا درد انگیز کلام سن کر کوئی بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ میرے ہمدرد ساتھی نے جب میرا دردِ دل سنا تو وہ بھی اس درد میں مبتلا ہو کر رونے لگا۔ اس نے بھلا کیا پایا۔ اس سے تو بہتر تھا کہ وہ میری دلجوئی نہ کرتا۔ خود تو اس درد سے محفوظ رہتا۔ جس میں میں مبتلا ہوں۔ میر واقعی دردمند دل رکھتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

ہمیشہ چشم ہے نم ناک ہاتھ دل پر ہے — خدا کسو کو نہ ہم سا بھی دردمند کرے
۷۔ ان نے تو تیغ کھینچی تھی پر جی چلا کے میر — ہم نے بھی ایک دم میں تماشا دکھا دیا

اردو غزل کی روایت کے مطابق محبوب کا کام ہے کہ وہ اپنے چاہنے والوں پر ناز و ادا چلائے۔ تیر برسائے۔ برچھیاں مارے۔ لیکن وہ اس کے باوجود قابل سزا نہیں ہے کہ اس کے پاس روایتی ہتھیار نہیں ہیں بلکہ خنجر آبرو یا تیر مژہ ہے جس سے وہ عاشقوں کو نشانہ بناتا ہے۔ پھر اسی روایت کے مطابق عاشق اس کا نشانہ بننے میں عین سعادت محسوس کرتا ہے چنانچہ اسی روایت کے پیش نظر قاتل محبوب نے تلوار کھینچی کہ اپنے عاشق پر چلائے۔ اس کا خیال تھا کہ دیکھنے والے اس کی تیغ زنی کی داد دیں گے۔ مگر ہم نے تیغ زنی سے پہلے ہی ایک عجیب ہی تماشہ کر دکھایا جس کی پیش بینی کوئی نہیں کر سکتا تھا کہ ہم نے دل میں لگی عشق کی آگ کو اور بھڑکا دیا، اور ہلا اول جل گیا۔ جسے محبوب زخمی کرنا چاہتا تھا۔ میر اگرچہ اپنا دل جلا کر خاک کر چکا ہے۔ تاہم اس تماشے سے بہت لطف اندوز ہو رہا ہے۔ کیونکہ عاشقوں کو اپنے درد میں بھی لذت محسوس ہوتی ہے۔
میر اپنے کلام میں اکثر "انہوں نے" کی بجائے "ان نے" استعمال کرتے ہیں جو آج کل متروک ہے۔ "ان نے" کی بجائے اظہار کی اور بھی صورت ہو سکتی تھی۔ مگر میر کو یہی صورت مرغوب ہے۔ اس میں ایک خاص قسم کی جذباتی اپیل۔ محبوب کا احترام اور حسن پایا جاتا ہے۔

غزل (۵)

۱۔ جس سر کو غرور آج ہے یاں تاجوری کا کل اُس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

مشکلات: تاجوری: تاج پہننا۔ بادشاہت نوحہ گری: ماتم کرنا۔

اس شعر میں دُنیا کی بے ثباتی اور انسانی اقتدار اور بخت کی ناپائداری کا ذکر کر کے شاعر نے لوگوں کو عبرت دلائی ہے۔ تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے ہر دور میں ایسا ہوتا آیا ہے اور قیامت تک ایسا ہوتا رہے گا کہ اقتدار اور دولت عارضی اور فانی ہیں۔ یہ بے ثبات چیزیں جس کو میسر آگئیں، وہ چند روز کے لئے اپنے سر میں خمار پیدا کر کے متکبر ہو جاتا ہے۔ اپنی حیثیت اور عاقبت بھول جاتا ہے کہ اسے مرنا ہے اور مرنے کے ساتھ ہی اقتدار اور دولت سے محروم ہو جانا ہے۔ اقتدار کی بدولت آج اگر کسی کی شان میں جلوس نکلا ہے اور شادیانے بج رہے ہیں، تو کل موت کی گود میں سو جانے پر اس کی میت پر ماتم ہو رہا ہو گا۔ اس شعر سے قاری کے ذہن پر افسردگی اور دل پر پژمردگی طاری ہوتی ہے۔ اس لیے میر نے اس غزل میں نہایت مناسب طریقے سے موضوع کا پہلو اشعار میں بار بار بدلا ہے تاکہ اس اثر کو زائل کیا جا سکے۔ موضوعات کا یہ تناسب میر کے کلام کی ایک امتیازی خصوصیت ہے۔

۲۔ زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

مشکلات: زنداں: قید خانہ شورش: ہنگامہ آرائی سنگ: پتھر (دیوار کی اینٹ)۔ مداوا: علاج آشفتہ سری: دیوانگی

عاشق کے لیے جنوں کی کیفیت بڑی پُر لطف اور لذت بخش ہوتی ہے۔ مگر اس میں اسے زخموں اور تکلیفوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لڑکے پتھر مارتے ہیں۔ عاشق دیوانہ زخمی ہو جاتا ہے۔ اور اگر وہ اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے پر اتر آئے تو اور مصیبت! بے رحم محبوب کو عاشق کی ایسی حالت زار پر رحم آئے یا نہ کچھ لوگ ضرور نکل آتے ہیں جو از راہِ ہمدردی اُسے کہیں بند کر دیتے ہیں۔ کسی کو کھڑکی میں ڈال دیتے ہیں۔ شاعر کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ مگر اس کے باوجود اس کے جوشِ جنون میں کمی واقع نہیں ہوئی۔ اس لیے خود ہی کہتا ہے کہ اے میرے ہمدردو!

اگر میرے اس جنون سے مجھے نجات دلانا چاہتے ہو تو اس کا صرف ایک علاج ہے وہ یہ کہ میرا سر پتھر سے پھوڑ دو یا میں خود دیوارِ زنداں سے سر پھوڑ دوں۔ سر پھوٹ جانے پر سر کی آشفتگی خود بخود دور ہو جائے گی۔

نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری

غالب کہتے ہیں۔

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی ۔ یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

۳۔ آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت ۔ اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

مشکلات: آفاق: جمع افق کی۔ کئی جہان۔ کائنات۔ اسباب: سامان۔

کائنات ایک منزل اور مسافر خانہ ہے۔ یہاں پر آنے والا کوئی بھی مسافر صحیح وسالم یہاں سے نہیں گزرا۔ ہر مسافر اپنا کچھ نہ کچھ سامان یہاں گنوا بیٹھتا ہے، یعنی جو شخص بھی دنیا میں آتا ہے اپنے سفر کی اگلی منزلِ عاقبت سے بے پرواہ ہو جاتا ہے۔ اس دنیا کے مسافر خانہ میں رہ کر یہاں کی رنگینیوں اور دلچسپیوں میں یوں گم ہو جاتا ہے کہ اگلی منزل کا خیال ہی گم کر بیٹھتا ہے حتیٰ کہ جب موت آتی ہے یعنی اس منزل سے کوچ کا وقت آتا ہے تو اگلی منزل یعنی عاقبت کے لیے اس کے پاس کوئی زادِ راہ نہیں ہوتا۔ یہاں بھی میر نے دنیا کی بے ثباتی کا تصور دلا کر سامانِ عبرت پیدا کیا ہے۔

۴۔ لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام ۔ آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

مشکلات: کارگہ: کارخانہ ۔ شیشہ گری: آئینہ سازی۔ شیشہ سازی۔

شاعر نے کائنات کو شیشہ سازی کے کارخانے سے تشبیہ دی ہے کہ وجہ شبہ نزاکت ہے۔ شیشے کے کارخانے میں بڑی احتیاط سے کام کرنا پڑتا ہے ذرا سی بے احتیاطی سے سامانِ شیشہ کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے کیونکہ وہ بہت ہی نازک ہوتا ہے اور چوٹ برداشت نہیں کر سکتا۔ اسی طرح کائنات میں ہمیں احتیاط سے زندگی گزارنی چاہیے۔ ذرا سی بے راہروی یا بے احتیاطی سے ہمارے اندر کا انسان ٹوٹ پھوٹ سکتا ہے اور اس کی شکل مسخ ہو سکتی ہے۔ شاعر نے احتیاط کی انتہا یہاں تک پہنچا دی ہے کہ یہاں سانس بھی آہستہ آہستہ لینا چاہیے ہو سکتا ہے ہمارے زور سے سانس لینے پر بھی کائنات کا نظام شیشہ گری ٹوٹ پھوٹ جائے یعنی بہت ہی زیادہ احتیاط سے زندگی گزارنی چاہیے۔

۵۔ مت میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے ۔ کیا یار بھروسہ ہے چراغِ سحری کا

مشکلات: جگر سوختہ: وہ جس کا جگر جل چکا ہو۔ چراغِ سحری: صبح کا چراغ۔

جو بجھنے والا ہوتا ہے۔ ایسا شخص جو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہو۔ میرؔ کے اندر عشق کی آگ بھڑکی ہے کہ اس کا جگر جل کر راکھ ہو گیا۔ اس لیے وہ اب چند لمحات کا مہمان ہے۔ جس طرح چراغ سحر کی زندگی قریب الاختتام ہوتی ہے۔ اسی طرح اس کی زندگی بھی قریب الاختتام ہے اس کا بچنا اب محال ہے۔ اِس لیے اے محبوب! اس بیچارے جگر سوختہ کی اب تو خبر لے لے۔ مر گیا تو پھر مرنے پر حال پوچھنے کا کیا فائدہ! لفظ "ملک" میرؔ کا خاص لفظ ہے جو اس کے اشعار کو عام بول چال کا عوامی لہجہ عطا کرتا ہے۔

خواجہ میر دردؔ

۱۷۲۰ - ۱۷۸۵ء

نوٹ: میر دردؔ کے حالاتِ زندگی اور خصوصیاتِ کلام کا مطالعہ آپ گزشتہ صفحات میں کر چکے ہیں

غزل نمبر ۱

۱۔ تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا — برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

دردؔ کے کلام کا نمایاں موضوع تصوف ہے۔ اُن کا محبوب اللہ تعالےٰ ہے۔ اور اُسی کا جلوہ انہیں ہر طرف اور ہر چیز میں نظر آتا ہے۔ اس شعر میں درد کہتے ہیں۔ کہ انسان کا فرض اوّلیں یہ ہے۔ کہ وہ اس دنیا میں خدا کی ذات کا عرفان حاصل کرے۔ اور اگر وہ اس مقصد کے حصول میں ناکام رہتا ہے تو اس دنیا میں اُس کا آنا اور نہ آنا برابر ہے۔ اگر غور کی آنکھیں کھول کر دیکھا جائے تو خدا کا جلوہ ہر طرف ہر چیز میں موجود ہے۔ مگر اس کے لیے دیکھنے والی نگاہ ضرورت ہے۔ اسی مضمون کو دردؔ نے ایک اور شعر میں یوں باندھا ہے ؎

جگ میں آ کر اِدھر اُدھر دیکھا — تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

دردؔ کے کلام میں سادگی اور شیرینی ہے۔ وہ موسیقیت کے راز سے بھی واقف ہیں۔ چنانچہ اس شعر میں لفظ "دیکھا" کی تکرار سے موسیقیت پیدا کی ہے۔

۲۔ مرا غنچۂ دل ہے وہ دل گرفتہ — کہ جس کو کسو نے کبھو وا نہ دیکھا

دل گرفتہ: مغموم۔ غمگین — کسو: کسی — کبھو: کبھی — وا: کھلا یا کھیلا

غنچۂ دل مرکب اضافی ہے۔ جس کے مضاف اور مضاف الیہ میں تشبیہ کا تعلق

ہے۔ ایسی اضافت کو اضافت تشبیہی کہتے ہیں۔ شاعر نے اپنے دکھ غم گینی کو نمایاں کرنے کے لئے اُسے ایک ایسے غنچے سے تشبیہ دی ہے جس کے کھلنے کی نوبت کبھی نہیں آتی۔ غنچہ کھل کر ہی شاداں و خنداں پھول بنتا ہے۔ اور اسی میں اس کا کمال اور عروج ہے۔ مگر شاعر کا دل وہ غنچہ ہے۔ جو بن کھلا رہ گیا۔ بقول شاعر

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

عاشق کو اپنی پوری زندگی غم و الم میں ہی گزارنا پڑتی ہے چنانچہ ایک اور جگہ درد کہتے ہیں

دل کا حال کچھ نہ پوچھو تم وہی رونا ہے منت وہی غم ہے

کھوا اور کسو کے الفاظ میر اور درد کے کلام میں اکثر ملتے ہیں۔ آج کل یہ متروک ہیں۔

۳۔ یگانہ ہے تو آہ! بے گانگی میں کوئی دوسرا اور ایسا نہ دیکھا

یگانہ: لاثانی، واحد بے گانگی: پرایا ہونا۔ اجنبیت

عاشق کی خواہش ہوتی ہے کہ محبوب اس کا اپنا بن جائے۔ ان کے درمیان سے غیریت کے پردے چھٹ جائیں۔ چنانچہ وہ ایسا طرز عمل اختیار کرتا ہے کے اس کی خواہش فراست پوری ہو جائے۔ ہر حیلہ اور ہر جتن کرتا ہے۔ مگر ناکام رہتا ہے۔ بالآخر اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ محبوب کسی کا نہیں ہے۔ یہ با عمل پرایا ہے۔ پرایوں اور غیروں کے سے رویے اور طرز عمل میں عاشق نے محبوب کو اتنا انتہا پسند پایا کہ اس معاملے میں اس کا کوئی ثانی اسے نظر نہیں آیا۔ ہر کسی کا کوئی نہ کوئی اپنا ہوتا ہے۔ مگر یہ محبوب ایسا ہے کہ جس کا کوئی اپنا نہیں جو کسی کا اپنا نہیں۔ یگانہ اور بے گانہ میں لفظی رعایت بھی موجود ہے یعنی ان میں تضاد کا تعلق ہے۔ شاعر نے لفظ آہ! استعمال کر کے انتہائی حسرت و یاس کا اظہار کیا ہے۔

۴۔ اذیت، مصیبت، ملامت بلائیں ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا

شاعر نے محبوب کو مخاطب کیا ہے کہ تیرا عشق ہمارے لئے سراپا بلا بن گیا۔ اور کونسی ایسی مصیبت، اذیت اور بلا ہے جس سے ہمیں دورانِ عشق دوچار نہ ہونا پڑا۔ حتیٰ کہ رسوا ہو کر ہر طرف سے ہدفِ ملامت بھی بنے۔ درد کے ہاں غم کی جھلک ہے۔ مگر ان کا تصورِ زندگی ایسا ہے کہ ان کے کلام میں غم بھی ایک لمبی اور قدرتی امر معلوم ہوتا ہے۔ عشق کی وادی میں قدم رکھتے ہی مصائب و آلام کا سلسلہ سا چل نکلا۔ کہ ان سے نجات نہ ملی چنانچہ ایک اور شعر میں کہتے ہیں ؎

شمع کی مانند ہم اس بزم میں چشم تر آئے تھے دامن تر چلے

اذیت، مصیبت، ملامت، میں 'ت' کی آواز اور لفظ کیا' کی تکرار سے اس شعر میں

کی کیفیت پیدا ہوئی ہے۔

۵۔ کیا مجھ کو داغوں نے سرو چراغاں کبھی تو نے آکر تماشا نہ دیکھا

داغ: زخم سرو چراغاں: ایک جھاڑ جو محفلوں میں روشن کرتے ہیں۔ اس کی شکل سرو سے ملتی جلتی ہے۔

شاعر داغ یعنی زخم کو چراغ سے تشبیہ دیا کرتے ہیں وجہ شبہ چراغ کی لو کی رنگت اور زخم کے خون کی رنگت کی یکسانیت ہے۔ اگر زخم زیادہ ہو تو اسے چراغاں کہہ دیا جاتا ہے یہاں شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ کل

تن ہمہ داغ داغ شد

یعنی عاشق کا ہر موئے تن زخمی ہے۔ حتیٰ کہ وہ ان زخموں کی بدولت سرو چراغاں نظر آتا ہے اس کی خواہش ہے کہ کاش محبوب اسے ایسے عالم میں دیکھ لے۔ اس لئے دوسرے مصرعے میں کہا ہے کہ اے محبوب! تو نے ہماری طرف نظر التفات ڈالا بھی مناسب ہی نہیں سمجھا۔ اگر ایک بار دیکھ لیتا تو میری بجائے تجھے ایک سرو چراغاں نظر آتا۔ یہاں شاعر نے اپنے آپ کو سرو چراغاں سے تشبیہ دی کہ انسان سرو قامت ہوتا ہے زخموں کی بدولت اس پر جلتے ہوئے چراغ اسے سرو چراغاں بنا دیتے ہیں۔

۶۔ تغافل نے تیرے یہ کچھ دن دکھائے ادھر تو نے لیکن نہ دیکھا نہ دیکھا

تغافل اور تجاہل محبوب کا شیوہ ہے۔ عاشق کے لیے اس تغافل کا تصور جو بھی نکلے محبوب اس سے بے نیاز ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ بھی محبوب کی ادا ہے۔ عاشق بے چارے کے لئے یہ ادا

کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری

کا مصداق بن جاتی ہے۔ "یہ کچھ دن" کی ترکیب قابل غور ہے۔ محبوب کے تغافل نے یہ کچھ دن" دکھائے ہیں۔ شاعر نے وضاحت نہیں کی کہ "یہ کچھ دن" کون سی حالت ہے مگر اس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ مایوسی اور اضطراب میں مبتلا عاشق نہ جانے کس کس اذیت میں مبتلا ہے اس کا خیال تھا کہ محبوب کی جانب سے یہ بھی ایک آزمائش ہے اور آزمائش کی بھی ایک مدت ہوتی ہے۔ وہ اس انتظار میں رہا کہ آزمائش میں پورا اترنے پر محبوب ترک تغافل کر کے نظر التفات مرحمت کرے گا۔ مگر عاشق کو بار بار مایوسی ہوئی حتیٰ کہ "نہ دیکھا نہ دیکھا" کہہ کر یہ ظاہر کیا کہ میں اس معاملے میں محبوب سے قطعی طور پر مایوس ہو چکا ہوں۔ "نہ دیکھا" کی تکرار سے ترنم ملاحظہ کیجیے۔

۷۔ شب و روز و سال و مہ و ہفتہ رفتے کسے یاں نہ سمجھا نہ دیکھا

وحدۃ الوجود ایک صوفی شاعر ہیں صوفی کا کام ہے کہ تحقیق، جستجو اور غور و فکر کے ذریعے معرفت الٰہی

حاصل کرے۔ اس لیے کہتے ہیں کہ میں رات دن اس کے درپے ہوں اس کی تلاش میں ہوں۔ تلاش اور تجسس کی یہ کیفیت درد کے کلام میں عام ملتی ہے کیونکہ اہل تصوف کا یہ خاصہ ہے "اس کے" کا مرجع ذاتِ الٰہی ہے۔ جو کسی کو نظر نہیں آتا۔ شاعر کہتا ہے کہ ذاتِ خداوندی کو نہ اس دنیا میں کسی نے دیکھا ہے نہ کوئی اس کی حقیقت کو سمجھ سکا ہے۔ میں رات دن اسی ٹوہ میں لگا ہوا ہوں کہ کسی نہ کسی طرح اس کا عرفان حاصل کر لوں۔ لفظ کھود کے اشعار میں عام ملتا ہے مگر اب متروک ہو چکا ہے۔

غزل نمبر ۲

۱۔ دنیا میں کون کون نہ یک بار ہو گیا — پر منہ پھر اس طرف نہ کیا اس نے جی گیا

یک بار: ایک بار — اس طرف: اس دنیا کی طرف منہ کرنا: آنا گیا: ہو گیا

تخلیق کائنات سے لے کر اب تک ان گنت لوگ اس دنیا میں آئے اور زندگی مستعار گزار کر چلے گئے۔ جو لوگ بھی موت کے منہ میں گئے ان میں سے ہر ایک نے ایک بار اس دنیا کی زندگی کا مزا ضرور چکھا۔ مگر جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوا۔ تو پھر ادھر کا رخ کرنے کی مہلت اسے نہ ملی۔ اس لیے انسان کو چاہیے۔ کہ اس چند روزہ زیست میں زیادہ سے زیادہ کام کر جائے۔ دنیا سے رخصت ہونے پر دوبارہ اسے نامکمل کاموں کو مکمل کرنے کے لیے یہاں نہیں بھیجا جائے گا ؎

فرصت زندگی بہت کم ہے — مختصر ہے یہ دید جو دم ہے

انشا نے کہا ہے ؎

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

۲۔ پھرتی ہے میری خاک، صبا در بدر لیے — اے چشم اشکبار یہ کیا تجھ کو ہو گیا!

شاعر نے پہلے مصرعے میں یہ موضوع باندھا ہے کہ وہ عشق کے ہاتھوں خاک میں مل کر خاک ہو گیا ہے۔ اور صبا اس کی خاک کو اڑاتی پھر رہی ہے۔ دوسرے مصرعے میں رونے والی اپنی آنکھوں کو غیرت دلاتی ہے کہ یہ منظر تمہارے لیے کیسے قابل برداشت ہو گیا۔ کیوں نہ تم اپنے آنسوؤں کے سیلاب میں اس خاک کو بہا کر دربدری سے بچا لیتیں۔ غیر کے ہاتھوں میری خاک کی تذلیل ہو رہی ہے۔ تمہارے اندر وہ طوفان اور سیلاب پوشیدہ ہیں کہ جو سارے جہاں کو بہا لے جائیں تو پھر تم اپنے سیلاب کے ذریعے میری در بدر اڑتی خاک کو بہا کر اس ذلت سے نجات نہیں دلا سکتیں۔ آنکھوں کے سیلاب کو اکثر شعراء نے اپنا پسندیدہ مضمون بنایا ہے۔ چنانچہ غالب کہتے ہیں ؎

یونہی گرد و تار بادل تو نے اہل جہاں دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں کیا ہے۔

اسی طرح کئی شعراء نے برستے آنسوؤں کو برستے بادل سے زیادہ زور دار بیان

۳۔ طوفان نوح نے ڈبوئی زمیں فقط میں ننگِ خلق ساری خدائی ڈبو گیا

طوفان نوح: حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں آنے والا طوفان

ننگ خلق: خلقت کے لئے ذلت اور شرم کا باعث طوفانِ نوح تھا جس

حضرت نوح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ پیغمبر تھے۔ ان کے زمانے میں اللہ تعالیٰ نے سیلاب اور طوفان کی شکل میں لوگوں پر عذاب نازل کیا۔ اس میں صرف وہ لوگ محفوظ رہے جو حضرت نوحؑ کے کہنے پر ایمان لے آئے تھے۔ اس شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ طوفان نوح ایک بلاخیز طوفان تھا۔ مگر وہ طوفان صرف روئے زمین سے اٹھا اور فقط زمین ہی اس میں ڈوبی۔ باقی کائنات اس کی زد سے محفوظ رہی۔ میرا وجود وہ ذلت آمیز وجود ہے کہ پوری کائنات مارے شرم کے ڈوب گئی ہے اس طرح میری ذلت آمیز اور شرمناک حرکات نے پوری مخلوقات کو شرم سے ڈبو دیا ہے یعنی میری سیہ کاریوں سے پوری مخلوقاتِ عالم شرم سے سرنگوں ہیں یہ احساس اور اعتراف گناہ بھی صوفیاء کا شیوہ ہے۔

۴۔ واعظ کسے ڈراوے ہے یوم الحساب سے گریہ مرا تو نامۂ اعمال دھو گیا

یوم الحساب: قیامت کا دن گریہ: رونا نامۂ اعمال: وہ کاغذ جس پر اعمال درج ہوں۔

یوم الحساب اور نامۂ اعمال تلمیحات ہیں۔ یوم الحساب کا ذکر آسمانی کتابوں میں بالخصوص قرآن کریم میں آیا ہے کہ اس دن ہر شخص کے ہاتھ میں ایک کتاب دی جائے گی جس پر اس کی زندگی بھر کے اعمال درج ہوں گے۔ شاعر اور واعظ کی آپس میں کبھی نہیں بنی۔ شاعر موقع بموقع اس پر طنز کرتا رہتا ہے۔ واعظ کہتا ہے کہ بداعمالیوں سے پرہیز کرو۔ نیک اعمال کرو تاکہ قیامت کے دن بداعمالیوں کی سزا سے بچ جاؤ شاعر کہتا ہے کہ مجھے سزا نہیں مل سکتی۔ کیونکہ میرا نامۂ اعمال دھل گیا ہے۔ تحریر پر اگر پانی پھر جائے تو تحریر مٹ جاتی ہے اور پڑھنے کے قابل نہیں رہتی۔ شاعر کہتے ہیں کہ میرا نامۂ اعمال میرے آنسوؤں نے دھو دیا ہے۔ مگر قابل داد نکتہ یہ ہے۔ کہ شاعر کے یہ آنسو ندامت کے آنسو ہیں۔ جو واقعی توبہ بن کر بداعمالیوں کے داغ دور کر دیتے ہیں۔ اقبال نے ندامت کے آنسوؤں کے متعلق کہا ہے ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

۵۔ پھولے گا اس زبان میں گلزارِ معرفت یاں میں زمین شعر میں یہ تخم بو گیا

پھولے گا: پھل لائے گا۔ گلزارِ معرفت: معرفت کا باغ تخم: بیج

دردایک معرفت شناس شاعر ہے۔ اس نے اس شعر میں دعویٰ کیا ہے کہ میں نے شعر کی زمین میں معرفت کا بیج بویا ہے جس کے نتیجے میں معرفت کے پھول کھلیں گے اور گلزارِ معرفت کے پھولوں سے بھر جائے گا۔ دردکا یہ دعوے بالکل درست ہے۔ تصوف کے موضوع پر اکثر اردو شعرا نے طبع آزمائی کی ہے۔ مگر ایسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سنی سنائی باتوں کا ذکر کر رہے ہیں درد جب اس مضمون کو اشعار میں باندھتے ہیں تو ان کی اپنی واردات ہوتی ہیں ظاہر ہے کہ کلام شنیدہ کے بود مانند دیدہ ۔ عام بابو سکینہ کے قول کے مطابق تصوف کو درد سے بہتر کسی شاعر نے نہیں باندھا عارفان اور تصوف کے پیچیدہ اور مشکل مضامین اس خوبصورتی اور صفائی سے بیان کئے ہیں کہ دل وجد کرتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ ایک مکمل اور صاحب حال صوفی شاعر تھے۔

۶ آیا نہ اعتدال پہ ہرگز مزاج دہر میں گرچہ گرم و سرد زمانہ سمو گیا

اعتدال : میانہ روی - اوسط حالت - نزاکتی نرمی مزاج دہر: زمانے کی طبیعت۔ گرم و سرد زمانہ: زمانے کے اچھے اور برے حالات۔ سمونا: گرم اور سرد کو ملانا۔ مختلف المزاج چیزوں کو ملا کر اعتدال پیدا کرنا۔

شاعر کہتا ہے کہ میں نے پوری کوشش کی کہ برائی اور بھلائی کے امتزاج سے معاشرے میں ایسے حالات پیدا کروں کہ انتہا پسندی ختم ہو جائے اور ایک معتدل صورتِ حال پیدا ہو جائے۔ برے اور بھلے میں دوری ختم ہو جائے مگر میں اپنی کوشش میں ناکام رہا۔ میری کوشش تھی کہ برائی کے تریاق کے طور پر بھلائی کو سامنے لاؤں۔ تاکہ برائی کا برا اثر معاشرے میں سے زائل کیا جا سکے۔ مگر افسوس کہ کسی چیز کا فطری مزاج نہیں بدلا جا سکتا۔ میں بھی اعتدال پسند معاشرہ کی تشکیل میں ناکام رہا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی ایک فطرت بنائی ہے۔ اسے تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ کچھ کا کام ہے نیش زنی آپ اس سے لاکھ بہتر سلوک کریں اس کی آسائش کے سامان بہم پہنچائیں وہ نیش زنی سے باز نہیں آئے گا اس کی فطرت میں تبدیلی ناممکن ہے۔ اسی طرح میں بھی زمانے میں میانہ روی پیدا کرنے میں ناکام رہا کہ یہ زمانے کی فطرت نہیں تھی۔

۷۔ اے درد جس کی آنکھ کھلی اس جہان میں شبنم کی طرح جان کو وہ اپنی رو گیا

آنکھ کھلنا : حقیقت حال معلوم کرنا۔ جان کو رونا : کوسنا۔ بددعا دینا

جس شخص پر اپنی اور دنیا کی حقیقت زندگی میں کھل جاتی ہے۔ وہ اپنے حقیقت اور بے ثبات دنیا سے یوں بددل ہوتا ہے کہ شبنم کی طرح رو کر اپنے آپ کو کوستا ہی رہتا ہے کہ میں کیوں اس دنیا میں آیا۔ اس کے برعکس عام لوگ جن کی نگاہوں سے زندگی اور دنیا

کی حقیقت اوجھل رہتی ہے۔ دنیا میں محظوظ و مسرور رہتے ہیں اپنی دنیاوی آسائشوں کے حصول کے لئے سب کچھ کر گزرتے ہیں بلکہ ان کا مقصدِ حیات ہی حصولِ دنیا بن جاتا ہے۔ کیونکہ وہ دنیا کے بے حقیقت ہونے کے راز سے واقف نہیں ہوتے۔ جو لوگ رازِ حیات پا جاتے ہیں وہ خدا کی راہ میں مال و جان قربان کرنے سے ذرا بھی نہیں ہچکچاتے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے باوجود غربت و ناداری کے اپنا سارا مال چندہ میں دے دیا تھا۔ ان پر یہ حقیقت واضح ہو گئی تھی کہ اصل زندگی اخروی زندگی ہے۔ اس موجودہ زندگی میں جو بھی الجھا وہ اپنی عاقبت گنوا بیٹھا۔ تاہم جس نے رازِ حیات اس زندگی میں پا لیا وہ دنیاداروں کی نگاہ میں یہاں کی زندگی میں مفلوک الحال اور تنگ دست رہا گویا کہ وہ اپنی جان کو رو رہا۔

غزل نمبر ۳

۱۔ ہمارے پاس ہے کیا جو کریں فدا تجھ پر　　مگر یہ زندگیٔ مستعار رکھتے ہیں

فدا : قربان۔　　زندگیٔ مستعار : مانگی ہوئی زندگی۔

محبوب مجازی ہو یا حقیقی اپنے عاشق سے قربانی کا تقاضا کرتا ہے۔ اور واقعی عشق میں ایثار اور قربانی کے بغیر کسی کو کامیابی نصیب نہیں ہو سکتی۔ شاعر کہتا ہے کہ میرے پاس کیا ہے جو تجھ پر نثار کروں۔ میں تو بے مایا انسان ہوں۔ نہ اپنی مرضی سے اس دنیا میں آیا ہوں۔ نہ اپنی خوشی سے یہاں سے جاؤں گا۔ صاحبِ اختیار تو وہ مختارِ مطلق ہے جسے اللہ کہتے ہیں۔ دنیا کی کوئی چیز میری نہیں۔ سب کچھ اسی کا ہے۔ جو لوگ مال دنیا کو اپنا سمجھتے ہیں وہ بھول میں ہیں۔ اب اس صورت حال میں میدانِ عشق میں محبوب پر میں کیا نچھاور کروں ہاں! میرے پاس جان ہے جس کا نذرانہ پیش کر سکتا ہوں اور جسے محبوب پر نثار کر سکتا ہوں۔ مگر وہ بھی تو میری اپنی نہیں وہ بھی کسی کی دی ہوئی ہے۔ مانگی ہوئی یا ادھار لی ہوئی چیز کی قربانی کیا؟ غالب نے کہا تھا ؎

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی　　حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

۲۔ فلک سمجھ تو سہی ہم سے اور گلوگیری　　یہ ایک جیب ہے سو تار رکھتے ہیں

گلوگیری : لالچ طمع۔ تار تار ہونا : ٹکڑے ٹکڑے ہونا : جیب : گریبان یہاں کیسہ مراد ہے۔

غزل کی روایت کے مطابق عاشق دردمند کو ہمیشہ یہ گلہ رہا ہے کہ آسمان اس کے درپے ہے۔ اور جو کچھ بھی اس کے پاس ہوتا ہے وہ بھی چھین لینا چاہتا ہے۔ یعنی فلک عاشق کو ہر طرح

سے محرومی کا شکار کرنا چاہتا ہے۔ درد نے اس شعر میں اسی بات کو انداز میں پیش کیا ہے۔ کہ آسمان لالچی ہے جو مجھے لوٹنا چاہتا ہے۔ میری جیب پر ڈاکہ ڈالنا چاہتا ہے۔ اس لئے آسمان سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اے آسمان تو مجھ سے کیا لالچ رکھتا ہے۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں جسے تو لوٹ سکے۔ میری جیب تو پہلے ہی تار تار ہے۔ اس کے چیتھڑے ہو چکے ہیں۔ یہاں سے تجھے کچھ نہیں ملے گا۔ تاہم جیب کا مطلب گریبان بھی ہوتا ہے۔ اور عاشق زار جنوں کی حالت میں اسے تار تار کر دیتا ہے۔ یہاں جیب کی لفظی رعایت سے کام لیا گیا ہے۔

۳۔ بتوں کے جبر اٹھائے ہزار ہم نے جو اس پہ بھی نہ ملیں اختیار رکھتے ہیں

بت: محبوب۔ حسین لوگ۔ جبر: ظلم۔ ستم

غزل کی روایت کے مطابق محبوب ستم شعار ہے۔ اپنے چاہنے والوں پر ظلم کرتا ہے اور ستم ڈھاتا ہے۔ یہ اس کا شیوہ ہے۔ ادھر عاشق کا فرض کا ہے کہ وہ اس ظلم و ستم کو بسر و چشم قبول کر کے برداشت کرے۔ لیکن عاشق بے مقصد ایسا نہیں کرتا۔ اسے توقع ہوتی ہے کہ ظلم و ستم اٹھانے کے اس دور کے بعد مجھے اس کا پھل بھی ملے گا۔ اور میں وصال یار پا کر بامراد ہوں گا۔ تاہم عاشق اس دورِ ظلم و ستم سے گزر گزر کر بھی بامراد نہیں ہوتا۔ تو مایوسی کا شکار بھی ہو جاتا ہے۔ ایسی مایوسی کے عالم میں وہ بے اختیار کہہ اٹھتا ہے کہ ہمارا کام تو جبر اٹھانا تھا۔ ملنا اور وصال کا موقع ہم پہنچا محبوب کا کام تھا۔ ہم اس کے اختیار پر کوئی چیز نہیں رکھتے۔ ہم نے جبر اٹھائے کہ ہم مجبور تھے۔ صاحب اختیار نہیں تھے یہاں جبر اور اختیار کی آپس میں لفظی رعایت بھی ہے۔ اہل تصوف کے ہاں یہ ایک مسئلہ ہے جسے جبر و قدر یا جبر و اختیار کا مسئلہ کہتے ہیں۔ کہ انسان تو اس دنیا میں جبر کا شکار ہو کر مجبور ہے وہ اپنے اعمال پر خود قدرت نہیں رکھتا جو خدا چاہتا ہے وہی اس سے کرواتا ہے جبر و اختیار صفت تضاد ہے۔

۴۔ نہ برق ہیں نہ شرر ہم نہ شعلے سیماب وہ کچھ ہیں پر کہ سدا اضطرار رکھتے ہیں

برق: چمکنے والی بجلی۔ شرر: چنگاری۔ سیماب: پارہ اضطرار: بیقراری

یہاں شاعر نے تشبیہ جمع استعمال کی ہے۔ جس میں مشبہ ایک اور مشبہ بہ ایک سے زیادہ ہوتے ہیں خود شاعر مشبہ اور مشبہ بہ چار ہیں۔ برق، شرر۔ شعلہ اور سیماب جب کہ وجہ شبہ اضطرار ہے۔ شاعر بے چینی اور بے قراری کا شکار ہے۔ اس کی بے قراری کی وجہ ہی ہے جو چمکتی ہوئی بجلی میں ہوتی ہے۔ جو بھڑک کر بجھ جانے والی چنگاری میں ہوتی ہے جو لپکتے ہوئے شعلے میں ہوتی ہے اور جو کسی جگہ قرار نہ پانے والی دھات پارے میں ہوتی ہے کہنے کا انداز

انکاری ہے۔ کہ میں نہ تو برق ہوں، نہ شرر ہوں، نہ شعلہ ہوں نہ ہی سیماب ہوں۔ تاہم میں برق صفت بھی ہوں، شرر صفت بھی ہوں۔ شعلہ آسا بھی ہوں۔ اور سیماب صفت بھی ہوں۔ کہ ان سب میں اور مجھ میں ایک جیسی بے قراری موجود ہے مجھے فلک کی گردش اور محبوب کے ستم نے یوں سکوں نا آشنا کر دیا ہے کہ اضطراب میری فطرت کا حصہ بن گیا ہے۔ اس شعر میں درد نے تشبیہ کے ذریعے اپنے اندر کے اضطراب کرب اور اضطرار کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

۵۔ جنہوں کے دل میں عبرت ہے نقش عبرت سے سدا النظر ہیں وہ لوح مزار رکھتے ہیں

عبرت: خوف۔ نصیحت سدا: ہمیشہ لوح مزار: قبر کی تختی

دنیا جائے عبرت ہے تخلیق کائنات سے لے کر اب تک کی تاریخ آدم ایک عبرت ناک داستان ہے۔ پرانے زمانے کے واقعات ہوں یا جدید دور کے حادثات ان سب میں عبرت آموزی مشترک طور پر پوشیدہ ہے اسی لیے قرآن حکیم میں بار بار آیا ہے کہ گزشتہ قوموں کے حالات سے عبرت پکڑو اور زمین میں گھوم پھر کر عبرت آموز مشاہدات کرو۔ مگر انسان جسے اللہ تعالیٰ نے خطا کار بنایا ہے۔ یہاں آکر غافل ہو جاتا ہے اور عبرت حاصل کرنے کی بجائے خود اپنی زندگی اور اپنے کردار کو دوسروں کے لیے سامانِ عبرت بنا دیتا ہے۔ خود سبق نہیں لیتا۔ اس لئے خدا اسی کو دوسروں کے لیے درسِ عبرت بنا دیتا ہے پرانے زمانے کے فراعنہ کو چھوڑیئے آج کے جمہوری دور میں فرعون آتے جاتے رہتے ہیں مگر ہم ان کے عبرت ناک انجام سے سبق نہیں لیتے۔ تاہم شاعر کہتا ہے کہ جو لوگ اپنے دل میں عبرت کے نقوش بٹھا لیتے ہیں۔ اور دنیا کے واقعات سے سبق لے کر اپنے کردار پر نظر ثانی کرتے رہتے ہیں۔ وہ لوگ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ کہ دنیا کی ہر چیز حتیٰ کہ زندگی، اقتدار، دولت سب فانی ہیں۔ بالآخر موت کی گود میں سو جانا ہے۔ اس لئے ایسے لوگ ہر وقت اپنی موت کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ وہ موت سے ڈرتے ہیں بلکہ اس لیے کہ موت سے پہلے کی مہلت میں اچھے اچھے کام کر جائیں اور موت کے پیش نظر بُرے کاموں سے بچے رہیں۔

۶۔ وہ زندگی کی طرح ایک دم نہیں ہٹتا اگرچہ درد اسے ہم ہزار رکھتے ہیں

وہ کا اشارہ محبوب کی طرف ہے۔ شاعر نے محبوب کو زندگی سے تشبیہ دی ہے وجہ شبہ دونوں کی آمد و قیام کا عرصہ مختصر ہے۔ زندگی کو چار دن کی زندگی بھی کہا جاتا ہے۔ اسے چند روزہ کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ اسے شرر سے بھی نسبت دی جاتی ہے جو ایک پل کی زندگی دکھا کر بجھ جاتا ہے مقصد یہ ہوتا ہے کہ زندگی ایک نہایت ہی ناپائدار اور عارضی چیز ہے۔ شاعر کے ہاں اول تو محبوب کبھی آتا ہی نہیں ہے۔ اگر نہ نصیب وہ آ بھی جائے تو اس کا قیام

ہوتا ہے۔ اور وہ آتے ہی رخصت ہو جاتا ہے۔ کم از کم عاشق کو یہی محسوس ہوتا ہے وہ خواہ پوری زندگی ہی اس کے پاس رہے تو بھی عاشق یہی سمجھتا ہے کہ ابھی میری تسکین نہیں ہوئی تھی کہ وہ زندگی کی طرح مجھ سے جدا ہو گیا۔ عاشق ہزار کوشش کرتا ہے کہ اسے روک رکھے مگر وہ نہیں رکتا۔

یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ زندگی کتنی ہی مختصر کیوں نہ ہو پھر بھی قابل قدر مدت ہے مگر زندگی سے جی نہیں بھرتا۔ اسی طرح محبوب کا قیام عاشق کے ہاں خواہ زندگی بھر کا ہی کیوں نہ ہو۔ اسے ایک پل ہی محسوس ہوتا ہے ؎

مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اڑتے جاتے ہیں ۔۔۔ مگر گھڑیاں جدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں

غزل نمبر ۴

۱۔ کام مردوں کے میں سو ہی کر جاتے ہیں ۔۔۔ جان سے اپنی جو کوئی گزر جاتے ہیں

جان سے گزر جانا : جان قربان کر دینا

اگرچہ دنیا بے ثبات ہے۔ اور ہماری زندگی ناپائدار لیکن کم ہی انسان اپنی ناعاقبت اندیشی اور غفلت کوشی کی بنا پر دوام کو بہت ہی عزیز رکھتا ہے حتیٰ کہ ان سے جدائی کا صدمہ برداشت کرنے کو تیار نہیں۔ لیکن درد رکھتے ہیں۔ کہ جو لوگ راہ خدا میں اپنی جان پیش کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ وہی لوگ دراصل مردانِ حق ہوتے ہیں۔ اور بہادر انسانوں کے سے کارناموں کی توقع انہی سے رکھی جا سکتی ہے۔ درد صوفی شاعر ہے جو فنا کے راز کو خوب سمجھتا ہے۔ اس لئے فنا پسند ہے وہ فنا کا رتبہ اتنا بلند سمجھتے ہیں کہ مالِ دنیا ان کے لیے باعث ننگ ہے۔ ان کو فنا ہونے کے تصور میں وہ لطف محسوس ہوتا ہے کہ اتنا لطف کسی دنیا دار لالچی کو زندگی اور مال کی خواہش میں نہ آتا ہوگا مثلاً کہتے ہیں ؎

جو مرنے ہیں مرگ میں سو ہم سے پوچھ جائے ۔۔۔ کون جانے آہ! کیا لذت ہے مر جانے کے بیچ

۲۔ موت کیا آگے فقیروں سے مجھے لینا ہے ۔۔۔ مرنے سے آگے ہی یہ لوگ تو مر جاتے ہیں

اہل تصوف کے ہاں ایک قول بہت مشہور ہے کہ مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا یعنی مر جاؤ اس سے پہلے کہ تمہیں موت آ جائے۔ ان کے نزدیک طبعی موت سے قبل نفس امارہ کی موت ضروری ہے۔ اگر نفسِ امارہ زندہ رہا اور موتِ طبعی واقع ہو گئی تو صوفی کی ساری کوششیں رائیگاں گئیں۔ ہمارا نفسِ امارہ ہمیں دنیا میں ملوث کرتا ہے۔ اور دنیا اور اس کے مال و اقتدار کی محبت ہمارے دلوں میں ڈالتا ہے۔ اس کے نتیجے میں ہم اپنی عاقبت سے غافل ہو جاتے ہیں۔

اس لیے ضروری ہے کہ پہلے نفسِ امارہ کو کچل دیا جائے۔ تاکہ دنیا اور اس کے مال و منال کی محبت ہمارے دلوں میں نہ رہے۔ جب دنیا کی کشش بھی دل میں نہیں رہے گی۔ تو پھر مرنے سے کیا ڈرنا۔ یہی خیال شاعر نے اس شعر میں باندھا ہے کہ ہم فقیر اور درویش لوگ ہیں ہم نے نفسِ امارہ کو کچل دیا ہے۔ موت سے ہم نہیں ڈرتے کہ ہم دراصل اپنے نفس امارہ کو مار کر ایک لحاظ سے موت کا مزہ چکھ چکے ہیں۔ نہ ہمیں دنیا میں راحت محسوس ہوتی ہے نہ ہم موت سے ڈرتے ہیں۔ اس طرح ہم تو مرنے سے پہلے ہی اپنے نفس امارہ کو مار کر دنیاوی لحاظ سے مر چکے ہیں۔ اے موت! اب تیرے آنے کا ہمیں کوئی ڈر نہیں۔ ہم تیری گود میں سونے کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔

۳۔ دیدوادید جو ہو جائے غنیمت سمجھو جوں شرر ورنہ ہم اہلِ نظر اٹھتے ہیں

دیدوادید: نظارۂ دنیا۔ دوستوں کی ملاقات جوں شرر: چنگاری کی مانند

اہلِ نظر: اہلِ باطن۔ حقیقت شناس۔

اہلِ نظر وہ لوگ ہوتے ہیں جو حقیقت شناس نظر رکھتے ہیں۔ صوفیاء کے نزدیک ہماری آنکھیں اور ہمارے حواس تو ہمارا فریبِ نظر اور فریبِ حواس ہیں چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

ظاہر کی آنکھ سے نہ دیکھا کرے کوئی

شاعر نے اس شعر میں اہلِ نظر کو ہی مخاطب کیا ہے کہ تم تو جانتے ہو کہ زندگی کا قیام بہت ہی مختصر ہے یوں سمجھ کر ہم چنگاری کی طرح بھڑک کر مٹ جانے والے ہیں۔ ایسی صورت میں ہمیں چاہیے کہ یہ دیدوادید کا جو موقع میسر آیا ہے اس سے خوب فائدہ اٹھائیں۔ پھر یہ موقع نہیں ملے گا دید اور دیدوادید کے الفاظ درد کے اشعار میں اکثر ملتے ہیں۔ اس شعر کے موضوع کو ایک اور شعر میں درد نے دیدوادید کی ترکیب استعمال کر کے یوں بیان کیا ہے ؎

غنیمت ہے یہ دیدوادید یاراں جہاں مُند گئی آنکھ میں ہوں نہ تو ہے

یا اس شعر میں دید کے لفظ سے اسی مضمون کو یوں باندھا ہے ؎

فرصتِ زندگی بہت کم ہے مغتنم ہے یہ دید جو دم ہے

درد کا انداز صوفیانہ ہے۔ ایک دنیادار شاعر انشاء کا انداز ملاحظہ فرمائیے جو اسی موضوع کو یوں بیان کرتے ہیں ؎

بھلا گردشِ فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاء غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

۴۔ بے ہنر دشمنِ اہلِ ہنر سے آکر منہ پہ چڑھتے تو ہیں پر دل سے اتر جاتے ہیں

بے ہنر: جن میں کوئی خوبی نہ ہو۔ نکمے اہلِ ہنر: اہلِ فن۔ اہلِ کمال۔ منہ پر چڑھنا

برابری کرنا۔ گستاخی کرنا۔ دل سے اترنا : نظروں سے گر جانا۔ بے وقعت ہو جانا۔

بے ہنر اور اہل ہنر نیز بڑھتے ہیں" اور اترجاتے ہیں" کا استعمال صفتِ تضاد ہے اہل کمال اور اہل فن کو ہمیشہ ان لوگوں کی طرف سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ جو کمال و فن سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتے۔ مگر دعویٰ کمال و فن ضرور کرتے ہیں۔ یہ لوگ ایک اور فن کا ہر ہوتے ہیں جسے پروپیگنڈا کا فن کہتے ہیں۔ اپنا نام پیدا کرنے کے لیے یہ لوگ اہل کمال کے حق میں گستاخی کرتے ہیں۔ ان پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ ان کے عیوب کی تشہیر کرتے ہیں۔ پھر اپنے آپ کو ان سے بہتر ہنر ور اور صاحب کمال ثابت کر کے اہل کمال کی برابری کا دعویٰ کرتے ہیں۔ لیکن جلد ہی ان کی قلعی کھل جاتی ہے اور ان کی بے کمالی ظاہر و ثابت ہو جاتی ہے۔ اہل کمال سے برابری کی کوشش میں وہ لوگوں کی نگاہوں میں گر کر ذلیل و رسوا ہو جاتے ہیں اور اپنی قدر و منزلت کھو بیٹھتے ہیں۔ حالی نے ایسے ہی بے کمال لوگوں کے متعلق کہا ہے کہ اہل فن کی مخالفت اور دشمنی کرنا تمہاری طرف سے ایک قدرتی بات ہے کہ تم اس کے سوا کر ہی کیا سکتے ہو۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

کمال ہے ضدِ بے کمالی، نہیں ملاپ ان میں حرف گیرو!
جو ہم پہ کچھ چوٹ کیجیے گا تو آپ بے جا نہ کیجیے گا

۵۔ ہم کسی راہ سے واقف نہیں جوں نورِ بصر — رہنما تو ہی تو ہوتا ہے جدھر جاتے ہیں

نورِ بصر : آنکھ کی بینائی۔ آنکھ کی روشنی

اس شعر میں ذوق نے مسئلہ جبر کو موضوع بنایا ہے۔ صوفی ہونے کی حیثیت سے ذوق جبر کے قائل ہیں۔ اختیار کے قائل نہیں ہیں۔ اردو شاعری میں ہمیں عموماً جبر پر اشعار ملتے ہیں۔ اختیار کو بہت کم شعراء نے باندھا ہے کیونکہ قریباً سب شعراء جبر کے قائل ہیں۔ اختیار کے موضوع پر بہت کم اور جبر کے موضوع پر بہت اشعار ملتے ہیں۔ البتہ جدید دور میں اقبال جبری عقیدے کے قائل نہیں ہیں۔

اس شعر میں ذوق کہتا ہے کہ جس طرح آنکھ ہمیں جو مناظر دکھاتی ہے ہم دیکھتے ہیں جو مناظر آنکھ سے اوجھل رہیں وہ ہم نہیں دیکھ سکتے اسی طرح دنیا میں ہم جو کچھ عمل کرتے ہیں وہ تیری ہی رہنمائی پر کرتے ہیں۔ تو چاہتا ہے کہ کوئی خاص کام ہم کریں۔ تو ہم کر بیٹھتے ہیں تو چاہتا ہے کہ کوئی خاص کام ہم سے سرزد نہ ہو تو ہم نہیں کر سکتے۔ جس طرح آنکھ کے بغیر دیکھنے پر ہم اختیار نہیں رکھتے ہیں اسی طرح تیرے منشا کے بغیر ہم کچھ بھی کرنے پر اختیار نہیں رکھتے ہیں۔ آتش نے کہا ہے ؎

اختیاری حرکت جان نہ مجبوروں کی — لے جاتی ہے جدھر ہم کو قضا جاتے ہیں

یا ذوق نے کہا ہے کہ ؎

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

یا میر نے کہا ہے ؎

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے خودمختاری کی
جو چاہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

۶۔ اے رگِ ابر یہ مژگاں بھی اگر تک برسیں
ایک پل میں کئی تالاب تو بھر جاتے ہیں

رگِ ابر: بادل کا ٹکڑا مژگاں: پلکیں۔ آنکھیں تک: ذرا۔

شاعر لوگ آنکھوں سے بہنے اور برسنے والے آنسوؤں کے زور سیلاب کو مبالغہ آمیز طریقے سے اپنے اشعار کا موضوع بناتے ہیں۔ بلکہ وہ اکثر زور سے برسنے والے بادل کو دعوتِ مبارزت دیتے ہیں کہ آؤ آنسوؤں کی برسات اور جھڑی کا مقابلہ کرو۔ شلاً حالی کہتے ہیں ؎

موجزن ہیں یاں خون کے دریائے چشم
دیکھنا ابر سے آنکھیں نہ چرانا ہرگز

مصحفی کہتے ہیں ؎

گر ابر کھڑا ہوا کھڑا ہے
آنسو بھی تلا ہوا کھڑا ہے

اس شعر میں درد نے بھی یہی موضوع بیان کیا ہے۔ وہ بادل کے ٹکڑے کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔ تو برس کر روتے زمین پر جل تھل کر دیتا ہے۔ لیکن تجھ سے بھی زیادہ قوت سے برسنے والی برسات میری آنکھوں میں موجود ہے۔ اگر آنکھوں میں سے آنسو ذرا سی دیر کے لیے بہنے دوں تو ایک لمحے میں تالابوں کے تالاب بھر جائیں گے اور ہر طرف سیلاب کی کیفیت نظر آئے گی یہ آنسو ان دکھوں اور غموں کی پیداوار ہیں۔ جو عشق کی دنیا میں عاشق کو جھیلنا پڑے۔ چونکہ ان دکھوں اور غموں کی کوئی انتہا نہیں ہے اس لیے ان کے نتیجے میں بہنے والے آنسوؤں کی سیلابی قوت کی بھی کوئی انتہا نہیں ہے۔

۷۔ آہ! معلوم نہیں ساتھ سے اپنے شب و روز
لوگ جاتے ہیں کہاں سو یہ کدھر جاتے ہیں

یہ کائناتِ زندگی کی علامت ہے۔ اگرچہ بظاہر یہاں زندگی کا دور دورہ ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہاں فرشتۂ اجل کی کارفرمائی ہے ہم اپنی آنکھوں کے سامنے رات دن موت کی تباہ کاریوں کے مناظر دیکھتے ہیں اور افسوس کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ مگر ایک صوفی ایسے مناظر کو اپنے زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ وہ ہر منظر کے متعلق یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ اس کی حقیقت کیا ہے چنانچہ مرنے والوں کے متعلق وہ سوچتا ہے کہ چار دن کی زندگی کی بہار دیکھ کر یہ لوگ کہاں گئے ——— ؟ ہماری منزل کہاں ہے ؟ تجسس اور تحقیق کا یہ رجحان درد کے کلام میں عام ہے ——— تصوف کی دنیا میں تجسس اور جستجو ضروری ہیں درد اہل تصوف

ہیں۔ اس لیے ان کے اشعار میں سے اس رجحان کی نشاندہی عام ملتی ہے چنانچہ ایک اور شعر میں کہتے ہیں ؎

درد کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

موت کے بھی مناظر ایک دنیا پرست شاعر دیکھتا ہے۔ تو اس کا انداز نگاہ درد سے مختلف ہے۔ چنانچہ انشاء کہتا ہے ؎

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

۸۔ تاقیامت نہیں مٹنے کا دلِ عالم سے دردؔ ہم اپنے عوض چھوڑے اُٹھ جاتے ہیں

تاقیامت : قیامت تک۔ دلِ عالم : دنیا کا دل۔ صفحۂ ہستی۔ عنوانِ بیت

اس شعر میں دردؔ نے روایتاً ایک دعویٰ کیا ہے۔ شعرا عموماً غزل کے مقطع میں ایسا کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ میں اگرچہ اس دنیا سے رخصت ہو رہا ہوں اور میرا جسمانی وجود نیست و نابود ہو جائے گا۔ مگر میں اپنے جسمانی وجود کی بجائے دنیا کو ایک اور تحفہ دینے جا رہا ہوں جسے دنیا کبھی بھلا نہ سکے گی وہ تحفہ ہے میرا درد بھرا کلام جس میں تاثیر کی چاشنی اور شیرینی ہے۔ یعنی دردؔ کا دعویٰ ہے کہ میرا کلام تاثیر سے پُر ہے قیامت تک یہ تاثیر بھرا پُر درد کلام زندہ رہے گا اور اس کی بدولت میرا نام بھی زندۂ جاوید رہے گا۔ ان کا یہ دعویٰ درست ہے کیونکہ درد نے دوسرے شعرا کی نسبت بہت کم اشعار کہے۔ مگر جو کہے وہ اتنے شستہ پاکیزہ اور اثر انگیز ہیں کہ ان کے پورے دیوان کو انتخاب کہا جاتا ہے۔

غزل نمبر ۵

۱۔ فرصتِ زندگی بہت کم ہے مغتنم ہے یہ دید جو دم ہے

فرصتِ زندگی : زندگی کی مہلت۔ زندگی کا عرصہ۔ مغتنم : غنیمت۔ دید ملاقات دوستاں۔ زندگی دم ہے : مختصر ہے۔ عارضی ہے۔

وہ جو کسی شاعر نے کہا تھا کہ ؎ سامان سو برس کا پل کی خبر نہیں

تو اصل بات کہا تھا۔ سو برس کی زندگی بھی کوئی مدت نہیں ہے مرتے وقت انسان کو احساس ہوتا ہے کہ میں ابھی اس دنیا میں آیا تھا اور ابھی رخصت بھی ہو رہا ہوں۔ مگر مرنے کے بعد دوبارہ یہ زندگی میسر نہیں آئے گی اس لیے اسے ہی غنیمت سمجھ کر اس سے جو فائدہ حاصل کر سکتے ہو کر لو۔ اس وقت جو ملاقات یاراں میسر ہے اس سے فائدہ اٹھاؤ۔ حقوق العباد ادا کر لو۔ اگر ماں زندہ ہے تو اس کی خدمت کر لو پھر اس کی دید میسر نہیں رہے گی تو پچھتاؤ گے۔ درد ایک صوفی شاعر ہیں اس لیے اس موضوع کو پیش کرنے کا اپنا انداز ہے۔ حالی نے اس موضوع کو یوں پیش کیا ہے ؎

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا کچھ کر لو نوجوانو اٹھتی جوانیاں ہیں

ایک ہی موضوع کو پیش کرنے کا انداز کتنا مختلف ہے یہ اختلاف زاویۂ نگاہ کا اختلاف ہے۔ نصیحت بہت منظم میں "ت" زندگی دیدہ دم میں "د" اور کم منظم دم میں "م" کی آوازوں سے اس شعر میں اچھا صوتی آہنگ پیدا ہوا ہے۔

۲۔ دل پر چاک ہے گلِ خنداں شادی و غم جہاں میں توام ہے

پر چاک: ٹکڑے ٹکڑے، گلِ خنداں: ہنستا ہوا پھول۔ کھلا ہوا پھول

شادی: خوشی، توام: برطواں۔ لازم و ملزوم

اس شعر میں وہی مضمون ادا ہوا ہے۔ جسے غالب نے اپنے اس شعر میں ادا کیا ہے ؎

قید حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

تاہم غالب نے موت کو نجاتِ غم کا ذریعہ قرار دیا۔ جبکہ درد کا تصور یہ نہیں ہے جیسے کہ ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

دل صدموں کی وجہ سے چاک چاک ہو گیا ہے۔ اس چاک شدہ دل کو شاعر نے گلِ خنداں سے تشبیہ دی ہے کھلے ہوئے پھول کی پتیاں بھی اس کے ٹکڑے ہوتی ہیں دونوں کے ہاں چاک ہیں اس لیے تشبیہ دی ہے۔ گلِ خنداں جہاں چاک گریباں ہے وہاں کھلا ہوا ہونے کی وجہ سے خوشی اور ہنسی کی بھی علامت ہے اس لیے تشبیہ کے تقاضے سے جہاں دل کے چاک ہیں وہاں وہ خوشی کا بھی آئینہ دار ہے۔ جس طرح کہ پھول چاک رکھنے کے باوجود خوشی کا نمائندہ بھی ہے۔ اس سے شاعر یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ دنیا میں خوشی اور غم ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہیں اور لازم و ملزوم ہیں جہاں پھول کھلتے ہیں وہاں کانٹے بھی ہوتے ہیں۔ اگر انسان خواہش رکھے کہ وہ ہمیشہ خوش رہے اور دکھوں سے محفوظ رہے ناممکن ہے۔ شاعر یہ سبق دینے کی کوشش کر رہا ہے کہ ہر حال میں صبر و قناعت سے کام لینا چاہیئے۔ اقبال نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے وہ فلسفی کے سے انداز سے کہتے ہیں ؎

گو مرا پاکیفِ عشرت ہے شرابِ زندگی اشک بھی رکھتا ہے دامن میں سحابِ زندگی

مگر انسانیت کی تکمیل کے لیے وہ آگے چل کر یہ درس دیتے ہیں کہ ؎

جو خوں نادیدہ ہو بلبل وہ بلبل ہی نہیں

۳۔ دین و دنیا میں تو ہی ظاہر ہے دونو عالم کا ایک عالم ہے

دونو عالم: دونوں جہاں۔ دین و دنیا۔ ایک عالم ہونا: ایک ہی کیفیت ہونا

اس شعر کا موضوع وحدت الوجود ہے وہ اس عقیدہ کے قائل ہیں کہ وجود حقیقی

صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے خدا کا وجود۔ باقی جو کچھ ہمیں نظر آرہا ہے یہ ہمارے حواس کا دھوکا ہے اور فریب نظر ہے اگر بصیرت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو دو نو جہانوں کی ایک ہی کیفیت ہے ظاہر باطن سب ایک ہی ہے اور صرف اللہ ہی اللہ ہے باقی کچھ نہیں۔ لیکن اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے دیکھنے والی نگاہ درکار ہے جسے باطن کی نگاہ کہتے ہیں ظاہر کی نگاہ سے دیکھ کر خدا کا جلوہ دیکھنے کی خواہش رکھنے والے بے سود خام خیالی میں مبتلا ہیں میر نے اسی موضوع کو یوں بیان کیا ہے ؎

گل و رنگ و بہار پردے ہیں — ہر عیاں میں ہے وہ نہاں تک سوچ

خود درد ایک اور جگہ کہتے ہیں ؎

وحدت نے ہر طرف ترے جلوے دکھا دیئے — پردے تعینات کے جو تھے اٹھا دیئے

یا ؎ جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا — تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

۴۔ سلطنت پر نہیں ہے کچھ موقوف — جس کے ہاتھ آوے جام سو جم ہے

اس شعر میں ایک تلمیح ہے جام جم، جام جمشید۔ جام جہاں نما یا ساغر جم حوالہ ہے ایران کے مشہور بادشاہ جمشید کا جس کے متعلق مشہور ہے کہ اس کے پاس ایک پیالہ تھا جس میں سے دنیا بھر میں رونما ہونے والے واقعات نظر آتے تھے۔ اصل واقعہ غالباً یہ ہوگا کہ اس نے کوئی فلکیاتی رصد گاہ بنائی ہوگی اور زمانۂ قدیم کی جہالت کی نسبت سے رصد گاہ کی کا پہاڑ بنا دیا گیا۔

شعر کا مفہوم یہ ہے کہ جمشید کو جام جہاں نما اپنی سلطنت اور اپنے اقتدار کی بدولت میسر نہیں آیا تھا بلکہ بادشاہ کی حیثیت سے بھی اس کی بیشتر کامرانیاں اور ساری شہرت کا انحصار جام جہاں نما پر ہے۔ یہ جام جہاں نما اگر کسی اور کو میسر آجاتا تو وہ بھی سرخرو اور مشہور ہوتا۔ اگر ایسی شہرت کا انحصار بادشاہت یا سلطنت پر ہوتا تو بادشاہ اور سلطان تو اور بھی بے شمار ہو گزرے ہیں وہ گوشۂ گمنامی میں کیوں چلے گئے۔

جام اس شعر میں علامت ہے کمال فن کی اس طرح شعر کا مفہوم یوں بنتا ہے کہ جس کے پاس بھی کمالِ فن ہو شہرت اس کے قدم چومے گی۔ کسی فارسی شاعر نے درست کہا ہے کہ

کسبِ کمال کن کہ عزیز جہاں شوی

یعنی اپنے فن میں کمال پیدا کر تاکہ تو دنیا بھر میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے۔

۵۔ اپنے نزدیک باغ میں تجھ بن — جو شجر ہے سو نخلِ ماتم ہے

مشکلات: اپنے نزدیک: میرے خیال میں؛ تجھ بن: تیرے سوا؛ شجر: درخت؛ نخلِ ماتم: نخلِ تابوت۔ ایک قسم کی آرائش جو مُردوں کے تابوت پر کی جاتی ہے

اس شعر میں باغ علامت ہے دنیا کی اور شجر اور نخل علامات ہیں دیگر مخلوقات عالم کی چونکہ دنیا کو باغ کہا اس لیے اسی مناسبت سے اشیائے دنیا کو اشیائے باغ کے حوالے سے بیان کیا۔ عاشق کو دنیا میں کوئی منظر پسند نہیں آتا خواہ وہ کتنا ہی دلفریب کیوں نہ ہو جب تک کہ اس کا محبوب وہاں اس کی آنکھوں کے سامنے موجود نہ ہو۔ حتیٰ کہ باغ میں بہار آئی ہے جو سب لوگوں کے لیے فرحت کا سامان پیدا کر رہی ہے۔ مگر محبوب کے بغیر اس بہار آمیز باغ کا بلبل اور بوٹا عاشق کو میت کے تابوت میں لگے ہوئے سامانِ آرائش کی طرح نظر آ رہا ہے یعنی وہ دل خوش کن منظر اسے خوش نہیں کر سکا۔ وہ وہاں بھی اپنے ماتم کا سامان دیکھ رہا ہے جیسے کسی شاعر نے کہا ہے کہ ؎

سو بار چمن مہکا سو بار بہار آئی　　دنیا کی وہی رونق دل کی وہی تنہائی

پنجابی صوفی شاعر حضرت میاں محمد نے اس مضمون کو یوں باندھا ہے:۔

باغ بہاراں تے گلزاراں بن یاراں کس کاری

انسان اپنے خارج کے حالات و واقعات کو بھی اپنے داخل کے حوالے سے اور اپنے داخل کے رنگ میں سمو کر دیکھتا ہے۔ جب اس کا اپنا دل مغموم ہو تو پھر دنیا کی کسی رونق میں اسے دلکشی نظر نہیں آتی۔ اسی موضوع کو ان اشعار میں ملاحظہ فرمائیے ؎

آنکھوں میں خار بن کے کھٹکتے ہیں پھول بھی　　گرتم نہیں تو رونقِ گلزار بھی نہیں
بدلا ہوا تھا رنگ گلوں کا ترے بغیر　　کچھ خاک سی اڑی ہوئی سارے چمن میں تھی
۶۔ نہ ملیں گے اگر کہے گا تو　　تیری خاطر ہمیں مقدم ہے

مشکلات: مقدم ہونا: ضروری ہونا۔ واجب ہونا۔ خاطر: دل داری۔ لحاظ

عاشق بے تاب دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر شرف باریابی کی کوشش کرتا ہے بار بار ایسا کرنے سے محبوب برہم ہو گیا ہے اس نے ناراضگی کا اظہار کیا کہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں عاشق بے چارہ کہتا ہے حضور! اگر آپ کا فرمان یہی ہے تو ہم آپ کو ملنے کے لیے کبھی نہیں آئیں گے۔ آپ کے فرمان کا لحاظ کرنا ہمارا اولیں فرض ہے۔ اگرچہ دل کا اولین مقصد دیدار محبوب ہے۔ مگر آپ کا فرمان بجا لانا اس سے بھی کہیں زیادہ ضروری ہے ہم اپنے دل پر قابو پانے کی کوشش کریں گے اور اس جبر کو برداشت کرنے کی کوشش کریں گے۔

۷۔ درد کا حال کچھ نہ پوچھو تم　　وہ ہی رونا ہے نت وہی غم ہے

نت: ہمیشہ، ہر وقت۔

مشکلات: دنیائے عشق ایسی ہے کہ وہاں عاشقانِ صادق کے لیے آلام و مصائب کے

علاوہ کچھ ہے ہی نہیں۔ ایسے عالم میں عاشق صادق کی پہچان ہی یہی ہے کہ وہ ان آلام و مصائب کا رونا روتا رہے نہ یہ آلام و مصائب ختم ہونے میں آتے ہیں۔ نہ عاشق کا رونا دھونا ختم ہوتا ہے اس لیے درد کس بہادر کے حال پوچھنے پر کہتے ہیں۔ کہ میرا کیا حال پوچھتے ہو۔ وہی پرانا۔ دھونا اب تک قائم ہے ؎

وہی دیرینہ بیماری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

نہ خلشِ عشق سے نجات ملے گی نہ ہم اس غم سے نجات پائیں گے جو لازم و ملزوم ہیں۔

غلام ہمدانی مصحفی

حالات زندگی (۱۷۵۱ء تا ۱۸۲۴ء)

نام: غلام ہمدانی ــــ تخلص، مصحفی ــــ ۱۷۵۱ء میں امروہہ میں پیدا ہوئے ــــ والد کا نام شیخ ولی محمد تھا ــــ اوائل عمر میں دہلی میں آئے۔ ابتدائی تعلیم یہیں حاصل کی۔ شعر و شاعری سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ مشق سخن کرتے رہے۔ آہستہ آہستہ ایک شاعر کی حیثیت سے مصحفی کی شہرت پھیل گئی۔ کتب بینی اور مطالعہ کا شوق تھا۔ دہلی اُجڑی تو بے شمار دوسرے شعرا کی طرح مصحفی بھی ہجرت پر مجبور ہو گئے ــــ لکھنؤ علم و فضل کا مرکز تھا۔ شاہزادہ مرزا سلیمان شکوہ نے مصحفی کو اپنے ہاں ملازمت دی۔ اُن کی بقیہ عمر لکھنؤ میں ہی گذری ــــ تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ تقریباً تہتر برس کی عمر پا کر ۱۸۲۴ء میں لکھنؤ میں انتقال کیا۔

خصوصیات کلام

مصحفی فارسی اور اردو زبان دونوں کے شاعر تھے۔ مطالعے کی کثرت اور وسعت نے ان کی شاعری کو اور نکھار دیا تھا بڑے پُر گو تھے۔ غزل، قصیدہ، مثنوی اور قطعہ وغیرہ اصناف میں طبع آزمائی کی اور آٹھ دیوان یادگار چھوڑے۔ فارسی زبان میں اردو شعراء کا ایک تذکرہ بھی لکھا اس کے علاوہ نثر میں بعض چھوٹے چھوٹے رسائل بھی تصنیف کیے۔ اہم خصوصیات یہ ہیں۔

۱۔ **تنوع** ان کی شاعری اپنے رنگ و آہنگ کے اعتبار سے بڑی متنوع ہے ان کے ہاں دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ ان کے ہاں میر تقی، سودا، جرأت، انشا اور میر سوز وغیرہ کے رنگ کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ دراصل

انہوں نے اغراض اکتساب سے کبھی اجتناب نہیں کیا۔ وہ طبعاً سنجیدہ اور متین انسان تھے۔ مگر انشاء کی ظرافت نے انہیں بھی ویسا رنگ اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ بایں ہمہ مصحفی کا اپنا شخصی اور متفرد رنگ موجود ہے۔

۲۔ نرم لہجہ اور غنائیت مصحفی ایک قادر الکلام شاعر تھے، آتش، خلیق اور ضمیر نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور بعد میں شعر گوئی میں بڑا نام پیدا کیا ـــــ اُن کا لب و لہجہ بالعموم دھیما اور نرم ہے۔ الفاظ کے انتخاب و استعمال میں انہیں خاص سلیقہ ہے۔ ترنم اور موسیقیت کا خیال رکھتے ہیں چنانچہ ان کی شاعری میں غنائیت کی ایک ایسی کیفیت پیدا ہو گئی ہے جو انہیں اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہے۔ انہوں نے طویل ردیفوں سے شعروں میں حسن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے ہاں سہ لفظی ردیفیں بھی ملتی ہیں ان میں سے اکثر ردیفیں مکمل جملوں کی صورت میں ہیں اور معنی کے اعتبار سے مکمل ہیں مثلاً:

ہوا ہے عشق کا اظہار دیکھیے کیا ہو ۔۔۔ سبھی ہے اس نے بھی تلوار دیکھیے کیا ہو

۳۔ نفسیات کا گہرا مطالعہ مصحفی کے احساسات میں داخلی غم اور دروں بینی کی کیفیت کا خوبصورت اظہار ملتا ہے۔ ان کے شخصی و انفرادی احساسات بڑے نرم و نازک ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار میں نفسیات انسانی کا گہرا مشاہدہ موجود ہے ؎

جتنی الفت زیادہ ہوتی ہے ۔۔۔ دل کو حسرت زیادہ ہوتی ہے
دیکھتا ہوں جو تیری صورت کو ۔۔۔ مجھ کو حیرت زیادہ ہوتی ہے
میری اور تیری یہ نہیں معلوم ۔۔۔ کیوں محبت زیادہ ہوتی ہے
وصل میں مصحفی فراق سے بھی ۔۔۔ کچھ مصیبت زیادہ ہوتی ہے

جہاں لکھنوی دبستان کا خارجی رنگ ملتا ہے۔ وہ بھی روایتی لکھنؤیت سے ممتاز ہے ان کا محبوب گوشت پوست کا انسان ہے اور روایتی محبوب سے منفرد نظر آتا ہے ؎

میں ہوا ہوں جس پہ عاشق یہ عجب معاملہ ہے ۔۔۔ کہ مرے عوض لگا ہے اُسے اضطراب اُلٹا

تمہاری اور میری کج ادائیاں ہی ہیں ۔۔۔ رہے ہے جو میرے پاس تو باہم لڑائیاں ہی ہیں
چشم بد دور وہ کافر ہے طرح داروں میں ۔۔۔ جس کے ہنسنے سے گلے پڑتے ہیں رخساروں میں

۴۔ تصویر کاری رنگ و روپ، صورت و شکل، سجاوٹ اور نکھار کا آئینہ دار جتنا مصحفی کا کلام ہے کسی اور غزل گو کا کلام نہیں۔ فراق گورکھپوری کے بقول مصحفی کا کلام ایک تصویر خانہ یا پکچر گیلری ہے مثلاً

بھیگے سے ترا رنگ حنا اور بھی چمکا ۔۔۔ پانی میں لگا ریں کفِ پا اور بھی چمکا

شب کی جھلک دکھا کر وہ مہ چلا گیا ہے ۔۔۔ ابتک وہی سماں ہے غرفے کی جالیوں پر

۵۔ قادر الکلامی | مصحفی نے سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کرتے ہوئے انہیں اتنا آسان بنا دیا کہ مصحفی کی قادرالکلامی کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ انشاء اور مصحفی کے معرکوں کے سلسلے میں وہ غزلیں، جن کے قافیے اور ردیف "مغرور کی گردن"۔ "تنگور کی گردن" وغیرہ ہیں۔ اس بات کا بین ثبوت پیش کرتی ہیں۔

غزل نمبر ۱

۱ یہ قصہ تمام ہو چکا اب بس اپنا تو کام ہو چکا اب

مشکلات | قصہ تمام ہونا: داستان پوری ہونا۔ ختم ہو جانا، کام ہو چکا: جان سے جانا۔ ہلاک ہو جانا۔ مصحفی کو میر، درد اور اثر کی تقلید میں چھوٹی اور شگفتہ بحروں کے ساتھ انس ہے، جن میں انہوں نے پُر تاثیر اشعار کہے ہیں۔ مصحفی کی ایسی غزلوں پر متقدمین کا رنگ غالب ہے۔ یہ غزل ایسی ہی غزلیات میں سے ہے۔ مصحفی نے ایک اور غزل میں کہا ہے ؎

صفحۂ روزگار پر لکھ لکھ عشق کی داستان چھوڑ گئے

نصابی شعر میں اسی داستان عشق کی طرف اشارہ ہے کہ اب میرا خاتمہ بالخیر ہے۔ میں جان سے گیا میرے اس خاتمے کے ساتھ ہی وہ قصۂ عشق بھی ختم ہوا جسے میں صفحۂ روزگار پر برابر لکھتا رہا ہوں۔ یہ قصہ ہجر و فراق کا قصہ تھا۔ یہ داستان آلام و مصائب کی داستان تھی۔ اس کا مرکزی کردار میں خود تھا۔ اب ستم سہنے کی ہمت نہیں اس لیے ہلاک ہونے والا ہوں اور میری ہلاکت کے ساتھ ساتھ یہ قصہ بھی تمام ہوا

اس شعر میں الفاظ کی سادگی اور روانی ہے۔ جذبہ کا خلوص ہے۔

۲ جب ظالم ملک سر پہ آئے! دُنیا کا نظام ہو چکا اب

مشکلات | ظالم ملک: حکمران۔ ملک کا نظام چلانے والے

مصحفی کا دور تاریخی لحاظ سے سیاسی بدامنی اور اقتصادی بدحالی کا دور ہے۔ زمانے کے خارجی حالات نے خود مصحفی کو متاثر کیا۔ وہ خود ان حالات کا شکار ہوئے اس لیے ان خارجی اثرات کا عکس ان کے کلام میں ملتا ہے۔ اس شعر میں غالباً خارجی حالات کو موضوع بنایا گیا ہے کہ جب ملک کا سربراہ بے فکر ہو کر لمبی تان کے سو رہے اور ملک کے نظم و نسق پر کوئی فکر نہ رکھے تو نتیجہ ظاہر ہے کہ ستر پسند عناصر کی عید ہو گی۔ نظام سلطنت درہم برہم ہو گا۔ شرفاء کی پگڑی اچھلے گی اور یہی کچھ مصحفی کے دور میں ہوا۔ جسے نہ صرف اس

نے اپنی آنکھوں سے دیکھا بلکہ وہ خود کئی بار اس کا نشانہ بنا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس زمانے کے خارجی حالات کی عکاسی محسنؔ کے کلام میں ملتی ہے۔

۳ قاصد اگر اس گلی میں جائے گا کبھی کہ غلام ہو چکا اب

مشکلات قاصد: پیغام رساں، غلام: عاشق۔ خود محسنؔ، ہو چکا: مر چکا
غزل میں جس داستانِ عشق کا ذکر ملتا ہے۔ اس میں کردار قاصد بھی ہے جو عاشق زار کی جانب سے محبوب تک پیغام لے جاتا اور لے آتا ہے۔ عاشق خود محبوب کے ہاں دو دو بوجہ سے جانا نہیں چاہتا۔ ایک یہ کہ اس کے جانے سے رازِ عشق افشا ہو گا۔ رسوائی ہو گی۔ دوسرے خود محبوب نہیں چاہتا کہ عاشق اسے ملنے کے لیے آئے۔ محسنؔ نے اس شعر میں قاصد سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ اسے مخاطب کرتے کہتے ہیں۔ اگر تمہارا جانا کہیں کر پھر محبوب میں ہو۔ تو میرا آخری پیغام پہنچا دینا کہ تمہارا بندہ و غلام یعنی محسنؔ اب مزید تابِ ستم نہیں لا سکتا یوں سمجھو کہ مر گیا۔ دراصل اس پیغام کے بھیجنے سے عاشق کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ شاید بے رحم محبوب کو خبرِ مرگ سے ہی عاشق پر رحم آجائے

۴ دُنیا ہے سرائے فانی اس سے چلے کہ مقام ہو چکا اب

مشکلات سرائے: مسافروں کے پڑاؤ کے لیے جگہ، مقام ہو چکا: عرصہ قیام ختم ہوا
دُنیا کی بے ثباتی ظاہر کرنے کے لیے شاعر نے دُنیا کو ایک عارضی سرائے سے تشبیہ دی ہے دیہہ شہر دونوں میں مسافروں کا عارضی قیام ہے۔ جس طرح مسافر لوگ دور دراز کے سفر کے دوران کسی مقام پر پڑاؤ کرتے ہیں اور چند روز کے لیے اس مقام کی سرائے میں قیام اختیار کرتے ہیں۔ پھر چند روز قیام کے بعد اگلی منزل کی طرف کوچ کر جاتے ہیں اس طرح اس جہان فانی میں بھی لوگ مسافر کی حیثیت سے آتے ہیں۔ کچھ عرصہ یہاں گزار کر اگلے جہان یا اگلی منزل کی طرف کوچ کر جاتے ہیں۔ شاعر اپنے آپ سے مخاطب ہے کہ میرا عرصہ قیام اس دُنیا میں ختم ہو گیا ہے اب چاہیے کہ اگلی منزل کو چلیں۔ بالآخر یہاں کا انجام فنا ہے۔

غزل نمبر ۲

(۱) نہ گیا کوئی عدم کو دلِ شاداں لے کر یاں سے گیا کیا نہ گئے حسرتِ ارماں لے کر

مشکلات عدم: اگلا جہان۔ موت کے بعد کی زندگی، دلِ شاداں: خوش و خرم دل
اس میں عشقِ مجازی کا ذکر کیا ہے۔ کہ عشاق بے چارے اس دُنیا میں زندگی بھر محروم و ملال رہتے ہیں۔ ہجر کی آگ میں جلتے رہتے ہیں۔ ان کی ساری تمنا خاک میں مل جاتی ہے۔ ناکامی اور نامرادی ان کا مقدر ہوتی ہے۔ اسی محرومی اور نامرادی کے دوران فرشتہ اجل

انہیں آ لیتا ہے اور دل ہی نہ جانے کیا کیا حسرتیں اور ارمان باقی ہوتے ہیں کہ موت انہیں اپنی گود میں لے لیتی ہے شاعر کے مطابق اس کے مشاہدے میں کوئی ایسا عاشق نہیں جو اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت خوش و خرم دل کے ساتھ گیا ہو اس کے مشاہدے میں ایسے لوگ ہیں جو اپنے دل میں نہ جانے کیا کیا ناکام تمناؤں کے ارمان لے کر مرتے ہیں۔ "کیا، کیا" کی تکرار سے ادرک کی آواز کی تکرار سے شعر میں موسیقیت پیدا ہوتی ہے۔ الفاظ "کیا کیا" کو حسرت و ارمان کے ساتھ ملا کر پڑھیں تو صحیح مفہوم ذہن میں آتا ہے کہ نہ جانے کیا کیا حسرتیں دل میں لیے مر گئے غالب نے کہا ہے ؎

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد — مجھ سے مرے گناہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

۲ باغ وہ دشتِ جنون تھا کہ کبھی جس میں سے — لالہ و گل کے ثبات نہ گریباں لے کر

مشکلات دشتِ جنون: وہ جنگل جہاں اہلِ جنون آوارگی کرتے ہیں

شاعر نے ایک طرف دشت کا ذکر کیا ہے۔ پھر اسے باغ قرار دیا ہے یہ کوئی بے جوڑ بات نہیں ہے کیونکہ صحراؤں اور جنگلوں میں بھی قدرتی نباتات اگتے ہیں۔ پھول کھلتے ہیں۔ پھولوں کے کھلنے کی نسبت سے اسے یعنی دشت جنون کو باغ کہا ہے۔ جنگل میں پھول کھلنے کا ذکر اکثر شعرا نے کیا ہے ایک مصرع ہے ۔۔۔ ع پھول جنگل میں کھلے کن کے لیے

اقبال نے اپنی ایک مشہور غزل میں کہا ہے ع

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار

ضروری نہیں کہ دشت بے آب و گیاہ ہو جس دشت جنون کا تصور مصحفی نے پیش کیا ہے۔ اس میں بھی پھول اگتے ہیں۔ چنانچہ اس نے دوسرے مصرعے میں لالہ و گل کا حوالہ دیا ہے یہ دونوں پھول جب کھلتے ہیں تو ان کی پتیاں یعنی برگِ گل جدا جدا ہوتی ہیں۔ شاعر نے کہا کہ دراصل ان کے گریبان چاک کر دیئے گئے شاعر نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ اس دشت میں آ کر نہ صرف اہلِ جنون چاک گریبان پھرتے ہیں۔ بلکہ دشت کی چیرہ دستی سے لالہ و گل بھی محفوظ نہیں۔ دشت کے کانٹوں نے ان کے گریبان بھی چاک کر ڈالے۔ چاک گریبانی اس دشت کی امتیازی خصوصیات میں ہے ہے جو بھی یہاں آئے گا اس کا گریبان چاک ہو گا

۳ پردہ خاک میں سو رہے جا کر افسوس — پردہ رخسار پہ کیا مہ تاباں لے کر

مشکلات پردہ خاک میں: زیرِ زمین، سو رہے: مرنے کے بعد دفن ہو کر ہمیشہ کی نیند سو رہے ہیں۔ مہ تاباں: روشن چاند یعنی حسین محبوب

اس شعر میں جہاں "گ" اور "س" کی تکرار سے صوتی اثر پیدا ہوا اور لفظ "سو سو" اور "کیا کیا" کی تکرار

موسیقیت پیدا ہوتی ہے "کیا کیا مہ تاباں" کی نسبت سے "سر" کا لفظ بھی دوبارہ استعمال کیا۔ کیا کیا مہ تاباں کا مطلب کیسے کیسے خوبصورت اور حسین محبوب جو اپنی زندگی گزار کر موت کے آنے پر اپنے رخسار پر کفن کا پردہ ڈال کر زیر زمین ہمیشہ کی نیند سو گئے۔ عام طور پر سوتے وقت انسان منہ پر کوئی پردہ ڈال لیتا ہے۔ سونے کی نسبت سے رخسار کے اسی پردہ یعنی کفن کا ذکر ہے۔ شاعر کو حسن و جمال سے لگاؤ ہے۔ وہ حسن پرست ہے۔ اس لیے حسن کو زندہ جاوید دیکھنا چاہتا ہے مگر حسن کو بھی زوال ہے۔ اقبال نے کہا ہے ع وہی حسین ہے حقیقت زوال ہے جس کی۔ مگر مصحفی اس زوال پر ملول ہے۔ اس لیے افسوس کا لفظ استعمال کیا ہے نہ جانے کیسے کیسے حسین محبوب موت کی نیند سو گئے غالب نے اسی مضمون کو یوں پیش کیا ہے اور کیا عمدہ انداز ہے ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں — خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

۴ ابر کی طرح سے کر دیں گے عالم کو نہال — ہم جدھر جاویں گے یہ دیدۂ گریاں لے کر

مشکلات نہال کرنا، سیراب کرنا، دیدۂ گریاں، روتی ہوئی آنکھ

مصحفی نے ایک اور شعر میں اپنی گریہ سامانی کا ذکر یوں کیا ہے۔ ع

تو سیر کو نہ آیا ابر بہار تھے ہم

اس شعر میں مصحفی نے اپنی گریہ سامانی کا ذکر کرتے ہوئے دیدۂ گریاں کو ابر سے تشبیہ دی ہے۔ وجہ شبہ دونوں کا برسنا ہے شاعر کے دل میں غم و الم کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے کہ جس کے نتیجے میں آنسوؤں کے سمندر اندر امڈ رہے ہیں۔ شاعر کا دعویٰ ہے کہ اگر ہم رونے پر آ گئے تو روتی آنکھ کے ساتھ جہاں کہیں جا پڑے سارے عالم کو اسی طرح سیراب کر دیں گے۔ جس طرح ابر برس کر سب کو سیراب کر دیتا ہے یہاں تو مصحفی نے احتیاط سے کام لیا ہے اور اپنے آنسوؤں کی جھڑی کو بادل کی جھڑی سے تشبیہ دی ورنہ عموماً شعرا آنسوؤں کی جھڑی کو زیادہ زوردار ثابت کرتے ہیں۔ اپنی ایک چھوٹی بحر کی غزل میں مصحفی نے آنسوؤں کی جھڑی کا ذکر یوں کیا ہے۔ ؎

گرا بر گھرا ہوا کھڑا ہے — آنسو بھی تلا بندھا کھڑا ہے

اس شعر میں "ا" اور "گ" کی آواز دل کی تکرار ہے۔ جو دھیمی اور ملائم آوازیں شمار ہوتی ہیں۔ ان سے اس شعر میں موسیقی اثر پیدا ہوا ہے

۵ پھر گئی سوئے ایران قفس باد صبا — خبر آمد ایام بہاراں لے کر

مشکلات سوئے ایران قفس، پنجرے میں بند قیدیوں کی طرف، خبر آمد ایام بہاراں بہار کے موسم کی آمد کی خبر۔

موسم بہار میں ٹھنڈی اور خوشگوار ہوا صبا چلتی ہے۔ جو دل کو فرحت پہنچاتی ہے اور موسم بہار کی

اطلاع دیتی ہے۔ آزاد لوگوں کے لیے تو یہ خبر بڑی روح افزا اور فرحت انگیز ہوتی ہے مگر قیدیوں کے لیے یہ خبر قید سے بھی زیادہ روح فرسا اور غم انگیز ہوتی ہے۔ کیونکہ ان کی کرا پنی آزادی کے دور کے ایام بہار یاد آجاتے ہیں۔ جب خوشی سے چہچہاتے تھے۔ اپنی خوشی سے آتے اور اپنی خوشی سے جاتے تھے۔ پرواز پر کوئی پابندی نہ تھی۔ چنانچہ صبا کے پہنچنے پر جب انہیں آمد بہار کا احساس ہوتا ہے تو ان کے دل پر ایک چوٹ لگتی ہے۔ قیدی پرندے کو علامت بنا کر شاعر نے اپنے دل کی کیفیت بیان کی ہے کہ میں اپنی منزل سے دور قید تنہائی میں وقت گزار رہا ہوں۔ بہار آئے یا نہ آئے اس کے کس کام کی۔ بقول ؎

سو بہار چمن مہکا سو بار بہار آئی — دُنیا کی وہی رونق دل کی وہی تنہائی

۹ معنی گر شہ عزلت کو سمجھ تخت شہی — کیا کرے گا تو عبث تخت سلیمانی لے کر

مشکلات گر شہ عزلت: تنہائی کا گر شہ، تخت شہی، بادشاہی تخت، عبث: فضول تخت سلیمانی تلمیح ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ پیغمبر تھے۔ جن کو بڑے کر و فر پر حکومت حاصل تھی۔ اس لیے ان سے بڑا بادشاہ کوئی نہیں گزرا جن دیو بیں ان کے زیر تسلط تھے۔ معنی اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ تخت سلیمانی لے کر اور ان جیسا اقتدار حاصل کر کے بھی کیا حاصل ہوگا انجام تو ہے ہی اس لیے بہتر یہ ہے کہ گوشۂ تنہائی کو اپنا تخت سمجھ لو۔ یہ گوشہ تنہائی عافیت کا سامان ہے۔ دُنیا جتنی زیادہ ملے گی اتنی ہی ذمہ داریاں اور الجھنیں بھی زیادہ ہوں گی۔ اس گوشے میں بے فکری کی زندگی گزار رہے ہو الجھنوں سے محفوظ ہو اس سے زیادہ اور کیا مانگتے ہو۔ فقر و درویشی اور ناداری میں یہ مصلحت تو ہے کہ آدمی میٹھی نیند سوتا ہے غالب نے کہا ہے کہ ؎

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا — رہا کھٹکا نہ چوری کا دُعا دیتا ہوں رہزن کو

خواجہ حیدر علی آتش

۱۷۷۴ء تا ۱۸۴۶ء

حالات زندگی

نام: حیدر علی ——— تخلص: آتش ——— والد علی بخش دہلی میں مقیم تھے۔ شجاع الدولہ کے زمانے میں ہجرت کر کے فیض آباد میں جا بسے۔ آتش ۱۷۷۴ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی

بچپن والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا جس کے نتیجے میں تعلیم ادھوری رہ گئی (بعد میں اپنے طور پر عربی فارسی پڑھی)۔ دوسرے آتش کے مزاج میں آوارگی اور شوریدہ پشتی پیدا ہو گئی۔ شاعری کا ملکہ خدا داد تھا اس لیے جلد ہی شعر کہنے لگے۔ اتفاق سے نواب مرزا محمد تقی خاں شاعری اور سپہ گری دونوں کے دلدادہ تھے۔ چنانچہ آتش کر اُن کے ہاں ملازمت مل گئی اب وہ لکھنؤ پہنچ گئے اور مصحفی سے اصلاح لینے لگے۔

آتش قناعت پسند اور درویش صفت انسان تھے۔ تنخواہ کا بڑا حصہ فقیروں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ کبھی کبھار فاقہ بھی کر لیتے تھے۔ ایک جھونپڑی نما مکان میں رہتے تھے۔ فقیرانہ اور سپاہیانہ وضع کے سبب آنے والوں سے ان کا طرز عمل بڑا بے نیازانہ ہوتا تھا۔ لکھنؤ میں ناسخ اُنکے مدمقابل تھے مگر ان کا بڑا احترام کرتے تھے اور اُن کی وفات پر شعر گوئی ترک کر دی تھی۔ آتش کے شاگردوں میں نواب مرزا شوق، دیا شنکر نسیم، رند اور صبا جیسے شعرا شامل ہیں

۱۸۴۶ء میں انتقال کیا۔

کلام آتش کی خصوصیات

زبان کی صفائی آتش نے زیادہ تر غزلیں کہی ہیں۔ آتش کی زبان بڑی صاف ستھری اور شستہ و رفتہ ہے۔ ان کا انداز بیان لکھنؤ کے شرفا کی بول چال کا ہے۔ ان کا مشہور شعر ہے

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں　　شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

گو یا وہ شاعری کو ایک طرح کی مرصع سازی سمجھتے ہیں۔ مگر ان کی مرصع سازی لکھنؤ کی دبستان سے بڑی مختلف اور منفرد ہے۔ ان کے ہاں تکلف اور تصنع مطلق نہیں۔ ترشے ہوئے الفاظ جو برجستہ مرجھوں کی طرح ایک لڑی میں پروئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

رجائی لہجہ آتش کے ہاں زندگی کے حقائق کا گہرا احساس ملتا ہے۔ ان کا لہجہ رجائی ہے۔ ان کی عمر کا بیشتر حصہ لکھنؤ میں گزرا۔ چنانچہ ان کے ہاں مسرت و راحت طلبی کا احساس، لکھنویت کا ہی اثر ہے۔ معاملہ بندی اور محبت کے خارجی پہلو کو آتش نے ایک صحت مند رجحان بنا کر پیش کیا ہے۔ مثلاً ؎

ہر شب شب برات ہے، ہر روز روز عید　　سوتا ہوں ہاتھ گردن مینا میں ڈال کر

یار کر میں نے مجھے یار نے سونے نہ دیا　　رات بھر طالع بیدار نے سونے نہ دیا

سوز و گداز لکھنؤ میں عمر بسر کرنے کے باوجود ان کے ہاں عشق و محبت کا وہ تصور، وہ دردمندی، وہ خلش و آرزو، وہ درد و کسک ملتی ہے۔ جس سے بالعموم لکھنوی شاعری خالی ہے۔ یہ دلستان دہلی کا رنگ ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں،

کسی نے مول نہ پوچھا دل شکستہ کا کوڑی خرید کے ٹوٹا پیالہ کیا کرتا

پھوٹ بہنے دو مجھے یار کے آگے آنسو دل کا احوال بھی آنکھوں کو بیان کرنے دو

سر پر چھر حال ہر اپ جو خشک صحرا ہوں لگا کے آگ مجھے کارواں روا نہ ہوا

محاورات کا استعمال آتش کو محاورات کے استعمال میں زبردست مہارت حاصل تھی۔ ان کے کلام میں قدم قدم پر اس کی مثالیں ملتی ہیں ؎

زمین چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

آتش کے اکثر مصرعے ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ مثلاً

؎ ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

؎ یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا

؎ بس ہو چکی نماز، مصلے اٹھائیے

؎ میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

لکھنوی انداز ان کے ہاں لکھنویت کا مصنوعی اور تکلفانہ انداز بھی ملتا ہے جو لکھنؤ کی روایتی شاعری سے مخصوص ہے۔ جس میں لفظی اور معنوی صنائع پر زور دیا گیا ہے اس سبب سے کہیں کہیں ابتذال کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ مگر یہ بہت نمایاں نہیں ہے

بہر حال آتش کی شاعری میں بڑی تہ داری ہے۔ ان کے اپنے بقول ؎

اپنے ہر شعر میں ہیں معنی تہ دار آتش

ان کے ہاں رجائیت کے ساتھ حزن و یاس کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ بعض غزلوں میں احساس انبساط دو چار شعروں کے بعد اپنا رخ غم و حرماں کی طرف موڑ لیتا ہے۔ اردو شاعری

کی تاریخ میں اُن کا مقام بلند ہے

غزل نمبر ۱

۱ میری آنکھوں کے آگے آئے گا کیا جوش میں دریا ہمیشہ صورت ساحل ہے یاں آغوش میں دریا

مشکلات دریا: سمندر، صورتِ ساحل: ساحل کی مانند، یاں: یعنی آنکھ میں، آغوش میں ہونا: بغل گیر ہونا، ہم کنار ہونا، باہوں میں ہونا

شاعر نے آنکھوں میں امڈنے والے آنسوؤں کے سمندر کا ذکر کیا ہے کہ اس کے سامنے جوش دریا یعنی سمندر کا سیلاب بھی ہیچ ہے۔ یہاں ایک خوبصورت تشبیہ دے کر سمندر کی کوتاہی اور آنکھوں کی وسعت کا ذکر کیا ہے۔ کہ جس طرح دریا ساحل سے ہم آغوش ہوتا ہے۔ یعنی اس کی باہوں میں آجاتا ہے۔ اسی طرح یاں یعنی میری آنکھوں میں سمندر ہم آغوش ہے۔ جس طرح ساحل پورے سمندر کو اپنی باہوں میں لے لیتا ہے۔ اسی طرح میری آنکھوں نے پورے سمندر کو اپنی باہوں میں لے لیا ہے پورے سمندر کی وسعت میری آنکھوں میں سما آئی ہے۔ اس لیے روانی چشم کے مقابلے میں سمندر کی روانی اور اس کا جوش ہیچ ہے۔ آنسوؤں کا یہ سمندر ان بے پناہ اور بے انتہا دکھوں کا نتیجہ ہے جو شاعر کو وادیٔ عشق میں جھیلنا پڑے۔ جس طرح ان دکھوں کا کوئی حساب و شمار نہیں ہے۔ اس طرح ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والے آنسوؤں کے سمندر کی وسعت کا بھی کوئی کنارہ نہیں ہے۔ دریا کے ساحل سے ہم آغوش ہونے کی کیفیت کو غالب نے ایک ترکیب "خمیازۂ ساحل" سے نمایاں کیا ہے جو خود غالب کی ایجاد ہے۔ چنانچہ وہ محبوب کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔ ؎

جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

خمیازہ کا مطلب ہے انگڑائی لینا۔ انگڑائی کے وقت باہیں خمیدہ ہوتی ہیں۔ ساحل بھی خمیدہ ہوتا ہے۔ اس لیے غالب نے "خمیازۂ ساحل" کی نہایت ہی مناسب ترکیب بنائی

۲ خموشی اور گویائی مری اک اک سے بہتر ہے سکوت میں یہ قطرہ ہے گہر تو جوش میں دریا

مشکلات گویائی: لب کشائی، بات کرنا، اک اک سے بہتر ہونا: ایک سے ایک بڑھ کر ہونا، سکوت: سکوت خاموشی گہر: موتی، دریا: سمندر

شاعر نے دو تشبیہات کے ذریعے سکوت لب اور لب کشائی کو ایک سے ایک بڑھ کر ثابت کیا ہے کہ میں خاموش رہوں یا کچھ کہوں دونوں صورتیں خوبی میں ایک سے ایک بڑھ کر ہیں۔ خموشی کے عالم میں میں اس قطرہ کی مانند ہوں جو موتی بن کر ڈوبنے میں قدر و قیمت پاتا ہے اور گفتگو کے عالم میں میں وہ قطرہ ہوں جو اپنے اندر سمندر جیسی وسعت اور گہرائی رکھتا ہے۔ دونوں

صورتوں میں میری قدر و قیمت ہویدا (ظاہر) ہوتی ہے۔ اقبال نے خموشی کو بھی گفتگو کا ایک ذریعہ بتایا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ

خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زبان میری

یا یہ کہ بے زبانی زبان نہ ہو جائے۔

اقبال ہی نے خموشی کو سکوت اور گریہ کو تقریر کہہ کر اس مصرعے میں دونوں کو ایک سے ایک بڑھ کر بتایا ہے کہ ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو۔

قطرہ ذرے کو بھی کہتے ہیں۔ انکسار اور عجز کا اظہار کرنے کے لیے ہم اپنے آپ کو ذرۂ ناچیز کہتے ہیں۔ اسی نسبت سے شاعر نے اپنے آپ کو قطرہ سے تشبیہ دی ہے۔ سکوت کے عالم میں وہ قطرہ جو موتی کی طرح قابل قدر ہے اور گریہ کے عالم میں وہ قطرہ دریائے لطافت کا جوش دکھاتا ہے

۳ کیا جو ضبط گریہ تو کیا دریا کو کر زیر میں — کبھی دل کھول کر رویا تو آیا جوش میں دریا

مشکلات گریہ ضبط کرنا: رونے پر قابو پانا، آنسو روک لینا۔ دل کھول کر رونا: خوب رونا۔

حالی نے ایک شعر میں کہا ہے کہ

مرجان دل میں ہیں یہاں خون کے دریا اے چشم

یہی مرضوع آتش کے اس شعر میں باندھا گیا ہے کہ دل میں آنسوؤں کے سمندر موجزن ہیں کہ جب رونے پر آئیں تو دریا بہا دیں۔ جیسے اقبال نے کہا ہے کہ

جب رونے پہ ہم آئیں دریا ہی بہا دیں — شبنم کی طرح ہم کو رونا نہیں آتا

اور مگر رونے پر قابو پالیں اور آنسو روک لیں تو گویا ہم نے اپنے کرتوں سے چھوٹے دل میں آنسوؤں کے سمندر کو بند کر دیا۔ دونوں صورتوں میں ہم نے معرکہ مارا اور عظیم کارنامہ انجام دیا۔ اصل میں اس عظیم کارنامے کا نام لے کر شاعر کہنا یہی چاہتا ہے کہ

مرجان دل میں ہیں یہاں خون کے دریائے چشم

یہ مضمون غزل میں ایک پامال مضمون ہے۔ ہر شاعر نے اپنی بساط کے مطابق اسے اپنے اپنے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس شعر میں "ک" کی آواز کی تکرار اور "کیا" اور "گریہ، دریا، رویا، آیا میں "یا" کی تکرار سے ایک خوشگوار مترنم آہنگ پیدا ہوا ہے۔

۴ اگر موتی نہ بنتے قطرہ ہائے ابر نیساں سے — تو حلقہ ڈالتا آتش صدف کے گوش میں دریا

مشکلات قطرہ ہائے ابر نیساں: موسم بہار کی بارش کے قطرے، گوش میں حلقہ ڈالنا: غلام بنانا، سزا دینا، صدف: وہ سیپی جس میں قطرہ ابر نیساں کے موتی بنتے ہیں

اس شعر میں کوئی خوبی نہیں ہے۔ شاعر نے گوش میں حلقہ ڈالنا" کا محاورہ استعمال کیا ہے اور اس سے ایک نئی بات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہتے ہیں کہ بہار کے بادلوں میں کچھ قطرے بارش کے ایسے ہوتے ہیں کہ وہ دریاؤں اور سمندروں میں گر کر اپنے وجود کو برقرار رکھتے ہیں (یعنی سمندر یا دریا کے پانی میں جذب ہوئے بغیر اور اپنے وجود کو فنا کیے بغیر) نہ ہیں جا کر صدف میں جا گرتے ہیں اور ساتھ ہی صدف کا منہ بند ہو جاتا ہے۔ وہی قطرہ بائے باراں موتی بن جاتے ہیں۔ آتش کہتے ہیں کہ سمندر کی خواہش یہی ہے کہ اس کی تہیں موتیوں سے مالا مال رہیں اس لیے وہ ان قطروں کو موتی بنتے دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر یہ قطرے موتی نہ بنتے تو صدف دریا کے غیض و غضب کا شکار ہوتا اور دریا سزا کے طور پر صدف کے کان میں چھلا ڈال کر اسے غلام بنا لیتا۔ جب غلاموں کی خرید و فروخت ہوتی تھی تو مالک اپنے اپنے غلاموں کے کانوں میں سوراخ کر کے اپنی اپنی نشانی کا چھلا ڈال دیتے تھے تاکہ فرار کی صورت میں جب غلام پکڑا جائے تو اُسے چھلے کے ذریعے پہچان کر اصل مالک تک پہنچا دیا جائے۔

ایسے ہی فضول مضامین ہیں۔ جنہیں غزل میں باندھ کر غزل کو ہدف تنقید بنایا گیا۔

غزل نمبر ۲

۱ نہ کسی کو کڑوی کہی ہم نے نہ کسی کی کڑی اُٹھائی بات

مشکلات کڑی کہنا: سخت بات کہنا، ناگوار بات کہنا، کڑوی بات اُٹھانا: سخت بات سہنا۔

اس شعر میں شاعر نے ایک ایسی بات کو اپنا موضوع سخن بنایا ہے۔ جس کا تعلق انسانوں کے آپس کے معاملات اور طرز عمل سے ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میرا طرز عمل یہ رہا ہے کہ میں نے کبھی کسی کو سخت سُست نہیں کہا۔ کبھی کسی سے ایسی بات نہیں کی جو اس کی طبع کو ناگوار گزرے اور پھر اگر اس کے مقابلے میں کسی نے کوئی سخت بات جیں کہہ دی تو ہم نے اسے بھی کبھی برداشت نہ کیا یا شاعر کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چونکہ میں نے کبھی کسی کو ناگوار بات نہ کہی اس لیے مجھے بھی کبھی کسی نے ایسی بات نہ کہی۔ جیسا بوؤ گے ویسا کاٹو گے۔

۲ دردِ دل کہنے میں ہے کیا پس و پیش کہی جاتی ہے منہ تک آئی بات

مشکلات دردِ دل: دل کا دکھڑا، پس و پیش: تردد۔ سوچ بچار۔ جھجک، منہ تک آئی بات: زبان تک آئی ہوئی بات۔

یہاں شاعر نے غزل کے روایتی عاشق کے برخلاف نیا رویہ اپنایا ہے۔ عام طور پر دردِ دل

کو سینے میں ہی پالا جاتا ہے۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں ؎

نالہ ہے بلبل شوریدہ ترا خام ابھی — اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

اسی طرح تمام شعرائے غزل یہی کہتے ہیں کہ ضبط غم و گریہ کرنا عشق کی شرط اولین ہے اگر یہ نہ ہو سکے تو عاشق کا عشق خام متصور ہوتا ہے۔ مگر آتش اس شعر میں غزل کی اس روایت کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ زبان تک آئی بات کیسے رُکے۔ اس لیے درد دل کہنے میں پس و پیش نہیں کرنا چاہیے۔ بلا تکلف اپنا حال دل بیان کر دینا چاہیے بقول پنجابی شاعر ؎

منہ آئی بات نہ رہندی اے

۳ تازگی فکر کی کبھی نہ گئی — جب سُنائی، نئی سنائی بات

مشکلات فکر: فکر سخن، تازگی: تنوع، ندرت، نئی بات

اس شعر میں آتش نے اپنی قادر الکلامی کا دعویٰ کیا ہے جیسے ذوق نے کہا تھا ؎

اک رنگ کا مضمون ہو تو سو ڈھنگ سے باندھوں

یا حالی نے کہا تھا کہ ؎

نیا ہے لیجیے جب نام اس کا — بہت وسعت ہے میری داستاں میں

آتش کہتے ہیں میرا فکر سخن ہمیشہ تازہ رہتا ہے۔ جب بھی بات کرتا ہوں مضمون و خیال خواہ مخواہ چپکا پڑا ہو۔ میں اسے ایسے انداز سے پیش کرتا ہوں کہ وہ تازہ اور نیا لگتا ہے۔ اسے جدت بیان کہتے ہیں کہ ایک ہی بات کو ہر بار نیا رنگ بیان دیا جائے۔ آتش کا دعویٰ ہے کہ میرے کلام میں جدت بیان ہے جب بھی فکر سخن کرتا ہوں۔ نئی بات اور نیا انداز پیش کرتا ہوں۔

اس شعر میں ک "گ" کی ملائم آوازوں اور "ن" کی نغمہ سے بھری آواز اور "ی" کی تکرار سے ترنم اور موسیقت پیدا کر دی ہے۔ آتش اپنے کلام میں صوتی اثرات اور ترنم کا خاص اہتمام کرتے ہیں۔

۴ کہہ گئے تم کنائے میں کیا کیا — نہ کسی نے تمہاری پائی بات

مشکلات کنایہ: اشارہ، بات پانا: بات کی تہ تک پہنچنا۔ بات سمجھنا

محفل عشق میں بات کرنے کے کئی طریقے ہوتے ہیں۔ خاموشی اور بے زبانی بھی گویائی کی ایک صورت ہے۔ جس میں آنکھوں آنکھوں میں باتیں ہو جاتی ہیں۔ لب کشائی کی ضرورت ہی نہیں پڑتی ہے۔ عاشق اور محبوب کھل کر اس طرح بات کر لیتے ہیں مگر اہل محفل کو پتہ تک نہیں چلتا دوسرا طریقہ اشارے کنائے میں بات کرنے کا ہے اس کی کئی صورتیں ہیں۔ بعض اوقات ؎

گفتہ آید در حدیث دیگراں کے مصداق دوسروں کے حوالے دے کر اپنے دل کی بات دوسروں تک پہنچا دی جاتی ہے۔ دوسرے لوگ اس راز کو سمجھ نہیں پاتے۔ آتش کے بیان کے مطابق

اس کا مخرب بھی بھری محفل میں اشاروں کنایوں سے اپنا مدعا اُس تک پہنچا گیا۔ مگر آتش کے علاوہ اور کوئی بھی بات کی تہ تک نہ پہنچ سکا۔ اس طرح راز بھی محفوظ رہا اور متعلقہ حلقہ تک اس کے ابلاغ کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔

"کیا کیا" کی تکرار اک کی آواز کی تکرار اور ی مے کی تکرار سے آتش نے اس شعر میں موسیقیت اور ترنم پیدا کر دیا ہے۔

۵ تم جو گویا ہوئے تو پھول جھڑے غنچہ سے منہ میں رنگ لائی بات

مشکلات | گویا ہونے : بات کرنے لگے ، پھول جھڑنا : میٹھے بول بولنا۔ پیاری پیاری باتیں کرنا ، رنگ لانا : اثر دکھانا

آتش نے مخرب کے طرزِ تکلم کی تعریف کی ہے۔ کہ تم جب باتیں کرنے لگتے ہو تو اتنی پیاری پیاری باتیں ہوتی ہیں کہ منہ سے گویا پھول جھڑ رہے ہیں۔ تمہارا منہ غنچہ سا ہے۔ یہاں شاعر نے مخرب کے منہ کو غنچہ سے تشبیہ دی ہے۔ "سے" حرف تشبیہ ہے۔ مخرب کے دہن کو شاعروں نے اس نظریہ کے پیشِ نظر موضوعِ سخن بنایا ہے کہ وہ بہت ہی چھوٹا ہوتا ہے۔ غنچہ بند ہوتا ہے۔ اس لیے مخرب کے منہ کو اس سے تشبیہ دی ہے۔ تشبیہ دے کر غنچہ اور پھول کی نسبت سے رنگ لانے کا محاورہ استعمال کیا ہے۔ یہ لفظی رعایت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہاری باتیں اتنی میٹھی اور پیاری ہوتی ہیں کہ منہ سے نکل کر دل پر اثر کر جاتی ہیں۔

اس شعر میں پھول کا لفظ استعمال کر کے شاعر نے اس کے مناسب رنگ اور غنچہ کا ذکر کیا ہے۔ اس طرح اس شعر میں صنعت مراعاۃ النظیر استعمال ہوئی ہے۔

۶ یہ صدا آتی ہے خموشی سے منہ سے نکلی ، ہوئی پرائی بات

مشکلات | صدا : آواز ، پرائی بات ہونا : بات کا دوسروں میں پھیل جانا۔

خاموشی اور سکوت بھی ایک آواز ہے۔ اسے سمجھنے اور سننے کی کوشش کی جائے۔ تو اس آواز کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ اگر کوئی رازدارانہ بات ایک بار منہ سے نکل گئی۔ تو پھر وہ راز نہیں رہتی بلکہ لوگوں میں یوں عام پھیل جاتی ہے کہ وہ پرائی بات بن جاتی ہے۔ شاعر کا مقصد یہ ہے کہ اگر راز کو سینے میں محفوظ نہ رکھا جائے اور خموشی اختیار نہ کر لی جائے بلکہ کسی کو راز دار بنا کر بات اس ہدایت کے ساتھ بتا دی جائے کہ آگے کسی کو نہ بتانا۔ تو بتانے والے کی بھول ہے کہ وہ راز رہے گی۔ ایک بار جب کسی کے سامنے یہ بات منہ سے نکل گئی۔ تو یوں سمجھ کہ یہ عام لوگوں میں پھیل گئی "منہ سے نکلی" کے بعد وقف ، دے دیا جائے تو مطلب واضح ہوتا ہے۔ یعنی نکلی ہوئی اکٹھا پڑھنے سے مطلب مبہم ہو کر اُلجھ جاتا ہے۔

۷ تیرے شیریں کلام کو سُن کر پھر نہ آتش کسی کی بھائی بات

غزل کے شعر نمبر ۱ مقطع میں آکر اپنی عظمت کے متعلق کوئی بڑا دعویٰ کرتے ہیں۔ آتش نے اس شعر میں دعویٰ کیا ہے کہ میں اتنا شیریں کلام ہوں یعنی میرے کلام اور اشعار میں اتنا رس اور مٹھاس ہے کہ میرا کلام پڑھنے یا سُننے کے بعد لوگوں کو کسی اور شاعر کا کلام پسند ہی نہیں آتا ہے۔ اس کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ میرے کلام میں جتنی حلاوٹ اور مٹھاس پائی جاتی ہے اتنی اور کسی شاعر کے کلام میں نہیں۔ ظاہر ہے کہ آتش کا یہ دعویٰ درست نہیں۔ تاہم شاعر کو ایسا مبالغہ اور دعویٰ کرنے کا حق حاصل ہے۔

غزل نمبر ۳

۱ ہوائے دورِ مے خوشگوار راہ میں ہے خزاں چمن سے بہاری بہار راہ میں ہے

مشکلات دورِ مے: مستی کا دور۔ خوشیوں کے دن، راہ میں ہونا: آمد آمد ہونا

آتش نے اس شعر میں مے، خزاں اور بہار کو علامات کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ان کے لغوی معانی یہاں مراد نہیں بلکہ مے سے مراد مسرت و سرور ہے۔ خزاں سے مُراد ناکامی کا دور اور بہار کا مطلب کامیابی اور سرخروئی کا دور ہے۔ یہ شعر امید افزائی کا ترجمان ہے اس شعر سے یہ احساس ہوتا ہے کہ آتش مایوسی کا شکار نہیں باوجود یکہ وہ نامساعد حالات کا سامنا کرتا رہا ہے اور ناکامیوں سے بھی دوچار ہوا ہے۔ جس کا اظہار لفظ خزاں سے ہوتا ہے۔ لیکن وہ یاس پسند شاعر نہیں ہے۔ اس کی طبیعت میں شگفتگی اور مسرت پیدا ہوتی ہے اور وہ کہتا ہے کہ خزاں جا رہی ہے یا دور آ رہا ہے۔ جو دورِ بہار اور دورِ مے ہے۔ یہ بڑا خوشگوار دور ہوگا اس لیے مایوس ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ یہ آتش کی حوصلہ مندی کی علامت ہے کہ اس نے آلامِ روزگار کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے بلکہ کسی آنے والے بھلے دور کی توقع میں انہیں سہے جا رہا ہے۔

۲ عدم کے کوچ کی لازم ہے فکر ہستی میں نہ کوئی شہر نہ کوئی دیار راہ میں ہے

مشکلات عدم: ہستی کا متضاد۔ موت کے بعد کا جہان، ہستی: زندگی

آتش خود تو بڑے صوفی نہ تھے۔ مگر تصوف کی روایات انہیں اپنے خاندان سے ورثے میں ملی تھیں۔ ان کے ہاں فقر و درویشی کے موضوعات عام ملتے ہیں۔ درویشوں کی نگاہ میں یہ دنیا فانی ہے۔ فنا کا یہ تصور اور عاقبت کی پرسش آتش کے اشعار میں عام موضوع ہے یہاں بھی ہستی یعنی زندگی کی بے ثباتی اور فنا پذیری کے پیشِ نظر انسان کو نصیحت کی ہے کہ اسی زندگی میں ہی اگلے جہان کے لیے زادِ راہ تیار کر لو۔ کیونکہ اگلے جہان کا سفر وہ سفر ہے جس میں اپنے

اعمال کے سوا اور کوئی چیز کام نہیں آئے گی۔ اس دور دراز کے سفر کے راستے میں قیام و آسائش کے لیے نہ کوئی شہر ہے نہ کوئی بستی۔ یہ ساری چیزیں اس دنیا میں ہی رہ جائیں گے وہاں تو اکیلے بغیر کسی کی مدد کے اپنے اعمال کے سہارے ہی منزل پر پہنچنا پڑے گا۔

عدم اور ہستی دو متضاد الفاظ ہیں۔ جنہیں اس شعر میں استعمال کر کے آتش نے صنعتِ تضاد استعمال کی ہے

۳ نہ بدرقہ ہے نہ کوئی رفیق ساتھ اپنے فقط عنایت پروردگار راہ میں ہے۔

بدرقہ: رہنما، رفیق: ساتھی۔

مشکلات اس شعر کا مفہوم پچھلے شعر سے مسلسل ہے اور متعلق ہے کہ اگلے جہان کا سفر ایسا سفر نہیں ہے کہ جہاں اس دُنیا کے مسافر کی طرح تجھے رہنما اور ہم سفر ساتھی میسر آئیں گے۔ یہ سفرِ آخرت تنہا ہی طے کرنا پڑے گا۔ ہاں! اگر کوئی چیز مددگار ہو سکتی ہے تو وہ صرف اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے اور عنایتِ خداوند تو جسے چاہے پار اتار دے۔ عنایتِ خداوند کا استحقاق بھی تو اپنے اندر پیدا کرنا چاہیے۔

۴ سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

مسافر نواز: مسافر پر نوازش کرنے والے۔

مشکلات سفر کی نسبت سے شاعر نے اس سایہ دار کا ذکر کیا ہے۔ ورنہ یہاں سفر بھی علامت کے طور پر استعمال ہوا ہے اور اس کی مناسبت سے استعمال ہونے والی ترکیب شجرِ سایہ دار بھی علامت ہے۔ سفر ہے مُراد ہے اپنی مُراد پانے کی کوشش اور کامیابی حاصل کرنے کی جدوجہد۔ مُراد پانے اور کامیابی حاصل کرنے کی اولین شرط یہ ہے کہ کوشش کی جائے۔ قرآن حکیم میں آتا ہے۔

لَيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ

یعنی انسان کو اس کی کوشش و سعی کی نسبت سے نتیجہ و ثمر ملتا ہے اگر کسی مقصد کے حصول کے لیے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائیں اور اسے توکل کا نام دیں تو یہ ہماری کوتاہ اندیشی اور کم کوشی شمار ہوگی۔ حصولِ مقصد کے لیے تگ و دو اولین شرط ہے۔ جسے شاعر نے سفر کا نام دیا ہے اگر یہ سفر اختیار کر لیا جائے یعنی ایک بار تگ و دو شروع کر دی جائے تو راستے میں آنے والی رکاوٹوں اور تکالیف کو دور کرنے کے سامان خود بخود پیدا ہو جائیں گے ان سامانوں کو شاعر نے ہزاروں سایہ دار درختوں کا نام دیا ہے جو مسافر کو راستے کی تھکاوٹ اور دھوپ سے نجات دلاتے ہیں

۵ مقام تک بھی ہم اپنے پہنچ ہی جائیں گے خدا تو دوست ہے دشمن ہزار راہ میں ہے

مقام: منزل۔ مقصد

مشکلات آتش ایک حوصلہ مند اور درویش شاعر ہے۔ جسے خدا کی نصرت و تائید

پر پورا ابھر رہا ہے۔ اس شعر میں وہ کہتا ہے کہ بے شک میرے مقصد کے حصول میں رکاوٹ ڈالنے والی بے شمار طاقتیں سر ہو رہی ہیں۔ جو مجھ سے دشمنی پر تلی ہوئی ہیں اور جو نہیں چاہتیں کہ میں اپنی منزل مقصود تک پہنچوں مگر میں ان رکاوٹوں اور دشمنوں سے خوفزدہ نہیں ہوں۔ میرے پیش نظر خدا کی اعانت ہے جب تک وہ میرے ساتھ ہے میں قطعاً مایوس نہیں ہوں خدا کی اعانت میسر ہو تو پھر گھبرانے کی کیا بات ہے۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ آتش کا مقام و منزل کیا ہے وہی جو ایک مسلمان کی ہونی چاہیے۔ پھر اس کے دشمن کون ہیں۔ ہر قسم کے لات و منات اور سب سے بڑا دشمن اپنا نفس ہے۔

۶ تھکیں جو پاؤں تو چل سر کے بل نہ ٹھہر آتش — گل مراد ہے منزل میں خار راہ میں ہے

یہاں آتش نے حوصلہ مندی کی انتہا کر دی ہے۔ یہ وہ مسافر نہیں جو تھک ہار کر ارادۂ سفر ہی ترک کر دے۔ بلکہ یہ وہ عزم لے کر سفر پر نکلا ہے کہ اگر پاؤں تھک کر چور ہو جائیں۔ چلنے سے عاجز آ جائیں تو بھی سفر جاری رہنا چاہیے۔ اس لیے اپنے آپ سے کہتا ہے کہ سر کے بل چل نکلو۔ رکنا گناہ ہے کیونکہ یہ ساری تکالیف راستے میں ہی ہیں۔ جب منزل پر پہنچ جاؤں گا تو پھر یہ تکالیف خود بخود ختم ہو جائیں گی۔ گل اور خار متضاد ہے۔ راستے کی تکالیف کو خار سے اور منزل کی راحت و سکون کو گل سے بہت عمدہ نسبت دی ہے۔ ایک فارسی شاعر نے اسی مضمون کو اس شعر میں عمدگی سے باندھا ہے ؎

برادری کہ در دشت را عصا خفت است — بہ سینہ می سپرم راہ گرچہ پا خفت است

غزل نمبر ۴

۱ خوشا وہ دل کہ ہو جس دل میں آرزو تیری — خوشا دماغ جسے تازہ رکھے بو تیری

خوشا: مسرت کا کلمہ۔ بہت اچھا

مشکلات

یہ شعر آتش کی درویشی و فقر کا نمائندہ ہے۔ درویشی کی زندگی خدا کے لیے وقف ہوتی ہے اس لیے شاعر کہتا ہے کہ کیا خوب ہے وہ دل جسے صرف تیری ہی تمنا ہو اور جو صرف تیری ہی آرزو کا مرکز ہو۔ غیر اللہ کا وہاں گزر نہ ہو۔ اس کی آبادی صرف تیری ہی تمنا سے وابستہ ہو اور کیا خوب ہے وہ دماغ جس میں صرف تیری ہی خوشبو آئے۔ ایسے دل و دماغ کو سراہ کر آتش اصل میں چاہتے ہیں کہ کاش مجھے ایسا دل اور ایسا ہی دماغ میسر آئے۔ جہاں تو ہی تو بستا ہو۔ تیرے علاوہ اور کوئی خواہش یا خیال ادھر نہ آئے۔

۲ یقین ہے اٹکے گی جان اپنی آ کے گردن میں ۔۔۔ سُنا ہے جا ہے تری رگِ گلو تیری

مشکلات جا: جگہ۔ مقام ، رگِ گلو: گلے کی رگ۔ شہ رگ

ایک مقولہ مشہور ہے کہ خدا تو ہماری شہ رگ سے زیادہ نزدیک ہے۔ اسی مقولہ کو بنیاد بنا کر شاعر کہتا ہے کہ سُنتے ہیں کہ تو کہیں شہ رگ کے قریب رہتا ہے۔ اسی لیے مجھے یقین ہے کہ نزع کے عالم میں میری جان گردن میں آ کر اٹک جائے گی کہ اسے تو تیرے قرب کی تلاش ہے اس کی منزل تو ہی ہے۔ جب وہ تجھے رگِ جان کے قریب پائے گی تو جان وہیں اٹک جائے گی

۳ یہ گردشِ فلکِ پیر سے ہوا ثابت ۔۔۔ قوی ضعیف کو کرتی ہے جستجو تیری

مشکلات فلکِ پیر: بوڑھا آسمان ، قوی: طاقت ور ، ضعیف: کمزور

شاعر آسمان کو بوڑھا کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ وقت تخلیق سے لے کر اب تک قائم ہے اس کی عمر بہت ہو گئی ہے۔ جس کی عمر زیادہ ہو جائے اسے پیر یعنی بوڑھا کہہ لیتے ہیں لیکن یہ بوڑھا بڑا طاقتور ہے۔ حالانکہ بڑھاپا ضعف کی علامت ہے اور پیر یعنی بوڑھے کو ضعیف بھی کہتے ہیں۔ لفظ پیر سے ضعیف کی نسبت رعایتِ لفظی ہے۔ بوڑھے کو ضعیف ہونا چاہیے۔ مگر آسمان بوڑھا ہونے کے باوجود ضعیف نہیں قوی ہے۔ اسے طاقت کہاں سے ملی؟ شاعر نے غور کیا تو اس کا سبب دریافت کر لیا کہ آسمان چکر لگا رہا ہے اور سرگرداں ہے۔ اس کی گردش اور سرگردانی دراصل نشاندہی کرتی ہے کہ وہ خدا کی جستجو اور تلاش میں لگا ہوا ہے۔ شاعر نے نتیجہ یہ نکالا کہ جو بھی تیری ذات کی جستجو میں لگ جائے وہ ضعیف سے قوی یعنی کمزور سے طاقتور بن جاتا ہے جیسا کہ آسمان کو ضعیف ہونا تھا۔ مگر تیری تلاش میں سرگرداں ہو کر طاقتور بن گیا۔ قوی اور ضعیف متضاد الفاظ ہیں۔ اس لیے اس شعر میں صنعت تضاد کا استعمال ہے

۴ ہوا برگریہ کناں ہے تو برق خندہ زن ۔۔۔ کسی میں ہے غو ہماری کسی میں غو تمہاری

مشکلات گریہ کناں: روتا ہوا ، برق: بجلی ، خندہ زناں: ہنستی ہوئی ، غو: عادت۔ شعار

آتش نے پہلے مصرع میں ابر اور بجلی کی حالت کا الگ الگ ذکر کیا۔ پھر اسی نسبت سے اپنا اور محبوب کا ذکر کیا۔ ترتیب وہی ایک سی ہے۔ ایسی صنعت کو لف و نشر مرتب کہتے ہیں۔ ابر آنسوؤں کے طرح برسنے کی وجہ سے روتا ہوا یا گریاں کہلاتا ہے۔ بجلی چمکتی ہے تو مسکرانے والے انسان کے دانتوں کی طرح چمک دکھاتی ہے۔ اس قرینے سے اُسے ہنستی ہوئی کہا جاتا ہے یا اُسے تبسم سے نسبت دی جاتی ہے۔ اب عاشق زار بھی گریہ کناں ہے۔ اس لیے اس کا تعلق ابر سے ہو گیا اور محبوب ہنسی خوشی وقت گزار رہا ہے۔ اس لیے اسے برق سے نسبت ہو گئی۔ یہ تعلق قائم کر کے شاعر نے

کہہ دیا کہ کسی نے میری عادت اپنائی۔ جیسے ابر نے گریہ کی عادت اپنائی اور کسی نے تیرا شعار اختیار کر لیا۔ جیسے برق خندہ زنی کرتی رہتی ہے یہ نسبت دے کر حاشق اپنی حالت گریہ کا موازنہ مجرب کی حالتِ خندہ زنی سے کرنا چاہتا ہے کہ ہم دونوں کی کیفیت ایک دوسرے کی ضد ہے۔

۵ زمانے میں کوئی تجھ سا نہیں ہے سیف زبان رہے گی معرکے میں آتش آبرو تیری

مشکلات | سیف زبان: تلوار کی طرح تیز زبان رکھنے والا، معرکہ: مقابلہ آبرو: عزت،

مقطع میں آتش نے پھر دعویٰ کیا ہے کہ مجھ جیسا غزل گو اور تلوار کی طرح تیز زبان رکھنے والا شاعر جس کے اشعار میں تلوار کی سی کاٹ ہے کوئی نہیں ہے۔ اس لیے جب کبھی شاعری کا مقابلہ ہوا تو میری عزت برقرار رہے گی۔ میں ہر صورت میں مقابلہ جیت جاؤں گا۔ میری تیز زبان کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔ مقطع میں شعراء ایسے دعوے کرتے رہتے ہیں جو بعض اوقات بے بنیاد بھی ہوتے ہیں۔

مرزا اسد اللہ خاں غالب

نوٹ: غالب کے حالات اور خصوصیاتِ کلام آپ گذشتہ صفحات میں پڑھ چکے ہیں

غزل ۱

۱۔ ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

مشکلات | ہوس: آرزومندی، ذوق و شوق نشاطِ کار: وہ خوشی اور لذت جو کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں ملتی ہے۔

شعراء زندگی کی مہلت قلیل کا ذکر کرتے رہے ہیں۔ مگر اس سے جو مضمون اور خیال غالب نے نکالا ہے وہ غالب ہی کا حصہ ہے۔ موت کے متعلق عام تصور یہی ہے کہ وہ زندگی کو ختم کر دیتی ہے مگر غالب نے موت کا ایک خوش آئند پہلو بیان کیا ہے کہ زندگی کی چہل پہل اور رونق کا سبب ہی موت ہے۔ انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ جتنی مہلت قلیل ملتی ہے، اتنی ہی وہ تن دہی اور تیزی سے کام کرتا ہے کہ اگر مدت کثیر ہو تو وہ سست پڑ جاتا ہے اور ہر کام کو کل پر ٹالتا رہتا ہے۔ موت کا خیال انسانی ذہن کو ہر لحظہ آمادہ کار رکھتا ہے۔ غالب کا خیال ہے کہ اگر موت نہ ہوتی تو انسانی اعمال میں تیزی اور توانائی نہ ہوتی اور زندگی بے کیف ہو کر رہ جاتی۔ یہ شعر انسانی زندگی کی بے یقینی کی نہایت ہی حسین تصویر ہے۔ مرزا زندگی کی اس بے یقینی حالت کا ایک اچھا پہلو ہمارے سامنے لائے ہیں کہ معلوم نہیں انسان کب ختم ہو جائے۔ اس غیر یقینی

کیفیت نے انسانی سعی و سرگرمی کو تیز تر کر دیا ہے۔ ہر چھوٹا بڑا کام جو انسان کے ہاتھوں سے انجام پاتا ہے اُسے خوشی عطا کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس مختصر زندگی میں جو کچھ بھی مکمل ہو جائے غنیمت ہے۔ غرض موت انسان کو افسردہ کرنے کی بجائے اس میں توانائی تیزی اور لذت کار پیدا کرتی ہے۔ غالب کے کلام کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عموماً اچھوتے خیال پیش کرتے ہیں یہ انہی میں سے ایک اچھوتا خیال ہے۔ مرنا اور جینا کا استعمال صنعت تضاد ہے۔ بس کی تکرار اور کیا کی تکرار سے شعر میں صوتی حسن پیدا ہوا ہے۔

۲۔ نوازش ہائے بے جا دیکھتا ہوں شکایت ہائے رنگین کا گلا کیا

مشکلات: نوازش ہائے بے جا: نامناسب اور بے موقع مہربانیاں۔
شکایت ہائے رنگین: پیار کے انداز میں گلے شکوے

جدت غالب کی امتیازی خصوصیت ہے۔ یہاں بھی جدت خیال ہے۔ ایسا خیال کسی غزل گو شاعر کے ہاں نہیں ملتا۔ ہوا یوں ہے کہ غالب کہیں محبوب کے ہاں گئے۔ دیگر شعرا کی طرح خود شکایت کرنے کی بجائے غالب یہ تصور پیش کرتا ہے کہ وہاں میرے محبوب نے میٹھے انداز میں گلے شکوے پیش کرنے شروع کر دیئے۔ غالب اس کے اس انداز شکایت ہائے رنگین میں کھو گیا۔ اسے ایک طرح کا سرور محسوس ہونے لگا۔ کوئی اور ہوتا تو شاید گلہ کے جواب میں گلہ اور شکوہ کے جواب میں شکوہ پیش کرتا۔ مگر غالب کے لیے تو محبوب کی شکوہ سنجی ایک عنایت ہے۔ ایک نوازش ہے جو کبھی کسی محبوب نے کسی عاشق پر نہیں کی۔ اس لئے غالب کہتا ہے کہ محبوب نے تو رنگین شکایت کر کے مجھ پر بے جا نوازشات کی بارش کر دی۔ میں گلہ اور شکوہ کس بات کا کروں۔ میں اس کی ان نوازشات بے جا کو دیکھ کر خود گلہ کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔

۳۔ دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

مشکلات: انا البحر: میں سمندر ہوں قطرہ: ذرہ۔ سمندر کی سے قطرہ کا مناسب لفظ لایا گیا۔

یہاں وحدت الوجود کا عقیدہ پیش کیا گیا ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ کائنات کے ہر ذرے کا دل ایک ساز ہے جس میں سے مسلسل آواز آ رہی ہے "میں سمندر ہوں۔ میں سمندر ہوں۔ مجھے قطرہ نہ سمجھو سمندر سے الگ میرا کوئی وجود نہیں"۔ جب یہ صورت حال ہے تو پھر ہماری ہستی اور ہمارا وجود کیا ہے جو کچھ ہے وہی وجود ازلی ہے۔ ایک اور شعر میں اسی عقیدہ کو یوں پیش کیا ہے

ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

"ہمارا پوچھنا کیا" اور "یہاں کیا دھرا ہے" کے الفاظ ایک ہی کیفیت کو نمایاں کرتے ہیں۔

۴۔ سنا ہے غارت گر جنس وفا تھا شکست قیمت دل کی صدا کیا

مشکلات غارت گر جنس وفا، وفا کی جنس کو لوٹنے والا۔ محبوب۔ شکست قیمت دل دل کی قیمت کا کم ہونا یا ٹوٹنا۔ غالب نظری اور روحانی عشق کے قائل نہ تھے۔ وہ حقیقت پسند تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا محبوب اردو شاعری کے روایتی محبوب کے برعکس ایک زندہ کردار ہے جو محبت، نفرت اور دیگر انسانی جذبات رکھتا ہے۔ بعض اوقات جوش عشق میں ان میں وفا کا جذبہ بلند ہو جاتا ہے لیکن محبوب کی بے وفائی ان کے دل کو توڑ دیتی ہے اور جذبۂ وفا کو پارہ پارہ کر دیتی ہے۔ ایسے ہی موقع وہ تڑپ کر یہ شعر کہہ اٹھتے ہیں۔ اے جنس وفا کو لوٹنے والے اور تباہ کرنے والے ظالم محبوب! جنس دل کی قیمت ٹوٹنے یعنی کم ہونے کی آواز نہیں ہے، جذبہ وفا دل میں تھا۔ سو تو نے اس جنس گراں مایہ کو لوٹ کر دل کی قدر و قیمت گنوا دی۔ مگر یہ وہ شکست و ریخت ہے جس کی صدا نہیں ہے۔

ردِ عمل کے طور پر عام انسانی فطرت اور جذبہ انتقام سے مغلوب ہو کر غالب پھر یوں اعلان بے وفائی بھی کرتے ہیں ؎

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا — تو پھر اے سنگ دل! تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

۵۔ بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات — عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

مشکلات بلائے جاں: جی کا جنجال۔ بڑی مصیبت عبارت: بیان۔ اشارت اشارہ رمز

غالب کا محبوب اردو دو غزلہ کا روایتی محبوب نہیں کہ جس کے ہاں عاشق زار کو شرف باریابی ہی نصیب نہیں ہوتا۔ غالب اپنے محبوب سے کھل کر باتیں کرنے کے مواقع سے بھی مستفید ہوتا ہے۔ دوسروں کے سامنے اس کے اور محبوب کے درمیان اشاروں اور رمز و کنایہ میں بھی باتیں ہوتی ہیں۔ جو راز داری کی غمازی کرتی ہیں اور غالب کو اپنے محبوب کی طرف سے تحفۂ وفا بھی ملتا ہے۔ وہ ہرجائی بے وفا نہیں ہے۔ غرض غالب نے اپنے محبوب کو ہر رنگ میں دیکھا ہے۔ اس کا عشق آسمانی عشق نہیں ہے۔ وہ زمین پر رہنے والا ایک گوشت پوست کا انسان ہے، اس کا محبوب کوئی ماورائی انسان نہیں ہے وہ بھی اسی زمین پر رہنے والا گوشت پوست کا انسان ہے۔ اسی لئے غالب کو عشق کے دوران یہ سارے مواقع بہم ملے ہیں جن میں کچھ خوشگوار ہیں۔ کچھ تلخ بھی ہیں۔ مگر غالب کا خیال ہے۔ میں نے اسے جس رنگ میں بھی دیکھا۔ اس نے میرے دل پر غصب ڈھایا۔ دل میں حسرت تھی کہ کھل کر باتیں کرنے کا موقع ملے۔ یہ موقع بھی ملا۔ دوسروں کے سامنے رازدارانہ رمز و کنایہ بھی میسر آیا۔ جس سے دوسروں اور غیروں کو دکھ بھی ہوا۔ محبوب کی جانب سے وفاشعاری بھی دیکھنے میں آئی۔ مگر ہر رنگ میں محبوب غالب کے لئے آفت جاں ثابت ہوا۔ ہر رنگ میں غالب نے اسے نئی آن اور نئی شان میں نئی تو بہ شکن اور دل شکن اداؤں کے ساتھ جلوہ گر دیکھا۔

غزل ۲

۱۔ عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی میری وحشت تیری شہرت ہی سہی

مشکلات: وحشت جنون، دیوانگی

وحشت ایک ایسی کیفیت اور واردات قلب ہے کہ جس میں مبتلا ہو کر عاشق انسانوں اور آبادیوں سے گھبرانے لگتا ہے۔ وہ باہر کھلی فضا میں صحراؤں اور جنگلوں کا رخ کرتا ہے کہ شاید وہاں اس کی گھبراہٹ، وحشت کی دستبرد میں کچھ دور ہو جائے۔

غالب کو محبوب نے کہہ دیا ہے تم کیسے عشق ہو۔ دعویٰ عشق کرتے ہو اور عشق کے آداب سے واسطہ نہیں رکھتے یہ عشق نہیں وحشت ہے۔ میں وحشت کو پسند نہیں کرتا۔ اس کے جواب میں غالب کہتا ہے کہ چلئے یوں ہی سہی کہ مجھے عشق نہیں بلکہ وحشت ہے پھر کیا ہوا۔ میری وحشت تیری شہرت کا سبب بن جائے گی۔ اس کے ذریعے تیرے حسن و جمال کے چرچے ہوں گے۔

۲۔ قطع کیجے نہ تعلق ہم سے کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

مشکلات: قطع تعلق کرنا۔ تعلق ختم کرنا عداوت، دشمنی

غالب اپنے محبوب سے کوئی نہ کوئی تعلق قائم رکھنا چاہتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس کا محبوب سے ٹوٹ جائے۔ چنانچہ محبوب سے التماس کرتا ہے کہ اگر آپ دوستی کا تعلق قائم نہیں رکھنا چاہتے ہیں۔ تو نہ سہی۔ مگر بالکل ہی قطع تعلق تو نہ کریں۔ دوستی کی بجائے دشمنی قائم کر لیں۔ میں اس پر بھی مطمئن ہو جاؤں گا کہ آپ سے کسی نہ کسی طرح کا رابطہ تو رہے گا۔ اس طرح کے دور کے تعلق کا ذکر غالب نے ایک اور شعر میں بھی کیا ہے۔ اگرچہ اس میں ایسے محبوب کا تذکرہ نہیں ہے ؎

گو واں نہیں پہ واں سے نکالے ہوئے تو ہیں کعبہ سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

۳۔ ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

محبوب نے ایسا طرز عمل اختیار کیا ہے کہ وہ غالب سے بے التفاتی اختیار کرتا ہے اور اس کے رقیب سے زیادہ رغبت رکھتا ہے۔ غالب کے پوچھنے پر وہ کہتا ہے کہ وہ تجھ سے محبت اور عشق کرتا ہے میں کیوں نہ اس کا خیال رکھوں۔ اس کے جواب میں غالب کہتے ہیں کہ میں نے بھی تیرے ساتھ جو عشق اختیار کر رکھا ہے اس سے محض اپنی دشمنی ہی مقصود نہیں۔ مجھ میں جو سختیاں جھیل رہا ہوں تو واقعی عاشق کی حیثیت سے ایسا کر رہا ہوں۔ پہلے

مصرع میں غالب نے بہت عمدہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ تیرے ساتھ عشق کرنا اپنے ساتھ برا کرنے کے مترادف ہے۔ جو بھی تجھ سے عشق اختیار کرے گا۔ وہ اپنے لیے بلاؤں کو دعوت دیگا۔ اس لئے اپنا دشمن ہی ہوگا۔ غالب ہی نے ایک اور شعر میں کہا ہے ؎

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اسکا آسمان کیوں ہو

میر نے اسی مضمون کو اس شعر میں یوں باندھا ہے ؎

دشمنی ہم سے کی زمانے نے
کہ جفا کار تجھ سا یار کیا

۴۔ اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

مشکلات: ہستی: وجود۔ ذات آگہی: عرفان۔ خبر

غالب نے اس شعر میں تلقین کی ہے کہ ہمیں عرفانِ ذات حاصل کرنا چاہیئے۔ دوسری چیزوں کی حقیقت اور ماہیت کے پیچھے کیوں پڑیں۔ کہ صبح کیوں ہوتی ہے۔ شام کیسے ہوتی ہے۔ سورج مغرب میں کیوں ڈوبتا ہے؟ جو کچھ بھی جستجو اور تجسس کرنا ہے۔ کیوں نہ وہ اپنی ذات کے متعلق ہی ہو۔ اگر ہم اپنی ذات کی خبر نہیں رکھتے یا اس کی خبر کی صلاحیت نہیں رکھتے تو نہ سہی۔ بے خبری ہی سہی۔ مگر خبر یا بے خبری جو کچھ بھی ہو اپنی ذات ہی سے متعلق ہونی چاہیئے۔

۵۔ کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

مشکلات: رخصت: اجازت

بخت و اقبال سے بہرہ یابی یا محرومی اگرچہ خداوند کے ہاتھ میں ہے مگر علم نجوم کی رو سے اس کا تعلق آسمان اور اس کے سیاروں کی گردش سے ہوتا ہے۔ اس لئے ہماری شاعری میں اسے خدا کی بجائے آسمان سے نسبت دے دی جاتی ہے۔ کچھ لوگ تو یوں اقبال مند ہو جاتے ہیں کہ دوسرے رشک کرتے رہ جاتے ہیں اور کچھ یوں محروم ہو جاتے ہیں کہ ان کی محرومی داستانِ عبرت بن جاتی ہے۔ اس لئے آسمان کو شاعر نے ناانصاف کہا ہے کہ مجھے تو نے میری خواہش کی تکمیل سے محروم کر رکھا ہے۔ میری تقدیر میں ہر طرح کی ناکامی اور نامرادی لکھ دی گئی ہے۔ کچھ تو مجھے بھی دے۔ پھر شاعر طنزاً کہتا ہے کہ اور نہیں تو احتجاج یا رونے پیٹنے کی اجازت ہی دے دے کہ یہ بھی مجھے میسر نہیں ہے۔ غالب ایک اور شعر میں کہتے ہیں ؎

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

۶۔ ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

مشکلات: تسلیم: فرمانبرداری۔ مان جانا خو: عادت بے نیازی: بے پروائی۔ بے التفاتی۔

غالب کا تجربہ ہے کہ محبوب اپنی بے توجہی اور بے التفاتی کی روش ترک نہیں کرتا۔ اس نے پوری کوشش کر دیکھی کسی طرح مہربان ہو جائے۔ مگر وہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہوا۔ آخر تھک ہار کر کہتا ہے کہ چلو بے نیازی تیری عادت و فطرت ہی سہی۔ ہم پھر اس کے مقابلے میں تسلیم و رضا کی عادت اپنائیں گے ورنہ کام نہیں چلے گا۔ اگر ہم تیری اس روش کو بدلنے کی کوشش کریں گے تو بار بار ناکامی سے دکھ میں اضافہ ہی ہوتا رہے گا۔ اس لئے اب تسلیم و رضا کی عادت ڈالنے بغیر چارہ نہیں ہے۔ دکھ سے نجات حاصل کرنے کا یہی ذریعہ ہے کہ

ع ہر تسلیم خم ہے۔ جو مزاج یار میں آئے

۷۔ چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

چھیڑ، تعلق خوباں، جمع خوب۔ حسین محبوب

مشکلات: وصل، ملاپ

غالب اس بات کا قائل ہے کہ محبوب اور حسین لوگوں سے تعلق کسی طرح توڑنا نہیں چاہیئے۔ اس تعلق کے قائم رہنے میں ہی عشق کا لطف حاصل ہو سکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ تعلق حصول قرب اور وصل کا ہو۔ اگر وصل نصیب میں نہیں لکھا ہے اور محبوب ایسا نہیں چاہتا ہے تو نہ سہی۔ اس کے علاوہ تعلق کی صورت فراق کی صورت بھی ہے۔ فراق کی صورت میں محبوب سے ایک طرح کا تعلق قائم رہے گا۔ غالب کا عشق زمینی عشق ہے۔ یہ کوئی رومانی عشق نہیں ہے۔ اس لئے اس نے چھیڑ کا لفظ استعمال کیا ہے جو غالب کی شوخی و ظرافت کا اظہار کرتا ہے۔

غزل ۳

یہ غزل بہادر شاہ ظفر کی صحت یابی سے متعلق ہے۔ اگست ۱۸۵۳ء میں وہ ایک خطرناک بیماری سے صحت یاب ہوئے۔ یہ غزل ایک خاص موقع سے تعلق رکھتی ہے۔ اس لئے یہ مسلسل موضوع پر لکھی گئی ہے۔ اس میں بادشاہ کی صحت یابی کی خوشی کے ساتھ ساتھ موسم بہار اور اس کے اثرات کا ذکر ہے۔

۱۔ پھر اس انداز سے بہار آئی کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

بہار کی آمد کا تذکرہ کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ اس کی آمد کا انداز ایسا دلفریب ہے کہ سورج اور چاند بھی اس کی آمد کے مناظر دیکھنے لگے۔ مہر و مہ دونوں روشن سیارے ہیں۔ اور شکل میں گول ہیں۔ آنکھیں بھی روشن اور گول ہوتی ہیں۔ اس لئے مہر و مہ کو دیکھنے والی آنکھوں

سے نسبت دے کر شاعر نے ان کے محو نظارہ و تماشا ہونے کا ذکر کیا ہے۔

۲۔ دیکھو رے ساکنانِ خطۂ خاک اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

آسمان کی مخلوق میں سے سورج اور چاند کو محو نظارہ بہار دکھا کر شاعر اب زمین کی مخلوق سے مخاطب ہوتا ہے کہ روئے زمین پر رہنے والو! تم بھی اس نظارے کو دیکھو۔ یہ منظر کیا ہے گویا عالم آرائی ہے یعنی سارے جہان کی آرائش کا اہتمام کیا گیا ہے۔ بہار کی آمد پر ہر طرف سبزہ و گل یوں نمودار ہو گئے ہیں۔ گویا خدا نے پورے جہان کی آرائش کا اہتمام کیا ہے۔

۳۔ کہ زمین ہو گئی ہے سرتاسر ___ رو کش سطح چرخ مینائی

مشکلات: سرتاسر: مکمل رو کش: ہمسر۔ ہم سر
چرخ مینائی: سبز آسمان

آسمان کا رنگ نیلا ہوتا ہے۔ مگر اسے سبز رنگ بھی باندھا گیا ہے۔ اب موسم بہار کی آمد پر روئے زمین پر سبزہ ہی سبزہ اُگ آیا ہے اس کے حوالے سے کہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمین مکمل طور پر سبز رنگ آسمان کی سطح کی آئینہ دار ہو گئی ہے۔ یعنی روئے زمین پر ہر طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔

۴۔ سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی بن گیا روئے آب پر کائی

مشکلات: روئے آب: پانی کی سطح کائی: وہ سبزی جو بند پانی پر جم جاتی ہے۔

بہار کی آمد نے سبزہ کو نمو کی ایسی تحریک دی ہے کہ روئے زمین مکمل سرسبز بننے کے بعد بھی سبزہ میں نمو اور روئیدگی کی قوت موجود ہے۔ چنانچہ سبزہ نے پانی کی سطح خالی دیکھ کر وہاں کائی کی صورت اختیار کر لی۔ ظاہر ہے پانی پر کائی بننے کا یہ سبب غیر حقیقی ہے۔ مگر اس میں شاعرانہ حسن ہے۔ ایسی صنعت کو حسن تعلیل کہتے ہیں۔

۵۔ سبزۂ گل کو دیکھنے کے لئے چشم نرگس کو دی ہے بینائی

مشکلات: بینائی: بصارت۔ دیکھنے کی قوت

سبزہ کا اُگنا اور پھولوں کا کھلنا اتنا عمدہ سماں پیش کر رہا ہے کہ خداوند کریم نے نرگس کو آنکھ عطا کر دی ہے کہ وہ بھی اس نظارہ سے لطف اندوز ہو سکے۔ نرگس کا پھول شکل میں آنکھ سے شباہت رکھتا ہے۔ اس لئے اُسے آنکھ سے تشبیہ دے کر چشم نرگس کہا ہے۔ لیکن اردو شاعری کی روایت میں یہ وہ آنکھ ہے جس میں بینائی نہیں ہے کہ غالب نے یہاں اس کی

آنکھ میں بھی بینائی پیدا کر کے نظارہ کے انتہائی دیدنی ہونے کا ذکر کیا ہے۔

۷۔ کیوں نہ ہو دنیا کو خوشی غالب شاہ دیندار نے شفا پائی

یہ بہادر شاہ ظفر کی صحت یابی کی طرف اشارہ ہے جو اگست ۱۸۵۳ء میں ایک خطرناک بیماری سے صحت یاب ہوئے تھے۔ بادشاہوں کی صحت یابی کے موقع پر شعرا تہنیت کا کلام پیش کیا کرتے تھے۔ غالب نے یہ غزل بطور تہنیت پیش کی۔ مقطع میں یہ کہا ہے کہ دین اسلام کی پابندی کرنے والے شہنشاہ نے صحت پائی ہے۔ اس لئے ساری دنیا خوش ہے۔

غزل ۴

۱۔ فریاد کی کوئی لے نہیں ہے نالہ پابند نے نہیں ہے

مشکلات: لے: سُرتال نالہ: فریاد۔ رونا نے: بانسری۔ راگ

غالب نے بہت عمدہ بات کہی ہے کہ نغمہ و سرود کا رونے سے کیا تعلق ہے۔ گریہ وزاری کرتے ہوئے انسان کسی خاص راگ یا سُرتال کو پیش نظر نہیں رکھتا۔ نہ ہی غم کی شدت اُسے ایسا کرنے کی مہلت دیتی ہے۔ نغمہ و سرود تو دل میں انبساط و شادمانی بیدار کرنے والی چیزیں ہیں۔ فریاد سے انہیں کیا نسبت نالہ و فریاد وہ کلام ہے جو سُرتال اور راگ کے قواعد سے آزاد ہے۔ کسی خاص راگنی میں رونے میں بھی کوئی تک ہے! نالہ و فریاد اظہار جذبہ کی ایک صورت ہے۔ چونکہ جذبات انسانوں میں مشترک ہوتے ہیں۔ اس لئے زبان و بیان کے تفاوت کے باوجود اس جذبہ کا ابلاغ ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے زبان و بیان کے کسی مخصوص پیمانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

۲۔ کیوں بوتے ہیں باغبان تو بے گر باغ گدائے مے نہیں ہے

مشکلات: تونبہ: کدو۔ جسے فقیروں کا کاسہ گدائی بنایا جاتا تھا

باغ میں مختلف قسم کی نباتات کاشت کی جاتی ہیں جن میں کھانے کی سبزیوں سے لے کر گملے میں ڈالنے والے پاروں اور سجنے کے لئے پھول سب شامل ہیں۔ کدو کھانے کی سبزی ہے باغ میں کاشت کی جاتی ہے۔

غالب اپنی طرز تماشا طبیعت سے اسے موضوع سخن بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ کدو کا مغز

نکال کر اسے کاسۂ گدائی بنایا جاتا ہے۔ باغ میں کاسۂ گدائی کی کاشت اور مقصد اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ باغ شراب کی بھیک مانگنا چاہتا ہے۔

۳۔ ہر چند ہر ایک شے میں ہے تو — پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے

یہ شعر وحدت الشہود پر کہا گیا ہے۔ وحدت الوجود کا مطلب یہ ہے کہ حقیقی وجود صرف اللہ کا ہے۔ باقی سب فریب نظر ہے۔ وحدت الشہود کا مطلب ہے کہ کائنات کا بھی وجود ہے لیکن یہ وجود قائم بالذات نہیں۔ یہ وجود اللہ تعالیٰ کے وجود کا عکس ہے شاعر کہتا ہے کہ اگرچہ ہر شے میں تو ہے۔ ہر جگہ اور ہر ذرے میں تیرا جلوہ اور عکس ہے۔ مگر اس جلوے میں ہمیں ہو بہو تیری ذات نظر نہیں آتی۔ کیونکہ تو لاثانی ہے۔ تجھ سی کوئی چیز نہیں ہے۔ جیسے قرآن حکیم میں آتا ہے: لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ

۴۔ ہاں! کھائیو مت فریب ہستی — ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

مشکلات: فریب ہستی: وجود کا دھوکا

اس شعر کا موضوع وحدت الوجود ہے کہ حقیقی وجود صرف باری تعالیٰ کا ہے۔ کائنات میں ہمیں جو کچھ نظر آتا ہے۔ یہ سب وہم ہے۔ غالب تلقین کرتے ہیں کہ اس وہم سے بچو اور اپنی ہستی اور دیگر موجودات کی نفی کرو۔ جو کچھ ہمیں نظر آ رہا ہے۔ یہ ہستی نہیں بلکہ فریب ہستی ہے یہ سراب ہے۔ یہ فریب نظر ہے۔ یہ ہمارے حواس کا دھوکہ ہے۔ یہ ہمارے تصور کی خیالی اور فرضی تصویریں ہیں۔ ہمارا کوئی وجود نہیں ہے ہم لاکھ کہیں کہ ہم ہیں، پھر بھی ہم نہیں ہیں۔ میر نے کہا ہے

؎ یہ توہم کا کارخانہ ہے — یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

۵۔ شادی سے گزر کر غم نہ ہووے — اردی جو نہ ہو تو دے نہیں ہے

مشکلات: شادی، خوشی اردی: ایرانی مہینہ بہار دے: ایرانی مہینہ۔ خزاں

ویرانی اور خزاں کا تصور تو بہار کے دم قدم سے قائم ہے بہار نہ ہونے سے خزاں ہی خزاں رہ جائے گی جب بہار کا وجود ہی نہ ہوگا تو ہمیں بہار کی رونقیں اور دل فریبیاں بھی یاد نہیں آئیں گی۔ اسی طرح اگر خوشی کو دور کر دو تو غم ہی غم رہ جائے گا۔ جب خوشی کا وجود ہی نہیں رہے گا تو اس سے محرومی کا احساس بھی نہ ہوگا۔ غم کی شدت تو خوشی کے احساس سے پیدا ہوتی ہے۔ خوشی نہ ہوگی تو غم ہی غم ہوگا اور جو میسر ہوگا ہم ضرور اسی کو جہنم کر لیں گے۔

۶۔ ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب آخر تو کیا ہے؟ اے "نہیں ہے"!

"نہیں ہے" ایک ہی ذات کا نام سمجھ لیجئے جو موجود نہیں ہے۔ اس غیر موجود ذات کو "نہیں ہے" کے نام سے مخاطب کرنا غالب کی طرزِ گی طبیعت ہے۔ اے وہ جو نہیں ہے! تو خود ہی بتا کہ تو کیا ہے؟ تیری حقیقت کیا ہے جب موجود اور نہ موجود سب برابر ہیں۔ اور کچھ بھی نہیں تو پھر اسے "کچھ نہیں" تو ہی بتا کہ تیری ماہیت اور اصلیت کیا ہے۔

مومن خاں مومن دہلوی

(۱۸۰۰ء ـــــ ۱۸۵۲ء)

حالاتِ زندگی

نام محمد مومن خاں ـــــ تخلص، مومن ـــــ ولادت، ۱۸۰۰ء دہلی۔ والد حکیم غلام نبی اپنے والد اور چچا سے طب پڑھی۔ مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی کی مجلسوں سے مستفیض ہوئے موسیقی، نجوم اور ریاضی سے لگاؤ تھا۔ شاعری میں شاہ نصیر کی شاگردی اختیار کر لی۔ مومن طبعاً درویش آدمی تھے۔ نوابوں اور امرا کے ہاں جانا پسند نہ تھا۔ مہاراجہ کپورتھلہ اور والیٔ ٹونک نے وظیفہ دے کر بلانا چاہا مگر انہوں نے انکار کر دیا۔

مومن پر شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر کی صحبت کا بڑا اثر تھا۔ اسی لیے عمر بھر کسی کی خوشامد نہیں کی، اور نہ تمام شاعروں کی طرح بادشاہوں اور نوابوں کے قصیدے لکھے۔ انہیں سید احمد شہید بریلوی کی تحریک مجاہدین سے عقیدت تھی۔

۱۸۵۲ء میں کوٹھے سے گر گئے۔ علم نجوم میں ماہر تھے۔ اپنی وفات کی پیش گوئی کی۔ چنانچہ پانچ ماہ میں انتقال کر گئے۔

مومن کی شاعری

مومن نے تقریباً ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی مگر ان کی جدتِ طبع کا اصلی رنگ اُن کی غزلوں میں نمایاں ہے۔ غزل ان کی محبوب صنفِ سخن تھی۔ مومن طبعاً حسن پرست انسان تھے انہیں مزاجاً غزل سے ایک گونہ مناسبت تھی۔

ندرت اور شوخی

مومن کی غزل میں حسن و عشق کی مختلف کیفیات کی رنگین ترجمانی ملتی ہے۔ ان کا محبوب اردو شاعری کے روایتی محبوب سے قدرے مختلف ہے۔ اسی انفرادیت نے مومن کی شاعری کو جدت و ندرت بخشی ہے۔ وہ غزل کے عام مضامین کو ندرت اور شوخی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ یہ ندرت بعض اوقات مکر شاعرانہ رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

تو کہاں جائے گی، کچھ اپنا ٹھکانہ کر لے
ہم تو کل خوابِ عدم میں شبِ ہجراں ہوں گے

کیوں سنے عرضِ مضطرب مومن — صنم آخر خدا نہیں ہوتا

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

اس ندرت اور "مکر شاعرانہ" سے کہیں کہیں پیچیدگی اور الجھن بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ وہ خیال کی درمیانی کڑیاں چھوڑ دیتے ہیں۔ مگر ایسے حصوں سے قطع نظر، جہاں مومن کے کلام میں ابہام اور معنوی الجھنیں پائی جاتی ہیں، ان کا محبوبی کلام بہت پُر لطف، رنگین اور دلچسپ ہے۔

معاملہ بندی

مومن کے ہاں معاملہ بندی کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ ایک نقاد کے بقول "ان کی معاملہ بندی متانت کا لطیف نقاب منہ پر ڈالے رہتی ہے" مومن کی معاملہ بندی میں لکھنوی شعراء کے برعکس لطافت و پاکیزگی اور نفاست موجود ہے۔ اس اعتبار سے انہیں معاملہ بندی میں ایک منفرد مقام حاصل ہے۔

خلوص اور سچائی

مومن کی غزلوں میں خلوص اور سچائی ہے۔ بناوٹ اور تصنع نام کو نہیں۔ اُن کی غزلیں اُن کے دل سے نکلی ہوئی بے ساختہ آوازیں ہیں۔ ایسا خلوص، ایسی سادگی اور ایسی سچائی کہ غالب کو اُن کے اس شعر

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

کے مقابلے میں اپنا پورا دیوان ہیچ معلوم ہوا۔

لطیف طنز

مومن کی غزلوں میں لطیف طنز کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں۔ اُن کا طنزیہ انداز منفرد ہے مثلاً ؎

میرے آنسو نہ پونچھنا دیکھو
کہیں دامان تر نہ ہو جائے

مومن نے اپنے تخلص کو بڑی خوبی کے ساتھ اور اکثر اوقات نام کی رعایت سے استعمال کیا ہے جس کے سبب ان کے مقطعے بڑے پُرلطف بن گئے ہیں مثلاً ؎

کہا اس بت سے جب مرتا ہے مومن
کہا: "میں کیا کروں مرضی خدا کی"

دشمن مومن ہی رہے بُت سدا
مجھ سے مرے نام نے یہ کیا کیا

علم و فضل

مومن ایک عالم فاضل انسان تھے۔ انہیں بیک وقت علم طب، علم نجوم، علم موسیقی اور ریاضی وغیرہ میں مہارت حاصل تھی۔ اُن کی غزلوں میں ان علوم و فنون کی اصطلاحات بکثرت ملتی ہیں اس انفرادیت کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔

اُس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

بہرحال مومن ایک منفرد اور جدت طراز غزل گو شاعر ہیں۔ اردو غزل کے ارتقاء میں اُن کا حصہ بہت نمایاں اور قابل قدر ہے۔

غزل ۱

۱ - ٹھانی تھی دل میں اب نہ کسی سے ملیں گے ہم — پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

مشکلات: ٹھانی تھی: پکا ارادہ کیا تھا — ناچار ہو گئے: مجبور ہو گئے۔ بے بس ہو گئے

عشق کے میدان میں بڑے کٹھن مراحل آتے ہیں جن میں سے آسان گزر جانا محال ہوتا ہے۔ جیسے کسی شاعر نے کہا ہے ؎

اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

ان مراحل میں سے ایک مرحلہ محبوب کی ہتک آمیز اور ذلت بخش بے اعتنائی ہے جس کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ وہ عاشق صادق کے سامنے اس کے رقیبوں سے لطف آمیز طریقے سے باتیں کرتا ہے۔ عاشق کا دل جلانے کے لئے یہ کیا کم سامان ہے۔ اس لئے عاشق دل میں مصمم ارادہ کر لیتا ہے کہ اب میں یہاں نہیں آؤں گا۔ اس مصمم ارادے کے ساتھ وہ محبوب کے ہاں سے نکلتا ہے۔ مگر دل کے ہاتھوں پھر مجبور ہو جاتا ہے۔ دل کئی بہانے پیش کرتا ہے کہ اصل میں محبت تو محبوب کو بھی ہے۔ تیرے جذبۂ عشق کی آزمائش کے لئے یہ طرزِ عمل اختیار کرتا ہے۔ اس طرح دل ناداں کئی حیلوں بہانوں سے پھر ترکِ ملاقات کا ارادہ ترک کر دیتا ہے۔

۲ - ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم — منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بے کسی سے ہم

اس شعر میں حرف "س" کی تکرار ہے۔ "تے" کی تکرار ہے۔ اور "سے" کی تکرار ہے "دیکھ دیکھ" کی تکرار ہے اور اس طرح ایک خوش آئند صوتی آہنگ پیدا ہوا ہے۔ اس کا مضمون وہی پہلے شعر کا سا ہے کہ محبوب کی محفل میں سب کو بے تکلف ہنسنے کی اجازت ہے اور اس بے تکلفی کی اجازت عام سے فائدہ اٹھا کر رقیب محبوب سے جو ہنس ہنس کر اور قہقہے لگا لگا کر باتیں کر رہے ہیں۔ ہم ان کا منہ دیکھ دیکھ کر دل میں رو رہے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر ہمارے دل پر چھریاں سی چل جاتی ہیں مگر بے کسی اور بے بسی ملاحظہ ہو کہ شکوہ تک نہیں کر سکتے۔

۳ - ہم سے نہ بولو تم اسے کیا کہتے ہیں بھلا — انصاف کیجئے پوچھتے ہیں آپ ہی سے ہم

یہاں بڑے ادب سے محبوب کو خطاب کر کے التماس کے انداز میں اپنا شکوہ پیش کر رہا ہے۔ جو محبوب ہی کی ناانصافی کے خلاف ہے۔ محبوب سے ناانصافی یہ ہوئی ہے کہ وہ عاشق صادق سے نہیں بولتا۔ محفل میں سب سے ساتھ مصروفِ گفتگو ہے مگر ایک عاشق صادق اس نوازش اور توجہ سے محروم ہے۔ عاشق کی نگاہ میں یہ بہت بڑی بے انصافی ہے کہ جو شخص سب سے زیادہ توجہ

اور نوازش کا مستحق ہے وہ محروم التفات ہے اور یہ والہوں نوازش و التفات سے مالا مال ہو رہے ہیں۔ ایسے عالم میں عاشق بے چارہ اپنی بے کسی کی پیش نظر محبوب ہی سے التماس کے لہجے میں انصاف مانگ رہا ہے کہ اے ناانصاف! تم خود ہی انصاف کرو تاکہ تمہارا طرز عمل ناانصافی نہیں تو اور کیا ہے؟ لطف کی بات یہ ہے کہ ناانصاف سے ہی انصاف طلب کیا جا رہا ہے۔

۴۔ بیزار جان سے جو نہ ہوتے تو مانگتے ۔ شاہد شکایتوں پہ تری مدعی سے ہم

مشکلات: جان سے بیزار ہونا: زندگی سے تنگ آجانا۔ شاہد: گواہ۔ مدعی: عشق کا دعویٰ کرنے والا

عشق کے ڈرامے میں عاشق ہیرو کی حیثیت رکھتا ہے تو اس کے مقابلے میں ایک کردار VILLAIN یعنی بدمعاش کا بھی ہوتا ہے جسے شاعر کبھی بوالہوس، ہوس پرست، رقیب غیر، دشمن، عدو کا نام دیتے ہیں۔ یہاں مومن نے اسے مدعی کا نام دیا ہے شعر کا مفہوم یہ ہے کہ محبوب کے ہاں جا کر مدعی نے عاشق کے خلاف شکایتیں پیش کی ہیں جن سے محبوب عاشق سے بدظن ہو گیا ہے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ عاشق اپنی صفائی پیش کرتا یا کسی طرح اپنا موقف بیان کرتا۔ مگر مومن کہتے ہیں ہیں کہ میں نے اس صورت حال پر اعتراض کیا۔ اس چشم پوشی کا سبب یہ نہیں کہ میں واقعی قصوروار ہوں بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ محبوب کے مظالم اور بے نیازیوں سے میں اتنا تنگ آچکا ہوں کہ اب مرنا چاہتا ہوں۔ میں زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ اگر مجھ میں زندگی کی خواہش ہوتی تو میں رقیب کا مقابلہ کرتا اور اس سے مطالبہ کرتا کہ اپنے دعویٰ اور ان شکایتوں کے ثبوت میں شہادتیں اور گواہ پیش کرے۔

۵۔ کیا گل کھلے گا دیکھیے ہے فصل گل ترو ۔ اور سوئے دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم

مشکلات: گل کھلنا: انوکھی بات ظاہر ہونا۔ طوفان اٹھنا ۔ فصل گل: موسم بہار

بہار اور جنون کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جنون کے عالم میں انسان کی گھبراہٹ اُسے مجبور کرتی ہے کہ وہ کھلے آسمان کے نیچے دشت کو منہ کرے۔ شاید دشت کی وسعت اس کی دیوانگی اور گھبراہٹ دور کر سکے۔ مومن کہتے ہیں کہ ابھی موسم بہار تو بہت دور ہے اور اس کی آمد سے بہت پہلے مجھ پر جنون کا غلبہ طاری ہو گیا ہے۔ میں جوشِ جنون میں دشت کی طرف بھاگ کر اپنی وحشت کا اظہار کر رہا ہوں۔ موسم بہار سے پیشتر جب وحشت اور دیوانگی کی یہ کیفیت ہے تو بہار کی آمد پر تو نہ جانے یہ وحشت کیا رنگ لائے گی اور کیا طوفان کھڑا کرے گی۔

۶۔ دل کو لے گیا کوئی بے گانہ آشنا ۔ کیوں اپنے جی کو لگتے ہیں کچھ اجنبی سے ہم

مشکلات: بے گانہ آشنا: وہ جو دوست بھی ہو اور غیر بھی

اس شعر میں "بے گانہ آشنا" کی ترکیب بہت عمدہ اور برجستہ ہے اس میں بے ساختگی ہے بے گانہ آشنا وہ محبوب یا دوست ہے جو غیروں کا سا طرزِ عمل اختیار کرتا ہے کہ عاشق اُسے اپنے دل سے اپنا دوست سمجھتا ہے جبکہ وہ اپنے عاشق سے غیریت اور بے گانگی روا رکھتا ہے۔ مومن کہتے ہیں کہ جب سے میں اپنا دل اُس محبوب کو دے چکا ہوں جو مجھے دوستوں کی طرح عزیز ہے دل کی عجیب ہے کہ خود میں اپنے آپ کو اجنبی لگنے لگا ہوں۔ دراصل محبت ہو جانے کے بعد انسان کے دل پر جو واردات گذرتی ہیں اور جس کیفیت سے اُسے گزرنا پڑتا ہے وہ اس کیلئے بالکل ایک نیا تجربہ ہوتا ہے۔ اس نئے تجربے کو شاعر نے یوں کہہ کر واضح کیا کہ میں خود اپنے آپ کو اجنبی لگنے لگا ہوں۔ کیونکہ میں اس سے پہلے ایسا نہیں تھا جیسا کہ اب ہوں۔ اس تبدیلی نے مجھے خود اپنے آپ سے اجنبی بنا دیا ہے۔

؎ لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں — مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

مشکلات: ربط: تعلق۔ واسطہ بدعتی: مشرک۔ دین اور سنت میں نئی بات پیدا کرنے والا

مومن کا خیال ہے کہ میرے دل میں اب صرف محبوب بستا ہے۔ اگر کوئی اور خواہش دل میں پیدا ہوئی تو وہ محبوب کی ذات میں شرکت کے مترادف ہوگی۔ میں اس کا وفادار بندہ ہوں اس لئے یہ کیسے برداشت کر سکتا ہوں کہ میرے دل میں محبوب کا شریک پیدا ہو اور میں راہِ عشق میں اس شرک کا مرتکب بن جاؤں۔ سو اگر میرے دل میں محبوب کے علاوہ کوئی اور خواہش پیدا ہوئی تو میں اپنے دل کو ہی سینے سے نکال لوں گا۔ اگر اس سے کوئی تعلق رکھوں تو پھر میں مومن نہیں۔ کیونکہ بدعتی اور مشرک کا مومن سے کیا تعلق اور رشتہ ہو سکتا ہے اس شعر میں مومن نے بدعتی کو نیا مفہوم دیا ہے یہ اس غزل کا مقطع ہے اور مومن کی امتیازی خصوصیت ہے کہ عموماً وہ مقطع میں اپنا تخلص اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ تخلص کا تخلص ہوتا ہے اور شعر کے دیگر الفاظ مرکبات کے ساتھ ایک بامعنی لغت بھی۔ جیسے یہاں مومن کا مطلب ہے صاحبِ ایمان مسلمان۔

غزل ۲

۱۔ اگر غفلت سے باز آیا جفا کی — تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

مشکلات: باز آنا: چھوڑ دینا تلافی کرنا: نقصان کا معاوضہ دینا

یہاں مومن یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ محبوب کا طرزِ عمل ہر صورت میں عاشق کے لیے دل شکن ہی ہوتا ہے پہلے اس کا شعار تغافل۔ مجھ سے غفلت شعاری اختیار کی کبھی مجھ پر توجہ دینا مناسب نہ سمجھا۔ جیسے کہ میں اس کا کچھ نہیں لگتا ہوں۔ اس کی اس بے نیازی اور تغافل نے مجھے جیتے جی مار دیا۔ میرے بار بار کے شکوے پر اس نے غفلت ترک کی۔ اور مجھ پر توجہ دی تو ایک نئی آفت مجھ پر آگئی۔ اس کی توجہ جفا کا راز تھی۔ ظالم محبوب نے شیوہ تغافل ترک کر کے میری شکایت پاس کی تلافی کی مگر یہ تلافی میرے لیے اور بھی زیادہ مصیبت بن گئی کہ اس نے مجھے اپنی جفا کا نشانہ بنالیا اور مجھ پر ستم ڈھانا شروع کر دیئے۔ سو ظالم محبوب نے تلافی کی بھی کیا صورت نکالی۔

۲- موئے آغازِ الفت میں ہم افسوس اسے بھی رہ گئی حسرت جفا کی

مشکلات: موئے: مر گئے آغازِ الفت: عشق کی ابتدا جفا: ظلم۔ ستم

عشق کے میدان میں آگے بڑھنا بڑی ہمت اور تاب کی بات ہے۔ یہ ہر کہ دمہ کے بس کی بات نہیں ؎

انہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

کیونکہ اس میں بڑے کڑے مراحل آتے ہیں۔ کڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ مومن کہتے ہیں کہ مجھے تو اس میدان میں آگے جانے کا موقع ہی نہ ملا۔ ابتدائے عشق میں ہی میں ناتواں عشق کی بلا کاریوں کی تاب نہ لاکر مر گیا۔ اس پر شاعر افسوس کا اظہار کر رہا ہے کہ اس کی خواہش تھی کہ آگے چل کر کچھ آگے کے حالات بھی دیکھتے کہ آگے کیا ہوتا ہے مگر وائے حسرتا!

کہ ایسا نہ ہو سکا بقول میر ؎

ابتدا ہی میں مر گئے سب یار عشق کی کون انتہا لایا

مومن کو افسوس اس بات کا نہیں کہ وہ مر گیا۔ بلکہ افسوس اس بات کا ہے کہ میں عشق کی سختیوں کو جھیل نہ سکا۔ اپنی ناکامی کا افسوس ہے پھر ایک اور بات کا بھی افسوس ہے جس کا دوسرے مصرع میں اظہار کیا ہے۔ میں محبوب کے پہلے ہی وار سے مر گیا۔ جی اس نے جفا کی بھڑاس بھی نہ نکالی تھی کہ میں ناتواں جان دے بیٹھا۔ افسوس اس بات کا بھی ہے کہ

محبوب کو مزید جفا کاری کا ارمان رہا۔

۳۔ چمن میں کوئی اُس کُو سے نہ آیا گئی برباد سب محنت صبا کی

مشکلات: اس کُو سے: کوچۂ محبوب سے کوئی: محبوب

جب کسی بڑے آدمی کی آمد ہوتی ہے تو مقام آمد کو اچھی طرح سجایا جاتا ہے۔ اس کی آرائش آنے والے کی عظمت کے متناسب ہوتی ہے۔ اس شعر میں محبوب کی آمد باغ میں متوقع تھی۔ اس لیے صبا نے خوب تیاریاں کیں۔ رنگ رنگ کے اور قسم قسم کے پھول کھلائے۔ سبزہ کا فرش بچھایا۔ سبزہ و گل کا منہ شبنم سے دھلایا کہ ایک عظیم شخصیت کی آمد ہے۔ باغ کی آرائش اسی کے حسب مرتبہ ہونی چاہیئے مگر افسوس کہ صبا کی محنت دھری کی دھری رہ گئی اور باغ کی سیر کو کوئی نہ آیا۔ اس کوچہ سے کوئی نہ آیا یعنی کوچۂ محبوب سے کوئی نہ آیا۔ شاعر کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ محبوب [illegible] نہیں کرتا۔ باغ میں آمد کا وعدہ تھا۔ صبا تیاریاں کر کے تھک گئی مگر وعدہ خلاف نہ آیا۔

۴۔ تمہیں شورِ فغاں سے میرے کیا کام خبر لو اپنی چشم سرمہ سا کی

مشکلات: شورِ فغاں: فریاد اور نالہ خبر لینا: دیکھ بھال کرنا۔ سرمہ سا: سرمہ جیسی

وہ آنکھ جس میں سرمہ یا کاجل لگا ہو۔ وہ آنکھ جس میں آنسو پھیلا ہوا ہے۔ خوب صورت کالی آنکھ اس شعر میں شاعر نے بلیغ انداز میں عشق و محبت کا ذکر کیا ہے کہ جہاں عاشق نالہ و فریاد بپا کرتا ہے وہاں محبوب کی آنکھ بھی بھیگی ہوتی ہے۔ چنانچہ ہجر و فراق کے لمحے میں نالے جب آسمان کو پہنچنے لگتے ہیں۔ اور ایک شور سا بپا ہو جاتا ہے تو محبوب عاشق سے پوچھتا ہے کہ یہ کیا طوفان بپا کیا۔ کچھ ہوش کے ناخن لو۔ اس پر عاشق اسے کہتا ہے کہ میں اکیلا ہی اس جرم کا مرتکب نہیں ہوں۔ تمہاری آنکھوں میں سرمہ پھیلا دیکھ کر تمہاری آنکھیں بھی بھیگی لگتی ہیں۔ یہ کیسے بھیگیں؟ یہ سرمہ پھیلاتی آنکھیں بھی غمازی کرتی ہیں کہ تم بھی روتے رہے ہو۔ آنکھوں میں آنسو کے پھیلنے کو کاجل یا سرمہ سے نسبت دینے میں عابد کا یہ شعر لاجواب ہے ؎

دمِ رخصت وہ چپ رہے عابد آنکھ میں پھیلتا گیا کاجل

مومن بھی کہتا ہے کہ بے شک تمہارے لبوں سے آہ و فریاد نہیں نکلی ہے۔ میں جہاں آنسو بہانے کے ساتھ ساتھ نالہ بپا کر رہا ہوں۔ مگر وہاں تم نالہ کے بغیر آنسو بہاتے رہے ہو۔

اس شعر کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم میرے نالہ و فریاد کی مدت پوچھو۔ ان خوبصورت آنکھوں کی خبر کیوں نہیں لیتے۔ جو میری آہ و فریاد کا سبب بنی ہیں بقول ؏

کوئی ان سے بھی تو پوچھو اتنے کیوں پیارے ہوئے

۵۔ دیا علم و ہنر حسرت کشی کو فلک نے مجھ سے یہ کیسی دغا کی

مشکلات: علم و ہنر: علم و فن حسرت کشی: حسرت برداشت دغا: دھوکا

غالب نے اہل دانش اور اہل ہنر کے ساتھ آسمان کی دشمنی کا ذکر کیوں کیا ہے ؎

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

علم و ہنر ایک فضیلت ہے جو ہر کسی کو میسر نہیں ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی دین ہے جسے دیدے مگر علم و ہنر کا یہ بھی دیکھا گیا ہے۔ اہل علم و اہل کمال دنیا میں کسمپرسی کی حالت میں زندگی گزار دیتے ہیں ہر دور میں اہل علم و فن کو شکوہ رہا ہے کہ ہماری قدر نہیں کی گئی۔ آج کے زمانے میں بھی یہی حالت ہے۔ اسی حسرت ناک حالت کا نقشہ مومن کے اس شعر میں کھینچا گیا ہے۔ لیکن اس نے اس ناانصافی کا ذمہ دار آسمان کو ٹھہرایا ہے کہ علم نجوم کی رو سے ہماری تقدیر اور اس کا سنورنا بگڑنا آسمان کی گردش پر منحصر ہے۔ اس لئے شاعر اپنی بدقسمتی کی تہمت آسمان کے ذمے لگا دیتے ہیں۔ مومن کہتے ہیں کہ آسمان نے مجھے علم و ہنر کی فضیلت دے کر بظاہر مجھ پر احسان کیا۔ لیکن حقیقت میں دھوکا تھا کہ دنیا میں اس کی کوئی قدر نہیں ہے اور اس فضیلت کو لے کر میں اپنے دل میں حسرت پال رہا ہوں۔ یہاں تو اہل مال اور اہل اقتدار کی قدر ہے۔ اہل علم و ہنر کو کون پوچھتا ہے۔ فارسی کے ایک شاعر نے کہا ہے ؎

بنادان آں چناں روزی رساند کہ دانا اندراں حیراں بماند

۶۔ مجھے اے دل! تیری جلدی نے مارا نہیں تقصیر اس دیر آشنا کی

مشکلات: تقصیر: غلطی، کوتاہی دیر آشنا: وہ محبوب جو دوست بننے میں بہت مدت گزار دے

خلق کی دنیا بھی عجیب دنیا ہے کہ عاشق دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر بے صبر و بے تاب ہوتا ہے کہ اس کی خواہش وصل جلد پوری ہو۔ ادھر حسن اور محبوب کی جانب سے طویل آزمائش کا تقاضا ہوتا ہے۔ مومن نے ایسی ہی صورت حال کو اس شعر میں پیش کیا ہے۔ اپنی ناکامی کا الزام اپنے دل پر دے رہے ہیں کہ اگر دل مجھ سے جلدی نہ کراتا تو میں صبر و استقامت سے مصائب عشق جھیلتا اور آزمائش

بیتاب کرتا رہا۔ محبوب دیر آشنا تھا۔ وہ جلدی نہیں چاہتا تھا وہ چاہتا تھا کہ ابھی جذبہ عشق کو میں اپنے سینے میں تمام کر صبر و تاب کی مزید آنچ دوں۔ جب یہ پک جاتا تب وہ آشنا بنتا مگر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں بے صبر ہو گیا اور جلدی میں اپنا کام بگاڑ بیٹھا۔

غالب نے اسی مضمون کو اس شعر میں یوں باندھا ہے ؎

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہونے تک

غم مقصد دی تا نزع اور ہم
اب آئی موت بخت نارسا کی

مشکلات: مقصد کی: حصول مقصد پر، بیابی نزع: دم توڑنا، مرنا، بخت نارسا: بد بختی

مومن نے اپنی بد بختی اور نامرادی کی تصویر بہت عمدہ انداز میں پیش کی ہے کہ میں تا نزع اس غم میں مبتلا رہا کہ کاش میری مراد پوری ہو جائے اور میں مقصد پا لوں۔ موت آ گئی مگر مقصد برآئی نہ ہوئی۔ میرے ہمراہ یعنی بد بختی کو بھی میرے ساتھ ہی موت کا سامنا کرنا ہوگا۔

شاعر انتہائی یاس و قنوطیت کے عالم میں یہ کہہ رہا ہے کہ بخت کی نارسائی میرا مقدر تھی۔ تا دم مرگ میں بد بختی کا شکار رہا اور نامراد اس دنیا سے جا رہا ہوں۔ بخت نارسا میرے ساتھ ملزم تھا۔ ظاہر ہے کہ میرے مرنے پر وہ بھی ختم ہو جائے گا اور اب میرے بعد کوئی بھی بد بخت نہیں رہے گا یعنی بد بختی بھی میرے ساتھ دنیا سے رخصت ہو جائے گی۔

غالب نے کچھ اسی طرح کے مضمون کو اس شعر میں یوں پیش کیا ہے اور کیا عمدہ انداز ہے ؎

آئے ہے بے کسی عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

۸۔ جفا سے تھک گئے تو بھی نہ پوچھا
کہ تو نے کس توقع پر وفا کی

عموماً تو جفا کاری سے محبوب کا جی نہیں بھرتا۔ وہ ظلم و ستم کے نئے نئے طریقے ایجاد کرتا رہتا ہے۔ اس کی جفا کاری وافر ساماں ہے۔ ختم ہونے میں نہیں آتی۔ مگر مومن اس شعر میں جفا سے محبوب کے تھکنے کا ذکر کرتا ہے۔ عاشق کے لیے یہ لمحات بسا غنیمت ہیں کہ تھک جانے کی وجہ سے محبوب نے جفا سے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ اسے توقع ہے کہ اس وقفے میں محبوب کم از کم یہ تو پوچھے گا کہ اے! تو نے کس بھروسے پر آشنائی اور وفا شعاری اختیار کی؟ دیکھ نہیں رہا کہ میں وفا شعاروں کا اور طلب گاروں کا کیا حشر کرتا ہوں۔ مگر افسوس کہ عاشق کی یہ خواہش بھی پوری نہیں ہوئی اور محبوب نے اس وقفہ جفا میں بھی اس سے کوئی بات تک کرنا گوارا نہ کیا۔ التفاتی کی انتہا ہے۔

۹- کہا اس بت سے جب "مرتا ہے مومن" کہا "میں کیا کروں مرضی خدا کی"

مومن نے ایک ایسے عاشق کی کیفیت یہاں بیان کی ہے۔ جو عمر بھر محبوب کی توجہ کا طلبگار رہا مگر بامراد نہ ہوا۔ محبوب کی بے نیازی اور بے التفاتی کو توجہ اور نوازش میں بدلنے کیلئے اس نے اس کی ہر آزمائش میں پورا اترنے کی کوشش کی اور بھی حیلے بہانے اختیار کئے مگر محبوب کے سامنے ایک نہ چلی اور وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اب وہ ایک نیا حیلہ تراشتا ہے کہ اسے پیغام بھیجا جائے کہ میں قریب المرگ ہوں۔ شاید موت کا نام سن کر وہ پسیجے اور بھاگا بھاگا آکر میرے سوئے نصیبوں کو جگائے۔ جیسے مصحفی نے کہا ہے ؎

قاصد اگر اس گلی میں جائے کہو کہ غلام ہو چکا اب

مگر اس حیلے پر بھی عاشق کو نہایت ہی مایوس کن جواب ملتا ہے کہ "موت خدا کے ہاتھ میں ہے"۔ اگر وہ مر رہا ہے تو خدا کی مرضی۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔

غزل ۳

۱- صبر وحشت اثر نہ ہو جائے کہیں صحرا بھی گھر نہ ہو جائے

مشکلات: وحشت اثر: وحشت پیدا کرنے والا۔ جنون خیز

صبر عشق کی شرط اوّل ہے اور عاشق کے لئے صبر کئے بغیر چارہ نہیں۔ لیکن صبر بھی بقدر ظرف و حوصلہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ جتنا کسی کا ظرف ہوگا اتنا ہی صبر آزما میں پورا اترے گا۔ ورنہ انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ غم و الم دل میں سنبھال سنبھال کر پیمانۂ صبر لبریز ہو جاتا ہے اور انسان مائل بہ جنون ہو جاتا ہے۔ مومن نے اس شعر میں ایسے ہی مرحلہ پر پہنچے ہوئے عاشق کا ذکر کیا ہے کہ اب مزید الم سہنے کی ہمت نظر نہیں آتی۔ ادھر صبر کرنا ضروری ہے۔ اندیشہ ہے کہ اس سے ایسی گھٹن پیدا ہوگی جس کے نتیجے میں مجھ پر وحشت اور جنون کے آثار پیدا ہوں گے کہیں ایسا نہ ہو وحشت پذیر ہو کر میں صحرا کو ہی اپنا گھر بنا لوں۔ وحشت اور جنون کا صحرا و وحشت سے تعلق ہوتا ہے۔ اس لئے صحرا کا ذکر کیا ہے۔

۲- کثرت سجدہ سے وہ نقش قدم کہیں پامالِ سر نہ ہو جائے

مشکلات: پامال: روندا ہوا۔

شاعر کے نزدیک محبوب کا نقش قدم سجدہ گاہ ہے۔ وہ محبوب کے نقش پا کو مقام سجدہ بنا کر سجدے پہ سجدے کئے جا رہا ہے۔ مگر پھر خیال آتا ہے کہ یہ مقدس نشان قائم رہنا چاہیئے ایسا نہ ہو کہ بار بار کے سجدوں سے میرے سر سے روندا جائے۔ پامال کا لغوی مطلب ہوتا ہے پاؤں تلے روندنا۔ لیکن شاعر چونکہ نشان پائے محبوب کو جبیں سائی کا مقام بنائے ہوئے ہے

اس لئے اس نے سر کی نسبت سے پامال سر کی نئی ترکیب وضع کی ہے۔

۳۔ میرے تغیر رنگ کو مت دیکھ تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

مشکلات: تغیر رنگ: رنگ بدلنا۔ حالت بدلنا نظر ہونا: بری نظر کا اثر ہونا

شاعر کی حالت محبوب کے جور و ستم سے متغیر ہو گئی ہے کہ اس سے پہلے وہ اچھی بھلی صحت رکھتا تھا۔ مگر محبوب کے تیر جفا اور تیغ ستم نے وہ جوہر دکھائے کہ بایدو شاید۔ اس کے نتیجے میں وہ بے چارہ خستہ حال ہو گیا۔ اس کی حالت زار کو محبوب نے جو دیکھا تو عاشق نے ازرہ ہمدردی فوراً کہا کہ میری طرف مت دیکھو کیونکہ میری حالت زار دیکھ کر تجھے اپنے تیر جفا اور تیغ ستم کی کارگری پر فخر ہو گا۔ کہیں ایسا نہ ہو تجھے اپنی بری نظر لگ جائے اور تو ستم ڈھانے کے قابل ہی نہ رہے۔ اسی بات کو غالب نے یوں بیان کیا ہے ؎

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

۴۔ میرے آنسو نہ پونچھنا دیکھو کہیں دامان تر نہ ہو جائے

مشکلات: دامان تر ہونا: دامن آلودہ ہونا۔ گناہ سرزد ہونا

عاشق اپنی حالت زار پر رو رہا ہے۔ وہ دکھوں کا مارا آنسو بہا رہا ہے شاید محبوب کو کچھ رحم آیا ہو گا۔ اس نے چاہا ہو گا کہ بڑھ کر اس کے آنسو پونچھ لوں۔ مگر عاشق کو اپنی ذات سے محبوب کا مفاد زیادہ عزیز ہے۔ فوراً اسے ٹوکتا ہے کہ ایسا نہ کرنا اگر تم نے ایسا کیا تو اندیشہ ہے کہ تیرا دامن بھی گناہ آلود ہو جائے گا۔ یہ آنسو تو احساس گناہ پر ندامت کے آنسو ہیں انہیں پونچھنے والا بھی اس آلودگی میں اپنا دامن تر کر بیٹھے گا۔

۵۔ بات ناصح سے کرتے ڈرتا ہوں کہ فغاں بے اثر نہ ہو جائے

مشکلات: ناصح: نصیحت کرنے والا۔ ہمدرد فغاں: نالہ۔ فریاد

عاشق کے دل پر جو کچھ گزر رہی ہے وہ ناقابل برداشت اور ناقابل بیاں ہے۔ اس لئے وہ مسلسل نالہ و فریاد کر رہا ہے اور آہ بکا کا شور بلند کر رہا ہے۔ اس کا مونس و غم خوار دوست یہ برداشت نہیں کر سکا۔ اس سے نالہ و فغاں کا سبب پوچھتا ہے کہ مجھے اصل حقیقت سناؤ۔ اب عاشق حقیقت حال بیان کرنے سے ڈر رہا ہے کہ اس طرح میرے دل کا غبار کچھ ہلکا ہو جائے گا اور میرے فغاں میں وہ تاثیر نہیں رہے گا۔ جواب ہے۔ ضبط غم سے انسان کی آہ و فریاد میں تاثیر پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اگر اپنا غم کسی سے بیان کر دیا جائے تو غم ہلکا ہو جاتا ہے۔ ہلکے غم کے نتیجے میں اول تو فغاں کہاں سے آئے اور آئے بھی تو اس میں وہ پہلی سی تاثیر نہیں ہوتی

عشق کے اس ڈرامے میں ناصح بھی ایک کردار ہے جسے مونس، غم خوار، ہمدرد، چارہ گر، نصیحت گر ہم راز وغیرہ کے نام دیئے جاتے ہیں۔ یہ عاشق کا ہمدرد ہوتا ہے۔ اسے سمجھاتا ہے اور اس کے دکھ کا مداوا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

۶۔ رشکِ دشمن کا فائدہ معلوم — مفت جی کا ضرر نہ ہو جائے

مشکلات: رشکِ دشمن: دشمن کے خلاف حسد، دشمن کا مقابلہ — فائدہ معلوم: فائدہ نہیں ہے — جی کا ضرر: جی گنوانا۔ نقصان اٹھانا

عشق کے ڈرامے میں بدعاش کا کردار بھی ہے۔ جو عاشق کے مقابلے میں بظاہر سرخرو اور کامیاب و بامراد ہوتا ہے۔ مگر عاشق اُسے ہوس پرست اور عشق کا جھوٹا دعویدار سمجھتا ہے۔ عاشق کو ستانے کے لیے یا اسے آزمانے کے لیے محبوب بھی اسی دشمن کی طرف مائل بہ کرم رہتا ہے۔ عاشق بے چارہ تڑپ تڑپ اٹھتا ہے مگر بے بس ہوتا ہے کوئی زور نہیں چلتا۔ کوئی دلیل کام نہیں دیتی کہ محبوب کے ہاں سرکارِ عشق میں دلیل و عقل کا گزر کہاں؟ بالآخر عاجز آکر کہہ رہا ہے کہ رقیب کے ساتھ مقابلہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یونہی اپنے جی کا نقصان کر لوں گا۔ مجھے اس کے مقابلے میں کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

۷۔ اے دل! آہستہ آہ تاب شکن — دیکھ ٹکڑے جگر نہ ہو جائے

مشکلات: آہ تاب شکن: قوتِ برداشت کرنے والی آہ۔ حوصلہ توڑنے والی آہ

شاعر اپنے دل کو سمجھا رہا ہے کہ تیری آہ حوصلہ توڑنے والی اور جگر کو ٹکڑے کر دینے والی ہے۔ اس لیے آہستہ آہستہ آہ کھینچ۔ ایسا نہ ہو کہ جگر پارہ پارہ ہو جائے۔ شاعر اپنی آہ کی تاثیر کو نمایاں کرنا چاہتا ہے اور غم و الم کی شدت کو ظاہر کرنا چاہتا ہے جس کے نتیجے میں ایسی پُرتاثیر آہ پیدا ہو رہی ہے۔

۸۔ مومن، ایمان، قبولِ دل سے تجھے — وہ بت، آزردہ اگر نہ ہو جائے

مشکلات: بت: محبوب — آزردہ: رنجیدہ۔ ناراض

بت پرستی اور ایمان دو متضاد چیزیں ہیں۔ مومن نے ان میں سے اپنے لیے بت پرستی یعنی محبوب کی پرستش کا انتخاب کیا ہے۔ مگر اسے ایمان قبول کرنے میں بھی دریغ نہیں ہے۔ بشرطیکہ محبوب اس بات سے ناراض نہ ہو جائے۔ عجیب نکتہ ہے کہ خدا کی ناراضگی کا اتنا خیال نہیں جتنا کہ محبوب کی رضاجوئی کا خیال ہے۔ بت پرستی کی دنیا یعنی عشق کی دنیا میں یہی بات ضروری ہے۔ غالب نے فارسی میں اس مضمون کو یوں پیش کیا ہے

رندِ ہزار شیوہ را طاعتِ حق گراں نہ بود
یک صنم بہ سجدہ در نامیہ مشترک نخواست

بہادر شاہ ظفر

غزل-۱

۱- مقدور کس کو حمد خدائے جلیل کا اس جا پہ بے زباں ہے دہن قال و قیل کا

مشکلات: مقدور، طاقت۔ قدرت۔ حمد۔ خدا کی تعریف۔ جلیل، جلال والا۔ دہن، منہ۔ قال و قیل گفت گو۔ قوت گویائی

شاعر کہتا ہے کہ صاحب جلال خدا کی تعریف کا حق ادا کس کی کے بس کا روگ نہیں۔ کسی میں اتنی قدرت و طاقت نہیں کہ خداوند کریم کی تعریف کما حقہ کر سکے۔ بلکہ یہاں اگر یعنی حمد خدا کے موقع پر خود قوت گویائی بے بس ہو جاتی ہے۔ جیسے اس منہ میں زبان نہیں ہے یہ حمدیہ غزل ہے۔ ظفر کے کلام میں حمد و نعت کی کثرت ہے

۲- پانی میں اس نے راہبری کی کلیم کی آتش میں وہ ہوا چمن آرا خلیل کا

مشکلات: راہبری۔ رہنمائی۔ کلیم۔ حضرت موسیٰ کا لقب، آتش۔ آگ۔ چمن آرا۔ باغ پیدا کرنے والا۔ خلیل۔ حضرت ابراہیمؑ کا لقب

خدا کی ذات وہ ذات بے ہمتا ہے کہ جس نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قوم بنی اسرائیل سمیت دریائے نیل میں سے راستہ پیدا کر کے صحیح و سلامت دوسرے کنارے پر پہنچا دیا۔ اس مصرع میں اس واقعہ کی طرف تلمیح ہے۔ جس کے مطابق قتل کے خوف سے موسیٰ اپنی قوم کو لے کر بھاگے۔ فرعون کو پتہ لگا اس نے اپنا لشکر تعاقب میں لگا دیا۔ دریائے نیل پر پہنچ کر اللہ تعالیٰ نے پانی میں سے خشکی کا راستہ بنا دیا۔ موسیٰؑ اپنے ساتھیوں سمیت دریا عبور کر گئے۔ مگر فرعون مع اپنے لشکر کے دریا میں غرق ہو گیا۔ دوسرے مصرع میں حضرت ابراہیمؑ کے آگ میں ڈالے جانے کا تلمیحی اشارہ ہے۔ نمرود نے انہیں آگ میں ڈالا۔ اللہ تعالیٰ نے آگ کو حکم دیا کہ يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ اور وہ آگ حضرت ابراہیم کے لئے گلزار بن گئی۔ حضرت موسیٰ خدا سے ہم کلام ہونے پر کلیم سے اور حضرت ابراہیم خدا کے دوست ہونے پر خلیل کے لقب سے ملقب ہیں۔

۳- اس کی مدد سے فوج ابابیل نے کیا لشکر تباہ کعبہ پہ اصحاب فیل کا

یہ تلمیح ہے۔ سورہ فیل میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ یمن کے بادشاہ ابرہہ نے کعبہ کو تباہ کرنے کی غرض سے ہاتھیوں کے لشکر سے کر چڑھائی کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی تباہی کے لئے ابابیل بھیجے جن کی چونچوں میں کنکر تھے انہوں نے کنکر لشکر پر گرائے اور لشکر تباہ ہو گیا۔ شاعر کہتا ہے کہ خدا کی ذات ایسے کام کر دکھاتی ہے کہ اصحاب فیل کے لشکر کو ابابیلوں سے شکست دے دی۔

۴- کیا پائے کہہ ذات کہ اس کے کوئی ظفر واں عقل کا نہ دخل نہ ہرگز دلیل کا

مشکلات: پائے۔ دریافت کرے۔ کہنہ۔ پرانی۔ ازلی۔ دلیل۔ شہادت

اللہ تعالیٰ کی ذات ازل سے موجود ہے۔ جبکہ اور کوئی بھی موجود نہ تھا۔ اس لئے شاعر نے اسے کہنہ ذات کہا ہے۔ شاعر کہتا ہے اس کی ازلی ذات کو پالینا ناممکن اور محال بات ہے انسان تو اپنی عقل اور مشاہدہ حواس کے ذریعے ہی ادراکِ اشیاء کرتا ہے۔ مگر خدا کی ذات کے ادراک میں نہ عقل کا دخل ہے نہ مشاہدہ کا۔ اس لئے انسان اس کی ذات کا ادراک کر ہی نہیں سکتا۔

غزل۔۲

۱۔ نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں جو کسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک مشت غبار ہوں

مشکلات: آنکھ کا نور: بہت پیارا، بہت عزیز، محبوب دل کا قرار: وہ جسے مل کر دل کو سکون ملے۔ محبوب، مشتِ غبار: مٹھی بھر غبار۔ مُردہ انسان کی خاک۔

یہ شعر حسرت و یاس کی منہ بولتی تصویر ہے۔ شاعر اپنی بدقسمتی اور بے بضاعتی کا رونا رو رہا ہے کہ میں وہ شخص ہوں جسے کوئی بھی عزیز نہیں رکھتا اور جس سے کوئی پیار نہیں کرتا۔ نہ ہی مجھے دیکھ کر یا مجھے مل کر کسی کو سکونِ قلب میسر آتا ہے۔ میں تو جیتے جی مر گیا ہوں۔ اور مردہ انسان کی خاک ہوں جو کسی کے بھی کام نہیں آتی۔ بقول سودا ؎ اس میکدے کے بیچ عبث آفریدہ ہوں۔

۲۔ میرا رنگ روپ بگڑ گیا میرا یار مجھ سے بچھڑ گیا جو چمن خزاں سے اجڑ گیا میں اسی کی فصلِ بہار ہوں

مشکلات: رنگ روپ بگڑنا: حلیہ بگڑنا

محبوب کی جدائی پر عاشق پر جو کیفیت گزر رہی ہے وہ ظفر نے اس شعر میں بیان کی ہے کہ میرا محبوب مجھ سے کیا بچھڑا میرا حلیہ ہی بگڑ گیا ہے۔ نہ وہ خال وہ خد نہیں رہے جو پہلے تھے۔ اب اگر کوئی مجھے دیکھے تو پہچان نہ سکے۔ چہرے کی رونق اڑ گئی ہے۔ دوسرے مصرع میں ظفر نے اپنے آپ کو موسم بہار سے تشبیہ دی ہے لیکن وہ موسم بہار جسے خزاں نے لوٹ کر اجاڑ دیا ہو۔ بہار اور خزاں کا بیک وقت ذکر بالکل مناسب حال ہے کہ کبھی تو میرے دل میں بہار کی طرح رونق تھی۔ میرے چہرے سے اس رونق کی عکاسی ہوتی تھی۔ مگر محبوب کے فراق میں دل کی اس بہار کو خزاں نے آکر اجاڑ دیا۔ اب دل ویراں ہے۔ اور چہرہ بے رونق۔

۳۔ پئے فاتحہ کوئی آئے کیوں کوئی چار پھول چڑھائے کیوں کوئی آکے شمع جلائے کیوں میں وہ بے کسی کا مزار ہوں

مشکلات: پئے فاتحہ: فاتحہ خوانی کے لئے۔

شاعر نے مرنے کے بعد اپنی بے کسی کی تصویر کھینچی ہے جو اس کے مزار پر برس رہی ہے بقول شاعر ؎ حسرت برس رہی ہے ہمارے مزار پر

بے کسی نے موت کے بعد بھی ساتھ نہ چھوڑا۔ لوگوں کے عزیز و اقارب مرنے کے بعد ان کی

قبروں پر آتے ہیں۔ فاتحہ خوانی کرکے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ پھولوں کی چادر چڑھاتے ہیں اور شمع جلاکر روشنی کا اہتمام کرتے ہیں۔ مگر میرا کون ہے؟ جو میرے مرنے کے بعد ایسا اہتمام کرے۔ میں تو نہ کسی کی آنکھ کا نور تھا نہ کسی کے دل کا قرار تھا۔ پھر مرنے کے بعد کون میرے مزار پر آتا۔ میرا مزار حسرت و یاس کی منہ بولتی تصویر ہے۔

۴۔ میں نہیں ہوں نغمہ جاں فزا مجھے سن کے کوئی کریگا کیا میں بڑے برگ کی ہوں صدا میں پڑے دکھی کی پکار ہوں

مشکلات: نغمۂ جاں فزا۔ روح کو فرحت پہنچانے والا نغمہ۔ برگ۔ جدائی۔ بجر۔ صدا۔ آواز

اس شعر میں بھی شاعر نے اپنی حسرت و یاس کا اظہار کیا ہے اور یہ حسرت و یاس ہجر یار اور دوسرے غم و الم عشق کا نتیجہ ہے۔ کہتا ہے کہ میں وہ آواز نہیں ہوں جسے نغمہ سمجھ کر لوگ سنیں اور سرور و فرحت پائیں۔ میں تو جان کاہ جدائی کی آواز ہوں۔ ایک دکھی انسان کی فریاد ہوں مجھے سن کر کوئی کیا کرے گا سوائے غم و الم کے اسے کیا ملے گا۔ اگر میری آہ و فریاد میں نغمگی کا امکان ہوتا تو لوگ میری طرف توجہ دیتے۔ دکھ بھری آواز نے لوگوں کو مجھ سے بیزار کر دیا ہے

غزل - ۳

۱۔ لگتا نہیں ہے دل مرا اجڑے دیار میں کسی کی بنی ہے عالم ناپائدار میں

مشکلات: ۱۔ اجڑا دیار۔ ویران دنیا۔ بنی رہنا۔ قسمت کا موافق ہونا۔ عالم ناپائدار۔ فانی جہاں

شاعر کی نگاہ میں یہ جہاں اجڑا اجڑا ہے اور ظاہر ہے کہ اجاڑ میں انسان کا جی کیسے لگے؟ جبکہ وہ فطری طور پر معاشرت پسند ہے۔ تنہائی اور ویرانوں میں اس کا دل کیسے لگے؟ دنیا کی ویرانی یا آبادی بھی ایک اضافی بات ہے۔ جس کی اپنے دل کی نگری آباد ہے۔ اسے دنیا جہاں آباد نظر آتے گا اور جو اپنے دل کی نگری اجاڑ چکا ہے۔ اسے جہان کی رونقوں میں بھی بے رونقی نظر آئے گی۔ بقول شاعر ؎

دل کی دنیا سونی سونی نگر نگر آباد

دوسرے مصرع میں شاعر شاید دل کی تسلی کے لئے کہتا ہے کہ یہ دنیا ہے ہی ایسی جگہ کہ جہاں کسی کی قسمت بھی موافق نہیں ہوتی۔ کس کو بھی حسب منشا حالات نہیں ملتے۔

۲۔ بلبل کو باغباں سے نہ صیاد سے گلہ قسمت میں قید تھی لکھی فصل بہار میں

کچھ انسانی طبائع کا طرز عمل ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے اچھے بڑے حالات کا ذمہ دار قسمت کو ٹھہرا لیتے ہیں جو افراد ان کی بدقسمتی یا خوش قسمتی کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ یا بدنصیبی یا خوش نصیبی کا سبب بنتے ہیں۔ وہ ان کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور ساری ذمہ داری تقدیر یا قسمت کے لکھے پر ڈال دیتے ہیں کہ قسمت کا لکھا کون ٹال سکتا ہے اس شعر میں شاعر نے بلبل کی زبان سے یہی بات کہلوائی ہے۔ بلبل کو عین عالم بہار میں صیاد نے گرفتار کرکے قفس میں ڈال دیا ہے۔ وہ اپنی اس قید اور گرفتاری کا ذمہ دار باغباں اور صیاد کو نہیں بلکہ تقدیر کے لکھے کو قرار دے رہا ہے۔

۳- کہہ دو ان حسرتوں سے کہیں اور جا بسیں اتنی جگہ کہاں ہے دلِ داغدار میں

شاعر دنیا کی ناکامیوں اور نامرادیوں سے گھبرا گیا ہے۔ مزید ناکامیوں کو برداشت کرنے کی سکت نہیں ہے اس لئے اپنی خواہشات کو ہی مخاطب کر کے کہہ رہا ہے کہ انہیں کہو کہ میرے دل میں ٹھکانہ نہ کریں۔ کہیں اور ٹھکانہ کریں کہ میرے دل میں مزید حسرت و ارمان کی گنجائش نہیں ہے۔ اپنا اپنا ظرف اور حوصلہ ہے۔ غالب اس کے مقابلے میں ناکردہ گناہوں کی حسرت کی داد چاہتے ہیں۔ یعنی ابھی ان کے دل میں بے شمار مزید خواہشات کو ٹھکانہ دینے کی گنجائش تھی۔ مگر زندگی نے مہلت نہ دی دکھتے ہیں

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد یارب! اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

۴- اک شاخِ گل پہ بیٹھ کے بلبل ہے شادمان کانٹے بچھا دیئے ہیں دلِ لالہ زار میں

مشکلات:۔ شادمان۔ خوشی۔ دل میں کانٹے بچھانا۔ ناگوار گزرنا۔ برا لگنا۔ تکلیف دینا۔

شاعر نے یہ تصور پیش کیا ہے کہ سارا باغ بلبل کا دشمن ہے وہ اس کے درپے آزار ہے اور اپنے محبوب گل سے خزاں میں محروم رکھتا ہے۔ بلبل نے اپنا انتقام لینے کا یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ شاخِ گل پر بیٹھا ہے اور شادمانی اور مسرت کا اظہار کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ بلبل کو شادمان و فرحاں دیکھ کر باغ کے دل پر تو کانٹے بچھ گئے کہ وہ اس کا دشمن ہے۔ بلبل نے ایسا طرزِ عمل اختیار کیا ہے کہ جس سے اس کے دشمن کو تکلیف پہنچے۔

۵- عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

مشکلات:۔ عمرِ دراز، لمبی عمر

شاعر دن نے انسانی زندگی کو بلسان شریا مانند حباب کہا ہے۔ یعنی اسے نہایت ہی مختصر مہلت قرار دیا ہے ایک دم کی مہلت۔ تاہم اسے چار دن کی زندگی یا دو روزہ زندگی بھی کہا جاتا ہے شاعر نے اس شعر میں چار دن کی زندگی کا حوالہ دیا ہے۔ لیکن چار دن کی مہلت بھی ایک قلیل مہلت ہے۔ لمبی مہلت نہیں ہے کہ اسے عمرِ دراز کہا جا سکے اس لئے ظاہر ہے کہ شاعر لمبی عمر طنزاً کہا ہے پھر زندگی مستعار کی نسبت سے کہا کہ ہم نے چار دن کی زندگی خدا سے مانگی۔ سو مل گئی۔ مگر یہ چار دن کیسے بسر ہوئے؟ آدھی عمر تو اس ادھیڑ بن میں گزری کہ کس کس چیز کی خواہش کریں اور باقی آدھی زندگی خواہشات کی تکمیل کے انتظار میں گزر گئی۔ جبکہ ابھی کوئی خواہش پوری نہیں ہوئی تھی۔ زندگی کے چار دن کچھ حاصل کئے بغیر گزر گئے۔ اسی لئے طنزاً اسے عمرِ دراز کہا۔

۶- دن زندگی کے ختم ہوئے شام ہو گئی پھیلا کے پاؤں سوئیں گے کنجِ مزار میں

مشکلات:۔ شام ہونا۔ دن کا ختم ہونا۔ پاؤں پھیلا کے سونا۔ بے فکر ہو کر آرام کرنا۔ کنجِ مزار قبر کا گوشہ۔

شاعر کی زندگی غم و آلام میں گزری اور ہمیشہ مختلف قسم کے تفکرات اس کے دل و دماغ پر مسلط رہے۔ اس لئے وہ موت کی آغوش میں سونا چاہتا ہے۔ موت کی خواہش دراصل زندگی کے آلام سے فرار کی ایک صورت ہے نا عاقبت اندیش انسان یہ نہیں سوچتا کہ موت کے بعد کا محاسبہ انتظار کر رہا ہے اور مرکے چین کہاں ملے گا؟ موجودہ غم سے نجات کی ایک عارضی صورت اسے موت میں نظر آتی ہے تو وہ خوشی سے کہہ اٹھتا ہے کہ زندگی پوری ہو گئی۔ اب موت آنے والی ہے ہم قبر کے گوشے میں آلام روزگار سے بے فکر ہو کر اطمینان سے سوئیں گے۔

۷۔ کتنا ہے بدنصیب ظفر، دفن کے لئے — دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

یہاں غزل کے پیرائے میں محبوب کے حوالے سے کوئے یار کا ذکر کیا ہے ورنہ اس کا اشارہ اپنی اس محرومی کی طرف ہے کہ جس سرزمین پر میرے آباؤ اجداد نے کئی سو سال حکومت کی اور خود میں نے حکومت کی اس سرزمین پر مجھے دفن ہونے کی سعادت بھی نہ ملی اور وطن سے دور دیار غیر میں مجھے دفن کیا گیا۔ ظفر کی وہ غزلیات جو تخت و تاج چھن جانے اور آنکھوں سے محروم ہونے کے بعد کہی گئی ہیں۔ ان میں درد و غم کی چبھن بہت واضح ہے۔ یاد رہے کہ ظفر کو قید کر کے رنگون لے جایا گیا تھا، اور وفات پر انہیں وہیں دفن کیا گیا۔

غزل — ۴

۱۔ جب چمن میں اس کے آنے کی خبر اڑ جائے گی — گل کی رونق دم میں اس کے باد صبا اڑ جائے گی

مشکلات:۔ خبر اڑنا۔ خبر مشہور ہونا۔ دم میں۔ فوراً ہی۔ رونق اڑنا۔ مرجھا جانا

"اس" کا مرجع محبوب ہے یہ محبوب کی طرف اشارہ ہے۔ شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ جو رونق رنگینی اور حسن میرے محبوب کے چہرے سے جھلکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں گل کی رنگینی اور رونق کی کوئی حیثیت نہیں۔ چنانچہ جب کبھی میرے محبوب نے میرے باغ کا ارادہ کیا اور اس کے ارادے کی خبر مشہور ہوئی تو دیکھ لینا کہ خبر سنتے ہی گل کی ساری رونق اڑ جائے گی اور وہ مقابلے میں شکست کے احساس سے مرجھا جائے گا۔ آتش نے اسی مضمون کو اس شعر میں یوں پیش کیا ہے ؎

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے — ہم اور بلبل بے تاب گفتگو کرتے

۲۔ آپ کا کیا جائے گا گر خواب میں آ جائیے گا تم — نیند آنکھوں کی ہماری رات بھر اڑ جائے گی

عاشق اپنے محبوب سے مخاطب ہے۔ شرف باریابی بخشا ہے تو بیداری کے عالم میں یہ نوازش کرو۔ اگر تم خواب میں ملنے آؤ گے تو اس سے تمہارا تو کچھ نہیں بگڑے گا۔ بلکہ تمہیں تو قدم رنجہ فرمانے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔ ہماری رات بھر کی نیند اڑ جائے گی۔ خواب میں تم سے شرف ملاقات حاصل کر کے جب آنکھ کھلے گی اور تجھے نہیں پاؤں گا تو مجھ پر جو کچھ گزرے گی۔ وہ میں جانتا ہوں

ایسے عالم میں مجھے پھر رات بھر نیند نہیں آئے گی۔

۳ - خون تو مل لے گا میرا، تو کفِ پا سے ۔۔۔ سرخی رنگِ حنا اسے فتنہ گر ابا ڈر جائے گی

مشکلات: کفِ پا۔ پاؤں کا تلوا۔ رنگِ حنا۔ مہندی کا رنگ۔ فتنہ گر۔ فتنہ پیدا کرنے والا محبوب

محبوب کو فتنہ گر کہہ کے مخاطب کیا ہے کہ وہ فتنہ ساماں ہے اور عاشقوں اور طلب گاروں کے دلوں پر فتنے ڈھاتا ہے کفِ پا کا ذکر کیا ہے کہ ظالم محبوب عاشق بے چارہ کے زخمی دل و جگر کو پاؤں تلے روندتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اے فتنہ گر محبوب! اگر تو نے میرے زخمی دل کو پاؤں تلے روندا تو میرا خونِ دل تیرے تلوے پر لگ جائے گا۔ اس طرح تو نے آرائشِ حسن کے لئے تلوے پر جو مہندی کا سرخ رنگ لگایا ہوا ہے وہ مٹ جائے گا۔ اس لئے اپنے حسن کی فتنہ گری کو قائم رکھنے کے لئے میرے دل و جگر کو پامال کرنے کی کوشش نہ کر۔

۴ - آئے گا وہ مہروش لے دل، تو شبنم کی طرح ۔۔۔ تاب و طاقت تیری اس کو دیکھ کر اڑ جائے گی

مشکلات: مہروش۔ سورج کی طرح تاباں۔ محبوب

دل کی خواہش ہے کہ محبوب ملاقات اور وصل کے لئے آئے۔ محبوب نے وعدہ دیدار کر بھی رکھا ہے۔ توقع ہے محبوب ضرور آئے گا۔ مگر شاعر اپنے دل کو سمجھاتا ہے کہ وہ آیا تو اسے دیکھتے ہی تیری قوت برداشت ختم ہو جائے گی۔ تو تاب نظارہ نہیں لا سکے گا۔ یہاں شاعر نے محبوب کو سورج سے اور دل کی تاب و طاقت کو شبنم سے تشبیہ دی ہے۔ پہلی تشبیہ میں وجہ شبہ تابانی ہے۔ دوسری تشبیہ میں وجہ شبہ دونوں کا جلد اڑ جانا یعنی ختم ہو جانا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جس طرح سورج کے آنے پر شبنم اڑ جاتی ہے اسی طرح محبوب کی آمد پر تیری تاب و طاقت بھی اڑ جائے گی۔ کیونکہ

ع ۔۔۔ ان کا آنا غضب کا آنا ہے۔

محبوب کی آمد پر تابِ نظارہ نہ لا سکنے کو غزل میں اکثر موضوع بنایا گیا ہے۔

۵ - یہ صبا سے کوئی پوچھے، تیرے کیا آئیگا ہاتھ ۔۔۔ خاک میری اس کے کوچے سے اگر اڑ جائیگی

اس شعر میں شاعر نے مرنے کے بعد کی کیفیت بیان کی ہے۔ عاشق عشق کی آگ میں جل کر خاک ہو گیا ہے۔ اب یہ خاک محبوب کے کوچے میں پڑی ہے۔ زندگی میں تو اس کوچے میں اسے رقیب روک لیتے تھے۔ مرنے اور خاک ہو جانے کے بعد ایک نیا دردِ سر صبا نے پیدا کر دیا کہ وہ چلتی ہے تو خاک اڑنے لگتی ہے شاعر کی خواہش ہے کہ کم از کم پس مرگ ہی اس کی خاک کو محبوب کے ہاں کو چہ نشین ہونے دیا جائے چنانچہ وہ صبا سے التماس کرتا ہے کہ وہ میری خاک کو یہاں سے اڑا لے جا کر اور میری خواہش

قرب محبوب کو پامال کر کے تجھے کیا ملے گا۔

۶۔ شعلۂ رخسارِ ساقی، گر ہو اپرتو فگن — مے جو ہے ساغر میں تیرے، اے ظفر، اڑ جائے گی

مشکلات: پرتو فگن۔ عکس ڈالنے والا۔ عکس ریز

رخسارِ ساقی حسن کی وجہ سے تاباں ہے۔ بلکہ وہاں حسن کی تابانی شعلہ فگن ہے۔ چنانچہ درد کہتے ہیں ؎

رات مجلس میں ترے حسن کے شعلے کے حضور — شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا

ظفر نے بھی محبوب کے رخسار پر حسن شعلہ ساماں کو اس شعر کا موضوع بنایا ہے، کہتا ہے کہ اگر ساقی محفل ناؤ نوش میں محبوب کے رخسار پر لپکنے والے شعلۂ حسن کا عکس کہیں میرے ساغر میں پڑ گیا۔ تو اس کی گرمی سے ساغر کی ساری شراب بھاپ بن کر اڑ جائے گی۔ حدتِ شعلہ کا اندازہ لگائیے کہ شعلہ کے عکس میں اتنی حرارت اور شدت ہے کہ جس چیز پر بھی شعلہ کا عکس پڑتا ہے۔ اسے جلا دیتا ہے۔ پھر اصل شعلہ کی آتش کاری کی تو کوئی حد ہی نہیں ہے۔

غزل ۵

۱۔ جہاں ویرانہ ہے، پہلے کبھی آباد گھر تھے یاں — شغال اب ہیں جہاں رہتے کبھی بستے بشر تھے یاں

مشکلات: شغال: گیدڑ — بشر: آدمی

اس پوری غزل میں ایک ہی مضمون بیان کیا گیا ہے کہ دنیا فانی اور بے ثبات ہے۔ ظفر کہتے ہیں کہ اب ہمیں جہاں ویرانے نظر آتے ہیں اور جہاں جنگل نظر آتے ہیں کبھی یہاں انسانی آبادیاں اور بستیاں تھیں۔ اب یہ گیدڑوں اور دیگر وحشی جانوروں کا مسکن ہیں۔ جب کہ کبھی صدیوں پہلے یہاں انسان رہتے تھے۔

۲۔ جہاں چٹیل ہے میدان اور سراسر ایک خارستاں — کبھی یاں قصر و ایواں تھے، چمن تھے اور شجر یاں تھے

مشکلات: چٹیل: وہ میدان جہاں سبزہ اور پانی کا نام و نشان نہ ہو۔ خارستاں: کانٹوں بھرا جنگل قصر: محل، ایوان: دربار، شجر: درخت۔

دنیا ایک عبرتناک مقام ہے۔ اب جہاں ہمیں وسیع عریض میدان نظر آتے ہیں۔ جہاں پانی اور سبزے کا کہیں نشان بھی نہیں ہے اور اب جہاں خاردار درختوں اور جھاڑیوں سے بھرے جنگل نظر آتے ہیں۔ کبھی کسی زمانے میں یہاں بادشاہوں کے محلات تھے، دربار تھے اور ہرے بھرے درخت تھے۔

۳۔ جہاں پھرتے بگولے ہیں اڑاتے خاک صحرا میں — کبھی اڑتی تھی دولت، رقص کرتے سیم یاں تھے

مشکلات: بگولہ، گرد باد۔ ہوا کا چکر۔ سیم بر: چاندی جیسی سفید جلد والی حسینائیں حسین لوگ، جہاں آج گرد باد خاک اڑاتے پھرتے ہیں اور آبادی کا نام و نشان نہیں وہاں کسی زمانے میں دولت لٹائی اور لٹ ڈھائی جاتی تھی اور وہاں حسین اور نازنین رقاصائیں رقص و سرود کی محفلوں دولت مندوں کے دل گرمایا کرتی تھیں۔ بگولے کی رقص کی نسبت سے حسیناؤں کے رقص کا ذکر کیا ہے۔

۴۔ جہاں ہیں سنگ ریزے، تھے یہاں یاقوت کے تودے جہاں کنکر پڑے ہیں اب، کبھی ڑلتے گہر یاں تھے

مشکلات: سنگ ریزے: پتھر کے روڑے۔ یاقوت: سرخ رنگ کا قیمتی پتھر۔ لعل، گہر، موتی۔

جن مقامات پر اب پتھر ہی پتھر ہیں۔ کسی زمانے میں یہاں لعل عام و دستیاب تھے، پتھر کے روڑوں کی نسبت سے ایک قیمتی پتھر کے ٹکڑے یا قوت کا ذکر کیا ہے۔ مناسبات کا خیال رکھنا کلام کی خوبی ہے اور اس پوری غزل میں ظفر نے اس بات کا خیال رکھا ہے جہاں آج چھوٹے چھوٹے بے قیمت کنکر نظر آتے ہیں۔ وہاں کسی زمانے میں قیمتی کنکر یعنی موتی ملتے تھے کنکر کی نسبت سے موتی کا ذکر مناسب ہے۔

۵۔ جہاں سنسان اب جنگل ہے اور بے شہر خاموشاں کبھی کیا کیا تھے ہنگامے یہاں اور شور و شریاں تھے

مشکلات: سنسان، ویران، بے آباد۔ شہر خاموشاں: قبرستان۔ شور و شر: رونق، ہنگامہ

جہاں اب ویران اور بے آباد جنگل نظر آتے ہیں اور جہاں اب قبرستان بنے ہوئے ہیں وہاں کسی زمانے میں نہ جانے کیا کیا انسانی ہنگامہ آرائیاں، شور و غل اور رونقیں برپا رہتی ہیں۔ کیا عبرتناک حالت ہے۔ جو مقامات انسانی زندگی اور سرگرمی کا مرکز تھے۔ وہاں اب ویرانی اور موت کی سی خاموشی ہے۔

۶۔ جہاں اب خاک پر ہے نقش پائے آہوئے صحرا کبھی محو تماشا، دیدۂ اہل نظر یاں تھے

مشکلات: نقش پائے آہوئے صحرا: صحرائی ہرنوں کے قدموں کے نشانات، محو تماشا دیکھنے والے۔

جہاں اب صحراؤں میں ہرنوں کے ڈار پھرتے ہیں اور زمین پر ان کے قدموں کے نشانات عام ملتے ہیں۔ وہاں کسی زمانے میں انسانی نگاہیں مختلف قسم کے قابلِ دید مناظر دیکھا کرتی تھیں۔ اب آہوانِ صحرا، بے خوف خطر چوکڑیاں بھرتے پھرتے ہیں، مگر کسی زمانے میں یہ مقامات انسانی زندگی اور آبادی کے مراکز تھے۔

۷۔ ظفر! جہاں عالم کا کبھی کچھ ہے، کبھی کچھ ہے۔ کہ کیا کیا رنگ اب ہیں اور کیا کیا پینتریاں تھے

مشکلات: احوال: حالات۔ یہاں شاعر نے اسے واحد استعمال کیا ہے۔ پیشتر: پہلے
یہ شعر اس غزل کے ہر شعر کا مرکزی خیال ہے۔ غزل کے تمام اشعار میں یہی مضمون پیش کیا گیا ہے۔ شاعر اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ دنیا کے حالات ہر وقت تغیر پذیر ہیں۔ یہاں انقلاب آتے رہتے ہیں۔ اس لئے یہاں کا نقشہ اور منظر بدلتا رہتا ہے آج جو مقامات بے آباد ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ صدیوں پیشتر وہ انسانی تمدن کی آماجگاہ رہے ہوں۔ ارضی محققین بھی یہی کہتے ہیں کہ جہاں اب پہاڑ ہیں وہاں کسی زمانے میں سمندر تھے۔ روئے ارض پر جغرافیائی ہیئت ہمیشہ انقلاب پذیر رہی ہے۔

خواجہ الطاف حسین حالی

(نوٹ: حالی کے حالات زندگی اور خصوصیات کلام آپ گذشتہ صفحات میں پڑھ چکے ہیں)

غزل ۱

۱۔ کامل ہے جو ازل سے وہ ہے کمال تیرا باقی ہے جو ابد تک وہ ہے جلال تیرا

مشکلات: کامل: مکمل۔ جس میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔ ازل: وقت کا نقطۂ آغاز جس کا تعین نہ ہو سکے۔ ابد: وقت کا نقطۂ اختتام جس کا تعین نہ ہو سکے۔ ہمیشہ رہنے والا جلال: عظمت۔ شان و شوکت۔

مخلوقات میں سے کسی کو بھی کسی بھی معاملے میں کمال حاصل نہیں ہے۔ یہ کمال صناعی کا ہو یا علمیت کا خدا کی مخلوقات میں سے کوئی فرد اپنے فن میں پورا کمال حاصل نہیں کر سکتا البتہ کائنات کو پیدا کرنے والا خدا خود ایسا کمال رکھتا ہے کہ ازل سے کامل ہے اور اس کی کاملیت ابد تک رہے گی۔ نیز دنیا کی ہر چیز کو زوال ہے۔ دولت، زندگی، وجود، اقتدار ہر چیز فانی ہے مگر خدا کی عظمت ایسی چیز ہے جسے کوئی زوال نہیں ہے۔ یہ ابد تک یعنی ہمیشہ قائم رہے گی۔

۲۔ ہے عارفوں کو حیرت اور منکروں کو سکتہ ہر دل پہ چھا رہا ہے رعب و جلال تیرا

مشکلات: عارف: معرفت شناس۔ حیرت: تصوف اور معرفت کی ایک منزل جہاں عارف تحیر میں مبتلا ہو کر ساکت ہو جاتا ہے۔ سکتہ: تحیر کی حالت بے حس و حرکت ہونے کی حالت۔

اے خدا! تجھے ماننے والے اور تجھے پہچاننے والے عارف ہوں یا تیری ذات اور تیرے وجود سے انکار کرنے والے ہوں۔ تو نے دونوں طرح کے لوگوں پر اپنا رعب اور جلال یوں نقش کیا ہے کہ دونو تحیر میں ڈوب گئے ہیں۔ منکر بھی تیرے رعب و جلال سے اسی طرح متاثر ہیں جس طرح معرفت شناس۔

۳۔ گو حکم تیرے لاکھوں ہاں ٹالتے رہے ہیں لیکن ٹلا نہ ہرگز دل سے خیال تیرا

اگرچہ انسان اپنی فطرتی خطا کوشی اور غفلت شعاری کی وجہ سے تیرے احکام کی پوری پابندی نہیں کرتے۔ لاکھوں، کروڑوں انسان ایسے اس دنیا میں پیدا ہوئے۔ جنہوں نے تیری اطاعت کا پورا حق ادا نہیں کیا۔ مگر ان کے بھی دلوں میں تو موجود رہا وہ تیرے احکام کو پس پشت ڈالتے رہے۔ مگر تیرے خیال کو دل سے نہ نکال سکے۔

۴۔ پھندے سے تیرے کیونکر جائے نکل کوئی پھیلا ہوا ہے سو عالم میں جال تیرا

اے خدا! تو نے اس کائنات میں اپنی نشانیوں کا جال ہر طرف پھیلا دیا ہے۔ اگر کوئی شخص تیرے اس جال سے نکل کر تیرے تصور اور تیری بندگی سے آزاد ہونے کی کوشش کرے تو کیسے کامیاب ہو سکتا ہے کہ شش جہت میں تیری نشانیاں موجود ہیں اس نظام کائنات میں اتنی وسعت ہے کہ محدود ہونے کے باوجود ہم اس سے باہر نکل کر لامکاں میں تو جا نہیں سکتے کہ تیری خدائی سے الگ ہونے کا دعویٰ کر لیں۔

۵۔ ان کی نظر میں شوکت جچتی نہیں کسی کی آنکھوں میں بس رہا ہے جن کے جمال تیرا

مشکلات: نظر میں جچنا۔ پسند آنا۔

اے رب جلیل! تیرے حسن و جمال کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ جس کسی نے تیرے حسن کی جھلک دیکھ لی اور تیرے جمال کو اپنی آنکھوں میں بسا لیا۔ اس کی نظروں میں پھر کسی اور کی شان و شوکت اور کسی اور کا حسن کیسے پسند آ سکتا ہے۔ کیونکہ تیرے حسن و جمال اور شان و شوکت کے مقابلے میں سب حسن و شوکت ہیچ ہیں۔

۶۔ دل ہو کہ جان کیوں کر تجھ سے عزیز رکھئے دل ہے سو چیز تیری، جاں ہے سو مال تیرا

ہمیں دنیا کی کوئی چیز تجھ سے زیادہ عزیز نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ہم دل اور جان کو بھی تجھ سے عزیز نہیں رکھتے۔ بلکہ تجھے دل و جان سے کہیں زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ اگر ہم کو دل و جان تجھ پر قربان کرنا پڑے۔ تو ہم انہیں عزیز نہیں رکھیں گے اور ایسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے دل بھی تیرا ہے اور جاں بھی تیری ہے ؎

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

۷۔ بے گانگی میں حالی یہ رنگ آشنائی سن سن کے سر دھنیں گے قال اہل حال تیرا

مشکلات: قال: بات، کلام

اگرچہ حالی کوچۂ معرفت سے بے گانہ اور نابلد ہے۔ مگر اس بے گانگی اور بے خبری کے باوجود اس نے اپنے ان اشعار میں خدا شناسی کے وہ جوہر دکھائے ہیں۔ اور معرفت کے وہ لطیف نکتے پیش کئے گئے ہیں کہ اہل حال و اہل نظر جو حقیقت کے کوچے سے واقف ہیں۔ اس کی یہ باتیں سن کر جھوم جھوم اٹھیں گے اور اس کے کلام کی داد دیں گے۔

غزل نمبر ۲

۱۔ جیتے جی موت کے تم منہ میں نہ جانا ہرگز دوستو! دل نہ لگانا نہ لگانا ہرگز

یہ شعر عشق مجازی کا حامل ہے۔ حالی دوستوں کو مشورہ اور نصیحت پیش کر رہا ہے کہ دل نہ لگانا۔ کبھی نہ لگانا۔ یعنی عشق اختیار نہ کرنا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے انسان جیتے جی موت کے منہ میں چلا جائے۔ عشق بلا کار عاشق کے لئے آفت جان بن کر زندگی کو عذاب میں تبدیل کر دیتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں اذیت، مصیبت اور غم و الم کے علاوہ اور دھرا ہی کیا ہے۔ "نہ لگانا نہ لگانا" کی تکرار سے جہاں تلفظ میں اصرار اور زور پیدا ہوتا ہے وہاں موسیقیت بھی پیدا ہوتی ہے پورے شعر میں 'ت'، 'ن'، اور 'گ' کی آوازوں سے اچھا صوتی اثر قائم ہوا ہے۔

۲۔ داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رلانا ہرگز

مشکلات: گل کی داستان، عروج کی داستان، خزاں: زوال، بربادی

حالی کی یہ غزل تیس اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ نواں شعر ہے۔ اس سے قبل دو اشعار یوں ہیں ہے

کوچ سب کر گئے دلی سے ترے قدر شناس قدر یاں رہ کے اب اپنی نہ گنوانا ہرگز

تذکرہ دہلیٔ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانا ہرگز

ان دو اشعار کے پس منظر میں بھی باقی ماندہ اشعار کی تفہیم ہو سکتی ہے۔ کتاب کے مرتبین نے ان کو خارج از نصاب کر کے خوش ذوقی کا ثبوت نہیں دیا۔ کیونکہ ان اشعار کے بغیر غزل کے اشعار کا مفہوم ادھورا بن جاتا ہے۔ جب کہ باقی ماندہ تمام اشعار ایک مسلسل مضمون و موضوع رکھتے ہیں۔ اس تسلسل مضمون کی وجہ سے حالی کی اس غزل کو نوحۂ دہلی کا عنوان دیا گیا ہے حالانکہ مختلف الموضوع اشعار کی وجہ سے غزل کا عنوان نہیں بن سکتا۔ حالی اردو کے

پہلے شاعر ہیں۔ جن کے کلام میں اجتماعی شعور اور ملی احساس ملتا ہے دلی کی عظمت رفتہ اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ غزل کے ایک شعر میں دلی کا نام آجانے پر شاعر کا ملی اور اجتماعی شعور بیدار ہو جاتا ہے۔ اور وہ اپنے ماضی کا رونا رونے لگ جاتا ہے۔ چنانچہ اس شعر میں بلبل سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ مجھے ہندی مسلمانوں کے اس دور خزاں میں بہار کی داستان نہ سنا۔ بلبل علامت ہے۔ شاعر کی خود اپنے آپ سے شاعر مخاطب ہے کہ اس زوال پذیر دور مسلمانان ہند میں ان کے عروج کی داستان کلام میں پیش نہ کر۔ ورنہ ہم ہنستے ہنستے رونے لگ پڑیں گے۔ عروج و زوال کی یہ داستان اتنی درد انگیز اور کرب ناک ہے کہ بے اختیار رونا آجائے گا۔

۳۔ ڈھونڈتا ہے دل شوریدہ بہانے مطرب — درد انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز

اس شعر میں گلوکار سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے مطرب! اس بات کا خاص خیال رکھیو کہ کوئی درد انگیز غزل نہ گاؤ۔ ورنہ میرا دل دیوانگی کے بہانے ڈھونڈ رہا ہے اگر کوئی درد بھرا شعر تو نے گایا تو میں جنوں کی شدت میں مبتلا ہو کر ہوش و حواس کھو بیٹھوں گا۔

۴۔ صحبتیں اگلی مصور! ہمیں یاد آئیں گی — کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز

مشکلات: صحبتیں: مجلسیں، محفلیں، رونقیں۔ مرقع: تصاویر کا مجموعہ، البم

اس شعر میں حالی نے مصور کو خطاب کیا ہے کہ خدارا دلکش تصاویر کا کوئی مرقع ہمیں دکھانا ورنہ ہمارا دھیان فوراً گذشتہ عظمت اسلامیان شہر سے تعلق رکھنے والی تقریبات اور محافل کی طرف چلا جائے گا اور میں انہیں یاد کر کے تڑپ اٹھوں گا خدا کے لئے مجھے اس کرب ناک کیفیت سے بچانا۔

۵۔ چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہ خاک — دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز

مشکلات: گوہر یکتا: لاثانی موتی — لاثانی عظیم ہستیاں تہ خاک: زیر زمین، دفن،

میر نے دلی اور اہل دلی کے متعلق کہا تھا۔

دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب — رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے

یہی بات حالی نے بیان کی ہے وہ کہتے ہیں کہ دلی اہل علم و ہنر کا مرکز تھا۔ جن سے فیض حاصل کرنے کے لئے لوگ اکناف عالم سے دلی میں آتے تھے یہ لوگ علم و ہنر کا خزانہ تھے جو مختلف ادوار میں اپنے چشمۂ علم و ہنر سے پیاسوں کو سیراب کرتے رہے اور خدا کو پیارے ہو کر یہیں دفن ہوئے، اس لحاظ سے دلی وہ شہر ہے۔ جہاں کے چپے چپے پر زیر زمین موتیوں کی سی قدر و قیمت رکھنے والے یکتائے روزگار اہل علم و ہنر دفن ہیں

اس لحاظ سے دنیا کے کسی اور مقام پر اتنا خزانہ دفن نہ ہوگا۔ جتنا یہاں ہے۔ غالب نے بھی ایسے یکتائے روزگار لوگوں کو گنج گراں مایہ سے نسبت دی ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم — تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

۶۔ وہ تو بھولے تھے ہمیں ہم بھی انہیں بھول گئے — ایسا بدلا ہے نہ بدلے گا زمانہ ہرگز

حالی کہتے ہیں کہ ہمارے اسلاف نے ہمیں بھلا دیا کیونکہ ہم ان کے ناخلف اخلاف ثابت ہوئے۔ ان کی میراثِ علم و ہنر کو نہ سنبھال سکے۔ ان کا روٹھ کر ہمیں بھلا دینا ایک فطرتی بات تھی مگر افسوس تو اس بات کا ہے کہ ہماری نسل نے بھی اپنے اسلاف کو بھلا دیا ہے یہ انقلاب ایسا بدترین انقلاب ہے جو اسلامی تاریخ میں نہ اس سے پہلے کبھی آیا نہ آئندہ کبھی آئے گا۔

۷۔ جس کو زخموں سے حوادث کے اچھوتا نہ بھیں — نظر آتا نہیں اک ایسا گھرانا ہرگز

مشکلات: حوادث، حادثات ۔ اچھوتا: جس کو کوئی نہ چھوئے

حالی ایک ملی اور قومی شاعر ہیں۔ اگرچہ وہ سرسید کی تقلید میں انگریزوں کے ساتھ تعاون کی پالیسی پر گامزن تھے مگر ان کے دل سے انگریزوں کی بے پناہ لوٹ مار اور مسلمانوں پر شدید مظالم کا گہرا نقش نہ تھا اس شعر میں ایسا ہی حوالہ ہے کہ دلی میں ہمیں ایک گھر بھی ایسا نظر نہیں آتا جو جنگِ آزادی کے دوران حادثات و مظالم سے محفوظ رہا ہو۔ حالی کی مراد مسلمان گھرانوں سے ہے غالب نے اسی کیفیت کو اپنے ایک خط میں یوں بیان کیا ہے "دلی ڈھونڈے سے مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔"

۸۔ ہم کو گھر تو نے رلایا تو رلایا اے چرخ — ہم پہ غیروں کو تو ظالم! نہ ہنسانا ہرگز

اردو غزل میں بدبختی کا ذمہ دار آسمانوں کو ہی ٹھہرایا جاتا ہے کہ اس کا انحصار اس کی گردش پر ہوتا ہے۔ اس لئے حالی اس شعر میں آسمان سے ہی مخاطب ہیں کہ اے آسمان! تو نے ہمیں یہ دن دکھائے کہ ہم کو رلا دیا۔ ہمیں اپنی حالت پہ رونا آتا ہے۔ یہاں تک تو پھر بھی قابلِ برداشت ہے مگر ظالم! ایسی صورتحال پیدا کرنا کہ غیر ہم پر ہنسنے لگ جائیں۔ یہ صورت ہمارے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔

۹۔ بخت سوتے ہیں بہت جاگ کے اے دورِ زماں — نہ ابھی نیند کے ماتوں کو جگانا ہرگز

مشکلات: دورِ زماں: زمانے کا چکر کبھی دن آجاتے ہیں اور کبھی برے۔ نیند کا ماتا مست خواب، نیند کا بھرا۔

یہاں پھر دورِ زماں یعنی آسمان ہی کو مخاطب کیا ہے۔ زمانہ پھرتا رہتا ہے یعنی دن پھرتے

رہتے ہیں۔ کبھی اچھے دن آئیں تو بُرے دن بھی آسکتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ ہمارے بخت بہت جاگ کے سوئے ہیں۔ جو بہت جاگے اسی نسبت سے اس پر نیند کا غلبہ ہوتا ہے اور وہ گہری نیند سوتا ہے اس لئے بہت جاگے ہوئے بخت کو سونے دو۔ ابھی ہمارے بخت مست خواب ہیں۔ نیند کر لینے دو۔ ابھی انہیں نہ جگاؤ، بخت کے ساتھ جاگنے اور سونے کو نسبت دی جاتی ہے۔ جس کے دن اچھے ہوں۔ اس کا بخت بیدار اور جس کے دن بُرے ہوں اس کا بخت خفتہ کہلاتا ہے۔

۱۰۔ غالب و شیفتہ و نیّر و آزردہ و ذوق — اب دکھائے گا یہ کرتب نہ زمانا ہرگز

اس سے پہلے کے دو اشعار یوں ہیں ؎

کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمہارا دلی — ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز
شاعری مر چکی اب زندہ نہ ہوگی یارو — یاد کر کر کے اسے جی نہ کڑھانا ہرگز

حالی نے علم و فن کے دلی سے رخصت ہونے کا ذکر کر کے ان میں سے ایک فن یعنی شاعری کا ذکر دوسرے شعر میں کیا ہے۔ شاعری نے جو کچھ عروج دیکھنا تھا دیکھ چکی اب دوبارہ اسے وہ عروج حاصل نہ ہوگا۔ کیونکہ بڑے بڑے پائے کے شاعر مر چکے ہیں۔ ان کے بعد ایسا خلا شاعری میں پیدا ہو گیا ہے جسے پُر نہیں کیا جا سکتا۔ مرنے والے شاعروں میں اسد اللہ خان غالب، نواب مصطفےٰ خان بہادر شیفتہ، نواب ضیاء الدین احمد خان نیّر مفتی صدر الدین آزردہ اور شیخ محمد ابراہیم ذوق کا نام گنوایا ہے۔ اب نہ ایسے لوگ دیکھنے میں آئیں گے نہ شاعری کو ان کے زمانے کا عروج و کمال میسّر آئے گا۔

۱۲۔ مومن و علائی و صہبائی و ممنون کے بعد — شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز

اس شعر میں بھی اس کے ماقبل کے شعر کی طرح مرحوم شعرائے عظیم میں سے چند کا نام لے کر مثلاً کلیم مومن خان مومن، امام بخش صہبائی، نواب علاؤ الدین خاں علائی اور ممنون وغیرہ شاعر نے کہا ہے کہ شعر تو لوگ کہتے تھے۔ اب اگر کوئی عقل مند ہوا تو شعر کا نام تک نہ لے گا کیونکہ ایسے پائے کا شاعر اب کہاں ملتا ہے؟

۱۳۔ کر دیا مر کے نگانوں نے یگانہ ہم کو — ورنہ یاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانہ ہرگز

مشکلات: یگانہ: لاثانی۔ یکتا۔

عربی میں ایک مقولہ ہے تُعَرِّفُ الْاَمْوَاتُ الْکِبَارُ اعنی عظیم لوگوں کی موت نے ہمیں عظیم بنا دیا۔ ورنہ ہم عظمت کے مستحق نہیں تھے۔ عظیم لوگوں کی موت کے بعد ان سے کم عظیم اور پھر ان سے بھی کم عظیم اور ادنیٰ لوگ بھی عظیم شمار ہونے لگے ہیں۔ حالی نے یہی بات

شاعری کے ضمن میں دہرائی ہے کہ ہم عظیم شاعر نہ پھر تے ہیں کہ ہم جب اور کوئی شعر سنیں۔ ہم میں سے کوئی بھی اس عظمت شاعری کا حامل نہیں تھا غالب و شیفتہ و مومن وغیرہ جیسے یگانہ و یکتا شعرا کی موت نے ایسا خلا پیدا کر دیا کہ ہم سے بڑا کوئی شاعر نہ رہا۔ اس طرح لوگوں نے ہمیں ہی یگانہ شمار کر لیا۔ ورنہ ہم اس یکتائی کے کہاں مستحق تھے۔

۱۴۔ داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز

شاعر نے گلشن کی نسبت سے بلبل اور ترانہ کے الفاظ استعمال کئے ہیں گویا صنعت مراعات النظیر کا استعمال کیا ہے۔ اسے بالترتیب گلشن شاعری اور شاعر اور غزل سمجھا جائے تو مطلب واضح ہے کہ ابھی نواب مرزا خان داغ اور غالب کے شاگرد میر مہدی حسین مجروح زندہ ہیں ان کا دم گلشن شاعری میں بسا غنیمت ہے۔ ان کے کلام سے مستفید ہو لو کہ ان کی وفات کے بعد پھر غزل سننے کے لئے کوئی تیار ہی نہیں ہوگا غزل کی ساکھ اب انہی کے دم قدم سے قائم ہے۔

۱۵۔ رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر اب نہ دیکھو گے کبھی لطف شبانہ ہرگز

مشکلات۔ بزم زیر و زبر ہوئی، بزم درہم برہم ہوئی۔ لطف شبانہ: رات کی بزم کا لطف۔

حالی نے اس شعر میں جس بزم کے درہم برہم ہونے کا ذکر کیا ہے یہ دراصل وہ بزم سخن ہے جو بھلے دنوں میں سجتی تھی۔ حالی کہتے ہیں کہ رات کو سجنے والی ایسی محافل مشاعرہ کا لطف اب کبھی نہ پاؤ گے وہ دور ہی گزر گیا جس میں یہ لطف شبانہ حاصل ہوتا تھا اب رات گذر گئی۔ دن کو یہ لطف کیسے حاصل ہو۔ یعنی وہ زمانہ ہی گزر گیا جو سخن گوئی کا تھا اب وہ دور ہی نہیں رہا تو مشاعرے کیسے منعقد ہوں۔ یوں اور کوئی کلام اور سخن کیسے پیش کرے۔

۱۶۔ بزم ماتم تو نہیں بزم سخن ہے حالی یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز

حالی اپنی غزل پیش کر رہے ہیں۔ مگر ایک مضمون کو مسلسل باندھا ہے کہ ماتم اور نوحہ کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ اس لئے اس غزل میں ایک جگہ حالی نے دہلی کو دہلی مرحوم کہا ہے اور اسی لئے اس غزل کو "نوحہ دہلی" سے موسوم بھی کیا جاتا ہے۔ مقطع میں حالی کہتے ہیں کہ خود بھی روئے ہو۔ دوسروں کو بھی رلایا ہے۔ یہ بزم سخن کے حسب حال نہیں ہے۔ یہ مناسب نہیں ہے اگر یہ بزم ماتم ہوتی تو بے شک ایسا کرتے یہ تو بزم سخن ہے یہاں تو لوگوں کو محظوظ کرنے والا کلام پیش کرنا چاہیے۔ حالی بیان یہی کرنا چاہتے ہیں۔ کہ میری یہ غزل نوحہ دہلی میں

شمار کی جائے۔

غزل ۳

۱- کاٹیے دن زندگی کے ان یگانوں کی طرح جو سدا رہتے ہیں چوکس پاسبانوں کی طرح

مشکلات: یگانوں کی طرح، لاثانی اور بے نظیر لوگوں کی طرح، سدا: ہمیشہ، چوکس: ہوشیار

حالی کی یہ غزل بھی ایک مسلسل غزل ہے۔ اس میں تغزل کم اور تلقین و نصیحت زیادہ ہے حالی کی شاعری پر یہی اعتراض کیا جاتا ہے کہ انہوں نے بعض اوقات تغزل کو تبلیغ پر قربان کر دیا ہے حالی چونکہ قومی شاعر تھے اور مصلح، اس لئے ان کے کلام میں وعظ و تلقین کا آجانا ایک قدرتی بات تھی۔ اس پوری غزل میں وہ اپنی ہم قوموں کو کچھ تبلیغ و نصیحت کر رہے ہیں۔ اس شعر میں کہتے ہیں کہ تمہیں اپنی زندگی ایسے بے مثال لوگوں کے نمونے پر ڈھالنی چاہیے۔ جو ہمیشہ نگہبانوں اور پاسبانوں کی طرح ہوشیار رہتے ہیں۔ تم اپنے پاس خدا کی دی ہوئی صلاحیتیں رکھتے ہو جو قوم کی امانت ہیں۔ اپنے عمل سے ان صلاحیتوں کو یوں اجاگر کرو کہ حق کا مستقبل اور حال سنورے۔ پاسبانوں کی طرح ہوشیار رہ کر تمہیں اس امانت کی حفاظت کرنا چاہیئے۔

۲- منزل دنیا میں ہیں پا در رکاب آٹھوں پہر رہتے ہیں مہماں سرا میں مہمانوں کی طرح

مشکلات: پا در رکاب: تیار، آٹھوں پہر: ہر وقت۔ مہماں سرا: مسافروں کے ٹھہرنے کی جگہ

حالی اس غزل میں ایسے لوگوں کی تقلید کی تلقین کر رہے ہیں۔ جو اس دنیا کو اپنی عارضی منزل سمجھ کر اس میں سرائے کے مسافروں کی طرح ہر وقت اگلی منزل کو کوچ کرنے کو تیار رہتے ہیں اور وہ اس دنیا کی رنگینیوں میں پھنس کر اپنے اعلیٰ مقاصد کو پس پشت نہیں ڈال دیتے ہیں۔ بلکہ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے تگ و دو میں ہمہ تن لگے رہتے ہیں۔

۳- سعی سے اکتاتے اور محنت سے کنیاتے نہیں جھیلتے ہیں سختیوں کو سخت جانوں کی طرح

مشکلات: سعی: کوشش، کنیانا: گھبرانا، بچنا، جھیلنا: برداشت کرنا۔

یہ وہ لوگ ہیں جو کوشش و جہد سے کبھی نہیں ٹلتے اور محنت و مشقت سے کبھی جی نہیں چراتے ہیں۔ جب کبھی حصولِ مقصد کی راہ میں رکاوٹوں اور مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے سختیاں برداشت کرنا پڑیں تو حوصلہ نہیں ہارتے بلکہ سخت جان بن کر ان سختیوں کو برداشت کرتے ہیں۔

۴- رسم و عادت پر نہیں کرتے عقل کو فرماں روا نفس پر رکھتے ہیں کوڑا، حکمرانوں کی طرح

یہ لوگ رسومات اور روایات کی اندھا دھند تقلید نہیں کرتے ہیں، بلکہ روایات کو عقل کی

کسوٹی پر پرکھتے ہیں روایات کی پابندی اور اطاعت کرنے کی بجائے یہ ان پر عقل و استدلال کی حکمرانی قائم کرتے ہیں اور اپنی نفسیاتی خواہشات پر سخت گیر حکمرانوں کی طرح کوڑا چلاتے ہیں تاکہ نفس اپنی بے راہ روی سے باز رہے۔ یہ شعر حالی کی اپنی ذہنی کیفیت کا آئینہ دار ہے۔

۵ شادمانی پر گزرتے اپنے آپے سے نہیں
غم میں رہتے ہیں شگفتہ شادمانوں کی طرح

یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو نعمتوں سے مالا مال ہوں اور خوش و خرم زندگی بسر کر رہے ہوں تو اپنی حیثیت کو نہیں بھولتے اور تکبر نہیں ہوتے۔ اور اگر نعمتوں سے محروم ہو کر غم و الم میں اور عسرت میں زندگی گزارنی پڑے تو صبر سے کام لیتے ہوئے شادماں انسانوں کی طرح ہنستے رہتے ہیں۔ یہ دونوں مراحل انسانوں کے لیے بڑے کڑے مراحل ہیں، ایک نعمتوں سے بہرہ یابی مقام شکر ہے کہ جس نے نعمتیں دی ہیں۔ اس کا صحیح معنوں میں شکر ادا کیا جائے۔ اور آپے سے باہر ہو کر اسے بھلا نہ دیا جائے۔ دوسرا مرحلہ نعمتوں سے محرومی کا ہے۔ یہ مقام صبر ہے۔ دوسروں کو ان نعمتوں سے مالا مال دیکھ کر جن سے خود محروم ہیں۔ کڑھنا اور دل میں مشرکانہ و باغیانہ جذبات پیدا کرنا مقام صبر کے آداب کے خلاف ہے۔ یہ لوگ جن کی تقلید کی تلقین حالی کر رہے ہیں۔ وہ لوگ ہیں جو مقام شکر اور مقام صبر دونوں حالتوں میں آزمائش میں پورے اترتے ہیں۔

۶۔ رکھتے ہیں تمکیں جوانی میں بڑھاپے کے سوا
رہتے ہیں چوکنچال پیری میں جوانوں کی طرح

مشکلات: تمکین: وقار سوا: زیادہ چوکنچال: زندہ دل پیری: بڑھاپا

یہ وہ لوگ ہیں جو جوانی کی خوبیاں بڑھاپے میں اور بڑھاپے کی خوبیاں جوانی میں بھی قائم رکھتے ہیں۔ مثلاً تمکین اور وقار بڑھاپے کی امتیازی خصوصیت ہے۔ یہ لوگ اسے جوانی میں بڑھاپے سے بھی زیادہ اختیار کرتے ہیں۔ بوڑھوں کی طرح وقار آمیز طریقے سے زندگی گزارتے ہیں۔ اور زندہ دلی جوانی کی امتیازی خصوصیت ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو بڑھاپے میں جوانوں کی طرح زندہ دلی سے زندگی بسر کرتے ہیں اور مایوسی اور مردہ دلی کو اپنے نزدیک نہیں آنے دیتے۔

۷۔ پاتے ہیں اپنوں میں غیروں سے سوا بیگانگی
پھر بھی منہ تکتے ہیں اک اک کا یگانوں کی طرح

یہ وہ لوگ ہیں جو صلہ رحمی سے کام لیتے ہیں۔ صلہ رحمی وہ طرزِ عمل ہے جس میں اپنوں اور عزیز و اقارب سے ہمیشہ اچھا سلوک کیا جاتا ہے۔ حتی الوسع ان کی امداد کی جاتی ہے خواہ جواب میں ان کی طرف سے بدسلوکی ہی دیکھنا پڑے۔ قابلِ تقلید لوگوں میں یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ ہمیشہ اپنوں جیسا سلوک کرتے ہیں خواہ وہ پرائیوں سے بھی زیادہ پرایا پن کا مظاہرہ کریں۔ انھیں اُن کے جوابی عمل سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ وہ اپنا طرزِ عمل نیک مسلمانوں کا سا اختیار کرتے ہیں۔

۸۔ اُس کھیتی کے پنپنے کی انھیں ہو یا نہ ہو
ہیں انہیں پانی دیتے جائے کسانوں کی طرح

یہاں حالی نے تمثیل سے کام لیا ہے کہ جس طرح کسان لوگ اپنی کھیتی کو پانی دیتے ہیں۔ اس پر محنت صرف کرتے ہیں۔ خواہ کھیتی کے پکنے کی توقع ہو یا نہ ہو۔ اسی طرح یہ لوگ بھی اپنی طرف سے محنت کرتے ہیں۔ نتیجہ اس کا خواہ کچھ ہی ہو کیونکہ وہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔

۹۔ ان کے غصّے میں ہے دل سوزی، ملامت میں ہے پیار
مہربانی کرتے ہیں نامہربانوں کی طرح

مشکلات:۔ دل سوزی: ہم دردی۔ غم خواری۔

یہ وہ لوگ ہیں۔ جو اگر کسی کو غصّے سے پیش آئیں۔ تو سمجھ لو کہ یقیناً ہمدردی اور غم خواری کر رہے ہیں۔ کوئی کام کسی سے غلط ہوا تو اس کے غلط نتیجے سے بچانے کے لیے وہ غصّے کی آگ سے کام لیتے ہیں۔ اصل میں ان کا دل غلطی کے خوفناک نتیجے سے جل اُٹھا اور یہ سب کچھ ہمدردی میں کرتے ہیں۔ ان کا غصّہ ہمدردی کا نتیجہ ہے نہ کہ نفرت کا۔ جب کبھی وہ کسی کو ملامت کرتے ہیں۔ تو ان کا مقصد بُرا بھلا کہنا نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ یہ سب کچھ پیار اور محبت اور ہمدردی کی وجہ سے کرتے ہیں تاکہ دوسرے غلط کاموں سے پرہیز کر کے غلط نتائج سے بچ جائیں۔ اس طرح ان کا غصّہ اور ملامت بظاہر تو نامہربانوں کا سا رویہ ہوتا ہے۔ لیکن وہ نامہربانی کے روپ میں ہمدردی اور مہربانی کر رہے ہوتے ہیں۔

۱۰۔ کام سے کام اپنے ان کو، گو ہو عالم نکتہ چیں
رہتے ہیں بتیس دانتوں میں زبانوں کی طرح

مشکلات:۔ کام سے کام: اپنے کام میں مشغول رہنا۔ نکتہ چیں: اعتراض کرنیوالا۔

بتیس دانتوں میں زبان اپنے آپ کو دانتوں کی کاٹ سے محفوظ رکھتی ہے اور دانت اُسے کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے۔ اس طرح وہ لوگ جن کی قیادت قبول کرنی چاہیئے اور جن کی تقلید کرنی چاہیئے۔ کبھی نکتہ چینی سے نہیں گھبراتے۔ وہ اپنے کام سے غرض رکھتے ہیں۔ خواہ سارا جہاں اعتراض کرتا رہے وہ پروا نہیں کرتے۔ بتیس دانتوں میں زبان کی طرح وہ اپنے نکتہ چینوں کی گزند سے محفوظ رہتے ہیں۔

۱۱- طعن سن سن احمقوں کے ہنستے ہیں دیوانہ وار
دن بسر کرتے ہیں دیوانوں میں سیانوں کی طرح

یہ وہ لوگ ہیں جو احمق نکتہ چینوں کے اعتراضات اور طعنے سُن سُن کر بے اختیار ہنسنے لگ جاتے ہیں تاکہ ظاہر ہو کہ احمقانہ اور بے کار اعتراض ہے۔ وہ دیوانوں اور احمق لوگوں میں دن ایسے گزارتے ہیں یعنی زندگی ایسے گزارتے ہیں۔ جیسے دانش مند لوگ گزارا کرتے ہیں کہ احمقوں اور دیوانوں کی باتوں کو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھتے اور اپنے مقصد سے لگن رکھتے ہیں۔

۱۲- کیجیے کیا حالی، کیجیے سادگی گر اختیار
بولنا آتے نہ جب رنگیں بیانوں کی طرح

مطلع میں حالی نے اپنے نکتہ چینوں کو جواب دیا ہے جو کہتے تھے کہ حالی کے کلام میں کوئی رنگینی اور چاشنی نہیں ہے۔ ان کے کلام میں رعنائی اور چمک دمک نہیں حالی کہتے ہیں کہ میں سیدھا سادہ انسان ہوں۔ جب رنگین بیانی نہ آتے تو سادگی کیوں نہ اختیار کروں۔ مجھے اپنے پیغام کا ابلاغ کرنا ہے وہ رنگین اور پُر تکلف کلام سے نہیں ہو سکتا۔ میرے لیے سادگی ہی بہتر اندازِ سخن ہے

غزل ۴

۱- اتنی ہی دشوار اپنے عیب کی پہچان ہے
جس قدر کرنی ملامت اور کو آسان ہے

مشکلات:- دشوار: مشکل عیب: خامی۔ نقص۔

اس شعر میں حالی نے نہایت عمدہ نفسیاتی نکتہ بیان کیا ہے کہ ہم دوسروں کی خامیوں اور نقائص پر خوب معترض ہوتے ہیں اور اس کام میں ہمیں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ لیکن جس عیب کو ہم دوسروں میں دیکھ کر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ وہی عیب

اگر خود ہم میں بدرجۂ کمال موجود ہو تو ہم اُسے نہیں دریافت کر سکیں گے وہ عیب ہمیں عیب محسوس ہی نہ ہوگا۔ اپنے عیب کی پہچان اتنا ہی مشکل کام ہے۔ جتنا کہ وہی عیب دوسروں میں تلاش کر لینا آسان ہے۔ مقولہ مشہور ہے کہ اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا دوسرے کی آنکھ تنکا نظر آجاتا ہے۔ ظفر کہتا ہے ؎

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا

حالی عیب جوئی کو اخلاقی کمزوری قرار دے اپنے گریبان میں جھانک کر اپنے عیوب کی پہچان کی تلقین کرتے ہیں۔

۲۔ دیکھ اے بلبل! ذرا گلبن کو آنکھیں کھول کر
پھول میں گر آن ہے کانٹے میں بھی رکِ شان ہے

مشکلات:۔ گل بُن: گلاب کا پودا آن: شان

بلبل کو گل سے تعلق ہے وہ اسی پر عاشق و دارفتہ ہے۔ اس کی نگاہ میں اور کوئی چیز نہیں جچتی ہے۔ پھول حسن اور ملائمت کی علامت ہے: مگر بلبل جس گلاب کے پھول سے عشق رکھتی ہے اس کے ساتھ کانٹے بھی وابستہ ہیں۔ سخت نوکیلے اور چبھنے والے کانٹے۔ بلبل کو کانٹوں سے کوئی غرض نہیں ہے۔ وہ تو حسن و ملائمت کے پیکر گل پر نثار ہے۔ حالی اُسے نصیحت کر رہے ہیں کہ ذرا آنکھیں کھول کر گلاب کے پودے کو دیکھ۔ پھولوں کے ساتھ ساتھ کانٹے بھی اس کا لزوم ہیں۔ اگر تجھے پھول میں ایک شان اور آن نظر آتی ہے تو کانٹوں میں بھی ایک جلالی شان ہے۔ جو نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔ شاعر زندگی کے صرف ایک رخ پر نظر کرنے والوں کو تلقین کر رہے ہیں کہ خوشی و شادمانی کے ساتھ ساتھ غم و الم بھی وابستہ ہیں بلکہ زندگی غم و الم کے بغیر نامکمل رہتی ہے۔

اقبال نے کہا ہے ؎

تمنا آبرو کی ہو اگر گلزارِ ہستی میں
تو کانٹوں میں اُلجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے

۳۔ عقل پھیلی پر نہ سمٹی حرص و آز انسان کی
لے نہ اب نام آدمیت کا اگر انسان ہے

مشکلات:۔ حرص و آز: لالچ۔ خودغرضی عقل پھیلنا: عقلی علوم کا ترقی کرنا۔

حالی نے موجودہ علمی ترقی کو دیکھا ہے۔ لیکن وہ اس ترقی کے اس پہلو سے مطمئن ہیں کہ جہاں علم پھیلا ہے وہاں ساتھ ہی ساتھ انسان کے اندر کا لالچ بھی پھیلتا چلا گیا ہے۔ یہ ترقی اگر صرف سائنسی ترقی ہوتی تو قابلِ قبول تھی۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ انسانی، اخلاقی اقدار پامال ہو گئی ہیں۔ بجائے اس کے اچھی اخلاقی اقدار فروغ پاتیں یہاں پست اخلاقی اقدار نے فروغ پایا ہے۔ مثلاً انسان میں حرص و آز بہت بڑھ گیا ہے۔ حتیٰ کہ سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک ساری دنیا کو اپنے حرص و آز کی لپیٹ میں لے لینا چاہتے ہیں۔ اب انسان اگر اس مادی ترقی کے اس پہلو پر غور کرے تو کہنا پڑتا ہے کہ آدمیت ختم ہو گئی ہے۔ اقبال نے کہا ہے ؎

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

ہونا تو یوں چاہیئے تھا کہ اس علمی و سائنسی ترقی کے ساتھ انسان اخلاقی لحاظ سے بھی بلند رتبہ بن جاتا۔ مگر افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔

۴۔ چیونٹیوں میں اتحاد اور مکھیوں میں اتفاق
آدمی کا آدمی دشمن خدا کی شان ہے

یہ شعر پہلے شعر کے ساتھ مسلسل ہے کہ مادی ترقی نے انسان کی اخلاقی اقدار کو روند ڈالا ہے۔ حقیر جانوروں میں سے چیونٹیوں اور مکھیوں کا اتفاق قابلِ دید ہے۔ چیونٹیاں مل کر نظم و ضبط کے ساتھ اجتماعی مفاد کے لیے کام کرتی ہیں۔ خوراک کے ریزے کہاں کہاں سے منہ میں اُٹھا لا کر زیرِ زمین اجتماعی ذخیروں میں جمع کرتی ہیں۔ اسی طرح شہد کی مکھیاں اجتماعی اتفاق کا ایک قابلِ تقلید نمونہ پیش کرتی ہیں۔ حقیر سے جانوروں کی تو یہ حالت ہے اور اس کے مقابلے میں اشرف المخلوقات کی یہ حالت ہے کہ آدمی کا آدمی دشمن ہے۔ کہیں دشمنی کی بنیاد مذہب ہے۔ کہیں وطن ہے کہیں رنگ ہے تو کہیں نسل ہے۔ عالم انسانیت کو متحد کرنا ایک ناممکن بات نظر آتی ہے۔

۵۔ دل میں حالی کے رہے باقی نہ بس ارمان کچھ
جی میں ہے کچھ اب اگر باقی تو یہ ارمان ہے

حالی نے اپنے ارمان پورے کرنے کا ایک نیا طریقہ اختیار کیا ہے کہ اب دل میں ایک ہی ارمان باقی ہے کہ دل میں کوئی ارمان باقی نہ رہے۔ کہنا یہ چاہتا ہے کہ سارے ارمان پورے ہو جائیں۔ ویسے تو خواہشات بے حد و حساب ہیں۔ لیکن حالی نے ساری

خواہشات کو اب صرف ایک خواہش شکل دے دی کہ کاش میری ساری خواہشات پوری ہو جائیں۔" بظاہر یہ ایک خواہش ہے مگر اس میں ساری خواہشات جمع ہو گئی ہیں۔ جیسے مومن نے کہا ہے ؎

ایک دشمن کہ چرخ ہی نہ رہے ❊ تجھ سے یہ اے دعا نہیں ہوتا

بظاہر یہ ایک دعا ہے۔ لیکن یہ سب بلاؤں سے نجات پانے کا مجموعہ ہے۔

نواب مرزا خاں داغ دہلوی

۱۸۳۱ء ـــــ ۱۹۰۵ء

حالات زندگی

نام: نواب مرزا خاں تخلص: داغ ولادت: ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء بمقام دہلی۔ والد کا نام: نواب شمس الدین خاں۔ داغ ابھی سات برس کے تھے کہ والد فوت ہو گئے۔ اُن کی والدہ نے مرزا احمد سلطان ولی عہد شاہ دہلی سے شادی کر لی۔ داغ بھی والدہ کے ساتھ قلعۂ معلّٰی میں چلے آئے۔ لال قلعے کے ماحول نے شعر و شاعری کی طرف مائل کیا۔ ذوق سے اصلاح لی۔ عربی، فارسی، خوشنویسی، اور شہسواری میں مہارت پیدا کی۔

۱۸۵۷ء میں لال قلعے کی دُنیا بدل گئی۔ داغ رام پور چلے گئے۔ نواب رام پور نے اُن کی قدر کی۔ ملازمت ملی اور کلب علی خاں کی ہم نشینی اور مصاحبت کا لطف بھی اُٹھایا۔ نواب صاحب کے ہمراہ حج بھی کیا۔ ۱۸۸۷ء میں نواب صاحب کی وفات رام پور سے دل اُچاٹ ہو گیا۔ مختلف مقامات پر گھومتے پھرے۔ آخر میں حیدر آباد دکن پہنچے اور نظام دکن کے استاد مقرر ہو کر پہلے ایک ہزار اور پھر ڈیڑھ ہزار وظیفہ پانے لگے۔ نظام نے دبیر الدولہ، فصیح الملک کے خطاب دیئے۔ ۱۹۰۵ء میں دکن میں ہی انتقال کیا۔

داغ کی شاعری

داغ کی عمر کا خاصا حصّہ لال قلعے کے شاہی ماحول میں بسر ہوا۔ یہاں اُن کی تربیت ادبی اور شعری ماحول میں ہوئی۔ اس ماحول میں غمِ دوراں کا گذر نہ تھا۔ چنانچہ اِن کا سرمایۂ شعر زندہ دلی، شوخی اور شگفتگی کا آئینہ ہے۔

داغ نے اُردو زبان کے گہوارے میں پرورش پائی، اس لیے زبان و بیان کی سادگی اور بے تکلفی میں اُن کی حیثیت مسلّم ہے۔ اُن کا کلام صنائع بدائع، غیر ضروری تشبیہ و استعارہ، عربی و فارسی کے مشکل الفاظ اور پیچیدہ تراکیب سے خالی ہے۔ محاورہ بندی اور بے ساختگی میں اُن کا جواب نہیں۔ اُن کی زبان شستہ و رفتہ ہے۔ داغ کو اپنے مرتبے و مقام کا خود بھی احساس تھا ؎

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زبان کی ہے

داغ کو قلعے کے ماحول میں زمانے کے آلام و محرومیوں سے واسطہ نہیں پڑا۔ ان کی زندگی بے فکری اور عیش و نشاط میں گزری لہٰذا شگفتگی، زندہ دلی، شادمانی اور مسرت و فرحت اُن کے کلام کی نمایاں خوبی ہے۔ ان کی خوش گفتاری میں ظرافت کے مختلف رنگوں نے اُن کے شوخ رنگ کو اور گہرا کر دیا ہے۔ ان کے ہاں طنز ہے، اور گدگدی پھبتی اور چٹکی بھی۔ مثلاً ؎

ہاتھ پر اُن کو لگا لائے تو ہیں باتوں میں
اور کھل جائیں گے، دو چار ملاقاتوں میں

ہم نے اُن کے سامنے اوّل تو خنجر رکھ دیا
پھر کلیجہ رکھ دیا، دل رکھ دیا، سر رکھ دیا

داغ کے ہاں عشق مجازی کی مختلف کیفیات ملتی ہیں مگر ان کیفیات کی ترجمانی اُنھوں نے اپنے مخصوص نامانوس لب و لہجے میں کی ہے۔ اُن کے ہاں جذبات نگاری ہے اور معاملہ بندی بھی۔

محبوب کے ناز و ادا کا بیان ہے اور رقیب کی عیاریوں کا ذکر بھی، مگر عشق و عاشقی کی جملہ واردات کے بیان میں ان کا مردانہ پن، جارحانہ انداز اور مخصوص رنگِ تغزّل صاف نمایاں ہے۔ مثلاً ؎

چلے جو وہ تو قیامت بپا تھی چار طرف
ٹھہر گئے تو زمانے کو انقلاب نہ تھا

بڑا مزہ ہو کہ محشر میں ہم کریں شکوہ
وہ منتوں سے کہیں چپ رہو خدا کے لیے

بہرحال تو اب مرزا داغ قدیم اردو غزل کے نمایاں شاعر ہیں۔ نوح ناروی کے بقول "داغ صرف شاعر نہ تھے بلکہ شاعر گر تھے اور ان کا جس قدر بھی کلام ہے وہ اور شعراء کے لیے ایک درس اور دستور العمل ہے۔"

غزل ۱

۱۔ اب دل ہے مقام بے کسی کا یوں گھر نہ تباہ ہو کسی کا

داغ کہتا ہے کہ میرا دل اب حسرت و یاس اور بے کسی کا مسکن ہے۔ جہاں حسرت و یاس اور بے کسی کا ٹھکانا ہو ظاہر ہے کہ وہ جگہ ویران و تباہ حال ہے۔ جب انسان تباہی اور بربادی کا شکار ہو یا کسی عبرت ناک مصیبت میں گرفتار ہو تو اللہ سے نجات پانے کے لیے دعا کی۔ ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ یا اللہ! ایسی مصیبت میں کسی دشمن کو بھی نہ ڈال۔ دوسرے مصرعے میں ایسی ہی خواہش ہے کہ میرا دل تو تباہ حال ہوا، خدا نہ کرے کہ اور کسی کا گھر بھی ایسے تباہ ہو۔

۲۔ رونا ہے اب اس خوشی کا ماتم ہے بہارِ زندگی کا

ہم تو اس بات کے لیے رو رہے ہیں کہ ہنسی خوشی میسر ہو۔ رونا ہونا محاورہ ہے یعنی شکوہ اور فریاد کرنا۔ شاعر کہتا ہے کہ ہمیں شکوہ و فریاد اس بات کی ہے کہ ہنسی خوشی میسر آئے اور ہمارے بھی بھلے دن آئیں۔ ہم تو اپنی گوشتہ زندگی کی اچھی یادوں کا ماتم کر رہے ہیں۔ زندگی کے گوشتہ خوشگوار ایام کو شاعر نے بہارِ زندگی کہا ہے۔

۳۔ اتنی سی تو بس کسر ہے تم میں کہنا نہیں مانتے کسی کا

شاعر نے محبوب کی "نہیں نہ مانوں" کی خصوصیت کو بڑے اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔ عاشق کے لیے محبوب کی "نہ" ہی سب بلاؤں کا پیش خیمہ ہے۔ ادھر سے التماس ہوتی ہے تو جواب میں نہ۔ اُدھر سے شکوہ ہوتا ہے تو جواب میں "نہ"۔ عاشق دھمکی دے تو بھی جواب دیں "نہ"۔ اس انکاری طرزِ عمل نے عاشق کو خانہ خراب کر رکھا ہے۔ مگر داغ اسے "اتنی سی بات" قرار دے کر طنزیہ انداز اختیار کرتے ہیں کہ محبوب! ویسے تو تم اور تمہاری فطرت بہت ہی پسندیدہ ہے۔ مگر صرف ایک کسر ہے کہ تم کسی کا کہنا

نہیں مانتے۔ حالانکہ یہی ایک کسر ساری بلاؤں کے برابر ہے۔

۴۔ جو دم ہے وہ بسا غنیمت ❊ سارا سودا ہے جیتے جی کا

داغ کی زندگی عیش و نشاط کی زندگی ہے۔ اس کا عکس ان کی شاعری میں بھی ملتا ہے چنانچہ اس شعر میں کہتے ہیں۔ زندگی کو غنیمت سمجھ کر اس سے فائدہ اٹھاؤ۔ یہ ساری عیش و عشرت زندگی کے قیام تک ہی ہے۔ جیتے جی جو کرنا ہے کر لو۔ مرنے پر یہ سامانِ عشرت نہیں ملیں گے۔

۵۔ آغاز کو کون پوچھتا ہے ❊ انجام اچھا ہو آدمی کا

عموماً انجام بخیر ہونے کی دعا کی جاتی ہے۔ داغ اس محاورے سے یہ نکتہ پیدا کرتے ہیں کہ ابتدائے عمر جیسے بھی گزری کوئی بات نہیں ہے۔ انجام اچھا ہونا چاہیئے آخر عمر میں آکر اگر تلافی کی صورت پیدا کر لی جائے۔ اور انجام اچھا ہو جائے۔ تو سمجھ لو کہ زندگی اچھی گزر گئی۔

۶۔ کہتے ہیں اُسے زبانِ اردو ❊ جس میں نہ رنگ بھاکا کی

داغ کو زبانِ اردو کے روزمرہ اور محاورہ پر پوری قدرت حاصل ہے۔ ان کی پرورش ایسے ماحول میں ہوئی جہاں اردو کے خالص بولی جاتی تھی اور جہاں اردو شاعری کا چرچا تھا۔ وہ ذوق کے شاگرد تھے۔ جو شاعری میں اردو روزمرہ اور محاورہ کا خاص خیال رکھتے تھے۔ اس طرح داغ کے کلام میں خالص اردو کا استعمال ہے۔ جس پر وہ فخر بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک شعر میں کہتے ہیں ؎

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ ❊ ہندوستان میں دھوم ہماری زبان کی ہے

یہاں وہ ایک معیار اردو کے خالص کا پیش کر رہے ہیں کہ میرے نزدیک صحیح اردو زبان وہ ہے جس میں فارسی لغت اور محاورہ کی آمیزش نہ ہو۔

۷۔ ایسے سے جو داغ نے نباہی ❊ سچ ہے کہ یہ کام تھا اسی کا

میر نے کہا ہے ؎ مرے سلیقہ سے نبھی میری محبت میں

یہی بات داغ نے اس شعر میں کہی ہے کہ ایسے ظالم غفلت شعار بے وفا محبوب سے نباہ کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ داغ نے جو اس سے عشق میں نباہ کیا تو سمجھ لو کہ یہ سارا سہرا داغ کے سر ہے ہی یہ کام کر سکتا تھا۔ اس میں نامساعد حالات کا مقابلہ کرنے کی سکت تھی۔

غزل ۲

۱- اِن آنکھوں نے کیا کیا تماشا نہ دیکھا ❊ حقیقت میں جو دیکھنا تھا نہ دیکھا

اس دنیا میں آکر انسان اپنے حواس کے ذریعے نہ جانے کن کن تجربات سے گزرتا ہے۔ اس کے مشاہدات کی کوئی حد ہی نہیں ہے۔ وہ اپنی چند سالہ زندگی میں سرد و گرم زمانہ اور زمانہ کے نشیب و فراز دیکھتا رہتا ہے۔ مگر افسوس کہ اصل چیز جو قابلِ مشاہدہ تھی۔ اُسے وہ نہ دیکھ سکا۔ وہ اصل چیز حقیقتِ اولیٰ یعنی ذاتِ باری تعالےٰ ہے۔ دردؔ نے کہا ہے ؎

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا ❊ برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

۲- تجھے دیکھ کر وہ ڈوئی اُٹھ گئی ہے ❊ کہ اپنا بھی ثانی نہ پایا نہ دیکھا

اس شعر میں شاعر نے انسان کی اس نفسیاتی خصوصیت کا ذکر کیا ہے کہ ہر شخص اپنے آپ کو سمجھتا ہے کہ ہیچو ما دیگرے نیست۔ شاعر کہتا ہے کہ جب سے میں نے تجھے دیکھا ہے۔ یعنی تیری ذات کا شعور حاصل کیا ہے۔ اُس وقت سے تیری ذات میں شرکت کا احساس اُٹھ گیا ہے۔

۳- ان آنکھوں کے قربان جاؤں جنہوں نے ❊ ہزاروں حجابوں میں پردا نہ دیکھا

یہ واقعۂ معراج کی طرف اشارہ ہے کہ میں اس انسانِ کامل کی آنکھوں پر قربان جاؤں جس نے ہزاروں پردوں کو چیر کر تجھے جلوہ فرما دیکھا۔ قرآنِ کریم میں یہ واقعہ موجود ہے کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم آسمانوں کی سیر کرتے عرش معلےٰ پر گئے۔ سدرۃ المنتہےٰ پر جبرئیل آگے نہ جا سکے۔ اور اکیلے رسول پاکؐ تشریف لے گئے۔ اور نورِ خدا کو عین اپنی آنکھوں کے سامنے جلوہ گر دیکھا۔

۴- نہ ہمت، نہ قسمت، نہ دل ہے نہ آنکھیں ❊ نہ ڈھونڈا، نہ پایا، نہ سمجھا، نہ دیکھا

خدا کو پانے اور حقیقتِ اولیٰ دریافت کرنے کے سلسلے میں شاعر نے کہا ہے کہ ہم میں اتنی ہمت نہیں تھی اس لیے اُسے نہ ڈھونڈ سکے۔ قسمت نے یاوری نہ کی اس لیے اُسے نہ پا سکے۔ بصیرتِ دل سے محروم تھے۔ اس لیے اُسے سمجھ نہ سکے۔ آنکھیں ظاہر بیں تھی اس لیے اُسے دیکھ نہ سکے۔ یعنی ہم خدا تعالےٰ کا ادراک حاصل نہ کر سکے۔ اس شعر میں صنعتِ لف و نشر مرتب ہے۔ پہلے مصرعے میں ہمت، قسمت، دل اور آنکھوں کا ذکر ہے۔ دوسرے مصرعے میں اسی ترتیب سے ڈھونڈنے، پانے، سمجھنے اور

دیکھنے کا ذکر ہے۔ ہمت کا تعلق ڈھونڈنے سے، قسمت کا تعلق پانے سے اور دل کا سمجھنے سے اور آنکھوں کا تعلق دیکھنے سے ہے۔

۵۔ وہ کب دیکھ سکتا ہے اُس کی تجلی ❊ جس انسان نے اپنا جلوہ نہ دیکھا

اس شعر میں یہ مضمون ہے۔ مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ۔ جو اپنی ذات کو پہچان لیتا ہے وہی خدا کی ذات کا عرفان حاصل کر لیتا ہے۔ خدا کی معرفت حاصل کرنے کے لیے جو مراحل ہیں۔ ان میں سے پہلا مرحلہ اپنی معرفت حاصل کرنے کا ہے۔ جسے اقبال خودی کا نام دیتے ہیں۔ داغ کہتے ہیں جو انسان اپنا جلوہ اور اپنی حقیقت نہیں پا سکتا۔ وہ خدا کا جلوہ کیسے دیکھ سکتا ہے۔

۶۔ اسے دیکھ کر اور کو بھی جو دیکھے ❊ کوئی دیکھنے والا ایسا نہ دیکھا

اس شعر کا موضوع بھی معرفت ہے۔ داغ کا کہنا ہے کہ جو شخص ایک بار عرفان ذات الٰہی حاصل کر لیتا ہے۔ پھر وہ کسی اور چیز کے وجود کا قائل نہیں رہتا۔ وحدت الوجود کے عقیدے کے مطابق اپنی ذات کی نفی اور دیگر موجودات کی نفی حاصل کر کے ہی خدا کے وجود کا ادراک حاصل کیا جا سکتا ہے۔ جب خدا کی ذات کا ادراک ہو جاتے تو گویا انسان دیگر موجودات کی فرضی تضاد یر سے گزر گیا۔

۷۔ وہ تھا جلوہ آرا مگر تم نے موسیٰ ❊ نہ دیکھا نہ دیکھا نہ دیکھا

یہ تلمیح ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خداوند کریم سے اصرار کیا کہ رَبِّ اَرِنِی اللہ تعالیٰ نے جواباً فرمایا کہ لَنْ تَرَانِی یعنی تو مجھے دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ مگر بار بار کے اصرار پر اللہ تعالیٰ نے انہیں کوہِ طور پر جانے کا حکم دیا۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کی ایک جھلک دکھائی۔ کوہِ طور جل کر راکھ ہو گیا۔ اور موسیٰ علیہ السلام تابِ نظارہ نہ لا کر غش کھا کر گر پڑے۔ داغ حضرت موسیٰؑ سے مخاطب ہیں کہ آپ جلوہ کی تاب نہ لا سکے۔ کہ آپ میں اتنی ہمت نہیں تھی۔ ورنہ خدا تو جلوہ فرما تھا۔ جلوہ دیکھنے کے لیے جس ہمت کی ضرورت تھی وہ آپ میں نہ تھی۔ غالبؔ نے اسی مضمون کو اس شعر میں پیش کیا ہے ؎

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب ❊ آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

۸۔ تری یاد ہے یا ہے تیرا تصوّر ❊ کبھی داغ کو ہم نے تنہا نہ دیکھا

داغ اپنی حالت کا ذکر کرتے ہیں کہ ہر وقت محبوب کی تصویر آنکھوں کے سامنے رہتی ہے۔ اور دل میں تیری یاد قائم رہتی ہے۔ میں کبھی تنہائی میں مبتلا نہیں ہوا۔ تنہا ہوتے ہوئے بھی تمہارے ساتھ محفل نشین ہوتا ہوں۔ جیسے مومن نے کہا تھا ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا ❊ جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

امیر مینائی

(۱۸۲۸ء — ۱۹۰۰ء)

حالاتِ زندگی

نام: منشی امیر احمد۔ تخلص: امیر۔ سلسلۂ نسب حضرت مخدوم شاہ مینا سے ملتا ہے اسی نسبت سے مینائی کہلائے۔ والد کا نام مولوی کرم محمد تھا۔ ۱۸۲۸ء میں لکھنؤ کے مفتی سعد اللہ رامپوری اور بعض دیگر جید علمائے سے حاصل کی۔

امیر کو بچپن سے ہی شعر و شاعری سے دلچسپی تھی۔ لکھنؤ کا ماحول یوں بھی شعر گوئی کے لئے ساز گار تھا۔ امیر نے سخن گوئی میں منشی جعفر علی اسیر کو شاگردی اختیار کی۔ اس زمانے میں لکھنؤ میں ایک طرف کثرت سے مشاعرے ہوتے تھے جن میں آتش و ناسخ کے شاگرد دادِ سخن دیتے۔ دوسری طرف میر انیس و میرزا دبیر کے معرکے زوروں پر تھے اس سے امیر نے بہت کچھ سیکھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں محنت اور مشق سے شاعری میں ایسا کمال حاصل کیا کہ واجد علی شاہ نے ان کی شہرت سن کر دربار میں طلب کیا۔ امیر کا کلام سنا اور انہیں انعام سے نوازا۔

کچھ عرصہ بعد نواب یوسف علی خاں والیٔ رامپور نے اپنے ہاں بلا لیا قیام رامپور کا زمانہ ان کی شاعری کے عروج کا دور تھا۔ شاعری میں نواب صاحب ان کے شاگرد تھے دربار میں انہیں ہر طرح کی عزت حاصل تھی۔ تنخواہ بھی معقول تھی۔ تقریباً تیرہ سال یہ رامپور میں قیام کے بعد ۱۹۰۰ء میں نظام دکن کی فرمائش پر حیدر آباد چلے گئے مگر حیات مستعار کے دن پورے ہو چکے تھے چنانچہ وہیں اکتوبر ۱۹۰۰ء میں انتقال کیا۔

امیر مینائی کی تصانیف کی تعداد پچیس تک پہنچتی ہے۔ "مرآۃ الغیب" اور "صنم خانۂ عشق" معروف شعری مجموعے ہیں۔ نعت گوئی سے بھی انہیں خاص لگاؤ تھا۔ نعتیہ مجموعے کا نام، "جواہر خاتم النبیین" ہے "امیر اللغات" ان کا اہم کارنامہ ہے مگر افسوس کہ یہ نامکمل رہی۔

امیر مینائی کی شاعری

امیر مینائی ایک عالم فاضل اور ذہین انسان تھے۔ انہیں کئی زبانوں پر عبور حاصل تھا

نہایت پر گو شاعر تھے۔ ان کی شاعری کے بعض اہم پہلو مندرجہ ذیل ہیں۔

تنوع امیر مینائی نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ انہیں غزل کے ساتھ ساتھ قصیدہ، رباعی، نعت، مخمس اور مسدس وغیرہ میں بھی مہارت تامہ حاصل تھی۔ باعتبارِ معانی بھی ان کے کلام میں تنوع کیفیات ملتی ہیں۔ کہیں تصوف کی چاشنی تو کہیں عشق کی رنگینی، کہیں داغ کی سی شوخی ہے تو کہیں اعلیٰ درجہ کے جذبات و خیالات ملتے ہیں۔

زبان کی صفائی ان کی زندگی کا ابتدائی زمانہ لکھنؤ میں گذرا۔ چنانچہ ان کے ہاں زبان کی صفائی اور روزمرہ کی سادگی لکھنوی اثرات کا نتیجہ ہے انہوں نے محاورے بھی خوبی کے ساتھ استعمال کئے ہیں۔ امیر مینائی کی غزلوں میں زبان کی صفائی کے ساتھ شیرینی بھی موجود ہے ان کے بعض اشعار تو زبان زدِ عام ہیں۔ مثلاً

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر — سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

قریب ہے یار روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیوں کر
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

شوخیٔ بیان امیر مینائی، جب داغ کے رنگ میں شاعری کرتے ہیں تو ان کے اندازِ بیان میں شوخی نمایاں ہو جاتی ہے۔ اسے لکھنؤیت کا اثر بھی کہا جا سکتا ہے اس شوخی نے ان کے بعض اشعار میں بے باکی اور کہیں طنز پیدا کر دیا ہے۔ مثلاً

گھٹا میں برق جو چمکی تو یاد آئی امیر — ادا کسی کی وہ پردا اٹھا کے آنے کی

آخری وقت بھی پورا نہ کیا وعدۂ وصل — آپ آتے ہی رہے مر گئے مرنے والے

قادر الکلامی امیر ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ سکسینہ لکھتے ہیں۔ ان کا کلام اعلیٰ خیالات، فصاحت، بلاغت، روانی و سلاست اور توازن الفاظ اور ایجاز کے لئے مشہور ہے۔ ان کے اشعار میں شگفتگی، نزاکت خیال، بلند پروازی، شیرینی، زور اور قادر الکلامی بدرجہ احسن موجود ہے۔"

آخر میں امیر مینائی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جن سے ان کی شاعری کے نمایاں پہلوؤں

کی عکاسی ہوتی ہے ۔

قیامِ روح پہ قالب میں اعتماد نہ کر — کچھ اعتبار نہیں میہماں رہے نہ رہے۔

وصل ہو جائے یہیں حشر میں کیا رکھا ہے — آج کی بات کو کیوں کل پہ اٹھا رکھا ہے

یاد آتی ہے وہ رہ رہ کے یہ کس کی مرے دل میں — اٹھ اٹھ کے بٹھاتا ہے کسے درد جگر آج

غزل ۱

۱ دہی چراغ، دہی گل، دہی قمر، دہی برق — نئے لباس میں دیکھا اسے جہاں دیکھا

اس شعر میں وحدت الشہود کا عقیدہ موضوع بنا ہے۔ کائنات کا ہر موجود اپنے اندر وجود حقیقی کا عکس رکھتا ہے۔ امیر کہتے ہیں کہ غور کی آنکھوں سے دیکھا جائے تو چراغ بھی وہی ہے۔ گل بھی وہی ہے، چاند بھی وہی ہے اور برق بھی اسکی ذات ہی ہے۔ اصل میں یہ سب اس کی ذات کے لباس ہیں۔ جہاں کہیں بھی کائنات پر نگاہ ڈالو۔ خدا ہی خدا کا جلوہ ہے۔ البتہ لباس مادی موجودات کا ہے مگر ہر چیز میں اس کا عکس جلوہ فگن ہے۔ ؛

بقول غالب ؎

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے — حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

۲۔ فنا ہے حسن کو، دولت کو، زندگانی کو — جہاں میں نہ کوئی باغ بن خزاں دیکھا

کائنات کی ہر مخلوق فنا پذیر اور بے ثبات ہے۔ حسن و جمال کے بڑے چرچے ہیں لوگ ذوق حسن کی بدولت حسین محبوبوں پر اور حسین مناظر پہ مرتے ہیں مگر حسن بھی لازوال نہیں ہے۔ دولت تو چھاؤں ہے آتی جاتی رہتی ہے زندگی کو قرار و ثبات نہیں، کوئی باغ نہیں ہے اس پہ خزاں نہ آتی ہو اور وہ ہمیشہ ہرا بھرا رہتا ہو فنا اور زوال اس کائنات کی فطرت ہے۔ امیر مینائی تو اس بے ثباتی سے یہ اخلاقی عبرت دلاتے ہیں کہ دنیا سے لگاؤ نہ رکھو۔ اقبال نے زوال سے ایک فلسفیانہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ سے وہی حسین ہے حقیقت زوال ہے جس کی۔

۳۔ پھنسی جو دام میں بلبل تو کن نگاہوں سے — کبھی چمن کو کبھی سوئے آشیاں دیکھا

آزادی بڑی ہی گراں قدر نعمت ہے، یہاں شاعر نے ایک بلبل آزاد کو گرفتار ہوتے دکھایا ہے۔ صیاد نے دام بچھایا تھا۔ بلبل بے چارہ دانے کے لالچ میں وہاں پھنستی گیا پھنسنے پر اسے احساس ہوا کہ آزادی کتنی قابل قدر چیز ہے وہ پہلے بھی اس باغ کو اور اپنے آشیاں

کو دیکھتی تھی۔ مگر اس کے اندازِ نگاہ میں بڑی تبدیلی آگئی ہے اس کی نگاہوں میں حسرت ہے وہ حسرت آمیز نگاہوں سے کبھی چمن کو دیکھتی ہے کہ ابھی چند لمحات پہلے میں اس میں آزادی سے پرواز کر رہی تھی۔ کبھی ارمان بھری نگاہوں سے اپنے آشیاں کو دیکھتی ہے۔ جو اب کاٹھکانہ تھا۔ نگاہوں کی اس حسرت کو شاعر نے اس شعر کا موضوع بنایا ہے۔

۴۔ بہار میں جو نکالا ہمیں تو کیا پایا خزاں میں حال چمن، تو نے باغباں دیکھا

باغباں باغ کی نگہداشت کرتا ہے۔ بہار کے موسم میں وہ باغ کے پھولوں، پودوں اور پھلوں کو مختلف پرندوں کی دستبرد سے بچانے کے لئے انہیں وہاں سے نکالنے کا اہتمام کرتا ہے۔ کبھی تیر کمان کے ذریعے کبھی غلیل کے ذریعے وہ انہیں وہاں سے اڑا کر بھگا دیتا ہے۔ بے چارہ بلبل جو موسم گل میں اپنے محبوب سے وصال پذیر ہو سکتا تھا۔ باغباں کو مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تو نے ہمیں بہار میں باغ سے نکال کر کیا حاصل کیا۔ بہار کے بعد جو خزاں آئی تو اس نے چمن کی رعنائی کو لوٹ لیا اب باغ کا نقشہ دیکھو۔ ویرانی کا منظر ہے۔ ہمیں نکال کے تو نے باغ کے لئے ویرانی مول لی۔

۵۔ کہیں گے وقت ملاقات ان سے اتنی بات جو کچھ سنا تھا، وہ آنکھوں سے مہرباں دیکھا

شاعر شاید نادیدہ ہی محبوب کے حسن کے چرچے سن کر اسے دل دے بیٹھا ہے اس کے حسن کا جو تصور وہ اپنے ذہن میں قائم کرتا ہے وہ بڑا ہی دل فریب اور دلکش ہے اسے اس خیالی تصویر کشی میں بڑا لطف آتا ہے گویا کہ وہ اپنے سامنے ایک مثالی محبوب دیکھ رہا ہے۔ اس کے دل میں ایسے مثالی محبوب سے ملاقات کی خواہش گدگدی لیتی ہے تو پھر وہ تصور ہی تصور میں ملاقات کے لئے مکالمے گھڑتا رہتا ہے۔ ایسی ہی کیفیت کو شاعر نے بیان کیا ہے کہ جب کبھی محبوب سے ملاقات پائی تو میں محبوب سے کہوں گا کہ مہربان! آپ کے حسن اور آپ کی اداؤں کے جو چرچے میں نے لوگوں سے سنے تھے وہ حرف بحرف درست ثابت ہوئے ہیں۔ میں نے آج وہ باتیں آپ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لی ہیں۔ حالانکہ دیکھنے والے نے یہ تصور پیش کیا ہے کہ اپنی طرف سے تو عاشق طے کر کے جاتا ہے کہ وقتِ ملاقات یہ کہوں گا اور وہ سناؤنگا مگر اسے سامنے دیکھ کر ہوش اڑ جاتے ہیں اور کچھ بھی منہ سے نہیں نکلتا۔ سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا۔

۶ دکھائی ترک تعلق نے شانِ بے رنگی بڑھے مکان سے آگے تو لامکاں دیکھا

شاعر کی نگاہ میں کائنات اور اس کی اشیاء کا وجود ایک رنگ ہے۔ اگر رنگ کو مٹا دیا جائے یعنی اپنے وجود سے ترکِ تعلق اختیار کر لیا جائے۔ جسے صوفیاء نفیِ ذات اور نفیِ موجودات کہتے

ہیں۔ تو پھر انسان گویا کائنات کی سرحدوں سے نکل گیا کائنات کی سرحدیں اپنے اندر جو کچھ رکھتی ہیں وہ مکاں ہے جب مکان کی سرحدوں سے نکل جائیں تو لامکاں میں داخل ہوں گے شاعر کہتا ہے کہ نفی وجود سے انسان فنا فی اللہ ہو سکتا ہے اور لامکاں اس کی منزل بن سکتی ہے۔

غزل نمبر ۲

۱۔ تیر کھانے کی ہوس ہے تو جگر پیدا کر ۔ سرفروشی کی تمنا ہے تو سر پیدا کر

یہ تیر محبوب کی نگاہوں کے تیر ہیں جو دل و جگر کے پار ہو جاتے ہیں۔ یہ سرفروشی محبوب پر سرشار کر دینا ہے یا اس کی مشقِ ستم کے لئے اسے پیش کر دینا ہے کہ تیغ ناز چلاؤ۔ تیر کھانے کی ہوس اور سرفروشی کی تمنا عشق کی ہی کیفیات ہیں۔ عشق کی دنیا بھی عجب دنیا ہے کہ وہاں آزار میں بھی لذت محسوس ہوتی ہے۔ شاعر عشق کا دعویٰ کرنے والوں سے کہتا ہے کہ اگر تیر ستم کی خواہش ہے تو پھر جگر بھی تاب و طاقت والا پیدا کرو کہ تیر ستم سے چھلنی ہو کر بھی مزید تیر سہنے کی سکت رکھتا ہو اگر سر قلم کرانے کی خواہش ہے تو پھر سر پیش کرنے کی بھی ہمت پیدا کرو۔ عاشقی کوئی آسان کام نہیں ہے یہاں تو محبوب جگر اور سر کا شکار کرتا ہے۔ اگر جگر میں تاب اور سر پیش کرنے کی سکت ہے۔ تو اس میدان میں قدم رکھو ورنہ یہ خیال دل سے نکال دو۔

۲ رنگ چاہے اگر اس باغ میں آزادی کا ۔ نکہت گل کی طرح شوقِ سفر پیدا کر

نکہت گل ؛ گل کی خوشبو

مشکلات

باغ استعارہ ہے اس سے مراد دنیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ دنیا کے باغ میں اگر تو آزادی چاہتا ہے تو پھول کی خوشبو کی طرح متحرک رہنا سیکھ۔ خوشبو باغ میں اپنے اس شوقِ سفر کی وجہ سے ہی آزاد ہے۔ ورنہ باغ میں سب پودے اور درخت پابہ گل ہیں۔ انہیں آزادی میسر نہیں ہے۔ حرکت میں برکت ہے حرکت اور عمل سے ہی کچھ حاصل ہوگا۔ اس کے بغیر کچھ نہیں مل سکتا۔

۳ کون سی جا ہے جہاں جلوۂ معشوق نہیں ۔ شوقِ دیدار اگر ہے تو نظر پیدا کر

اس شعر کا مضمون معرفت ہے۔ یہ جلوۂ معشوقِ مجازی نہیں بلکہ جلوۂ معشوقِ حقیقی ہے۔ انسان کو نظر میسر آجائے۔ جو دیدار کی طلب سے پیدا ہوتی ہے تو جہاں بھی نظر جائے گی، محبوب کا جلوہ نظر آئے گا۔ خدا کا جلوہ تو ذرے ذرے میں عیاں ہے۔ مگر اسے دیکھنے

کے لئے ایک خاص نظر کی ضرورت ہے۔ ہماری ظاہر بیں آنکھ اس کا جلوہ نہیں کر سکتی۔ یہ خاص نظر پیدا کر لی جائے تو ہر کہیں خدا ہی خدا نظر آئے گا۔

۴۔ میرے ہی دل پہ گرے کاش یہ بجلی بن کر اے فلک! آہ میں اتنا ہی اثر پیدا کر

شاعر کو گلہ ہے کہ اس کی آہ میں تاثیر نہیں ہے بقول درد ؎

نالہ، فریاد، آہ اور زاری آپ سے ہو سکا سو کر دیکھا

آسمان تقدیر کا مالک ہے اس لئے شاعر اسی سے مخاطب ہے کہ اگر میری آہ! محبوب کے دل میں کوئی اثر پیدا نہیں کر سکی تو نہ کرے۔ اس میں بجلی کی تاثیر پیدا کر خواہ یہ بجلی میرے اپنے دل پر ہی گرے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اس میں تاثیر پیدا ہو ضروری نہیں یہ تاثیر محبوب کو متاثر کرے۔ اگر یہ بجلی بن کر میرے اپنے دل پر گر پڑے تو بھی میں مطمئن ہو جاؤں گا۔

۵۔ آخرت میں عمل نیک ہی کام آئیں گے پیش ہے تجھ کو سفر، زاد سفر پیدا کر

آخرت، موت کے بعد کی زندگی۔ زاد سفر، سفر کا سامان

مشکلات

شاعر نے انسان کو خبردار کیا ہے کہ تو اس زندگی کو مقام عیش تصور نہ کر بلکہ اسے سفر سمجھ۔ یہ سفر سفرِ آخرت ہے، تیری منزل آخرت کی منزل ہے۔ جہاں صرف نیک اعمال مددگار بنتے ہیں اور کوئی بات یا کوئی شخص وہاں کام نہیں آتا۔ اس منزل پر صرف اپنے اعمال ہی کام آتے ہیں۔ اس لئے تجھے چاہیئے کہ اپنے سفر آخرت کے لئے زادِ راہ تیار کرے۔ یعنی نیک اعمال کمائے جو اس دنیا میں کمائے جا سکتے ہیں پھر نیک اعمال کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔

۶ صدمے الفت کے اٹھانے ہیں الٰہی مشکل دل اگر ایک دیا لاکھ جگر پیدا کر

شاعر کے خیال میں عشق کی دنیا میں ایسے جان کاہ صدمے آتے ہیں کہ انہیں برداشت کرنے کے لئے مضبوط دل اور توانا جگر درکار ہے اس لئے وہ خدا سے دعا کر رہا ہے کہ یا خدا! ایک دل کے ساتھ مجھے ایک لاکھ جگر بھی عطا کر تاکہ میں ایک دل کے ہاتھوں خریدے ہوئے عشق کے صدمات برداشت کر سکوں۔ صدمے سہنے کی تاب جگر میں ہی ہوتی ہے اور الفت کی خواہش دل میں ہوتی ہے۔ الفت تو ایک دل میں پیدا ہو گئی۔ مگر اس الفت کے نتیجے میں لاکھوں صدمے سہنے کے لئے لاکھوں جگروں کی ضرورت ہے اس لئے ایک دل کے ساتھ لاکھ جگر مانگے ہیں۔

غزل نمبر ۳

۱۔ دوسرا کون ہے جہاں تو ہے — کون جانے تجھے ؟ کہاں تو ہے

اے خدا ! جہاں کہیں بھی تو ہے۔ یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ وہاں تیرا کوئی شریک اور ثانی نہیں ہے۔ تو وہاں یکتا ہے، لیکن تجھے پائیں کیسے ! جب کہ ہمیں یہ معلوم ہی نہیں کہ تو کہاں ہے ؟ کہتے ہیں کہ تو رگ جان کے قریب ہے۔ مگر ہمیں تو کہیں نہیں ملتا۔ جہاں تو ہے وہاں چونکہ دوسرا کوئی بھی نہیں ہے۔ اس لئے تجھے جاننے والا کہاں سے آئے اگر تیری دنیا میں یعنی لامکاں میں کوئی اور بھی ہوتا تو وہ تجھے جانتا۔ وہاں تو تیرے سوا ہے ہی کوئی نہیں۔ ہم تجھے کیسے پہچان سکیں۔

۲۔ لاکھ پردوں میں تو ہے بے پردہ — سو نشانوں پہ بے نشان تو ہے

اے خدا ! تو عیاں اور بے پردہ ہے۔ مگر لاکھ پردوں میں چھپ کر عیاں ہے یہ ساری کائنات اور اس کا ایک ایک ذرہ ذرہ تیری نشانیاں ہیں۔ مگر اتنی بے شمار نشانیوں کے باوجود بھی تیرا نشان اور پتہ کہیں نہیں ملتا۔ تو ایسی پراسرار ذات ہے کہ عیاں ہونے پر بھی نہاں ہے اور نشان ہونے پر بھی تیرا نشاں نہیں ملتا۔

۳۔ تو ہے خلوت میں تو ہے جلوت میں — کہیں پنہاں، کہیں عیاں تو ہے

مشکلات خلوت۔ تنہائی عیاں۔ ظاہر جلوت۔ سرعام ہونا۔ پنہاں۔ چھپا ہوا

یا خدا ! تیری ذات ایسی پراسرار ذات ہے کہ جسے سمجھنا اور جس کا ادراک حاصل کرنا بہت ہی مشکل ہے تو تنہا بھی ہے کہ جہاں کوئی اور نہیں اور اس کے برعکس تو سرعام بھی ہر جگہ موجود ہے۔ کہیں تو پوشیدہ کہیں ظاہر ہے۔ تجھے پہچاننا بہت ہی مشکل کام ہے ہم کیسے تیرا عرفان حاصل کریں۔

۴ نہیں ہے تیرے سوا یہاں کوئی — میزباں تو ہے میہماں تو ہے

یہ وحدت الوجود کا مسئلہ ہے۔ یہاں تو ہی تو ہے۔ تیرے سے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ ہمیں تیرے سوا جو کچھ نظر آتا ہے یہ سب نظروں کا دھوکا ہے۔ درد نے تو کہا تھا کہ ہم سبھی مہمان تھے یاں تو ہی صاحب خانہ تھا۔ مگر امیر نے اپنی جہانی حیثیت سے بھی انکار کر دیا۔ یعنی ساری موجودات کی نفی کر دی۔ یہاں اور کچھ بھی نہیں ہے تو ہی تو ہے۔

بقول وحدہ ؎

جگ میں اگر ادھر ادھر دیکھا تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

۵۔ جسم کہتا ہے جان ہے تو ہی جان کہتی ہے جان جان تو ہے

جسم ایک جامد اور بے حس و حرکت چیز ہے جس میں اپنے آپ حرکت کرنے کی صلاحیت نہیں ہے، ہمارا جسم جو حرکت کرتا ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ اس کے اندر ایک روح کارفرما ہے۔ جب روح پرواز کر جاتی ہے تو ہمارا جسم بھی دیگر جمادات اجسام کی طرح ساکت و جامد ہو جاتا ہے، شاعر کہتا ہے کہ جسم کے خیال میں اس کے اندر کارفرما روح تو ہی ہے اور روح کہتی ہے کہ میری جان یا میرا محبوب تو ہی ہے۔ شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ کائنات کے ہر وجود اور ذرے کا مطلوب و محبوب تو ہی تو ہے۔

۶ رنگ تیرا چمن میں بو تیری خوب دیکھا تو باغباں تو ہے

باغ کی نسبت سے رنگ، بو اور باغباں کا ذکر کیا۔ جو باغ کے اجزا میں سے ہیں۔ لیکن ان میں سے ہر ایک کا اپنا الگ وجود قائم ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ غور سے دیکھا تو مجھے باغ کے ان سارے اجزا میں تو ہی نظر آیا۔ پھولوں میں رنگ تیرا ہے ان میں خوشبو تیری پاک ذات کی ہے۔ حتیٰ کہ چمن کی دیکھ بھال کرنے والا مالی بھی تو خود ہی ہے اہل نظر کو اس جہاں میں ہر جگہ تو ہی تو نظر آتا ہے۔ تاروں میں تو ہے، شمس و قمر میں تو ہے۔

۷۔ محرم راز تو بہت ہیں امیرؔ جس کو کہتے ہیں راز داں تو ہے

مشکلات محرم راز۔ راز داں۔ ہم راز۔

مقطع میں شاعر نے دعویٰ کیا ہے کہ معرفت کے راز ہائے سربستہ سے جتنا میں واقف ہوں اتنا اور کوئی نہیں ہے اور لوگ بھی عرفان خدا کر لیتے ہیں۔ اس طرح دنیا میں بہت عارف ہیں۔ جو خدا شناسی رکھتے ہیں۔ مگر صحیح معنوں میں جس کو رازدانِ حقیقت کہا جا سکتا ہے وہ میں ہی ہوں۔

غزل ۴

۱۔ ہوئے نام ور بے نشاں کیسے کیسے زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

مشکلات نام ور۔ مشہور لوگ، بے نشاں۔ جن کا نام و نشان مٹ جائے

زمین کھا گئی، زمین دفن ہوئے، آسمان، استعارہ ہے عظیم لوگوں سے

دنیا مقام عبرت ہے، یہاں لوگ آتے ہیں۔ اپنے عظیم کارناموں اور عظیم اقتدار کی بدولت نام پاتے ہیں۔ مگر موت آنے پر بالآخر انہیں زمین کھا جاتی ہے، یعنی وہ زیر زمین دفن ہو جاتے ہیں۔ زمین اور آسمان متضاد الفاظ ہیں اس طرح یہ صنعتِ تضاد ہے۔ مگر شاعر کا مطلب آسمان سے بلند رتبہ انسان ہیں۔ جن کا رتبہ آسمان تک بلند تھا ایسے بلند رتبہ اور آسمان جاہ لوگوں کو زمین نے کھا کر بے نشان کر دیا اب ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں ہے۔

اس پوری غزل میں کیسے کیسے" کی ردیف مترنم آہنگ پیدا کرتی ہے۔

۲۔ نہ گل ہیں، نہ غنچے، نہ بوٹے، نہ پتے ہوئے باغ نذرِ خزاں کیسے کیسے

یہاں بھی دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ پیش کیا گیا ہے کہ اس دنیا میں قرار کسی چیز کو میسر نہیں ہے، گل، غنچے، بوٹے، پتے، باغ، خزاں ایک دوسرے سے مناسبت رکھنے والے الفاظ ہیں۔ اس لئے یہ صنعت مراعات النظیر بن جاتی ہے۔ شاعر نے خزاں کو زوال کا استعارہ بنایا ہے اسی طرح گل، غنچے، بوٹے، پتے، باغ موجودات کی علامات ہیں یہاں کی کوئی چیز" زوال کے ہاتھوں محفوظ نہیں ہے۔ ہر چیز فنا پذیر ہے۔

۳۔ ہر اک دل پہ ہیں داغ ناکامیوں کے نشاں دے گیا بے نشاں کیسے کیسے

کوئی انسان ایسا نہیں جسے زندگی میں اپنے مقاصد حاصل کرنے کی تگ و دو کے دوران ناکامیوں کا سامنا نہ کرنا پڑا ہو، کامیابی یا ناکامی خدا کے ہاتھ میں ہے۔ شاعر نے ناکامیوں کے داغ کی نسبت سے نشان کا ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ خود تو بے نشان ہے۔ اس کا کوئی نہیں پتہ چلتا نہ سراغ ملتا ہے۔ مگر بے نشاں ہونے کے باوجود وہ ناکامیوں کے نشان یعنی داغ دلوں پر چھوڑ جاتا ہے۔ کوئی انسان ایسے نشانوں سے محفوظ نہیں ہے۔

۴۔ بہار آ کے قدرت کی گلشن میں دیکھو کھلاتا ہے گل باغباں کیسے کیسے

یہاں باغباں خود خدا ہے اور گلشن یہ ساری کائنات ہے۔ بہار اور گل اس کائنات کی رونقیں اور اس کے دل پسند مناظر ہیں۔ گلشن میں آ کر قدرت کی بہار دیکھو یعنی دنیا میں خدا کی خلاقی دیکھو کہ کیا کیا دلکش اور حسین مناظر پیدا کئے ہیں۔

۵۔ امیرؔ اب مدینے کو تو بھی روانہ ہو چلے جاتے ہیں کارواں کیسے کیسے

مدینہ منورہ میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا روضۂ اقدس ہے۔ لوگ حج پر

قافلوں کی صورت میں وہاں جاتے ہیں اور اپنی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتے ہیں۔ امیر نعت گو شاعر ہے۔ وہ رسول اللہؐ سے عشق رکھتا ہے اس لئے وہ بھی چاہتا ہے کہ روضۂ رسول کی سعادت حاصل کرے۔ چنانچہ کہتا ہے کہ قافلے جا رہے ہیں۔ اس لئے اب اے امیر! تو بھی مدینے کو روانہ ہو جا۔

مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی

(۱۸۷۵ء — ۱۹۵۱ء)

حالاتِ زندگی

سید فضل الحسن حسرت موہانی ۱۸۷۵ء میں یوپی کے ایک قصبے موہان (ضلع اناؤ) میں پیدا ہوئے، اردو، فارسی اور دینیات کی ابتدائی تعلیم کے بعد قصبے کے مڈل سکول میں داخل ہوئے جہاں سے حسرت نے ۱۸۹۴ء میں مڈل کا امتحان خاص امتیاز سے پاس کیا اور صوبے بھر میں اول رہے۔ ان کے والد کا قیام فتح پور ہنسوہ میں تھا چنانچہ مزید تعلیم کے لئے وہاں چلے گئے یہاں میٹرک کے ساتھ عربی اور فارسی کی اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کی۔ میٹرک میں شاندار کامیابی پر انہیں علی گڑھ والوں نے اپنے ہاں بلا لیا ۱۹۰۳ء میں آپ نے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ دوران تعلیم حسرت کو برطانوی راج کے خلاف آواز بلند کرنے کی پاداش میں تین مرتبہ کالج سے خارج کیا گیا۔

بی اے کے فوراً بعد آپ نے "اردوئے معلّٰی" کے نام سے ایک ادبی اور سیاسی پرچہ جاری کیا۔ ۱۹۰۸ء میں ایک باغیانہ مضمون کی اشاعت پر رسالہ بند ہوا اور حسرت کو ڈیڑھ سال قید بامشقت سنائی گئی۔ جیل میں ان کے ساتھ بہت سختی برتی گئی۔ ایک تو قید تنہائی دوسرے روزانہ من بھر گندم پیسنا مگر وہ ثابت قدم رہے ؎

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے، حسرت کی طبیعت بھی

حسرت موہانی کی ساری زندگی انگریزوں کے خلاف اور آزادیٔ وطن کی خاطر جدوجہد میں گذری۔ نہایت درویش قسم کے شخص تھے۔ انتہائی سادہ مزاج اور کھدر پوش قیام پاکستان کے بعد وہ ہندوستان میں ہی مقیم رہے اور مسلمانوں کی بھلائی کیلئے

مقدور بھر کوشش کرتے رہے۔

۱۳ مئی ۱۹۵۱ء کو ان کا انتقال ہو گیا

حسرت کی شاعری

حسرت موہانی نے اپنی شاعری کو متعدد اقسام میں تقسیم کیا، عاشقانہ، زاہدانہ فاسقانہ، عارفانہ، ناصحانہ اور سیاسی ——— وغیرہ ——— حقیقت میں غزل کے شاعر تھے۔ تاہم ان کی غزل کا رنگ، قدیم رنگ سے منفرد ہے اردو غزل کے ارتقا میں حسرت کی شاعری کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ بہرحال ان کی شاعری کی بعض خصوصیات یہ ہیں۔

عاشقانہ پاکبازی ان کی عشقیہ شاعری کا رنگ روایتی عشق سے الگ ہے اس میں رندی یا ہوسناکی کے بجائے پاکبازی جھلکتی ہے ان کے عشقیہ جذبات میں محبوب کی ذات کا احترام ملتا ہے، انہوں نے عشقیہ شاعری میں نئی راہ نکالی۔ ؎

دیکھنا بھی تو انہیں دور سے دیکھا کرنا　　شیوۂ عشق نہیں، حسن کو رسوا کرنا

خلوص اور سچائی حسرت کے عشقیہ جذبات کی سچائی اور خلوص نے ان کی غزل کو وہ رنگ و آہنگ عطا کیا ہے جس کی مثال اس سے پہلے کی شاعری میں نہیں ملتی، محبوب اور عاشق کی نفسیات کی صحیح ترجمانی، مبالغے سے اجتناب، سادگی اور سچائی　چند اشعار دیکھئے ؎

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہے حسرت　　ان سے مل کر بھی نہ اظہار تمنا کرنا

آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن　　آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے

صحت مندانہ لہجہ قدیم شعراء کے مریضانہ انداز کے برعکس حسرت کی غزل میں ایک صحت مند طرز احساس ملتا ہے۔ ان کے ہاں روایتی عاشق کا رونا، دھونا نہیں، مایوسی نہیں، بلکہ عشق ایک توانا جذبہ اور صحت مند رویہ ہے کوئی الجھاؤ نہیں بلکہ سادگی اور معصومیت ہے ؎

اس شوخ کو رسوا نہ کیا ہے، نہ کریں گے
ہم نے کبھی ایسا نہ کیا ہے، نہ کریں گے

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

سیاسی رنگ حسرت نے عمر بھر سیاست میں نہایت سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا اور جیل بھی کاٹی چنانچہ وہ شاعری میں سیاسی مسائل پر کھلم کھلا اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ سیاسی موضوعات کی آمیزش نے ان کی غزل کو زیادہ مقبول بنا دیا ہے

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی اک طرفہ تماشا ہے، حسرت کی طبیعت بھی

ہم قول کے صادق ہیں اگر جان بھی جاتی واللہ کہ ہم خدمتِ انگریز نہ کرتے

درد و سوز درد و سوز غزل کی بنیادی خصوصیات میں سے ہے، حسرت کی غزل اس خصوصیت سے خالی نہیں مگر اس میں بھی ایک درجہ اعتدال، وقار اور ٹھہراؤ ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

ہجر میں پاس مرے اور تو کیا رکھا ہے اک ترے درد کو پہلو میں دبا رکھا ہے

حقیقت کھل گئی حسرت ترے ترکِ محبت کی تمہیں تو اب وہ پہلے سے بھی بڑھ کر یاد آتے ہیں

مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ "حسرت محبت کے خوشگوار ماحول کے بہترین، مقبول ترین اور مہذب ترین مصور اور ترجمان تھے۔ وہ خالص غزل کے شاعر تھے ..... ان کے شعر میں ہر اس آدمی کے لئے اپیل ہے جو محبت کے جذبات سے متصف ہے۔"

غزل ۱

۱۔ اپنا سا شوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم گھبرا گئے ہیں بے دلی ہم زباں سے ہم

مشکلات ہم زباں ہم کلام۔ جس سے گفتگو کی جائے۔ بے دلی، بے ذوقی

حسرت نے اس شعر میں اپنے اندر وفورِ جذبۂ عشق کا اظہار کیا ہے۔ کہ جتنا میرے دل میں عشق کا ذوق و شوق ہے۔ وہ اوروں میں ناپید ہے۔ میں اپنا دل تو کسی کے دل میں ڈال نہیں سکتا۔ کہ دوسروں میں بھی یہ جذبہ پیدا ہو۔ عشق کے موضوع پر اور اس کی درد انگیزی پر میں اپنے مونس و غمخوار سے ہم کلام ہوں۔ مگر چونکہ اس کا دل اس جذبے سے

ناآشنا ہے۔ اس لئے وہ بد ذوقی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ جس سے میں گھبراہٹ اور بے چینی محسوس کر رہا ہوں کہ میں اس گفتگو میں اتنا سنجیدہ ہوں اور وہ بے دلی کا اظہار کر رہا ہے۔

۲۔ کچھ ایسی دور بھی تو نہیں منزل مراد لیکن یہ جب کہ چھوٹ چکیں کاروں سے ہم

حسرت کہتے ہیں کہ اس وقت جو ہمیں بقول غالب نظر آ رہا ہے کہ

ع ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے

تو اس کا سبب یہ ہے کہ ہم باجماعت اپنی منزل پر پہنچنا چاہتے ہیں۔ اگر میں خود غرضی اختیار کر لوں اور اپنی جماعت سے الگ ہو کر محض اپنا مفاد حاصل کرنا ہی مقصد بنا لوں تو میں آسانی سے اپنی منزل پر پہنچ سکتا ہوں۔ مگر میں ایسی مقصد رسی کا قائل نہیں، میں اپنی قوم سمیت قومی مقاصد کی تکمیل میں لگا ہوا ہوں۔ میں نے اپنی ذاتی اغراض کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ حسرت ایک قومی لیڈر تھے اور ان کی شاعری میں سیاست بھی ایک موضوع ہے یہ شعر ان کی بے لوث سیاسی خدمات کی عکاسی کرتا ہے۔

۳۔ بے تابیوں سے چھپ نہ سکا حال آرزو آخر بچے نہ اس نگہ بدگمان سے ہم

حسرت کہتے ہیں کہ میرے دل میں آرزو مچل رہی تھی۔ جس نے دل میں ہلچل مچا رکھی تھی اس کے نتیجے میں مجھے بے چینی اور بے تابی محسوس ہو رہی تھی۔ مگر میں نہیں چاہتا تھا کہ حال دل محبوب سے بیان کروں۔ ایسی ہی بے تابیوں کے عالم میں جب میں محبوب کے ہاں پہنچا تو میرا چہرہ اور میری حرکات و سکنات میری بے تابیوں کی چغلی کھا رہی تھیں۔ محبوب نے تیز نگاہوں سے مجھے دیکھا تو میرا حال دل اسے معلوم ہو گیا کہ میں اضطراب کا شکار ہوں۔ محبوب کی بدگمان نگاہوں سے میں اپنے دل کی حالت چھپا نہ سکا ہے

حال کھل جائے گا بے تابیٔ دل کا حسرت بار بار آپ انہیں شوق سے دیکھا نہ کریں

۴۔ مایوس بھی تو کرتے نہیں تم زراہِ ناز تنگ آ گئے ہیں کشمکش امتحاں سے ہم

زراہِ ناز : ناز کے طور

مشکلات

محبوب ہمارے جذبۂ عشق کو آزمانے کے لئے ہمارا امتحان لیتا ہے، مگر امتحان کا سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔ اگر وہ یہ کہہ دیتا کہ تم آزمائش میں پورے نہیں اترے ہو تو قطعی فیصلہ پر ہم چپ کر جاتے۔ مگر وہ آزمائش کے نتیجہ پر ایسے رویے کا اظہار کرتا ہے کہ جس سے ہماری مایوسی کا پہلو نہیں نکلتا۔ یعنی ہم مایوس بھی نہیں ہوتے۔ دوسری طرف ہم بامراد بھی نہیں ہوتے۔ نامرادی اور بامرادی کے بین بین ہم تذبذب کے عالم میں مبتلا ہیں۔

ہم تو آزمائشوں کی اس کشمکش سے تنگ آگئے ہیں اور وہ ابھی آزمائش کا سلسلہ جاری رکھنے پر تلا ہوا ہے۔ مایوس نہ کرنا بھی اس کی ایک ادا ہے۔ یہ بھی ناز محبوب کا ایک انداز ہے مگر اس ستم ناز سے ہم اب گھبرا گئے ہیں۔

۵۔ ہے انتہائے یاس بھی اک ابتدائے شوق پھر آگئے وہیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم

ہم نے وصال محبوب حاصل کرنے کے لئے ہر ممکن سعی کی۔ ہر آزمائش میں پورا اترنے کے لئے پوری تگ و دو کی۔ محبوب کے ستم برداشت کئے، زمانے کے طعنے سہے۔ عقل کی پاسبانی ترک کی۔ مگر بالآخر ناکام ہوئے اور انتہائی مایوسی کا شکار ہوئے۔ مگر وہ جو کسی نے کہا ہے کہ

گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں

ہم نے پھر ارادہ بنایا کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اب پھر از سر نو کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح ہم نے جہاں سے آغاز عشق کیا تھا پھر وہیں سے اپنی منزل کی طرف سفر شروع کر دیتے ہیں۔ نا امیدیوں کی انتہا بھی ہمارے لئے ابتدائے عشق کی نئی صورت بن جاتی ہے

۶۔ حسرت پھر اور جا کے کریں کس کی بندگی اچھا جو سر اٹھائیں بھی اس آستاں سے ہم

حسرت محبوب کے آستاں پر سجدے کو گناہ نہیں بلکہ بے خودی کی ایک کیفیت کہتے ہیں چنانچہ ان کا ایک شعر ہے ؎

سجدے کئے اس در پہ اس عذر سے لاکھوں ہم عاشق بے خود ہیں گنہ گار کہاں ہیں۔

اس شعر میں بندگی خدا کی نہیں بلکہ محبوب مجازی کی ہے۔ حسرت ہرجائی نہیں ہیں۔ اس لئے کہتے ہیں اگر ہم اس محبوب کے آستاں سے سر سجدہ اٹھا بھی لیں۔ تو پھر اور کس کی بندگی کریں اور کوئی محبوب پرستش کے لائق ہی نہیں ہے اس لئے وہ ہماری قدر کرے یا نہ کرے ہم اس کی بندگی کا حق ادا کرتے ہی رہیں گے۔

غزل

۱۔ لطف کی ان سے التجا نہ کریں ہم نے ایسا کبھی کیا نہ کریں

جس طرح غالب کا عشق امیرانہ اور میر کا عشق فقیرانہ تھا۔ اسی طرح حسرت کا عشق شریفانہ تھا۔ وہ عشق میں آداب و شرافت کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ اس لئے ان کے ہاں احتیاط عشق ہے۔ باوجود حسن سے قربت کے وہ نقاضے سے آگے نہیں بڑھتے

وہ احتیاط رکھتے ہیں کہ کہیں عشق کی بدولت حسن کو رسوا نہ ہونا پڑے۔ وہ خود کہتے ہیں ؎

دیکھنا بھی تو انہیں دور سے دیکھا کرنا　　شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا

ان کے مقابلے میں غالب کہتے ہیں ؎

بجز دنیاز سے تو وہ آیا نہ راہ پر　　دامن کو آج اس کے حریفانہ کھینچیے

اس شعر میں حسرت اپنی احتیاطِ عشق کے پیش نظر کہتے ہیں کہ میں نظارۂ حسن سے زیادہ محبوب سے تلطف اور مہربانی کی التجا نہیں کرونگا۔ نہ ایسا کبھی کیا ہے نہ کروں گا۔

۲۔ مل رہے گا جو ان سے ملنا ہے　　لب کو شرمندۂ دعا نہ کریں

شرمندۂ دعا : دعا کا احسان مند

حسرت کی احتیاطِ عشق انہیں دعا کے لئے لب کشائی کی اجازت بھی نہیں دیتی حسرت کہتے ہیں ؎

کٹ گئی احتیاط عشق میں عمر　　ہم سے اظہار مدعا نہ ہوا

وہ اپنے لب کو تکمیل آرزو کی دعا کا احسان مند بھی اس لئے نہیں کرنا چاہتے کہ اظہار مدعا خواہ محبوب سے التجا کی شکل میں ہو یا خدا سے دعا کی شکل میں یہ ان کے مسلک کے خلاف تھا کہ

؎ بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے۔

۳۔ صبر مشکل ہے آرزو بے کار　　کیا کریں بے خودی میں کیا نہ کریں

یہاں آرزو سے مراد اظہار آرزو ہے حسرت عشق کی الجھنوں میں مبتلا ہیں۔ وہ ابتلائے عشق سے کسی طرح محفوظ نہیں ہیں۔ لیکن صبر کر جاتے ہیں۔ اس شعر میں وہ کہتے ہیں کہ اب صبر مشکل ہے۔ میرا صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے۔ میں ہوش کھو بیٹھا ہوں۔ اپنے آپ میں نہیں رہا۔ ایسی بے خودی کے عالم میں میں کیا کروں۔ جب کہ صبر مشکل ہو گیا ہے اور اظہار تمنا ایک بے کار سی بات ہے ؎

بے زبانی ترجمان شوق بے حد ہو تو ہو　　ورنہ پیش یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں

۴۔ مسلکِ عشق میں ہے فکر حرام　　دل کو تدبیر آشنا نہ کریں

مسلک : راہ ، دستور فکر : سوچ ، تدبیر

عشق کی دنیا میں فکر و تدبیر کا واقعی کوئی دخل نہیں ہے۔ فکر و تدبیر تو عقل کی دنیا سے

تعلق رکھتی ہیں۔ اقبال یہ نکتہ یوں بیان کرتے ہیں ؎

عشق فرمودۂ قاصد سے سبک گام عمل　　عقل سمجھی ہی نہیں معنیٔ پیغام ابھی

حسرت کہتے ہیں، عشق کی راہ میں سوچنا اور عقل و تدبیر سے کام لینا حرام ہے عشق کی اپنی شریعت اور دستور ہے۔ اس دستور کے مطابق عقل سے مشاورت حرام ہے اس لئے ہمیں چاہیئے کہ دل کو عقل سے بے گانہ ہی رکھیں۔ فکر و تدبیر سے بے پرواہی رہے تو دل راہ عشق میں آگے نکل سکے گا۔

۵۔ مرضیٔ یار کے خلاف نہ ہو　　لوگ میرے لئے دعا نہ کریں

حسرت احتیاطِ عشق میں یوں پختہ ہیں کہ وہ نہ صرف محبوب سے التجا کرنا اور خدا سے دعا کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی منع کر رہے ہیں کہ میرے حق میں دعا نہ کرو۔ دعا کرنے والے تو اپنی طرف سے ہمدردی اور خلوص سے یہ کام کر رہے ہیں مگر حسرت کا مدعا ہے یہ ہے کہ کہیں یہ بات میرے محبوب کو ناگوار نہ گزرے ممکن ہے وہ اسے پسند نہ کرے۔ اس لئے میرے ہمدرد اور مونس دوستو! میرے حق میں دعا نہ مانگو

۶۔ شوق ان کا سو مٹ چکا حسرت　　کیا کریں ہم اگر وفا نہ کریں

حسرت نے ایک شعر میں اپنے جذبۂ عشق کے "اس حال" پر نہ رہنے کا ذکر کیا ہے ؎

اب عشق کا وہ حال نہ ہے حسن کا وہ رنگ　　باقی ہے فقط عہدِ تمنا کا فسانہ

ایسی ہی کیفیت اس شعر میں شاعر پر گزری ہے کہ رفتارِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ذوق و شوقِ عشق کے دل سے مٹنے کا تجربہ بھی حاصل کرتا ہے۔ مگر ساتھ ہی کہتا ہے کہ شوق و عشق کے عالم میں تو تمناؤں اور آرزوؤں کی توانائی سے زندہ تھے اب کیا کریں سوائے وفا کے اور کر ہی کیا سکتے ہیں۔ وفا کرنے پر مجبور ہیں۔

غزل

۱۔ ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی　　اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

طرفہ تماشا وہ طبیعت ہوتی ہے جس میں تضاد پائے جائیں۔ حسرت نے قید خانے میں چکی پیسنے اور شعر کہنے کو تضاد کہا ہے۔ مگر حسرت کی طبیعت کے اسی تضاد یا اسی طرفگی میں ان کی فنی صلاحیتیں پوشیدہ ہیں کبھی یہ محبتِ حسن اور آرزو کا رنگ اختیار کرتی ہیں اور کبھی آزادی کی تحریک کا روپ دھارتی ہیں۔ انہوں نے ملک کو آزاد کرانے کے لئے

اپنی زندگی مسلسل جدوجہد میں گذاری اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں یہ شعر اسی قید کی حالت میں کہا گیا۔ اس قید کے دوران میں ہر روز ایک من غلہ چکی میں پیسنے کے لئے دیا جاتا کمی رہ جاتی تو پانچ بید فی سیر کے حساب ننگے بدن پر کوڑے مار کر اس کی کمی پوری کی جاتی یہ شعر اسی قید خانے کی یادگار ہے۔ حسرت کے کلام میں واردات سیاست کے اشارے ہیں لیکن سیاست کے میدان میں جتنے ستم انہوں نے اٹھائے اس نسبت سے ایسے اشعار آٹے میں نمک کے برابر ہیں ایک اور شعر میں جابر حکمرانوں کے جبر کے متعلق کہتے ہیں ؎

ہیبت سی ایک خطرۂ دار و رسن میں تھی
چھایا ہوا کہ خاطرِ حسرت سے مٹ گئی

۲۔ یاں نالۂ مضطر کی جب مجھ میں تھی قوت بھی
رکھتے ہیں مرے دل پر کیوں تہمتِ بے تابی

مشکلات

تہمت بے تابی: بے چینی کا الزام، نالۂ مضطر: نالۂ پریشان

حسرت کہتے ہیں کہ مجھ پر یہ الزام لگانا بے جا ہے کہ میرے دل میں بے چینی اور اضطراب کا طوفان بپا ہے۔ میں نے ضبط غم کر لیا ہے اور عشق کی آنچ سے اسے پختہ کر لیا ہے۔ اس لئے بے تابیٔ دل کا طعنہ مجھے دینا مناسب نہیں اگر میرا دل بے تاب و مضطر ہوتا تو مجھ میں اسے ظاہر کرنے کے لئے نالۂ مضطر کی طاقت ہے۔ میں رو رو کے آہ کرتا اور فغاں کرتا، نالے آسمان تک پہنچاتا۔ میری طرف سے نالہ کا بلند نہ ہونا ظاہر کرتا ہے کہ مجھ پر یہ الزام غلط ہے۔

۳۔ اے شوق کی بے تابی وہ کیا تری خواہش تھی
جس پر انہیں غصہ ہے، انکار بھی، حیرت بھی

یہ شعر حسرت کے اپنے مسلکِ عشق سے انحراف کا مظہر ہے ان کا اپنا مسلک تو احتیاطِ عشق تھا۔ اظہارِ خواہش تو ان کے ہاں ہے ہی نہیں۔ مگر اس شعر میں اظہارِ خواہش ہو گیا ہے اور بے تابیٔ شوق کی وجہ سے ہوا ہے۔ خفیف ہو کر شاعر اپنے شوق کی بے تابی سے ہی پوچھتا ہے کہ وہ کون سی خواہش تھی۔ جس پر محبوب غصہ میں آگیا ہے۔ اس نے تکمیلِ خواہش سے بھی انکار کر دیا ہے اور حیران بھی ہوا ہے کہ یہ خواہش کیسے تیرے دل میں پیدا ہوئی حیرت شاید اسی وجہ سے ہوئی کہ عاشق کی طرف سے یہ طرزِ عمل محبوب کے لئے انوکھا اور نرالا تھا۔

۴۔ ہیں شاد و صفی شاعرِ یا شوق و دنا حسرت
پھر ضامن و محشر ہیں، اقبال بھی، وحشت بھی

حسرت عموماً اپنے اشعار میں اردو کے مسلّمہ شعرا کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ یہاں انہوں نے اپنے چند ہم عصر شعرا کے متعلق کہا ہے کہ وہ حقیقی شاعر ہیں۔

مثنا سید علی محمد شاد عظیم آبادی، شوق، وفا، ضامن، محشر، حضرت علامہ محمد اقبال اور رضا علی وحشت کلکتوی۔

غزل ۴

۱۔ دلِ مایوس کو سرچشمۂ صدق و صفا کر دے گداز غم اگر چاہے تو مجھ کو باخدا کر دے

سرچشمۂ صدق و صفا: سچائی اور پاکیزگی کا منبع، گداز غم: غم کی پگھلا دینے والی حرارت

غم اور ناکامی کا احساس ایک ایسی قوت ہے کہ جسے کسی بھی راہ پر لگا دیا جائے یہ اپنا اثر دکھاتی ہے۔ میر کے تغزل میں یہی قوت کارفرما ہے یہ وہ حرارت ہے جو ہر چیز کو پگھلا کر رکھ دیتی ہے۔ حسرت کہتے ہیں کہ اگر میرے غم کی قوت گداز چاہے تو میرے دل کی مایوسی کو پگھلا کر میرے دل کو سچائی اور پاکیزگی کے نور سے منور کر سکتی ہے اور اس طرح مجھے باخدا انسان بنا سکتی ہے۔

۲۔ عطا ہو اس وفا دشمن کو توفیق کرم یارب! نہیں تو پھر مجھی کو بے نیاز مدعا کر دے۔

وفا دشمن: بے وفا۔ محبوب، کرم: نوازش، بے نیاز مدعا: خواہش سے پاک

حسرت اپنے عشق میں ناکام ہو کر خدا سے دعا مانگ رہے کہ یارب! یا تو اس بے وفا محبوب کو مجھ پر نوازش اور کرم کرنے کی اور مہربان ہونے کی توفیق عطا کر اور اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو پھر میرے دل کو دلِ بے مدعا بنا کر مجھے آرزوؤں اور تمناؤں سے بے نیاز کر دے۔ ان میں سے کوئی صورت بھی عمل پذیر نہ ہوئی تو میری جان عذاب میں ہے۔

۳۔ اثر ایسا کہاں سے لاؤں یارب نالۂ دل میں جو اس بے مہر کو بھی رازِ غم سے آشنا کر دے

محبوب اپنے عاشق پر نامہربان ہے۔ وہ ستم ڈھاتا اور ظلم برساتا ہے اسے احساس ہی نہیں کہ اس طرح عاشق کے دل میں پیدا ہونے والا غم اس کے لیے بلائے جان بن جاتا ہے۔ شاعر مایوسی کے عالم میں خدا سے استدعا کرتا ہے کہ یارب! میرے نالۂ دل میں ایسا اثر پیدا کر کہ وہ بے مہر اور ظالم محبوب بھی غم سے دوچار ہو جائے۔ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مظلوموں کی فریاد سنتا ہے تو میری فریاد رسی کر ظالم کو غم سے دوچار کر دے۔ تب اسے پتہ چلے گا کہ غم برداشت کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔

شوکت علی فانی بدایونی

۱۸۷۵ء ـــــ ۱۹۴۱ء

غزل نمبر ۱

۱- ناکام ہے تو کیا ہے کچھ کام پھر بھی کر جا مردانہ وار جی اور مردانہ وار مر جا

مشکلات: مردانہ وار: مردوں کی طرح۔ بہادروں کی طرح

فانی کی شاعری ایک ناکام اور محروم انسان کی پکار ہے۔ لیکن یہ ایک شکست خوردہ انسان کی پکار نہیں بلکہ ایک جرأت مند انسان کی پکار ہے جو ناکامیوں اور محرومیوں کے باوجود کہتا ہے ؎ زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

اس شعر میں ان کا اپنا فلسفۂ غم اور فلسفۂ حیات ہے کہ ناکامیوں اور نامرادیوں سے جو یاس دل پر چھا گئی ہے اس میں ہی نہ ڈوب جاؤ۔ بلکہ اس یاس و ناامیدی کے عالم میں بھی کچھ کارنامے انجام دے سکتے ہو۔ انسان کو چاہیئے کہ زندگی کی ناکامیوں اور رکاوٹوں کا مقابلہ بھی بہادری سے کرے اور موت کا سامنا بھی دلیری سے کرے۔ فانی موت سے نہیں ڈرتے وہ اس کا جرأت مندانہ مقابلہ کرتے ہیں۔ اس طرح تلخیٔ حیات کو زہر سمجھ کر پھینک نہیں دیتے بلکہ وہ ایک حقیقت پسند انسان کی طرح اس تلخی کو عزیز رکھتے ہیں۔

۲- دنیا کے رنج و راحت کچھ ہوں تری بلا سے دنیا کی ہر ادا سے منہ پھیر کر گزر جا

شاعر نے دنیا کی دو اداؤں کا ذکر کیا ہے یعنی زندگی کے دو پہلو بیان کئے ہیں۔ ایک پہلو رنج کا ہے اور دوسرا راحت کا۔ زندگی کے دو بڑے رُخ یہی ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ زندگی کی ان دونو اداؤں سے منہ پھیر لو۔ نہ غم کی پروا کرو اور نہ راحت میں اُلجھو۔ رنج ہو یا راحت ہو اس کی پروا کئے بغیر جادۂ حیات پر گامزن رہو۔ اپنے کام سے غرض رکھو بے پروا نہ کرو کہ غم ملتا ہے یا راحت۔

۳- اس بحرِ بیکراں میں ساحل کی جستجو کیا کشتی کی آرزو کیا۔ ڈوب اور پار کر جا

مشکلات: بحرِ بے کراں، وہ سمندر جس کا کنارہ نہ ہو۔ وسیع و عریض سمندر

زندگی اور اس کے غم کو بحرِ بے کراں کہا ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں۔ بحر کی نسبت سے ساحل، کشتی، ڈوبنے اور پار کرنے کا ذکر کیا ہے۔ اسے مراعات النظیر کہیں گے۔ زندگی کے بحرِ غم میں ساحلوں کی جستجو کرنا اور اس غم سے نجات کی تمنا کرنا بے کار ہے۔ اس بحرِ خار میں ڈوب مرنے سے بچنے کے لئے کشتی کی تمنا بھی فضول ہے یعنی

غم سے بچنے کے لئے کوئی سہارا اختیار کرنا اور ڈھونڈنا فضول ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اس بھرے غم میں ڈوب جاؤ اور ڈوب مرنے کے بعد تمہاری لاش خود بخود پار اتر جائے گی۔ مرنے کے بعد ڈوبنے والے انسان کی لاش پانی سے ہلکی ہو کر اوپر آ بھر آتی ہے غم سے بچنے کے لئے سہارے ڈھونڈنے کی بجائے اس میں ڈوب مرو۔ یہی زندگی ہے۔

۴۔ کثرت میں دیکھتا جا تکرارِ حسنِ وحدت مجبور یک نظر آ مختار صد نظر جا

مشکلات: کثرت: ایک کے مقابلے میں کئی وجود۔ موجودات۔ وحدت: ایک وجود ہونا۔ خدا کا وجود جس جہان سے ہم آتے ہیں۔ وہاں کثرتِ موجودات کا تصور نہیں ہے۔ وہاں انسان اپنے اعمال کا مختار بھی نہیں ہے۔ وہ جہان جبر کا جہان ہے وہاں ہم مجبور تھے مختار نہیں تھے۔ وہاں ایک ہی وجودِ حقیقی کا حسن جلوہ گر تھا۔ جسے شاعر نے حسنِ وحدت کہا ہے۔ یعنی اس جہان میں ہمیں ایک ہی وجودِ حقیقی نظر آتا تھا۔ عالمِ جبر اور عالمِ وحدت کی نسبت سے شاعر نے کہا کہ تم مجبور یک نظر آئے۔ لیکن یہاں آ کر انسان موجودات کی کثرت دیکھتا ہے۔ وحدت کا تصور یہاں پنہاں ہے عیاں نہیں ہے۔ پھر انسان کو اپنے اعمال کا مختار اور ذمہ دار بھی بنایا گیا ہے۔ اس کثرتِ موجودات اور اختیارِ اعمال کی نسبت سے شاعر نے کہا کہ اس دنیا سے جاتے ہوئے تم مختارِ صد نظر ہو۔ یعنی اعمال میں مختار بھی ہو۔ اور ایک وجود کے مقابلے میں سینکڑوں وجود کا مشاہدہ بھی کر گئے ہو۔

۵۔ گھبرا گیا خرد کی تاریکیوں سے فانی اے نورِ عشق، دل کی گہرائیوں میں بھر جا

وہ جو اقبال نے کہا تھا کہ ؎

تجھ سے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا زندگی کی شبِ تاریک سحر نہ کر سکا

اگرچہ اقبال بھی خرد کو چراغِ راہ کہتے ہیں۔ لیکن خرد کی ترقی اور عروج نے انسانی اخلاقی اقدار کو تاریکیوں میں ڈبو دیا ہے۔ اسی لئے فانی بھی اسے خرد کی تاریکیاں قرار دے رہے ہیں۔ عقل و خرد بجائے روشنی اور رہنمائی بہم پہنچانے کے دنیا کو تاریک تر بنانے کا سبب بنی ہے۔ اس لئے شاعر ان سے گھبرا گیا ہے اور نورِ عشق کے دامن میں پناہ لینے کے لئے نورِ عشق کو کہتا ہے کہ آ اور میرے دل کو منور کر دے اب تک عقل کی گتھیاں سلجھا سلجھا کر میں تھک گیا ہوں بقول اقبال ؎

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ فانی یہاں اقبال کے ہم نوا ہیں۔ فانی ان شعراء میں سے ہیں جو اقبال کی شاعری کو اور ان کے پیغام کو ناپسند کرتے تھے۔ یہاں محض اتفاقاً

غزل نمبر ۲

۱- ضبط اپنا شعار تھا نہ رہا دل پہ کچھ اختیار تھا نہ رہا

مشکلات:- ضبط: ضبطِ غم- صبر شعار: طور- طریقہ

ضبطِ غم عشق کی شرطِ اوّلیں ہے۔ فانی کہتے ہیں کہ میں نے یہ شعار اختیار کیا۔ اور دل پر اختیار پائے رکھا۔ مگر کثرتِ آلام سے اب ضبط بہت مشکل ہو گیا ہے اور مجھے میرے دل پر قابو نہیں رہا ہے۔ دل بے اختیار ہو گیا ہے نتیجہ یہ ہے کہ ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے۔

۲- دلِ مرحوم کو خدا بخشے ایک ہی غم گسار تھا نہ رہا

مشکلات:- دلِ مرحوم: وہ دل جو مر چکا ہے۔ افسردہ اور بجھا ہوا دل۔

غم گسار: غم خوار- ہمدرد۔

یوں تو غم کا پہاڑ عاشق پر دل ہی کی مہربانیوں سے آ گرتا ہے جیسے میر نے کہا ہے

ے دل کہ یک قطرہ خوں نہیں ہے بیش سارے عالم کے سر بلا لایا

مگر فانی نے اسے غم گسار کہا ہے۔ یہ بھی ایک لطیف و غریب نقطہ ہے دل غم کی آماجگاہ تو ہے۔ فانی کی قسمت میں غم بے شمار لکھے تھے۔ وہ سب کے سب دل میں ہی سمائے ہوئے تھے۔ فانی کا سارا غم دل نے سنبھال رکھا تھا۔ اس لحاظ سے اسی بلائے جاں کو ہی غم گسار کہہ دیا۔ مگر اب غم سہنے کی قوت دل میں نہیں رہی۔ دل بجھ کر افسردہ ہو گیا ہے۔ جب تک دل میں آرزوئے عشق موجود رہے وہ زندہ ہے۔ جب یہ آرزو ختم ہو جائے تو عاشق کے لئے وہ مر گیا۔ فانی کے دل میں اب تمنائے عشق نہیں رہی اس لئے اُسے مرحوم کہہ کر اس کے حق میں بخشش کی روایتی دُعا مانگی۔ شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ میرا دل اب بجھ گیا ہے اس میں اب شوق کی توانائی نہیں رہی۔

۳- آ کہ وقتِ سکونِ مرگ آیا نالہ ناخوشگوار تھا نہ رہا

مشکلات:- سکونِ مرگ: موت کی خاموشی

میر نے کہا تھا ؎ جو اس زور سے میر روتا رہے گا- تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا۔

نالہ عاشق کے جذبۂ عشق کی نامرادی کا اظہار ہے۔ دوسروں کو اس سے کیا، غرض حتیٰ کہ محبوب کے مشغولات و مصروفیات میں بھی اس سے خلل پڑتا ہے۔ اس لئے محبوب کی نگاہ میں فانی کا نالہ ناخوشگوار تھا۔ زندگی بھر فانی کا شیوہ رہا کہ روتا نالے بپا کرتا رہا کہ محبوب تھا۔ اب مرنے کا وقت آ گیا۔ موت کے بعد تو نالہ بپا کرنے کی طاقت نہیں رہے گی۔ اس لئے فانی اپنے محبوب سے کہتا ہے کہ مجھے میرے

نالے سے نفرت تھی۔ اب تو میں مر رہا ہوں وہ نالہ خموش ہو جائے گا۔ اس لئے اب وقتِ سکونِ مرگ تو میرے پاس آجا۔ جو نالہ تجھے ناگوارِ خاطر تھا، وہ ختم ہو گیا ہے۔ اب تجھے آنے میں کوئی عذر نہیں کرنا چاہیئے۔

۴۔ ان کی بے مہریوں کو کیا معلوم کوئی امیدوار تھا نہ رہا

مشکلات:۔ بے مہری: نامہربانی۔ بے پروائی۔ ظلم امیدوار: دیدار کا امیدوار۔

فانی کے مطابق عاشق کو عمر بھر محبوب کی بے مہریاں برداشت کرنا پڑیں۔ وہ آزمائشوں کے ابتلا سے میں سے گزرتا رہا۔ ان آزمائشوں میں اُن پر جو کچھ گزری وہ بلائے جان اور آفت تھی۔ گمان آفتوں میں عاشق ایسا الجھا کہ محبوب کے سامنے آ ہی نہ سکا۔ اس لئے کہتا ہے کہ میں فضول ہی امیدوارِ عشق اور امیدوارِ وعدۂ دیدار بنا رہا ہوں۔ بے مہر محبوب کو تو شاید معلوم ہی نہ ہوگا کہ میں بھی امیدواروں میں شامل تھا۔

۵۔ آہ کا اعتبار بھی کب تک آپ کا اعتبار تھا نہ رہا

شاعر کو اب محبوب کے کسی وعدے پر اور قول پر اعتبار نہیں رہا۔ اس لئے آہ و فغاں کر رہا ہے۔ محبوب سے مخاطب ہے کہ آپ کا اعتبار زندگی بھر کیا۔ مگر اب قطعی مایوس ہو گیا ہوں۔ آپ پر اعتبار نہیں رہا۔ اب آہ و فریاد کا سہارا لیا ہے مگر آہ کا بھی کب تک اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ نہ جانے کب زندگی ختم ہو جائے اور ساتھ ہی آہ و فغاں کی سکت جاتی رہے۔

۶۔ موت کا انتظار باقی ہے آپ کا انتظار تھا نہ رہا

فانی نے کہا ہے کہ محبوب کا انتظار کرتے کرتے موت آجاتی ہے مگر محبوب نہیں آتا۔ اب محبوب کے انتظار سے مایوس ہو چکا ہے۔ انتظار کرتے کرتے زندگی گزر گئی۔ موت آپہنچی اور محبوب نہ آیا۔

۷۔ مہرباں! یہ مزارِ فانی ہے آپ کا جاں نثار تھا نہ رہا

فانی مر چکا کہیں محبوب بعد از مرگ اس کے مزار پر آیا تو اسے بتایا گیا کہ حضور! یہ قبر فانی کی ہے وہی فانی جو آپ کا جاں نثار اور سرفروش تھا۔ جو آپ سے والہانہ عشق رکھتا تھا۔ اور آپ کا سچا طلبگار تھا۔ مگر افسوس کہ آپ نے زندگی بھر اس کی وفاؤں کا جواب بے وفائیوں اور بے اعتنائیوں سے دیا۔ وہ مایوسی کے عالم میں جان ہار گیا۔

اصغر حسین اصغر گونڈوی

(۱۸۸۴ء ——— ۱۹۳۶ء)

حالاتِ زندگی نام: اصغر حسین۔ تخلص: اصغر۔ ان کے والد منشی تفضل حسین نے ملازمت کے سلسلے میں گونڈہ میں مقیم ہو گئے تھے۔ اصغر اسی نسبت سے گونڈوی کہلانے لگے۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ کچھ ایسی گھریلو مجبوریاں تھیں کہ کالج کی اعلیٰ تعلیم سے محروم رہے تاہم مطالعے کا شوق تھا اس لئے علم و ادب اور شاعری میں ذاتی محنت سے عبور حاصل کیا۔ شاعری میں پہلے منشی جلیل اللہ بیگ امی سے اصلاح لی پھر منشی امیر اللہ تسلیم سے۔ وہ کافی عرصے تک ایک رسالے "ہندوستانی" کے ایڈیٹر رہے۔

وہ نہایت شریف النفس، پاکیزہ مزاج اور نفاست پسند انسان تھے۔ اس کی جھلک ان کی شاعری میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ ۳۰ نومبر ۱۹۳۶ء کو الہ آباد میں انتقال کیا۔

اصغر کی شاعری

اصغر کا کلام، مقدار کے اعتبار سے دیگر معروف شعراء کے مقابلے میں کم ہے۔ مگر اس مختصر اور منتخب کلام کا معیار بلند ہے۔ ان کے دو مختصر مجموعہ ہائے کلام کے نام یہ ہیں۔ (۱) نشاطِ روح (۲) سرودِ زندگی ——— ان کی شاعری کی نمایاں خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ صوفیانہ لب و لہجہ اصغر اپنی ذاتی زندگی میں ایک متقی اور پرہیزگار انسان تھے۔ تصوف سے انہیں لگاؤ تھا۔ وہ ایک صوفی بزرگ شاہ عبدالغنی مگلوری سے گہری عقیدت رکھتے تھے۔ طبیعت کے رجحان نے ان کی شاعری میں متصوفانہ لب و لہجہ پیدا کر دیا۔ اس سلسلے میں ان کے ہاں میر درد سے خاصی مماثلت ملتی ہے۔ صوفیانہ انداز کے اشعار ملاحظہ ہوں

تیرا جمال ہے ترا خیال ہے تو ہے ——— مجھے یہ فرصتِ کاوش کہاں کہ کیا ہوں میں

مٹا نہ کر رہا ہوں رہ عاشقی کو طے ——— کچھ ابتدا کی ہے خبر نہ انتہا کی ہے

شگفتہ انداز اصغر کے ہاں روایتی حزن و ملال اور افسردگی و یاسیت کے بجائے ایک نشاطیہ کیفیت اور شگفتہ انداز ملتا ہے۔ ان کے کلام کو پڑھ کر رقص و سرمستی، شوخی و سرخوشی اور وجد و کیف کا احساس ہوتا ہے۔ یہ تازگی اور رعنائی انہیں ہم عصر شعرا

سے ممتاز کرتی ہے ؎

اصغر نشاطِ روح کا اک کھل گیا چمن — جنبش ہوئی جو خامۂ رنگین نگار کو

کیا ساعتیں چمن میں ہیں جوشِ بہار سے — ہر شاخِ گل ہے دامنِ ساغر لئے ہوئے

اس سلسلے میں اصغر کا اپنا ایک شعر اس کیفیت کی ترجمانی کرتا ہے ؎

شعر میں رنگینی و جوشِ تغزل چاہئے — مجھ کو اصغر کم ہے عادت نالہ و فریاد کی

محبت کا منفرد تصور اصغر نے محبت اور عشق کے روایتی تصور کو رد کرتے ہوئے محبت کا کا ایک نیا تصور دیا۔ ان کا محبوب ایک سدا بہار انسان ہے جو ایک قاتل اور ظالم کا کردار ادا کرنے کے بجائے مسرتیں اور خوشیاں بکھیرتا چلا جاتا ہے جسے دیکھ کر اور مل کر طبیعت میں فرحت و انبساط کی کیفیت پیدا ہوتی ہے ؎

یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی — یوں لب کشا ہوئے کہ گلستان بنا دیا

تم سامنے کیا آئے اک طرفہ بہار آئی — آنکھوں نے مری گویا فردوس نظر دیکھا

جمال و پاکیزگی اصغر کی شاعری پاکیزگی، خلوص اور جمال و رعنائی کا مرقع ہے۔ اور یہ اس لئے کہ خود اصغر کی زندگی نہایت پاکیزہ تھی۔ تصوف سے بھی لگاؤ تھا۔ اس لئے کائنات کی وسعتوں میں جمالِ خداوندی کا نظارہ کرتے کرتے یہی تجربات شعری پیکر اختیار کر گئے۔ ان کی شاعری کو پڑھ کر طبیعت میں گریز اور فرار کی بجائے شرافت اور پاکیزگی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اصغر کی نفاستِ طبع اور پاکیزگیٔ خیال نے ان کی شاعری کو ایک انفرادیت بخشی ہے۔

غزل نمبر ۱

۱- آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا — جو غم ہوا اُسے غمِ جاناں بنا دیا

مشکلات:- آلام: جمع الم کی۔ غم — روزگار: دنیا۔ جہاں — غمِ جاناں: غمِ محبوب۔

غالب نے مشکلات اور آلام کو آسان جاننے کی ترکیب یہ نکالی تھی کہ ان کی عادت ڈال دی جائے۔ یعنی کثرتِ آلام اس کی نگاہ میں آلام کو آسان بنا دیتی ہے ؎

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

مگر اصغر نے ایک لطیف ترکیب نکالی ہے کہ دنیا بھر کے غم اسی صورت میں آسان ہو سکتے ہیں کہ انہیں غمِ محبوب میں ضم کر دیا جائے۔ صرف غمِ عشق رہ جائے۔ تو باقی تمام آلام کی نفی ہو جاتی ہے۔ اصغر نے غمِ عشق اختیار کر کے دیگر تمام غموں سے نجات حاصل کر لی ہے۔ جیسے

کسی شاعر نے کہا ہے ؎

زمانے بھر کے غم اور اک ترا غم — یہ غم ہو گا تو کتنے غم نہ ہوں گے

۲- میں کامیابِ دید بھی محرومِ دید بھی — جلووں کے ازدحام نے حیران بنا دیا

مشکلات :- ازدحام : ہجوم - کثرت -

خدا کو دیکھنا ہو تو خدا کی صناعی کو دیکھو - اس نظامِ کائنات کے ہر ذرے کے اندر ایک نظامِ عظیم پوشیدہ ہے - بقول اقبال ؏

لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

تو کائنات کا ہر ذرہ اور اس کے نظامِ کار کی پیچیدگی ہمیں دعوتِ نظارہ دے رہی ہے کہ ہمارے خلاق کو دیکھ لو - ہمارے اندر اس کا جلوہ نظر آ رہا ہے - انسان اگر حقیقت بین نگاہوں سے دیکھے تو خدا کے جلوے کا ظہور اسے ہر وجودِ کائنات میں مل جاتا ہے - اس لحاظ سے وہ کامیابِ دید ہے - مگر اس صنعت کاری کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے کہ ہم اس کثرتِ جلوہ میں یوں محو ہو جاتے ہیں کہ جو ذات اس میں عکس فگن ہے وہ نظر نہیں آتی اور ظاہر بین آنکھ اس ظاہری جلوے کو حقیقت سمجھ لیتی ہے - اس طرح ہم محرومِ دید بھی ہیں - یہ کائنات ہماری کامیابیٔ دید اور محرومیٔ دید دونوں کے سامان فراہم کر رہی ہے -

۳- مجبوریٔ حیات میں رازِ حیات ہے — زنداں کو میں نے روزنِ زنداں بنا دیا

مشکلات :- مجبوریٔ حیات : زندگی میں حالتِ جبر - زنداں : قید خانہ - روزنِ زنداں : سوراخ - شگاف - کھڑکی - روشندان -

شاعر نے یہاں عقیدۂ جبر کو موضوع بنایا ہے - مگر اس کا اظہار لاجواب ہے - ذوق نے کہا تھا ؎

لائی حیات آئے، قضا لے چلی، چلے — اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے

اپنی خوشی نہ آنے کو اصغر نے مجبوریٔ حیات کا نام دیا ہے کہ ہم تو مجبور ہیں - صاحبِ اختیار کوئی اور ہے - کسی بھی کام میں ہمارے منشا کو دخل نہیں ہے - اس مجبوریٔ حیات سے اصغر نے یہ فائدہ اٹھایا ہے کہ اپنے سارے اعمال کی ذمہ داری صاحبِ اختیار پر ڈال دی ہے - اس کو وہ رازِ حیات کہتے ہیں - مجبوری کی وجہ سے زندگی اور دنیا ہمارے لئے زنداں ہے - شاعر نے اس زنداں سے نکلنے کی ایک صورت پیدا کر کے اسے روزنِ زنداں کہا ہے - کہ اس قید خانہ میں سے باہر نکلنے کی ایک صورت یا کھڑکی دریافت کر لی ہے - اسے انگریزی میں کہتے ہیں - شاعر نے نظریۂ جبر سے فائدہ اٹھا کر اعمال کی ذمہ داری سے بچنے کا ایک ڈھونڈ لیا ہے - حالت

جبر ہی ہمارے لئے کھل کھیلنے کا سبب بن گئی۔ جس کی ذمہ داری ہم پر عائد نہیں ہوتی۔

۴۔ وہ شورشیں نظام جہاں جن کے دم سے ہے — حسب محقر کیا انہیں انسان بنا دیا

مشکلات:۔ شورشیں۔ ہنگامے۔ فتنے۔

شاعر کہتا ہے کہ دنیا بھر کی فتنہ سامانیاں ایک طرف اور انسان کی فتنہ سامانیاں ایک طرف یہ دونوں برابر ہیں، وہ تمام ہنگامے۔ فتنے اور فساد جو نظام کائنات کا حصہ ہیں۔ ایک انسان کی شکل میں سمٹ آئے ہیں۔ دنیا کا کوئی ہنگامہ ایسا نہیں جو انسانی ذہن میں پیدا نہ ہو سکتا ہو۔ انسانی ذہن کی تباہ کاریوں کا مقابلہ ایٹمی تباہ کاریاں بھی نہیں کر سکتی ہیں۔ بلکہ کسی نے درست کہا ہے کہ ایٹم بم انسانی ہلاکت کا ذمہ دار نہیں ہے بلکہ اس کا ذمہ دار انسان کا اپنا ذہن ہے جو اسے اس طرح استعمال کرنے کے درپے ہے۔ ورنہ ایٹمی قوت کو مفید اور مفید کاموں میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح دیگر سائنسی ترقی کی ہلاکت خیزی اصل میں انسان کے ذہن کی ہلاکت خیزی کی آئینہ دار ہے۔

۵۔ کہتے ہیں اک فریب مسلسل ہے زندگی — اس کو وقف حسرت و حرماں بنا دیا

مشکلات:۔ فریب مسلسل: مسلسل دھوکا حرماں: محرومی۔ غم

وجودی عقیدے والے کہتے ہیں کہ زندگی اور کائنات ایک سراب ہے جو ہماری نگاہوں کا دھوکہ ہے اور اسے حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ فریب مسلسل اس لئے کہا ہے کہ یہ فریب تخلیق کائنات سے لیکر اب تک جاری ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر اصل حقیقت میں حسرت و غم ملتے تو بجا بھی تھا مگر تو اس بات کا ہے کہ فریب مسلسل کو بھی حسرت و غم کے لئے وقف کر دیا گیا۔ اگر یہ فریب ہے تو اس میں ملنے والا غم بھی فریب ہونا چاہئے۔ مگر افسوس کہ غم تو ہمیں کھائے جا رہا ہے۔ اور زندگی کو پھر بھی فریب کہا جا رہا ہے۔

غزل نمبر ۲

۱۔ کوئی محمل نشیں کیوں شاد یا ناشاد ہوتا ہے — غبار قیس خود اٹھتا ہے خود برباد ہوتا ہے

مشکلات:۔ محمل نشین: اونٹ کے کجاوے میں بیٹھنے والی۔ لیلیٰ شاد: خوش

ناشاد: ناخوش۔

اس شعر میں لیلیٰ اور مجنوں کے قصہ عشق کی تلمیح ہے۔ قیس نامی ایک شخص عشق لیلیٰ میں مبتلا ہوا۔ لیلیٰ اونٹنی پر محمل میں سوار ہو کر نکلی۔ قیس پیچھے پیچھے ہو لیا۔ رستے میں کہیں کانٹا چبھا۔ نکالنے لگا۔ تو محمل لیلیٰ آنکھوں سے اوجھل ہو گئی ؎

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر — یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد۔

اب دشت و صحرا میں مارا مارا پھرتا ہے کہ کہیں محمل لیلےٰ نظر پڑے تو دل کو تسکین ہو۔ اس طرح دشتِ نوردی، صحرا نوردی، محمل، قیس، لیلیٰ وغیرہ کی اصطلاحات سے اس واقعے کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ قیس بے چارہ تلاشِ محبوب میں صحرا نوردی کرتے کرتے خاک ہو گیا۔ ہوا چلتی ہے تو اس کا غبار اڑنے لگ جاتا ہے۔ ہوا بند ہوتی ہے تو اس کی خاک تہ نشین ہو جاتی ہے۔ مگر اس خاک کے اڑنے اور برباد ہونے سے اس کے محبوب لیلےٰ کو کبھی خوشی اور کبھی غم کیوں ہوتا ہے۔ وہ بے چارہ تو اس کی تلاش میں خاک ہو گیا۔ اب محبوب کی خوشی یا ناخوشی اس کے کیا کام۔ زندہ ہوتا تو وہ دونوں صورتوں میں خوش ہوتا۔ محبوب کی ناشادی سے سمجھتا کہ اس کو مجھ سے ہمدردی ہے۔ اس کے شاد ہونے پر سمجھتا کہ چلو مجھے دکھ ہوا تو کوئی بات نہیں محبوب تو خوش ہوا۔

۲۔ قفس کیا؟ حلقہ ہائے دام کیا؟ رنجِ اسیری کیا؟ چمن پر مٹ گیا جو، ہر طرح آزاد ہوتا ہے

مشکلات:۔ قفس: پنجرہ۔ قید حلقہ ہائے دام: جال کے پھندے رنجِ اسیری: قید کی تکلیف مٹ گیا: مر گیا۔ قربان ہو گیا

یہاں بلبل کی نسبت سے بات کہی گئی ہے جو نثارِ چمن ہے۔ چمن سے جدائی اسے برداشت نہیں۔ خواہ اس کی خاطر اسے صیاد کی اسیری کا شکار ہونا پڑے۔ وہ اپنے قفس، جال کے پھندوں اور اسیری کی تکلیف کو اس لئے درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا کہ اس نے ایک اعلیٰ مقصد کے لئے قربانی پیش کی ہے۔

شاعر بلبل اور قفس و دام و اسیری کے پیرائے میں ایک فرد کی بات کہہ رہا ہے جو اپنے ملی یا قومی مقصد کی خاطر قید و بند کی سختیاں جھیلتا ہے۔ ایسے آدمی کو بظاہر زندان میں ڈال دیا جاتا ہے، مگر چونکہ اس کے اندر قوم پر مٹ جانے کا جذبہ ہوتا ہے اس لئے وہ اس اسیری کی تکلیف محسوس کرنے کی بجائے اس میں آزادی کا سا لطف محسوس کرتا ہے۔ کیونکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اس قربانی سے اس کے ہم قوم لوگوں کو وہ حقوق ملیں گے جس کی خاطر اس نے قربانی دی ہے۔ اس ایک کی قربانی سے پوری قوم آزادی کے مزے لوٹتی ہے۔

۳۔ بنا لیتا ہے موجِ خونِ دل سے اک چمن اپنا وہ پابندِ قفس جو فطرتاً آزاد ہوتا ہے

مشکلات:۔ پابندِ قفس: قیدی

وہ شخص جس کے دل میں آزادی کا طوفان موجزن ہوتا ہے۔ بالآخر آزادی کے سلب کرنے والے لوگوں کے جبر و ستم کا شکار ہو کر قید و بند میں ڈال دیا جاتا ہے لیکن آزادی کا جذبہ اس کی فطرت کا حصہ ہے۔ اس لئے اسے اس پابندی اور قید سے کوئی فرق نہیں

پڑتا۔ اسے اس قید و بند میں ایک گونہ لذت محسوس ہوتی ہے جسے لذتِ عشق ہی کہتے ہیں۔ یہ لذت وصال میں نہیں بلکہ فراق میں زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ اس کے دل کی آرزوؤں کا خون اس کے دل میں موجزن ہوتا ہے۔ وہ خون کی ان موجوں سے ہی اپنا ایک نیا چمن بنا لیتا ہے۔ چمن میں سرخ رنگ کے پھول ہوتے ہیں۔ اور دل کے زخموں کی رنگت بھی یہی ہوتی ہے۔ اس نسبت اور قرینہ سے دل کے زخموں کو پھولوں سے نسبت دیکر شاعر نے دل میں چمن بنانے کا خیال پیش کیا ہے۔ یہ چمن خارجی دنیا کا چمن نہیں ہے یہ من کی دنیا کا چمن ہے جو وہی لوگ بنا سکتے ہیں جن کے من میں ایسے جذبات موجزن ہوں۔ یہ شعر ایک جاں نثار فرد کی داخلی کیفیت کا آئینہ دار ہے۔

۴۔ بہار انجام سمجھوں اس چمن کا یا خزاں سمجھوں زبانِ برگِ گل سے مجھ کو کیا ارشاد ہوتا ہے

مشکلات:۔ برگِ گل: پھول کی پتی

شاعر برگِ گل کی زبان سے کہلوانا چاہتا ہے کہ باغ کا انجام بہار ہے یا خزاں۔ زبان کو برگِ گل سے تشبیہ دی ہے۔ وجہِ شبہ دونوں کی ملتی جلتی شکل ہے زبانِ برگِ گل ایک مرکب اضافی ہے۔ جس کی اضافت تشبیہی ہے۔ مضاف اور مضاف الیہ میں تشبیہ کا تعلق ہے۔ یعنی زبان کو برگِ گل سے تشبیہ دی گئی ہے۔ بہار اور خزاں براہِ راست برگِ گل پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس لئے شاعر اسی کی زبان سے بہار و خزاں کی داستان سننا چاہتا ہے۔ برگِ گل کی رنگینی اور شگفتگی بہار کا نتیجہ ہے۔ مگر جلد ہی پژمردہ ہو کر خاک میں مل جانا بھی اس کا مقدر ہے۔ اس کی بہار جاودانی نہیں ہے شاعر بہار، خزاں، برگِ گل اور چمن کی نسبت سے دنیا کا ذکر کرنا چاہتا ہے کہ اس دنیا میں صرف خوشی اور رونق کارفرما نہیں ہے۔ دوسری طرف صرف غم و الم کا دور دورہ نہیں ہے بلکہ دونوں اس دنیا کے حالات میں بقدرِ مناسب دخیل ہیں بقول شاعر ؎

میں نے پوچھا کہ زندگی کیا ہے ہنس دیئے پھول رو پڑی شبنم

۵۔ ازل میں اک تجلی سے ہوئی تھی بے خودی طاری تمہیں کو میں نے دیکھا تھا کچھ ایسا یاد آتا ہے

اصغر یہاں جمالِ محبوب میں ہمہ تن محو ہیں۔ وہ مشاہدۂ حسن کی گفتگو اپنے کلام میں عموماً کرتے ہیں۔ اس شعر میں "تمہیں" سے مراد محبوب حقیقی ہے۔ یہ ایک داخلی کیفیت کا اظہار ہے۔ جس پر تصوف اور علم و عرفان کا رنگ غالب ہے۔ کہتے ہیں کہ روزِ ازل سے مجھ پر بے خودی طاری ہے۔ اسی لئے میں اپنی ذات تک کا احساس و شعور نہیں رکھتا۔ مجھے یوں یاد پڑتا ہے کہ روزِ ازل محبوب حقیقی کے حسن کا ایک

جلوہ میں نے دیکھا تھا۔ تجلیٔ نور کی تاب نہ لاکر میں بے خود ہوگیا۔ اس وقت سے اب تک اسی بے خودی میں مبتلا ہوں۔ اپنا بھی ہوش نہیں اور اپنی ذات کو نہیں پہچان سکتا۔ پھر محبوب حقیقی کو مخاطب کرکے کہتے ہیں کہ مجھے کچھ یاد پڑتا ہے کہ میں نے تجلی کو دیکھا تھا۔ "کچھ ایسا یاد پڑتا ہے" میں "کچھ ایسا" کی ترکیب بھی بے خودی کی غماز ہے۔

۶۔ یہاں کوتاہیٔ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

مشکلات:۔ کوتاہیٔ ذوقِ عمل: عمل اور حرکت کی کمی بازو سمیٹنا: بازوؤں کا کام چھوڑ دینا، کام روک لینا۔ حرکت میں وقفہ ڈالنا۔

گرفتاری، بازو سمیٹنا اور صیاد اس بات کی دلالت کرتے ہیں کہ شاعر بلبل کے حوالے سے بات کر رہا ہے جس کو ہر وقت گرفتاری کا اندیشہ ہے۔ صیاد اس کی تاک میں ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ صیاد پر تو یونہی گرفتاری کی تہمت لگائی جاتی ہے۔ گرفتاری کا اصل سبب خود بلبل کی پرواز میں کوتاہی ہے۔ جہاں اس کے بازو سمٹ جاتے ہیں یعنی وہ پرواز ترک کر دیتا ہے۔ بس وہیں صیاد موجود ہوتا ہے اور اسے گرفتار کر لیتا ہے۔ اگر وہ کوتاہیٔ ذوقِ پرواز نہ دکھائے اور مائلِ پرواز ہی رہے تو صیاد اسے کہاں گرفتار کر سکے گا۔ شاعر نے بلبل کے حوالے سے انسانوں کو حرکت و عمل کا درس دیا ہے۔

۷۔ یہاں مستوں کے سر انجام ہستی ہی نہیں اختر پھر اس کے بعد ہر الزام بے بنیاد ہوتا ہے

مشکلات:۔ مستوں کے سر: مستوں کے ذمے

زندگی کا انجام ہمارے اختیار میں نہیں۔ بلکہ ہمیں یہ بھی خبر نہیں کہ زندگی کب انجام کو پہنچے گی، جب ہم یوں بے اختیار ہیں۔ تو اس کے بعد ہم پر اعمال کی ذمہ داری اور الزام تھوپ دینا بے بنیاد اور نامناسب بات ہے۔ یہی بات میرؔ نے یوں کہی ہے ؎

ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

جگر مرادآبادی

نوٹ: جگر کے حالات اور خصوصیات کلام صفحہ ۱۴۱ پر ملاحظہ کریں۔

(۱۸۹۰ء ——— ۱۹۶۰ء)

۱- عشق کی یہ نمود پیہم کیا ہو تم ہی تم اگر تو پھر ہم کیا

مشکلات:- نمودِ پیہم: مسلسل نمائش

جگر خدا سے مخاطب ہیں کہ اگر ایک تیرا ہی وجود حقیقی ہے تو پھر ہم کیا ہیں؟ اور دنیا میں جو نت نئے حوادث و مناظر رونما ہو رہے ہیں۔ یہ کیا ہیں؟ کیا یہ سب کچھ بے مقصد اور موہوم ہے؟ کائنات کی تخلیق تو اب بھی بقول اقبال جاری ہے ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ کہ ایسا سلسلہ کیوں جاری ہے اور ہمیں اس فریب مسلسل میں کیوں الجھایا جا رہا ہے؟ "تم" اور "ہم" کی تکرار ملاحظہ کیجئے۔

۲- جز ترے کچھ نظر نہیں آتا آرزو بن گئی مجسم کیا

میں نے اپنے دل میں محبوب کی خواہش اور آرزو پالی تھی۔ پھر یہ آرزو میرے ذہن پہ یوں سوار ہوئی کہ میرا دل صرف اسی سے معمور رہا اور کسی چیز کی سمائی اس میں نہ رہی اب نوبت یہاں تک آپہنچی ہے کہ میں جدھر دیکھتا ہوں تیری ہی تصویر نظر آتی ہے۔ خارجی دنیا کے مناظر میری نظر سے اوجھل ہو گئے ہیں گویا کہ وہ سراب تھے، کیا کہیں تیری آرزو نے محبوب کی مجسم شکل تو اختیار نہیں کر لی۔ آرزو ایک مجرد چیز ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ جذبہ عشق نے اُسے مجسم شکل عطا کر دی ہو۔

۳- تیرا ملنا، تیرا نہیں ملنا اور جنت ہے کیا جہنم کیا؟

"ملنا" اور "نہیں ملنا" نیز "جنت" اور "جہنم" متضاد ہیں۔ اس لئے یہ صنعتِ تضاد ہے "ملنا" اور "کیا" کی تکرار سے صوتی آہنگ بھی پیدا ہوا ہے۔

شاعر نے پہلے مصرع میں دو باتوں کا ذکر کیا۔ "ملنا" اور "نہ ملنا"۔ پھر انہی کی نسبت سے اسی ترتیب سے "جنت" اور "جہنم" کا ذکر دوسرے مصرع میں کیا۔ اسے صنعتِ لف و نشر

مرتب کہتے ہیں۔ شاعر نے محبوب ملنے کو جنت کا مل جانا قرار دیا ہے اور محبوب کے نہ ملنے کو جہنم قرار دیا ہے۔ جنت مقام راحت اور جہنم مقام عذاب ہے ۔۔ جنت مقام راحت اور جہنم مقام عذاب ہے۔ شاعر کو محبوب مل جانے سے راحت ملتی ہے اور محبوب کے نہ ملنے سے وہ ایک عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے اس لئے اس کی نگاہ میں یہی جنت اور جہنم ہے

۴۔ ہم ہیں تیرے، ودیعتیں تیری شکرِ راحت، شکایتِ غم کیا

شکلات:۔ ودیعت : عنایت ۔

یہ مضمون تو شعرا کے ہاں ملتا ہے کہ محبوب یا مہربان کے سامنے شکایتِ غم پیش نہ کی جائے (یہاں شکایت خدا کے سامنے پیش کرنے کا تصور ہے) مگر یہ مضمون کسی شاعر نے نہیں باندھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ جگر اس شعر میں شکر اور شکایت دونوں کو غیر ضروری قرار دے رہے ہیں۔ شکر عنایات اور نعمتوں کے لئے کیا جاتا ہے اور شکایت محرومیوں کے خلاف کی جاتی ہے۔ شاعر کی توجیہہ یہ ہے کہ جب ہم بھی تیرے ہیں اور عنایات اور نعمتیں بھی تیری ہیں تو پھر نہ شکر کی گنجائش ہے نہ ہی شکایت بجا ہے۔ ہم تیرے ہیں۔ ہمیں کچھ دے یا نہ دے کوئی ناانصافی یا زیادتی نہیں ہوگی ۔

۵۔ ان نگاہوں کے سب کرشمے ہیں ورنہ یہ اضطرابِ پیہم کیا

شاعر مسلسل بے چینی اور کرب میں مبتلا ہے۔ جو کہیں ختم ہونے میں نہیں آتا۔ سوچتا ہے کہ اتنی بے چینی کیسے پیدا ہوئی؟ کچھ دیر کے لئے تو چین بھی آنا چاہئے کہ بیماری میں بھی کچھ نہ کچھ وقفہ آ ہی جاتا ہے۔ بالآخر اس کی نظر محبوب کی نگاہِ تیر انداز پر جاتی ہے تو وہ اصل سبب دریافت کر لیتا ہے کہ یہ سارے کرشمے تیری نگاہوں نے ہی دکھائے ہیں۔ جن کے تیر میرے دل و جگر کے پار ہوئے اب انہی کی جھن مسلسل بے چینی کا باعث بنی ہوئی ہے۔

۶۔ شوقِ گستاخ کر چکا تقصیر دیکھنا اب ہے حسنِ برہم کیا

شکلات:۔ تقصیر : خطا۔غلطی حسنِ برہم: غصے میں آیا ہوا محبوب ۔

شوق سے مراد عاشق اور حسن سے مراد محبوب ہے۔ عاشق کے دل میں شوق بے تابی پیدا کرتا ہے۔ وہ آدابِ عشق کو ملحوظ رکھنے کی اور اس شوق کو اندر ہی اندر دبانے کی پوری کوشش کرتا ہے کہ کہیں محبوب برہم نہ ہو جائے۔ مگر آخر دل ہے کہیں کہیں بے قابو

بھلی ہو جاتا ہے۔ انجام کی پروا نہیں کرتا۔ اس نے محبوب کے حضور میں آداب عشق کی خلاف ورزی کی گستاخی کر ہی بیٹھا ہے اور حد سے ذرا آگے بڑھنے کی جسارت کر بیٹھا۔ بس پھر کیا تھا محبوب برہم ہو گیا۔ مگر عاشق کہتا ہے کہ اب محبوب برہم کیا دیکھ رہا ہے دلِ مشتاق نے جو کچھ کرنا تھا وہ کر گزرا ہے۔ جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اب اس کے کئے کو مٹایا نہیں جا سکتا۔

۷۔ موت کی نیند چھائی جاتی ہے کہہ چکا میں فسانۂ غم کیا؟

رات کو محفلوں میں داستانیں اور فسانے سنائے جاتے ہیں جب کوئی داستان ختم ہو جائے تو پھر آرام کی نیند سوتے ہیں۔ یہاں شاعر اپنا فسانۂ غم سنا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اپنا فسانۂ غم اس وقت ہی ختم ہو گا۔ جب اس کی زندگی تمام ہو جائے گی۔ فسانے کے تمام ہونے کی نسبت سے اور اپنی زندگی کے تمام ہونے کی نسبت سے شاعر نے نیند اور موت کو آپس میں نسبت دے کر کہا کہ مجھ پر موت کی نیند چھائی جا رہی ہے۔ شاید میری زندگی کا فسانۂ غم ختم ہو چکا ہے۔

۸۔ عشق خاموشی کے مزے ہیں جگر جوشِ فریاد و شورِ ماتم کیا؟

جگر کہتے ہیں عاشق کو مزا اس بات میں ملتا ہے کہ وہ ہجر و نامرادی کی دھیمی دھیمی آنچ میں جلتا رہے، اگر وہ فریاد و ماتم کا جوش و خروش دکھائے گا تو آگ کی آنچ ختم ہو جائے گی دل کی بھڑاس نکل جائے گی اور وہ دھیمے دھیمے جلنے کا لطف جاتا رہے گا۔ دھیمے دھیمے جلنے کو جگر نے عشق خاموش کا نام دیا ہے۔

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

یہ بھڑاس دھیمے دھیمے مسلسل اور برابر جلاتی رہے تو لطف ہے، اب نالہ و بکا کرنے کی صورت میں یہ بھڑاس نکل جائے گی اور آگ ٹھنڈی پڑ جائے گی۔

غزل نمبر ۲

۱۔ کوئی یہ کہہ دے گلشن گلشن لاکھ بلائیں ایک نشیمن

گلشن کی نسبت سے شاعر نے نشیمن کا لفظ استعمال کیا ہے ظاہر ہے بات بلبل کی نسبت سے ہو رہی ہے۔ بلبل کو اپنے آشیاں اور نشیمن سے لگاؤ ہے۔ وہ اسے چھوڑنے پر کبھی رضامند نہیں ہے، مگر جگر کہتے ہیں کہ گلشن گلشن جا کر بہانگِ دہل میری طرف سے اعلان کر دو کہ یہ ایک نشیمن ہی بلبل کے لئے لاکھ بلاؤں کا سبب بنا ہوا ہے۔

کبھی وہ گرفتار ہو کر قفس میں جائے تو اس کی یاد اُسے تڑپاتی ہے اور وہ نئے حالات کے مطابق اس کی وجہ سے اپنے آپ کو ڈھال نہیں سکتا۔ کبھی اس آشیاں کو بجلی تاک لیتی ہے اور اس پر گر کر اسے جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ اس کا غم بلبل کے دل سے نہیں نکلتا اگر ایک نشیمن ہی نہ ہو تو نہ جانے کون کون سی بلاؤں سے بلبل محفوظ ہو جائے۔

جگر کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ ترنم کے رسیا تھے۔ اس لئے ان کے کلام میں ترنم اور صوتی اثرات کا خاص اہتمام نظر آتا ہے۔ اس شعر میں "گلشن" کی تکرار سے مترنم صوتی اثر قائم ہوا ہے۔

۲- کامل رہبر قاتل رہزن دل سا دوست، نہ دل سا دشمن

اس شعر میں بھی کامل، قاتل ہم قافیہ الفاظ ہیں۔ "دل سا" کی تکرار ہے۔ "ل" اور "س" کی ملائم آوازوں کی تکرار ہے۔ ان سب نے مل کر شعر میں موسیقیت اور ترنم سمو دیا ہے۔ میر نے دل کو سارے عالم پر بلا لانے کا سبب قرار دیا تھا۔ فانی نے اسے غم گسار کہا ہے۔ دل آفتِ جاں بھی ہے اور غم گسار بھی۔ جگر نے اس شعر میں دل کے یہ دونوں رُخ دکھائے ہیں کہ اس جیسا دوست کہیں نہیں ملے گا کہ کامل رہنمائی دوستوں کی طرح کرتا ہے۔ پھر اس جیسا رہزن اور قاتل دشمن بھی نہ ملے گا۔ کہ سب کچھ لوٹ لیتا ہے اور جان سے مار دیتا ہے۔ دوستی اپنی جگہ بجا مگر دشمنی بھی اپنی جگہ قائم ہے کہ عقل و شعور کے تمام تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر یہ عاشقِ زار سے وہ کچھ کراتا ہے جو عالمِ ہوش میں وہ کبھی نہ کرے۔

۳- پھول کھلے ہیں گلشن گلشن لیکن اپنا اپنا دامن

یہاں شاعر نے یہ کہنے کی کوشش کی ہے اپنا اپنا ظرف ہوتا ہے۔ کسی کا دامن اتنا وسیع ہے کہ وہ سب کچھ سمیٹ لے تو بھی مزید گنجائش موجود ہے کچھ بے چارے تنگ داماں بھی ہوتے ہیں کہ تھوڑا سا ہی پا لینے کی ہمت رکھتے ہیں۔ شاعر نے پھولوں کی نسبت سے بات کی ہے کہ پھول تو باغ باغ میں کھلے ہیں۔ ان کی کمی نہیں ہے اپنے دامن کی گنجائش کے مطابق ہر کوئی انہیں سمیٹتا ہے۔ جیسے اقبال نے کہا ہے ؎

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

انسان اپنے ظرف اور حوصلے کے مطابق اپنے دل میں مقاصد اور آرزوئیں پیدا کرتا ہے جس کا ظرف وسیع ہو اس کے مقاصد بھی اعلیٰ اور وسیع ہوتے ہیں۔

اس شعر میں "گلشن"، "اپنا"، "ل" اور "ن" کی تکرار سے نہایت خوش آئند مترنم آہنگ

پیدا ہوا ہے۔

۴- خیر مزاجِ حُسن کی یارب تیز بہت ہے دل کی دھڑکن

کچھ ایسی ہی بات جگر نے ایک اور جگہ یوں پیش کی ہے ؎

شوقِ گستاخ کر چکا تقصیر دیکھنا اب ہے حُسن برہم کیا؟

شاعر کے دل کی دھڑکن تیز ہے۔ شوق جوش مار رہا ہے۔ بے تابی زوروں پر ہے۔ اندیشہ ہے کہ دل کے ہاتھوں بے اختیار ہو کر عاشق کوئی گستاخی محبوب کی محفل میں کر بیٹھے۔ شاعر نے خدا سے دُعا مانگی ہے کہ یارب! مزاجِ حُسن کی خیر ہو۔ حُسن محبوب ہی کو کہتے ہیں۔ وہ محبوب کے مزاج کی خیر مانگ رہا ہے۔ حالانکہ اُسے اپنی خیر مانگنی چاہئے۔ کہ غلطی کا ارتکاب کرے گا محبوب کا مزاج برہم ہوگا۔ سزا پائے گا۔ اپنے لئے یہ دُعا مانگنے کا یہ خوب طریقہ ہے کہ یا اللہ محبوب کے مزاج بخیر رکھنا۔

۵- آ کہ نہ جانے تجھ بن کب سے روح ہے لاشہ جسم ہے مدفن

بے اختیاری کے عالم میں محبوب کو پکار رہا ہے کہ خدا کے لئے اب تو آ جا اور ایفائے عہد کر۔ تیرے انتظار میں میری روح بے جان ہو گئی ہے۔ اور وہ جسم میں مدفون ہے۔ جسم کو مدفن اور روح کو مردہ قرار دیا ہے۔ بہت انوکھا خیال ہے۔ ورنہ روح تو ہمیشہ زندہ رہنے والی چیز ہے۔ شاعر نے عشق میں ایسے نامساعد اور دل شکن حالات پائے ہیں کہ اس کی روح بھی مردہ ہو گئی ہے۔ اس لئے اسے لاشہ قرار دیا۔ ایک مجرد چیز روح کو شاعر نے تجسیم دی ہے۔ اور لاش قرار دیا ہے۔

۶- عمریں بیتیں صدیاں گزریں ہے وہی اب تک عقل کا بچپن

عمر کے ساتھ ساتھ پختگی آنی چاہئے۔ دنیا کی ہر چیز وقت کے ساتھ ساتھ اور کہنگی کے ساتھ پختگی اختیار کرتی ہے مگر شاعر نے عقل کے متعلق کہا ہے کہ یہ ایسی چیز ہے جو ابھی تک بچپن کے مراحل میں ہے۔ صدیاں اور عمریں بیت گئی ہیں۔ جب آدم پیدا ہوا تو اسے عقل اور شعور عطا ہوا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ آدم سے لے کر اب تک انسان وہی غلطیاں دہراتے آ رہے ہیں۔ جو پرانے زمانے میں کی گئیں۔ اگر انسانوں کی عقل میں پختگی آتی تو انسانی معاشرہ ایک خلائی معاشرہ بن چکا ہوتا۔ مگر عقلِ ناپختہ اور عقلِ نارسا نے انسانوں کو اس دنیا میں چین کی زندگی بسر کرنے سے محروم کر رکھا ہے۔

موجودہ دور عقلی و علمی ترقی کا دور ہے۔ مگر شاعر نے اس کے اخلاقی پہلو کے پیشِ نظر کہا کہ عقل پر جمود طاری ہے۔

۷- برق حوادث اللہ اللہ جھوم رہی ہے شاخ نشیمن

مشکلات:- حوادث: حادثات

شاعر نے حادثات کو برق بنا کر شاخ اور نشیمن کا ذکر کیا ہے کہ برق آشیاں پر گر کر اسے جلا کر راکھ کر ڈالتی ہے۔ یا خرمن پر گرتی ہے۔ یہاں اس نے خرمن کا ذکر نہیں کیا ہے۔ صرف نشیمن کا ذکر ہے۔ شاعر کہتے ہیں۔ حوادث کی برق عالم سوز کی کارگری دیکھو کہ اس کی سوزش کی داد دینے کے لئے اس آشیاں کی شاخ جھوم جھوم کر اللہ اللہ کہہ رہی ہے۔ جس پر بجلی گری ہے دنیا میں اگرچہ علت و معلول کی بنیاد پر نظام چل رہا ہے تاہم حادثات کی دخل اندازی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ زلزلے، سیلاب، طوفان وغیرہ ایسے سامان ہیں جو حادثات کا سبب بنتے ہیں اور ایسی تباہی و بربادی کرتے ہیں کہ انسان کو خدا یاد آجاتا ہے۔

۸- دل، کہ مجسم آئینہ ساماں اور وہ ظالم آئینہ دشمن

مشکلات:- آئینہ ساماں: آئینہ کی سی نشانی رکھنے والا

دل کو آئینہ سے نسبت دی جاتی ہے۔ آئینہ شکل دکھاتا ہے۔ اور کہتے ہیں کہ دل میں بھی محبوب کی شکل دکھائی دیتی ہے اس قرینے سے دل کو آئینہ کہا گیا ہے۔ یہاں شاعر نے آئینہ سامان کہا ہے بات وہی کہ دل ایک آئینہ ہے جس میں تصویر یار نظر آتی ہے ؎

دل کے آئینے میں ہے تصویر یار جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

مگر ظالم محبوب آئینہ دشمن ہے کہ وہ اس آئینۂ دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ آئینہ تو سنبھال کر احتیاط سے رکھنے کی چیز ہے۔ مگر افسوس کہ میرا آئینۂ دل محبوب کے ہاتھوں شکستہ ہو کر ریزہ ریزہ ہو گیا ہے۔

۹- بیٹھے ہم ہر بزم میں لیکن جھاڑ کے اٹھے اپنا دامن

مشکلات:- دامن جھاڑنا: دامن صاف کرنا۔ کچھ پاس نہ رکھنا

ہم نے جا بجا دنیا دیکھی ہے اور اس کی رنگینیوں اور دلچسپیوں میں حصہ لیا ہے لیکن جس مقام سے بھی اٹھے دامن جھاڑ کے اٹھے ہیں۔ وہاں سے ساتھ کچھ نہ لائے مطلب یہ ہے کہ فی توفر سامان ہے۔ مگر دنیا میں کچھ حاصل کرنے کی اہلیت اور صلاحیت بھی ہونی چاہئے۔ ہم نے کچھ بھی حاصل نہ کیا۔ ؎

ایک محروم چلے میرؔ ہمیں دنیا سے ورنہ عالم کو زمانے نے دیا کیا کیا کچھ

۱۰- کانٹوں کا بھی کچھ حق ہے آخر کون چھڑائے اپنا دامن

انسان باغ میں پھول چننے اور سیر چمن سے لطف اندوز ہونے کے لئے جاتا ہے۔ مگر جہاں پھول کھلتے ہیں وہاں کانٹے بھی ہوتے ہیں۔ وہ کانٹے دامن سے اُلجھ جاتے ہیں تو ان سے دامن چھڑانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اصغر کہتے ہیں کہ ہم جہاں سیر کو آئے وہاں پھولوں کی رنگینی بھی تھی۔ اور کانٹوں کی چبھن بھی تھی۔ جب ہم نے دادِ رنگینیٔ گل دی۔ تو کانٹوں کو بھی کچھ حق ہے کہ وہ اپنی چبھن میں سے کچھ ہمیں دیں۔ اس لئے ان سے اب کیا دامن چھڑانا ہے۔ یعنی زندگی میں مسرتوں کے ساتھ غم کے کانٹے بھی ہیں۔ انسان جیسے مسرت بداماں ہو کر خوش ہوتا ہے دامن میں غم کے کانٹے اُلجھے دیکھ کر ناخوش ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کو اصغر سبق دے رہے ہیں کہ یہ غم بھی زندگی کا حصہ ہے اسے زندگی سمجھ کر ہی قبول کرو اس سے دامن چھڑانے کی کوشش نہ کرو۔

۱۱۔ چلتی پھرتی چھاؤں ہے پیارے کس کا صحرا کیسا گلشن

صحرا بے آباد ہونے کی وجہ سے بے آبادی اور محرومی کی علامت ہے۔ اور گلشن اپنی رنگینی اور آبادی کی وجہ سے آسائشوں کی علامت ہے۔ شاعر کہتے ہیں کہ دنیا چلتی پھرتی اور ڈھلتی چھاؤں ہے۔ آج کسی کے پاس دھن ہے اور اُسے آسائشیں میسر ہیں تو کل وہ ان سے محروم بھی ہو سکتا ہے۔ جیسے [illegible] ڈھل جاتی ہے اور غائب ہو جاتی ہے اسی طرح دنیا اور اس کی آسائشوں کا حال ہے۔ وہ بھی آنی جانی چیزیں ہیں۔ ان کے ملنے کی کیا خوشی اور ان کے نہ ملنے کا کیا غم۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال

(۱۸۷۷ء ——— ۱۹۳۸ء)

طرابلس

۱۔ مدت سے ہے آوارۂ افلاک مرا فکر کر دے اسے اب چاند کے غاروں میں نظر بند

مشکلات:۔ آوارۂ افلاک: آسمانوں کی سیر کرنے والا۔ الٰہیات اور مابعد الطبیعیاتی مسائل پر غور کرنے والا۔ فکر: سوچ۔ فلسفہ (یہ شعر علامہ اقبال کی ایک نظم سے لیا گیا ہے۔ جو بے عنوان بالِ جبریل میں درج ہے)

اقبال کہتے ہیں کہ میں مدت سے الٰہیات پر غور و فکر کرتا رہا ہوں۔ میرا ذہن فلک نوردی کرتا رہا ہے۔ جس کے خیالات میں آوارگی اور بغاوت ہو حکومت اُسے نظر بند

کر دیتی ہے۔ اس لئے مجھے بھی اب نظر بند کر دینا چاہیئے۔ افلاک کی نسبت سے اپنے لئے نظر بندی کا مقام چاند کے غار تجویز کرتے ہیں۔ علامہ اقبال کی زندگی میں انسان ابھی چاند تک نہیں پہنچا تھا۔ تاہم چاند پر تاریکی کے گڑھوں اور غاروں کو طاقتور دُوربینوں کے ذریعے دریافت کر لیا گیا تھا۔

۲۔ فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہرِ ملکوتی خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند

مشکلات: جوہر: خوبی، کمال ملکوتی: فرشتوں جیسی۔ فرشتوں کے جہاں سے تعلق رکھنے والی۔ پیوند: تعلق۔

علامہ اپنے متعلق بجا طور پر فرماتے ہیں کہ خداوند کریم نے مجھے وہ خوبیاں اور وہ جوہر عطا کئے ہیں جو فرشتوں میں ہیں۔ جو کہ نور کی مخلوق ہیں اور عالمِ ملکوت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگرچہ میں خاک نژاد آدمی ہوں۔ مگر میں ذہنی اور روحانی طور پر خاکی دنیا سے تعلق نہیں رکھتا۔ میرا ذہن مجھے عالمِ خاک کی بجائے عالمِ ملکوت میں لئے پھرتا ہے۔ میں وہاں کے رازہائے نہانی کا شناسا ہوں ؎ کیا میں نے اس خاکداں سے کنارہ

۳۔ اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

مشکلات:۔ زہرِ ہلاہل: ہلاک کر دینے والا زہر قند: شکر

اقبال نے زندگی میں حق گوئی کا ایسا رویہ اختیار کیا کہ وہ کبھی باطل کو حق نہیں کہتے تھے۔ جو کچھ انہیں درست نظر آتا تھا اُسے درست کہتے تھے اور غلط کو غلط کہنے میں کبھی تامل نہیں کیا۔ چنانچہ مولانا مدنی؟ جیسی عظیم المرتبت شخصیت نے وطن اور قوم کے متعلق اظہارِ خیال فرمایا تو اقبال نے فوراً ہی ایک تنقیدی نظم لکھ ڈالی۔ علامہ فرماتے ہیں کہ میرے اس حق پرستانہ طرزِ عمل کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ جہاں بیگانوں اور غیروں کو تو مجھ سے خفا ہونا ہی چاہیئے تھا۔ وہاں کچھ اپنے مسلمان بھائی بھی مجھ سے ناخوش ہیں۔ میں مہلک زہر کو شکر کہنے کے لئے کبھی تیار نہ ہو سکا۔ زہر کو زہر اور شکر کو شکر ہی کہوں گا۔

۴۔ ہر حال میں میرا دلِ بے قید ہے خرم کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوقِ شکر خند

مشکلات:۔ بے قید: آزاد۔ خرم: خوش۔ شکر خند: مسکراہٹ۔ تبسم

اقبال فرماتے ہیں میں ہر حال میں خوش رہتا ہوں۔ کیونکہ میرا دل آزاد ہے۔ وہ کسی کی قید میں نہیں۔ میں دل کی دُنیا میں آزادی کے مزے لوٹتا رہتا ہوں۔ اور خوش و خرم رہتا ہوں اور خوش و خرم وقت گزارتا ہوں۔ یہ خوشی مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔

یہ خوشی سن کی دنیا سے تعلق رکھتی ہے جہاں میں نے نہ فرنگی کا راج دیکھا نہ سود و سودا اور مکر و غن دیکھا۔ جس طرح غنچے سے اس کی فطری میٹھی مسکراہٹ کوئی نہیں چھین سکتا اُسی طرح مجھے دل کی اس مسرت اور تسکین سے کوئی محروم نہیں کر سکتا۔

۵۔ چپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبال کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

مشکلات:- یزداں: خدا زرتشت کے عقیدے کے مطابق نور اور نیکی کا خدا یزداں اور ظلمت اور بدی کا خدا اہرمن کہلاتا ہے۔ جبکہ ہم اُسے خدا نہیں مخلوق سمجھتے ہیں، اس کا نام ابلیس ہے۔ جس طرح بندہ اور آقا کے درمیان کبھی کبھار بے تکلفی کے عالم میں بندہ کے منہ سے شوخ اور گستاخانہ کلمات نکل جاتے ہیں اور آقا انہیں بخوشی برداشت کرتا ہے۔ اسی طرح شاعری میں شعراء نے اپنے آقائے حقیقی کے ساتھ تھوڑی سی شوخی کی آزادی حاصل کر رکھی ہے شوخی بہرحال شوخی کی حد تک ہونی چاہیئے۔ اگر یہ گستاخی کی حد میں داخل ہو جائے۔ تو پھر شوخی نہیں کفر بن جاتی ہے۔ علامہ اقبال کے ہاں ایسی شوخی ان کے کلام میں اکثر ملتی ہے۔ اُن کی مشہور نظم "شکوہ" شائع ہوئی۔ تو علمائے کرام نے اُن پر کفر کے فتوے لگا دیئے۔ مگر "جواب شکوہ" کی اشاعت پر اُن کے منہ بند ہوئے۔ ایک شعر میں خدا کو کہتے ہیں ؎

روزِ حساب جب میرا پیش ہو دفترِ عمل آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

شاعری سے ہٹ کر عملی زندگی میں خدا کی شرمساری کی بات کرنا واقعی گستاخی ہے۔ شاعری کے میدان میں یہ شوخی ہے اور خوبی کلام ہے۔

اس شعر میں اقبال فرماتے ہیں کہ میں خدا کے حضور میں بھی چپ نہ رہ سکا۔ وہاں بھی دل کی بھڑاس نکالتا رہا۔ شوخی کی خوبی دیکھیئے کہ خود ہی شوخی کے مرتکب ہوئے اور پھر خود ہی کہتے ہیں کہ اس شوخ اور گستاخ بندے کا منہ بند کرنے والا کوئی نہیں؟

نمبر ۲ (نظم بہ عنوان "جاوید کے نام")

علامہ مرحوم کے فرزند جاوید اقبال نے والدِ گرامی کو خط لکھا۔ یہ پہلا خط لندن میں موصول ہوا۔ تو علامہ نے یہ نظم لکھی۔ اس کی ہیئت غزل کی ہے۔ اس نظم میں انہوں نے اپنے لختِ جگر کو مخاطب کیا ہے۔ مگر اس کا اطلاق ہر فرزندِ ملت پر ہو سکتا ہے۔ اس نظم میں مرحوم نے وہ خوبیاں بیان فرمائی ہیں جو وہ اپنے لختِ جگر میں دیکھنا چاہتے تھے۔

۱۔ دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

اقبال اپنے فرزند دل بند سے مخاطب ہیں کہ اپنے عمل، اپنی قوتِ بازو اور اپنی سعی و جہد کے بل بوتے پر دنیائے عشق میں اپنا مقام پیدا کرو۔ "نیا زمانہ" اور "نئی صبح و شام" کی تراکیب علامہ کے کلام میں عام ملتی ہیں۔ وہ عالمِ نو کی تخلیق اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے جس میں گراں خواب چینیوں کے سنبھلنے اور اقوامِ ایشیا کے بیدار ہونے کے مناظر شامل ہیں۔ مسلمان نوجوانوں سے وہ توقع رکھتے تھے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر اپنے لئے دنیا میں معزز مقام حاصل کریں بلکہ دنیا کی امامت کریں۔ یہ نیا زمانہ اور نئی صبح و شام اسی عالمِ نو سے تعلق رکھتے ہیں جس میں اقوامِ غالب کی جادوگری کے پرخچے اڑ جائیں گے۔

۲- خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو۔ سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر

مطالعۂ فطرت ایک ایسی چیز ہے جس سے کائنات کے رازہائے سربستہ کو فاش کیا جا سکتا ہے لیکن یہ مطالعۂ فطرت ہر کسی کے بس کا روگ نہیں ہے۔ ویسے تو کتابِ فطرت کھلی ہے۔ جو لوگ فطرت شناسی کا ذوق رکھتے ہیں وہی اس کھلی کتاب کے مندرجات کو سمجھ سکتے ہیں۔ جیسے خود اقبال فرماتے ہیں ؎

وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروبِ آفتاب۔ جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیل

کائنات میں صرف انسانوں کو قوتِ نطق عطا ہوئی، دیگر مخلوقات اس سے عاری ہیں۔ مگر فطرت شناس لوگ ان کی زبانِ حال سے بہت کچھ سُن لیتے ہیں۔ یہی تلقین علامہ مرحوم اپنے بیٹے کو کر رہے ہیں کہ اگر خدا نے تجھے فطرت شناسی کا ذوق عطا کر دیا تو لالہ و گل بھی عالمِ سکوت میں تجھ سے ہمکلام ہو کر معارف و حقائق بیان کریں گے۔

۳- میں شاخِ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر۔ مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر

مشکلات:- شاخِ تاک: انگور کی بیل۔ ثمر: پھل۔ مئے لالہ فام: سرخ رنگ کی شراب۔

اس شعر میں علامہ مرحوم نے اپنے آپ کو انگور کی بیل سے اور اپنے کلام کو انگوروں سے تشبیہ دی ہے۔ اور پھر اپنے بیٹے کی نسبت سے نوجوانانِ اسلام کو پیغام دیا ہے کہ اس خوشۂ انگور سے خالص سُرخ رنگ کی شراب پیدا کر کے نوش کرو۔ اس میں تمہیں وہ نشہ اور سرور ملے گا جو تم میں حقیقت شناس نگاہ پیدا کرے گا۔ اقبال کے ہاں شراب، مئے کا ذکر آتا ہے۔ مگر یہ مئے عشقِ مجازی ہے۔ ان کے ہاں شراب ایک استعارہ ہے مئے مغرب سے مراد وہ مغربی تمدن اور مئے خانہ ساز سے مراد وہ مجازی تہذیب

لیتے ہیں۔ مثلاً ؎

پھر یہ غوغا ہے کہ لا ساقی شرابِ خانہ ساز دل کے ہنگامے مئے مغرب نے کر ڈالے خموش

اقبال اپنے بیٹے کو تلقین کر رہے ہیں کہ میرے کلام کا مطالعہ کر کے وہ ولولہ اور جذبہ حاصل کرو جو ملّت اسلامیہ کے نوجوانوں کو درکار ہے۔

۴- مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

اقبال کے نظامِ فکر کا مرکزی نقطہ خودی ہے، ان کا سارا فلسفہ اسی نقطے کے گرد گھومتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے بیٹے کے حوالے سے ملت اسلامیہ کے نوجوانوں کو پیغام دے رہے ہیں۔ تو خودی کا ذکر بھی آتا۔ چنانچہ آخری شعر میں اُن کے اس پورے پیغام کا خلاصہ یا نچوڑ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھے امیرانہ ٹھاٹ باٹ پسند نہیں ہے۔ جن کے سامان حاصل کرنے کے لئے خودی مجروح ہو۔ چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں ؎ اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی + جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی اس کے بجائے وہ فقیرانہ زندگی بدرجہا قابل قبول ہے جس میں انسان کی خودی اور غیرت توانا اور محفوظ ہو۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

خودی کو نہ بیچ سیم و زر کے عوض نہیں شعلہ دیتے شرر کے عوض

اپنے بیٹے کو سبق دے رہے ہیں کہ خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر۔ کیونکہ ؎ تری زندگی اسی سے تری آبرو اسی سے۔ جو رہی تو بادشاہی نہ رہی تو روسیاہی

نمبر ۳ (غزل)

یہ بالِ جبریل کی ایک مشہور غزل ہے۔ یہ غزل مسلسل ہے جس میں زمان و مکاں کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے

۱- ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

ستاروں کا لفظ یہاں علامت ہے، اس سے مراد یہ ستاروں کا جہان ہے یعنی کائنات جس میں شمس و قمر پائے جاتے ہیں۔ امتحان کے لفظ سے ظاہر ہے کہ یہ دنیا امتحان گاہ ہے۔ اور یہ امتحانِ عشق ہے جس کا انعقاد محبوبِ حقیقی کی طرف سے اس دنیا میں کیا گیا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ ہماری زندگی صرف اس جہانِ شمس و قمر اور جہانِ آب و گل تک ہی محدود نہیں ہے۔ زندگی ایک آزمائش ہے جس کا سلسلہ آگے کی منزل میں ہوگا۔ آزمائشوں کا سلسلہ جاری ہے۔ اس جہان کے علاوہ اور کئی

جہان ہیں۔ اور اس آزمائش کے علاوہ اور کئی آزمائشیں ہیں۔ جن میں سے ہمیں گزر کر آخری منزل پر پہنچنا ہے۔ یہ جہاں اور یہ زندگی ان بے شمار مراحل میں سے ایک مرحلہ ہے۔ جس میں سے ہمیں گزرنا ہے۔ نہ تو یہ واحد مرحلہ ہے اور نہ ہی آخری۔

۲۔ تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں

مشکلات:۔ تہی: خالی۔

یہ کائنات محدود ہونے کے باوجود بہت ہی وسیع ہے۔ ہم اس کی وسعت تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جہاں تک ہم پہنچے ہیں بس وہی کچھ کائنات ہے۔ سائنسدانوں نے اندازہ لگایا ہے۔ کہ ایک کہکشاں میں نظام شمسی کی طرح کے بے شمار نظام اور کائناتیں موجود ہیں۔ ہم تو نظام شمسی کی حدود کو بھی نہیں سمیٹ سکے۔ اقبال جیسے فلسفی کی نگاہ سے کائنات کو دیکھتے ہیں تو وہ کہہ اٹھتے ہیں کہ یہ خلا اور یہ کہکشاں زندگی سے عاری اور خالی نہیں ہیں۔ زندگی کا وجود جس طرح روئے زمین پر ہم مشاہدہ کرتے ہیں ممکن ہے کہ اس جیسا یا اس سے مختلف نوعیت کا وجود زلیست کائنات کے دیگر گوشوں میں پل رہا ہو۔ اس لئے سمجھ لو کہ ہماری طرح کے یا اس سے مختلف طرح کے زندگی کے کئی قافلے اس وسیع و عریض کائنات میں ہماری طرح مرحلہ بہ مرحلہ اگلی منازل کی طرف گامزن ہیں۔

۳۔ قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

اقبال اس جہان کو جہانِ رنگ و بو کہہ رہے ہیں۔ رنگ اور بُو کا تعلق ہمارے حواس خمسہ میں سے دو کے ساتھ ہے۔ اس طرح رنگ و بو کی نسبت سے وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ یہ جہان حواس کا جہان ہے۔ یہ محسوسات کی دنیا ہے جسے ہم اپنے حواس اور عقل کے حوالے سے پہچانتے ہیں۔ مگر پھر وہی بات کہ یہی وہ واحد جہان نہیں ہے جو ہمیں عطا ہوا۔ اس لئے ایک اسی جہان کے مال و زر کو جمع کرنا ہی مقصدِ حیات نہ بنا لو۔ آگے کے سفرِ حیات میں اور بھی ایسے کئی جہان آئیں گے۔ یہاں کا مال و زر یہیں رہ جائے گا اور ہم وقتِ معین پر موت کے نقارے پر آگے کی منزل کو کوچ کر جائیں گے۔ تو اسی ایک جہان کو سب کچھ سمجھ کر اپنی تنگ دامانی اور تنگ ظرفی کا ثبوت نہ دے۔ خدا نے تیرے لیئے اور بہت کچھ تیار کر رکھا ہے۔

۴۔ اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

یہاں اقبال نے اس دنیا کو ایک نشیمن کہا ہے کہ جس سے محروم ہونے پر یعنی وفات

پر ہم بہت آہ و فغاں کرتے ہیں۔ مگر آہ و فغاں کرنے کے ایسے مقامات تو آگے بھی بہت آئیں گے۔ اگر رونا اس بات کا ہے کہ جہان ہم سے چھین گیا تو یہ غم کرنے کی اور رونے کی کوئی بات نہیں یہ تو انسانی نادانی کی دلیل ہے، ورنہ اس طرح کے اور کئی جہاں آگے آنے والے ہیں۔ اس جہاں سے جاکر ہم محرومِ جہاں نہیں ہو جاتے بلکہ ہمیں اس سے بھی بہتر کوئی جہاں مل جاتا ہے۔ اس طرح اگر ہم ہر منزل پر ہر جہاں سے جُدا ہوتے وقت روتے رہیں تو یہ ہماری حقیقت ناشناسی اور نا عاقبت اندیشی ہے۔ اقبال کے ہاں زندگی کا تصور فلسفیانہ ہے۔ اسے عارفانہ نہیں کہا جا سکتا۔ مگر اس خشک فلسفہ کو اقبال نے جس عمدگی سے غزل کے رنگ میں سمو کر پیش کیا ہے۔ یہ اقبال ہی کا حصہ ہے۔ ورنہ یہ خشک موضوع غزل کے حُسن کو ضرور مجروح کرتا۔ یہ اقبال کا فنی کمال ہے کہ جہاں اس نے اپنے فلسفے کا ابلاغ عمدگی سے کیا ہے وہاں تغزل کا جوبن برقرار رکھا ہے اور اسے مجروح نہیں ہونے دیا۔

۵۔ تو شاہین ہے پرواز ہے کام تیرا ترے سامنے آسمان اور بھی ہیں

شاہین اقبال کے ہاں عام پرندہ نہیں ہے۔ وہ اسے ایک مستقل علامت کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ یہ علامت درویشِ مسلمان کی ہے۔ وہ خود ایک جگہ فرماتے ہیں کہ میں نے یہ علامت سوچ سمجھ کر وضع کی ہے۔ درویش کے دو مقصدِ حیات ہیں۔ کہ وہ گھر نہیں بناتا اور خود کما کر کھاتا ہے کسی کا دستِ نگر نہیں ہوتا۔ مجھے شاہین ایک ایسا پرندہ نظر آیا جس میں یہ دونوں خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ اس لئے میں نے اسے صاحبِ فقر مسلمان کی علامت کے طور پر انتخاب کیا ہے۔ یہاں اقبال مسلمان سے مخاطب ہے کہ تیرا کام جدوجہد کو جاری رکھنا ہے۔ جدوجہد جاری رکھنے کے لئے، تیرے پاس مقاصدِ جلیل کی کوئی حد نہیں ہے۔ شاہین کی طرح اپنی پروازِ عمل جاری رکھ اور بلند سے بلند تر مقامات کو عبور کرتا جا۔

۶۔ اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

یہ غزل اقبال کے فلسفۂ زمان و مکان پر کہی گئی ہے۔ ہر شعر میں تقریباً ایک ہی بات ہے جسے مختلف علامات اور استعاروں کے ذریعے مختلف انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ اس شعر میں واضح طور پر فلسفیانہ اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں۔ ہم نے اپنے اس جہاں میں وقت کو ناپنے کا ذریعہ اور پیمانہ شب و روز کو بنایا ہے۔ اقبال نے اپنے کلام میں اکثر اس معیارِ پیمائش پر تنقید کی ہے۔ کہیں اسے میزانِ سحر و شام کا نام دیتے ہیں مثلاً ؎

سعیِ پیہم ہے ترازوئے کم و کیفِ حیات تیری میزان ہے شامِ سحر و شام ابھی

کہیں اسے "پیمانۂ امروز و فردا" کہتے ہیں مثلاً ؎

تولے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی

اس شعر میں اسے شب و روز نہ نام دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ تیرے اندر وہ قوت پوشیدہ ہے کہ تو زمان و مکاں پر خود چھا جائے۔ اور ان پر حیط ہو جائے۔ تو کیوں اس ناقص تصورِ زماں میں محجور کر دیا گیا ہے۔ جسے شب و روز کے ناقص پیمانے سے ناپتے ہیں۔ تو جاوداں ہے تجھے اس محدود تصورِ زماں میں الجھنے کا کیا فائدہ ہے۔ کیوں تو زمانے کا مرکب بن گیا ہے حالانکہ تو زمانے کا راکب ہے۔

۷۔ گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

اقبال کے سامنے ایک واضح مقصد تھا۔ وہ خوابِ خرگوش میں مبتلا امتِ مسلمہ کو بیدار کرنا چاہتے تھے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس زمانے میں پورا عالمِ اسلام اہلِ مغرب کے زیرِ تسلط تھا۔ اگر یہ تسلط محض حکومت کا ہوتا تو غم نہیں تھا۔ مگر یہ تسلط ذہنی تھا۔ کمزوری اور زوالی کا شکار مسلمانوں نے مغربی فلسفہ کا اثر اس حد تک قبول کر لیا تھا کہ پڑھے لکھے لوگ نماز پڑھنا بھی رجعت پسندی سمجھتے تھے۔ ایسے عالم میں اقبال کو براہِ راست مغربی نظریات سے جنگ آزما ہونا تھا۔ ان کا کوئی ہم نوا نہیں تھا۔ وہ اکیلے ہی اس میدان میں اترے۔ آغازِ کار میں انہیں بے حد مشکلات پیش آئیں۔ مگر بالآخر وہ ہندی مسلمانوں کا دل موہ لینے میں اور انہیں اپنا ہم نوا بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ کہتے کہ ان کا کلام اور ان کا پیغام ہندی مسلمانوں کے دل کی دھڑکن بن گیا۔ تحریکِ پاکستان کے طوفانی دور میں اگرچہ علامہ اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ مگر ان کے کلام نے جادو کا اثر دکھایا۔ یہ سرخروئی اقبال نے اپنی زندگی میں ہی حاصل کر لی تھی۔ اس لئے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے اس شعر میں کہتے ہیں۔ وہ دن گئے جب میری آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز تھی۔ اب لوگ میرے پیغام کو سمجھ گئے ہیں۔ میرے بہت سے ہم نوا اور رازداں پیدا ہو گئے ہیں۔ مجھے اپنی کوششوں کا ثمر مل گیا ہے۔

نمبر ۴ (غزل)

یہ غزل بانگِ درا سے لی گئی ہے

۱۔ چمک تیری عیاں بجلی میں آتش میں شرارے میں۔ جھلک تیری ہویدا چاند میں سورج میں تارے میں

مشکلات:- عیاں: ظاہر آتش: آگ شرارہ: چنگاری ہویدا: ظاہر

شاعروں نے وحدت الشہود کو اپنے اشعار کا موضوع بنایا ہے۔ اقبال نے بھی اس شعر میں اس عقیدے کا اظہار کیا ہے۔ لیکن اس کا انداز اپنا ہے، خدا نورِ کل ہے۔ نور کی نسبت سے شاعر نے ایسی مادی اشیاء کا ذکر کیا ہے جن میں روشنی اور چمک ہے۔ شاعر کو ان روشن اور چمک دار اشیاء کی چمک نورِ خدا کی چمک اور جھلک نظر آتی ہے۔ چنانچہ خدا کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ بجلی ہو یا آگ یا چنگاری ان سب کی چمک میں تیرے نور کا جلوہ نمایاں ہے۔ رات کی تاریکی دور کرنے والی چاند کی چاندنی ہو یا سورج کی دنیا بھر کو روشن کرنے والی روشنی ہو یا تاروں کی ٹمٹماہٹ ہو ان سب کی روشنی میں تیرے نور کی جھلک ظاہر ہے۔ یعنی خدا کے نور کا جلوہ ہر قسم کی روشنی میں ظاہر ہے۔

۲- بلندی آسمانوں میں، زمینوں پہ تری پستی روانی بحر میں، افتادگی تیری کناروں میں

آسمان، زمین، بحر اور کنارے کی نسبت سے شاعر نے موزوں مناسبات استعمال کر کے ثابت کیا ہے۔ دنیا کی ہر مادی اور غیر مادی چیز میں خدا موجود ہے۔ آسمانوں میں تو بلندی بن کر ظاہر ہوا ہے۔ زمینوں میں پستی بن کر۔ تو سمندروں میں ان کی لہروں کی روانی بن گیا ہے۔ اور کناروں میں تو افتادگی بن گیا ہے۔ غرض دنیا کی ہر چیز میں تو موجود ہے۔ دیکھنے والی نگاہ کی ضرورت ہے۔

۳- جو ہے بیدار انساں میں وہ گہری نیند سوتا ہے شجر میں، پھول میں، حیواں میں پتھر میں بتانے میں

شاعر نے اپنے مشاہدے کی گہرائیوں کو کیا عمدگی سے پیش کیا ہے۔ انسان اشرف المخلوقات ہے باقی سب موجودات اس کے مقابلے میں کم تر ہیں خواہ وہ حیوانات ہوں یا جمادات یا نباتات سب کے سب انسان کے مقابلے میں کم تر مخلوق ہیں۔ انسان کے اندر خدا نے ایک ایسی امتیازی خصوصیت رکھ دی ہے جو دیگر مخلوقات مثلاً شجر، حجر، پھول، تاروں اور حیوانوں میں نہیں ہے اور وہ ہے شعور

مجھے پھونکا ہے سوزِ قطرۂ اشکِ محبت نے غضب کی آگ تھی پانی کے چھوٹے سے شرارے میں

مشکلات:- سوزِ قطرہ: قطرہ کی آگ اشکِ محبت: محبت کا آنسو شرارہ: چنگاری

اس شعر میں بہت عمدہ اور نادر تشبیہ دی گئی ہے۔ عشق کی کیفیت ہجر میں آنکھوں سے بہنے والے آنسو کے قطرے کو چنگاری تشبیہ دی ہے۔ وجہِ شبہ دونوں کی چمک ہے۔ مگر قطرے میں نمی اور چنگاری میں آتش پائی جاتی ہے۔ جو ایک دوسرے کے بالکل متضاد چیزیں ہیں۔ اس تضاد کی صورت میں یہ تشبیہ نادر ہے۔ شاعر کہتا ہے

کہ مجھے تو درد محبت کے آنسوؤں کی آگ نے جلا کر پھونک دیا ہے۔ یہ بظاہر پانی کا قطرہ تھا مگر چنگاری کی سوزش اس میں موجود تھی۔ اور پانی کی اس چھوٹی سی چنگاری نے غضب کی آگ لگائی جس میں میں جل کر راکھ ہو گیا ہوں۔

۵۔ نہیں جنس ثواب آخرت کی آرزو مجھ کو وہ سودا گر ہوں میں نے نفع دیکھا ہے خسارے میں

شاعر نے ثواب آخرت کو جنس قرار دے کر اس کی سوداگری اور نفع اور خسارے کے مناسبات استعمال کئے ہیں۔ جنس کی نسبت سے یہ مناسبات صنعت مراعات النظیر بن جاتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ میں جنس ثواب کا خریدار نہیں ہوں کہ یہ تو نفع کا سودا ہے۔ مجھے ایسے سودوں میں ہمیشہ گھاٹا ہوا ہے۔ اس لئے میں تو ایسا سودا کرتا ہوں اور ایسی جنس کا خریدار ہوں کہ جس میں خسارہ ہو۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ میں نے جب کبھی خسارے کا سودا کیا تو مجھے نفع ہوا۔ اس لئے میں جنس ثواب آخرت کا گاہک اور سوداگر نہیں ہوں۔

سکون ناآشنا رہنا اسے سامان ہستی ہے تڑپ کس دل کی یارب! مجھ میں آ کے بیٹھی ہے پارے میں

مشکلات:۔ سکون ناآشنا: بے قرار۔ بے چین سامان ہستی: زندگی کا سبب

شاعر نے اس شعر میں پارے کی بے چینی اور تڑپ سے ایک نکتہ پیدا کیا ہے۔ شاعر کے خیال میں تڑپ۔ اضطراب اور بے چینی تو کسی ہجر کے مارے عاشق کے دل میں ہوتی ہے۔ یہ وہ جنس ہے جسے بڑی جان جوکھوں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ آسانی سے دستیاب ہونے والی چیز نہیں ہے۔ تو پھر یہ تڑپ پارے میں کہاں سے چھپ کر آ گئی کہ یہ اضطراب اور تڑپ ہی اس کی زندگی کا سبب بن گئی ہے۔ پارہ ایک ایسی واحد دھات ہے جو سیال ہے مگر اس کی سیالی میں اضطرار پایا جاتا ہے۔ آپ اسے کہیں رکھیں یہ ادھر ادھر بکھر جاتا ہے۔ شاعر نے اس کے انتشار اور اضطراب کو عاشق زار کے دل کے انتشار اور اضطراب سے نسبت دی ہے۔

۶۔ صدائے لن ترانی سن کے اے اقبال! چپ کیوں۔ تقاضوں کی کہاں طاقت ہے تجھ فرقت کے مارے میں

لن ترانی تلمیحی اشارہ ہے۔ یہ قرآن کریم کے الفاظ ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کے اس اصرار کے جواب میں کہے گئے کہ یا اللہ مجھے اپنا جلوہ دکھا۔ ان کا مطلب ہے کہ تو مجھے نہیں دیکھ سکتا۔ موسیٰ علیہ السلام نے پھر بھی اصرار کیا تو کوہ طور پر نور خدا کی تاب نہ لا کر غش کھا کر گر پڑے تھے۔ اقبال کہتے ہیں۔ کہ میں بھی محبوب حقیقی کے حسن کا دیدار کرنا کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میں بھی اس کی فرقت کا مارا ہوں۔ مگر لن ترانی کے الفاظ سن کر

چُپ ہوں۔ میں ہجر کا ایسا مارا ہوں کہ مجھ میں تقاضا اور اصرار کرنے کی طاقت بھی نہیں ہے۔ لفظ "مارا" (یعنی مارا ہجر کی رعایت سے اپنے آپ کو ناطاقت کہا کہ ناطاقتی میں اصرار کے لئے منہ سے الفاظ نہیں نکلتے۔

نمبر ۵ (نظم)

یہ نظم قرآنِ کریم سے لی گئی ہے۔ اس کا عنوان ہے "مردِ مسلمان" اس میں اقبال نے مردِ مومن کی صفات بیان کی ہیں۔ یہ نظم مغزل کی ہیئت میں ہے۔

۱۔ ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن — گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

مشکلات:۔ برہان: دلیل۔ نشانی

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کے متعلق آیا ہے کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِی شَأْنٍ۔ کہ وہ ہر روز نئی آن اور نئی شان میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ مسلمان کو بھی اقبال بندۂ مولا صفات کہتے ہیں اس لئے وہ بھی ہر لحظہ نئی آن اور نئی شان میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ مسلمان اور مومن کا تصور ایک ایسے انسان کا تصور ہے جو ہر وقت حرکت و عمل میں مصروف ہے۔ کاروانِ وجود کی طرح وہ کسی بھی لمحہ کہیں نہیں ٹھہرتا ہے۔ مومن مجسم دلیلِ وجودِ خدا ہے۔ خدا کے وجود کے ثبوت میں اور کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ مومن کا کلام اور اس کا عمل دونوں خدا کی ذات کی دلیل ہوتے ہیں۔ وہ کوئی ایسی بات نہیں کرتا جس سے انکارِ خدا کا کوئی پہلو نکلتا ہو۔ پھر اس کے کردار اور عمل میں اتنی جاذبیت ہے اور اپنے عقیدہ کو وہ ایسی دلربا عملی شکل دیتا ہے کہ لوگ اس خدا کی ذات کے قائل ہو جاتے ہیں جس پر مومن ایمان رکھتا ہے۔ یہ مسلمانوں کا کردار ہی تھا کہ جہاں کہیں وہ فاتح کی حیثیت سے گئے جبر سے نہیں اپنے کردار سے لوگوں کو ایسا متاثر کیا کہ وہ مسلمان ہو گئے۔ ان کو کسی مباحثہ اور دلائل کے ذریعے قائل کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ اہلِ ایران کی مثال دیکھ لو۔ وہ بڑے متعصب لوگ تھے مگر فاتح مسلمانوں کے کردار سے یوں متاثر ہوئے کہ اپنی زبان کا پہلوی رسم الخط بدل کر عربی رسم الخط اختیار کر لیا۔

۲۔ قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت — یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

مشکلات:۔ قہاری: شدت کا قہر ڈھانے کی حالت غفاری: بدرجۂ کمال بخشنے کی حالت قدوسی: پاکیزگی جبروت: عظمت۔ جلال عناصر: اجزاء

علمائے یونان کا خیال تھا کہ مادہ چار عناصر پر مشتمل ہے۔ ہوا، آگ، مٹی، پانی۔ یہ نظریہ

آج غلط ثابت ہو گیا ہے۔ مگر اقبال شاید اسی عناصر الاربعہ والے نظریے کی نسبت سے کہہ رہے ہیں کہ جس مٹی سے مسلمان بنتا ہے۔ اس کے چار اجزا ہوتے ہیں۔ یعنی انسان کے کردار میں یہ چار صفات ہوں تو وہ مسلمان بنتا ہے۔ اوّل اس کا قہر اتنا شدید ہو کہ دشمن لرز اٹھیں۔ دوم موقع پڑنے پر اس میں عفو و درگزر ایسا ہو کہ لوگوں کے دل جیت لے۔ سوم اس کے کردار سے پاکیزگی اور تقدس ظاہر ہو۔ چہارم یہ کہ وہ عظمت و جلال کا مجسمہ ہو۔ چنانچہ زکوٰۃ کے منکرین کے مقابلے میں حضرت ابوبکر صدیق نے ایسی قہاری دکھائی۔ فتح مکہ کے موقع پر حضرت رسول اکرمؐ نے غفاری کے بے مثال نمونے دکھائے۔ ایسے مواقع پر اقوام عالم خوں ریزی اور تباہی میں آفاتِ سماوی کو پیچھے چھوڑ جاتی ہیں۔ پھر یہاں تو جواز بھی موجود تھا۔ اہلِ مکہ نے حضرت رسولِ پاکؐ پر اور ان کے صحابہؓ کرام پر کیا کیا مظالم نہ ڈھائے تھے۔ مگر اس سب کے باوجود عفو و درگزر کی یہ مثال دنیا کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ قدوسی کے لحاظ سے حضرت عثمانؓ کے پاکیزہ کردار کا مطالعہ کریں کہ حیا کو بھی حیا آتی تھی۔ جبروت کی کیفیت حضرت عمرؓ کے کردار سے ملاحظہ ہو کہ رومی سفیر انہیں دیکھ لرزاں ہو گیا۔ کردار کی یہ خصوصیات ایسی نہیں ہیں کہ جن کا عملی نمونہ ہمارے اسلاف کے ہاں موجود نہ ہو۔ اسلاف کے کردار کے پیشِ نظر ہی حضرت علامہ نے چار خصوصیات مسلمان کے کردار میں لازم قرار دی ہیں۔

۳۔ ہمسایۂ جبریلِ امیں بندۂ خاکی ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشاں

اقبال کا بندۂ مومن اگرچہ خاک نژاد ہے۔ وہ روئے ارض ہی پر بستا ہے۔ مگر وہ خاکی نہیں ہے۔ وہ کسی ایک شہر یا ایک ملک کا باشندہ نہیں۔ اس کی شخصیت آفاقی ہے اس کے کردار کی بلندی اُسے جبریلِ امیں کا ہمسایہ بنا دیتی ہے۔ وہ دنیا کی وطنی یا جغرافیائی حدود میں یا نسلی تفوق کے احساس میں محدود نہیں ہو جاتا۔ وہ ان چیزوں سے بہت بلند ہوتا ہے۔ اقبال نے مسلمانوں کے لئے ایک ایسا قومی تصور پیش کیا تھا جس میں جغرافیائی سرحدوں، نسلی امتیاز یا کسی اور تنگ نظرانہ تقسیم انسانی کو قومیت کی بنیاد بنانا غلط ہے۔ وہ مسلمانوں کے لئے ایک آفاقی ملت کا تصور پیش کرتے ہیں۔ اسی لئے کہتے ہیں

ہیں کہ سارا جہاں ہمارا ہے جیسے طارق نے کہا تھا ع

ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

۴۔ یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآں

مسلمان وہ ہے جو قرآن و سنت پر عمل پیرا ہو۔ اس لئے بظاہر تو مسلمان قرآن کریم کی

تلاوت کرتا نظر آتا ہے مگر حقیقت میں اس کی زندگی اور اس کا عمل قرآنی فرمودات کا عملی نمونہ ہوتا ہے۔ اسی لحاظ سے وہ مجسم قرآن ہی ہوتا ہے۔ اسوۂ رسولؐ سے ظاہر ہے کہ انہوں نے قرآنی احکامات کا عملی نمونہ پیش کر کے دکھایا۔ وہ قرآن کی عملی تفسیر تھے۔ اگر قرآن انسانی شکل اختیار کر سکے تو مومن کی شکل اختیار کرے گا کیونکہ مومن ہی قرآن کا عملی نمونہ ہوتا ہے۔

۵۔ قدرت کے مقاصد کا عیار اسی کا ارادے — دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

مشکلات:۔ عیار: معیار۔ کسوٹی — میزان: ترازو۔ ناپنے کا معیار

قدرت کاملہ جن مقاصد کی تکمیل چاہتی ہے۔ مومن انہی کی تکمیل کے ارادے باندھتا ہے۔ اس کے ارادے سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدرت کو کیا منظور ہے۔ جو اس کا ارادہ ہوگا وہی کچھ قدرت کو منظور اور مقصود ہوگا۔ اس طرح مومن کا ارادہ ہی قدرت کے مقصد کی کسوٹی اور معیار بن جاتا ہے۔ قدرت کا مقصد معلوم کرنا ہو تو مومن کے ارادوں کا جائزہ لے لو۔ مقصد وہی ہوگا جو مومن کے ارادوں سے ظاہر ہو۔ پھر مسلمان دونوں جہانوں میں نیکی کا معیار ہے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے نیکی ہے۔ وہ جس کام کے کرنے سے پرہیز کرتا ہے وہ بدی ہے۔ دو بنیاد عقلیے دونوں میں اس کا کردار نیکی اور بدی کی تمیز کا معیار ہے۔ جیسے یا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا

۶۔ جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم — دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

مسلمان کا کردار اور طرزِ عمل ہر لحظہ اس لئے بدلتا رہتا ہے کہ جیسے جیسے موقع محل کا تقاضا ہو ویسے ویسے وہ اپنا طرزِ عمل بدلتا رہتا ہے۔ وہ جگرِ لالہ کے لئے شبنم بن کر ٹھنڈک پہنچاتا ہے یعنی پرامن حالات میں لوگوں کی تسکین اور راحت کے سامان بہم پہنچاتا ہے اور جنگ و جدل کی صورت میں ایسا طوفان بن جاتا ہے جس سے دریاؤں کے دل بھی دہل جائیں یعنی وہ قوتِ باطل کے لئے ایسا طوفان بنتا ہے جسے کوئی قوت روک نہیں سکتی اور باطل اس کی طوفانی لہروں میں بہہ جاتا ہے۔ مومن کے اس کردار کے متعلق قرآنی اشارہ بھی موجود ہے کہ رسولِ پاکؐ کے ساتھی وہ ہیں۔ جو اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ — کافروں پر شدت اختیار کرتے ہیں اور آپس میں مجسم رحم بن جاتے ہیں۔ اقبال نے اس مضمون کو کئی اشعار میں پیش کیا ہے مثلاً ؎

اے رہروِ فرزانہ! رہ تیز میں اگر ہے — گلشن ہے تو شبنم ہے، صحرا ہے تو طوفاں ہے

یا ؎ گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے۔ گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

بتاتے ہیں مری کارگہِ فکر میں انجم ۔۔۔ لے اپنے مقدر کے ستارے کو تو پہچان

مشکلات :- کارگہِ فکر : فلسفہ کا کارخانہ۔ کلام ۔ شاعری ۔ انجم ، ستارے

مقدر : قسمت ۔

اقبال کہتے ہیں کہ میرا فلسفہ و کلام وہ کارخانہ ہے جہاں ستارے بنائے جاتے ہیں ۔ تو اپنی تقدیر اور قسمت کے ستارے کو پہچان کر میرے کلام سے لے لے ۔ وہی عقیدہ کہ ستاروں پر تقدیر کا انحصار ہے ۔ اقبال اگرچہ اس کے قائل نہیں ہیں تاہم انہوں نے اس کے حوالے سے بات کر کے شعر میں خوبی پیدا کی ہے ۔ پہلے مصرع میں انجم کا ذکر کیا پھر دوسرے مصرع میں قسمت کے اس نظریے کے پیشِ نظر قسمت کے ستارے کا ذکر کر دیا ۔ شاعر کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ میرے کلام میں وہ پیغام ہے کہ اگر تو میرے پیغام پر عمل کرے تو اپنا مقدر سنوار سکتا ہے ۔ اور تیرا نصیب جاگ سکتا ہے ۔

نمبر ۶ (غزل)

اقبال کی یہ غزل بالِ جبریل سے لی گئی ہے ۔

۱- یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبحگاہی ۔۔۔ کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام بادشاہی

اقبال کے کلام میں پیغام کے ابلاغ کا ایک عمدہ طریقہ یہ ہے کہ وہ ڈرامائی انداز اختیار کر کے اُثارِ فطرت سے یا تو ہم کلام ہوتے ہیں ۔ یا اُن کا پیغام سنتے ہیں ۔ یہاں وہی بات جو ان کے اپنے نظامِ فکر کا مرکزی نقطہ ہے انہوں نے بادِ صبحگاہی کے پیغام کے حوالے سے بیان کی ہے ۔ اس طرح شعر میں ڈرامائی کیفیت اور تاثیر پیدا ہوتی ہے ۔ پیغام وہی خودی کا ہے ۔ کہ جو لوگ اپنی خودی کا عرفان اور شعور حاصل کر لیتے ہیں ۔ سمجھ لو کہ وہ بادشاہی مقام پا گئے ۔ ضروری نہیں کہ انہیں تخت و تاج میسر ہو ۔ تخت و تاج تو ایسی حکومت اور بادشاہی کی علامت ہے جو ڈھلتی چھاؤں ہے مگر خودی کے عرفان سے جو بادشاہی حاصل ہوتی ہے ۔ وہ ہمیشہ قائم و دائم ہے ۔ اس مقام پر پہنچ کر فرنگی کا راج یا دھن دولت کا راج نہیں ہوتا ہے ۔ یہاں پہنچ کر انسان فقر کی اس منزل پر ہوتا ہے جہاں فقیرِ رہ گدا بن جاتا ہے جسے دماغِ سکندری عطا ہو جاتا ہے ؎

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی ۔۔۔ کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

۲- تری زندگی اسی سے تری آبرو اسی سے ۔۔۔ جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی

اقبال کی نگاہ میں خودی ہی وہ طاقت ہے جس کے بل بوتے پر انسان زندگی کی بھرپور

رعنائیوں سے بھرپور طور پر لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ یہی وہ طاقت ہے جس کے زور پر انسان اپنی عزت اور آبرو قائم رکھ سکتا ہے۔ اگر خودی مستحکم رہے تو سمجھ لو کہ شہنشاہی مل گئی اور اگر خودی زائل ہو گئی تو مقدر میں روسیاہی کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔

عزت آبرو سب کچھ ختم سمجھو ؎

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات — تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

۳۔ نہ دیا نشانِ منزل، مجھے اے حکیم تو نے — مجھے کیا گلہ ہے تجھ سے تو نہ رہ نشیں نہ راہی

مشکلات: نشانِ منزل: منزل کا پتہ۔ حقیقت کا پتہ رہ نشیں: راستے پر بیٹھنے والا۔

اقبال ایک فلسفی تھے۔ انہوں نے دنیا بھر کے حکما یعنی فلسفیوں کا مطالعہ کیا تھا۔ مگر ان میں سے کسی کو راہِ حقیقت پر نہ پایا۔ سب بھول بھلیوں میں اُلجھ گئے تھے۔ جرمن فلسفی نٹشے کے متعلق وہ اتنا کہتے ہیں کہ بیچارہ قلبِ اور مومن حاکش کا فراست۔ چنانچہ اس کے متعلق اپنے ایک شعر میں کہتے ہیں ؎

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں — تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

اوپر کے شعر میں جو نشانِ منزل اور راہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ تو منزل یہی مقامِ کبریا ہے اور اس منزل کو جانے والے راستے سے حکیم لوگ ناواقف ہیں۔ لیکن اقبال ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ فلسفیوں کا اس میں زیادہ قصور بھی نہیں۔ وہ عقل کو رہنما بناتے رہے۔ جو خود کور چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے اس لئے فلسفی مقامِ کبریا کی طرف جانے والے راستے کے قریب تک نہ پہنچ سکے۔ نہ وہ اس منزل کے راہی نہ اس راستے کے شناسا۔ وہ اس منزل پر کیسے پہنچتے۔

۴۔ یہ معاملے ہیں نازک جو تری رضا ہو تو کر — کہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریقِ خانقاہی

مشکلات:۔ رضا: مرضی خوش نہ آیا: پسند نہ آیا۔

اقبال طریقِ خانقاہی، راہبی اور رشد و ہدایت کی موجودہ گدیوں سے مطمئن نہیں ہیں۔ ان میں ہزار خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں۔ حتیٰ کہ اگر حضرت داتا گنج بخشؒ خود دوبارہ زندگی پا کر اپنے مزار کی حالت دیکھتے تو وہاں جو کچھ ہو رہا ہے اُسے قطعاً گوارا نہ کرتے مگر یہ بڑا نازک مسئلہ ہے کہ عقیدت مند ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ جیسے کہ اقبال نے حافظ شیرازی کی بے عملی کو اپنی مثنوی میں ہدفِ تنقید بنایا تو پیرانِ عظام نے ایک محاذ قائم کر لیا۔ مسئلے کی اس نزاکت کے پیشِ نظر اقبال کہتے ہیں کہ اے

مسلمان! تو جو چاہے کر میں تجھے روکتا نہیں ہوں۔ مگر مجھے یہ طریقہ پسند نہیں آیا ہے کہ اس سے مسلمان بے عمل ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ اسلامی روح کے خلاف ہے۔

۵۔ تو عرب ہو یا عجم ہو ترا لا الٰہ الا اللہ لغتِ غریب جب تک ترا دل نہ دے گواہی

مشکلات:۔ لا الٰہ الا اللہ: عقیدۂ توحید لغتِ غریب: اجنبی سے غیر مانوس الفاظ

اقبال کو مسلمانوں سے شکوہ ہے کہ وہ زبان سے لا الٰہ الا اللہ کا اعلان کر کے توحید کا اقرار کرتے ہیں مگر دل سے اس کی تصدیق نہیں کرتے۔ ایسی صورت میں یہ الفاظ یعنی کلمۂ توحید اپنے اصلی معنی کھو کر عجیب اور اجنبی الفاظ کا مجموعہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ کے ساتھ ساتھ تَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ بہت ضروری ہے۔ جیسے جاوید نامہ میں فرماتے ہیں ع لا اللہ گوئی؟ بگو از روئے جاں۔ اگر ہم سچے دل سے اس بات پر یقین کریں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں تو ہمیں اس عقیدہ پر عمل کر کے دکھانا چاہئے۔ اور کسی لات و منات اور کسی غیر اللہ کے سامنے نہیں جھکنا چاہئے۔

رضا علی وحشت کلکتوی

(۱۸۸۰ء ——— ۱۹۶۵ء)

غزل نمبر ۱

۱۔ چمن کا ذوق ہے لیکن چمن کہاں دیکھا قفس میں ہم نے بہت خوابِ آشیاں دیکھا

مشکلات:۔ چمن کا ذوق: باغیچے سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت

اس شعر میں شاعر نے یہ بات کہنے کی کوشش کی ہے کہ ع

اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

ایک ایسے بلبل کی بات ہے جو ابھی زندگی کی بہاروں سے لطف آشنا ہی نہیں ہوا تھا کہ گرفتار ہو گیا اور اس وقت سے قفس میں بند ہے۔ کہتا ہے کہ مجھ میں باغ کی رنگینیوں اور آزادیوں سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت تو موجود ہے۔ میں اس ذوقِ لطف سے محروم نہیں ہوں۔ مگر باغ میرے نصیب میں لکھا ہی نہیں۔ میں تو اس وقت سے باغ کی لطف اندوزیوں سے محروم ہوں۔ جس وقت مجھے ابھی شعور بھی نہیں ملا تھا۔ (البتہ خوابوں اور خیالوں میں میں آشیاں اور باغ کا تصور اپنے دماغ میں قائم کرتا رہا ہوں

۲- سبک سری سے جوان کے قدم پہ سر رکھا یہی ہوا کہ انہیں اور سرگراں دیکھا

مشکلات:- سبک سری: کم حوصلگی سرگراں: خفا

سبک سر اور سرگراں لفظی رعایت کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ ورنہ ان میں معنوی تعلق نہیں ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ محبوب مجھ پر مہربان نہیں ہوتا تھا۔ ادھر میرا حوصلہ جواب دے چکا تھا۔ مزید صبر کی تاب نہیں تھی۔ اس بے حوصلگی کے عالم میں میں نے محبوب کے قدموں پر سر رکھ دیا کہ شاید اس طرح اس کے دل میں رحم آئے۔ مگر افسوس کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ خفا ہو گیا۔ یہ بات اسے بہت ہی ناگوار گزری۔ غالب نے پاسباں کے قدم چوم کر اپنا بھرم کھویا تھا ؎

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

۳- بس ایک شغل کی حاجت ہے ایسے فرزاں کو کسی نے کب اثر نالہ و فغاں دیکھا

شاعر کا تجربہ ہے کہ عشق کی دنیا میں نالہ و فریاد کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ کب اثر دیکھا؟ سوالیہ انداز ہے۔ یعنی کچھ نہیں دیکھا تو پھر عاشق لوگ نالہ و فریاد کیوں کرتے ہیں۔ یونہی اپنے جی کا کیوں زیاں کرتے ہیں۔ اس کا جواب شاعر کی طرف سے یہ ہے کہ ان بے چاروں کو اپنی بے چینی دور کرنے کے لئے ایک مصروفیت اور ایک شغل کی ضرورت ہے۔ جتنے لمحات وہ آہ و فغاں میں بسر کرتے ہیں غم کو کچھ بھول جاتے ہیں۔ ورنہ محبوب پر آہ و فغاں کا کبھی اثر نہیں ہوتا۔

۴- سب اپنے اپنے خیالات میں ہیں سرگرداں نہ ہم سخن کوئی پایا نہ ہم زباں دیکھا

مشکلات:- سرگرداں: آوارہ- حیران ہم سخن: ہم کلام

سب لوگ اپنے اپنے حالات میں سرگرداں اور گم ہیں۔ میری بات کوئی سمجھ ہی نہیں پاتا میں بات کس سے کروں۔ میں نے اس دنیا میں کسی کو اس قابل نہ پایا کہ وہ رموزِ عشق سمجھ سکے۔ میری زبان رموزِ عشق کی زبان ہے۔ حالی نے کہا تھا ؎

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

یہ "اپنی زبان" واردات عشق کی زبان ہے۔ جسے وہی سمجھے جو ان واردات میں سے گزرا ہو۔

۵- رہا نہ پھر میرے دل میں خیال آزادی قفس کو میں نے جو ہم رنگ آشیاں دیکھا

مشکلات:- ہم رنگ آشیاں: آشیاں جیسے رنگ والا۔

میں گرفتار ہو کر بہت تڑپا۔ مگر کچھ بن نہ پایا۔ مجھے اپنے آشیاں سے محروم ہونے کا بہت

دکھ تھا۔ مگر بے بس تھا۔ پھر پھڑپھڑایا مگر بے کار۔ بالآخر صیاد نے مجھے قفس میں ڈال دیا۔ اس کا رنگ وہی تھا جو میرے آشیاں کا تھا۔ اس مشابہت سے مجھے کچھ اطمینان ہوا۔ کہ چلو میرے آشیاں کی کوئی خصوصیت تو اس میں بھی موجود ہے۔ اس طرح میں نے اپنے دل کو سمجھا لیا۔ اور خیالِ آزادی دل سے نکال دیا۔ یہ مضمون کچھ عجیب سا ہے۔ غالب نے دامِ ہم رنگِ زمیں کا ذکر کیا ہے جو بہت مناسب ہے۔ کوئی معقول مناسبت نظر نہیں آتی۔

۶۔ نہ اپنے درد کا دکھ ہے نہ غم کا غم مجھ کو شاد اپنا دل ہوا تم کو جو شاداں دیکھا

شاعر کہتا ہے کہ میں درد آشنا ہوں مگر مجھے اپنے درد کا اتنا احساس نہیں۔ غمگین ہوں۔ مگر میں نے اپنے آپ کو غم میں ڈبو نہیں دیا ہے۔ اپنے درد و غم کے باوجود جب میں محبوب کو خوش و خرم اور شاداں دیکھتا ہوں تو میرا دل خوش ہو جاتا ہے میں اپنے سارے غم بھول جاتا ہوں ؎

تجھے دیکھا شگفتہ کھل گیا دل تجھے دیکھا فسردہ کھو گیا دل

۷۔ سرورِ دل میں ہے وحشت تو نور آنکھوں میں نہ دیکھ کر اسے کہتا ہوں میں کہ ہاں دیکھا

وحشت کہتے ہیں کہ محبوب میرے دل میں سرور کی مانند موجود ہے۔ اور ہر وقت موجود ہے۔ اس کا دیدار مجھے میسّر نہ بھی آئے۔ تو بھی میں بجا طور پر کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اسے دیکھا۔ جب تک میری آنکھوں میں نور ہے میں یہی سمجھوں گا کہ میں نے اسے دیکھا کہ میں اسے آنکھوں کا نور سمجھتا ہوں۔ جب تک میرے دل میں سرور عشق ہے اس وقت تک میں یہی سمجھوں گا کہ میں نے اسے دیکھا کہ وہ سرور بن کر میرے دل میں سما گیا ہے۔

غزل نمبر ۲

۱۔ کسی طرح دن تو کٹ رہے ہیں فریبِ امید کھا رہا ہوں ہزار نقشِ آرزو کے بنا رہا ہوں مٹا رہا ہوں

شاعر امید کے سہارے زندہ ہے۔ مگر اسے بھی مایوسی کے عالم فریبِ امید کہا ہے کہ امید کبھی پوری نہیں ہوتی۔ پھر بھی انسان امید کے سہارے زندہ ہے شاعر کی بھی یہی کیفیت ہے کہ امیدوں کا سہارا لے کر حصولِ مقاصد کی کوشش کی۔ ہر بار ناکام رہا مگر پھر بھی امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ تاہم امیدیں پوری نہ ہوئیں اس لئے اپنی کیفیت کو "فریبِ امید کھانا" کہا۔ اس طرح ہر روز ہزاروں آرزوئیں دل میں جنم لیتی ہیں اور پھر مٹ جاتی ہیں۔

کبھی کسی آرزو کی تکمیل کی نوبت نہیں آئی۔

ارادے باندھتا ہوں سوچتا ہوں توڑ دیتا ہوں کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ایسا نہ ہو جائے

۲۔ زمانہ بھی مجھ سے ناموافق ہیں آپ بھی دشمن سلامت۔ تعجب اس کا ہے بوجھ کیونکر میں زندگی کا اٹھا رہا ہوں

جن حالات کا شاعر کو سامنا ہے ان کی تصویر کچھ یوں ہے کہ یورا زمانہ ناموافق اور زمانے کے حالات اس کے ناسازگار ہیں۔ ایسے عالم میں اگر محبوب کا التفات میسر ہوتا تو عاشق کو پروا نہ ہوتی۔ مگر ماشاءاللہ وہ بھی دشمن سلامت ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ محبوب بھی زندہ دشمن ہے۔ اور کسی طرح میرا بھلا نہیں چاہتا۔ ایسے نامساعد حالات میں شاعر خود تعجب کرتا ہے کہ میں کیسے زندگی کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہوں۔ ایسے ناسازگار حالات میں انسان کو دم توڑ دینا چاہیئے۔ مگر حیرانی ہے کہ میں کیسے زندہ ہوں۔

۳۔ نہ ہو مجھے جستجوئے منزل مگر ہے منزل مری طلب میں۔ کوئی تو مجھ کو بلا رہا ہے کسی طرف تو میں جا رہا ہوں

میں تھک ہار کر منزل کی جستجو ترک کر چکا ہوں۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منزل خود میری طلب میں ہے۔ منزل کی خواہش ہے کہ میں وہاں پہنچوں۔ میں کسی جانب جا رہا ہوں۔ ترک جستجو کے باوجود میں کسی جانب گامزن ہوں۔ یقیناً کوئی طاقت مجھے اپنی طرف بلا اور کھینچ رہی ہے۔ میری خوش نصیبی کہ خود منزل مجھے اپنی طرف کشاں کشاں لئے جا رہی ہے۔

۴۔ یہی تو ہے نفع کوششوں کا کہ کام سارے بگڑ رہے ہیں۔ یہی تو ہے مدعا کہ اشک حسرت بہا رہا ہوں

شاعر اپنی خواہشات اور ان کی تکمیل کے لئے اپنی تگ و دو کا انجام نہایت حوصلہ فرسا پاتا ہے۔ اس لئے طنز آمیز طریقے سے کہہ رہا ہے کہ میری کوششوں کا کیا حوصلہ افزا نتیجہ نکلا ہے کہ میرے سارے کام بگڑ گئے ہیں اور میری خواہشوں کا خوشگوار انجام ہوا ہے کہ میں حسرت و ارمان کے آنسو بہا رہا ہوں۔ یعنی میں نے زندگی میں اپنی تمناؤں کو شرمندۂ تعبیر ہوتے نہ دیکھا۔ ہمیشہ ناکامیوں اور حسرتوں کو سامنے پایا ہے۔ کیا آرزو اور کوشش کا یہی فائدہ ہے اور کیا ان کا یہی حشر ہونا چاہیئے۔

۵۔ خدا ہی جانے یہ سادہ لوحی دکھائے گی کیا نتیجہ وحشت۔ وہ جتنی الفت گھٹا رہے ہیں اتنی ہی میں بڑھا رہا ہوں

غالب نے کہا تھا ؎ ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

عشق و محبت دو طرفہ ہوتی ہے۔ یک طرفہ عشق کوئی حیثیت نہیں رکھتا کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ یہ ایک مقناطیسی کشش ہے جو قطبین یعنی عاشق اور محبوب میں باہم ہوتی ہے۔ عاشق اپنی طرف کھینچے اور محبوب بے نیاز ہو تو یہ کوئی عشق نہیں ہے وحشت کو بظاہر محبوب کے طرز عمل سے ایسا ہی لگا ہے کہ وہ اب آہستہ آہستہ سرد مہر ہوتا جا رہا ہے۔

اور محبت کی سرگرمی اس میں دھیمی پڑتی جا رہی ہے۔ مگر کہتا ہے کہ میں کتنا سادہ لوح ہوں کہ اس پر بھی میری محبت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی کم آمیزی اور میری گرم آمیزی نہ جانے کیا نتیجہ دکھائے گی۔ میں بھی کیا سادہ لوح ہوں کہ ایسی صورتِ حال پر بھی زورِ شوق بڑھتا جا رہا ہوں۔

حفیظ جالندھری

غزل نمبر ۱

۱- وہ قافلہ آرام طلب ہو بھی تو کیا ہو آوازِ نفس ہی جسے آوازِ درا ہو

مشکلات:- آوازِ نفس: سانس کی آواز آوازِ درا: اس گھنٹی کی آواز جو قافلے کی روانگی پر بجائی جاتی ہے۔

پرانے زمانے میں سفر اور مواصلات کی سہولتیں نہیں تھیں۔ راستے پُرخطر ہوتے تھے۔ لوگ قافلوں کی صورت میں سفر پر روانہ ہوتے تھے۔ قافلہ سالار پورے قافلے کی حفاظت اور روانگی، قیام وغیرہ کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ بعض اوقات قافلے سینکڑوں افراد پر مشتمل ہو کر پڑاؤ کی صورت دور دور تک پھیلے ہوتے تھے۔ اس لئے کوچ کے وقت ایک گھنٹی بجائی جاتی تھی کہ روانگی کے لئے سامان سمیٹ لو۔ یہ گھنٹی گویا ان کے لئے اگلی منزل کو حرکت اور روانگی کی علامت ہوتی تھی۔ اس شعر میں شاعر نے قافلۂ حیات کا ذکر کیا ہے کہ اگر چند زندگی کے قافلے میں شامل لوگ آرام طلب اور تن آسان ہیں۔ لیکن قافلہ اپنی طرف سے ہر وقت رواں دواں ہے۔ کیونکہ اس کے لئے سانس کی آواز ہی روانگی کی آواز بن جاتی ہے۔ یعنی ہم زندگی آرام طلبی میں گزار دیں یا حرکت و عمل میں۔ دونوں صورتوں میں زندگی رکنے والی چیز نہیں ہے۔ یہ ہر وقت رواں دواں ہے۔ اگر ہم حرکت و عمل سے اس کی روانی کا ساتھ دے سکیں تو ہمارا فائدہ ہے ورنہ اس کی رواروی میں کئی تو میں کچلی گئی ہیں۔

۲- خاموش ہو کیوں دردِ محبت کے گواہو دعوے کو نبا ہو مرے نالو! مری آہو!

شاعر درد و عشق میں مبتلا ہے۔ اسے سچے عشق کا دعویٰ ہے۔ دعوے کے ثبوت میں شہادتیں پیش کی جاتی ہیں۔ شاعر کے پاس بھی گواہ ہیں۔ اس لئے گواہوں کو پکارتا ہے۔ پکار کر

کہہ رہا ہے کہ آؤ اور میرے دعوئ عشق کی صداقت کی شہادت دو۔ گواہ خود عاشق کے نالے اور آہیں ہیں۔ جو ہمیشہ دردِ عشق اور دردِ نہانی کی غمازی کرتی ہیں۔ شاعر چاہتا ہے کہ نالے بیا کرے اور آہیں بھرے تاکہ اس کے جذبۂ عشق کی سرگرمی کا اظہار ہو۔ ویسے تو دردِ عشق کے اظہار کی اجازت نہیں کہ اس سے رسوائی ہوتی ہے۔ شاعر نے آہ و نالہ کرنے کی ایک نئی ترکیب نکالی کہ انہیں اپنے دعوے کا گواہ بنالیں۔

۳۔ ہر روز جو سمجھ نے چلے آتے ہیں ناصح میں پوچھتا ہوں تم مجھے سمجھے ہوئے کیا ہو

ناصح داستانِ عشق کا ایک کردار ہے۔ جو عاشق کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ کبھی وعظ و تلقین کرتا ہے۔ کبھی ہمدردی کرتا ہے۔ کبھی علاج کرتا ہے۔ اس لئے اسے مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ جیسے ناصح، مونس، غم خوار، چارہ گر وغیرہ۔ انسانی نفسیات کا تقاضا ہے کہ جو چیز اسے کثرت سے اور بار بار میسر آئے وہ اس سے اکتا جاتا ہے۔ ناصح اپنی ہمدردی کی وجہ سے ہر روز عاشق کو سمجھاتا رہتا ہے۔ بالآخر شاعر اکتا جاتا ہے اور غضبناک ہو کر اُسے اس بات سے منع کرتا ہے۔ "تم مجھے سمجھے ہوئے کیا ہو" کا جملہ اس کے غصّے کی غمازی کر رہا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میں جذبۂ صادق رکھتا ہوں تم اسے ترک کرنے کو کہتے ہو۔ ایسا کبھی ہو سکتا ہے۔ تم مجھے ہوس پرست سمجھے ہوئے ہو۔

۴۔ اس دارِ بقا میں مری صورت کوئی دیکھے اک دم کا بھروسہ ہے جو اک دم میں فنا ہو

دارِ بقا: باقی رہنے والا مقام۔ مقامِ حیات۔ دنیا

یہ جہان مقامِ زندگی ہے۔ یہ زندگی کی جولاں گاہ ہے۔ اس لئے اسے دارِ بقا کہا۔ مگر اصل میں یہ دارِ فنا ہے۔ اس لئے جلد ہی دوسرے معرعے میں اس کی فنا پذیری اور بے ثباتی کا ذکر کر دیا۔ شاعر کہتا ہے کہ یہ دنیا زندگی کا محل ہے۔ یہاں زندگی مختلف شکلوں میں کارفرما ہے۔ مگر اسے قرار حاصل نہیں ہے۔ یہ ایک دم کی زندگی ہے اور اس ایک دم کا بھی بھروسہ نہیں ہے۔ وہ ایک دم میں فنا ہو سکتی ہے۔ زندگی کو ایک دم کی زندگی کہا اور پھر یہ کہا کہ ایک دم میں ختم ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہوا کہ زندگی کا وجود ایک دم کا بھی نہ ہوا۔ میری حالت دیکھ لو ایک دم کی زندگی کا بھروسہ ہے جو ایک ہی دم میں ختم بھی ہو سکتی ہے۔ سو اس ایک دم کا بھی بھروسہ نہ ہوا۔

۵۔ مجھ کو نہ سنا خضر و سکندر کے فسانے میرے لئے یکساں ہے فنا ہو کہ بقا ہو

خضر و سکندر تلمیحی اشارہ ہے۔ دو روایتی شخصیتوں کی طرف کہ سکندر آبِ حیات کی تلاش میں نکلے۔ تاکہ اس سے سیراب ہو کر حیاتِ جاوداں پائیں۔ راستے میں حضرت خضر

ملے۔ جو بھولے بھٹکوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا تم یہاں ٹھہرو میں آبِ حیات تلاش کر کے تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا۔ حضرت خضر کسی نہ کسی طرح چشمۂ آبِ حیواں پر پہنچے۔ پانی سے سیراب ہو کر حیاتِ جاوداں پائی۔ مگر سکندر کا پتہ نہ لیا۔ سکندر طبعی موت مرا۔ یہ سکندر یونانی بادشاہ نہیں ہے۔ یہ اور شخصیت ہیں۔ پہلے مصرع میں خضر اور سکندر کا ذکر کیا دوسرے مصرعے میں ان کی نسبت سے الٹی ترتیب میں فنا اور بقا کا ذکر کیا۔ فنا کا تعلق سکندر سے اور بقا کا تعلق خضر سے ہے۔ اسے صنعتِ لف و نشر مکوس کہتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے۔ مجھے سکندر اور خضر کا فسانۂ آبِ حیات مت سناؤ۔ میری نگاہ میں فنا اور بقا ایک ہی چیز ہیں۔ اگر خضر نے حیاتِ جاوداں پائی۔ تو اس سے بھی کیا فرق پڑتا ہے۔ اس فنا پذیر دنیا میں حیاتِ دوام بھی فنا کی حیثیت رکھتی ہے۔

غزل نمبر ۲

۱۔ وہ سرخوشی دے کہ زندگی کو شباب سے بہرہ یاب کر دے۔ مرے خیالوں میں رنگ بھر دے مرے لہو کو شراب کر دے

مشکلات:۔ سرخوشی: نشہ۔ سرور شباب: جوانی بہرہ یاب: حصہ پانے والا۔ خوش نصیب خیالوں میں رنگ بھرنا: جوانوں کی طرح رنگین خیالات ہونا۔

حفیظ اس پیری میں بھی جوان ہے۔ ذہنی طور پر اس کا شباب قائم ہے۔ اس لئے اس کے جذبات بڑھاپے میں مضمحل اور پژمردہ نہیں ہوئے بلکہ ابھی تک جوانوں کی طرح زندہ و جواں ہیں۔ وہ خدا سے دعا مانگ رہے ہیں۔ کہ مجھے وہ سرور عطا کر جو میری زندگی کو اس پیری میں جوانی کا رنگ بخشے۔ ایسا سرور جو میرے خیالوں میں وہ رنگ اور رعنائی بھر دے جو شباب کا ہی حصہ ہوتی ہے۔ وہ سرور جو میری رگوں میں دوڑنے والے خون کو ہی شراب بنا کر تیز تر کر دے۔ شراب سے گردشِ خون تیز ہو جاتی ہے۔ اور گردشِ خون تیز ہونا بہ شباب اور توانائی کی علامت ہے۔ یعنی مجھے اس پیری میں وہ سب کچھ عطا کر دے جس سے میں جوانوں کی طرح توانائی اور حرکت کا حامل ہو جاؤں۔

۲۔ حقیقتیں آشکار کر دے عمل قلب و جگر کو بیتاب کر دے۔ ہر ایک ذرہ یہ کہہ رہا ہے کہ مجھے آفتاب کر دے

اللہ تعالیٰ کی یہ کائنات عجیب پراسرار مادی جہان ہے کہ اس میں اتنا کچھ پوشیدہ اور نہاں ہے کہ ہماری عقلِ محدود سارے پوشیدہ راز تو کجا ان کی ایک حقیر کسر بھی دریافت نہیں کر سکی۔ ورنہ کائنات کے ہر ذرے میں ایک جہان پوشیدہ ہے جیسے اقبال نے کہا تھا ؎

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو ہر خورشید کا پیکے اگر ذرے کا دل چیریں

ہمارا کائنات کو شمس کی نسبت سے شمسی کائنات کہتے ہیں۔ سورج اس میں مرکزی اور بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر کائنات کے ہر ذرے میں شمسی کائنات کا سا جہاں چھپا ہوا ہے حفیظ کہتے ہیں۔ یا خدا سارے سربستہ راز کھول دے تاکہ ہم پر ہر چیز کی حقیقت اور صداقت واضح ہو جائے۔ ہر ذرہ کہہ رہا ہے کہ مجھے سورج بنا دو کہ میں اپنے اندر سورج کی سی توانائی چھپائے ہوئے ہوں۔ کیوں نہ اسے بڑے کام لایا جائے۔

۳۔ یہ خوب کیا ہے یہ زشت کیا ہے جہاں کی اصلی سرشت کیا ہے

بڑا مزہ ہو تمام چہرے اگر کوئی بے نقاب کر دے

مشکلات:۔ خوب: اچھا۔ زشت: بُرا۔ سرشت: فطرت۔ اصلیت

دنیا میں اچھی اور بری اقدار کی تمیز کی جاتی ہے۔ اچھی اقدار کی ترویج اور بری اقدار کو ترک کرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ بُرے لوگوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور اچھے لوگوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ مگر شاعر کہتا ہے کہ سب بناوٹ ہے کون اچھا ہے اور کون بُرا اس کا معیار یہ نہیں ہے کہ دنیا میں کسی کی اچھائی یا برائی کے متعلق کیا تصورات اور خیالات پائے جاتے ہیں۔ کیونکہ بُرے لوگ ہمیشہ اچھائی کا روپ دھار کر زندگی کی سٹیج پر ابھرتے ہیں۔ جیسے فارسی شاعر نے کہا ہے ؎

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند چوں بخلوت می روند ایں کار دیگر می کنند

اس لئے یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ کون اچھا اور کون بُرا ہے۔ اگر ایسی صورت حال پیدا ہو جائے کہ ہر انسان کے اندر کا چھپا ہوا انسان بے نقاب اور بے پردہ ہو جائے تو بڑا ہی مزا آئے۔ کہ بڑے بڑے نیک نام لوگوں کی اصلیت ظاہر ہو جائے گی۔

۴۔ کہو تو رازِ حیات کہہ دوں حقیقتِ کائنات کہہ دوں

وہ بات کہہ دوں کہ پتھروں کے جگر کو بھی آب آب کر دے

مشکلات:۔ پتھروں کے جگر کو آب آب کرنا: پتھروں کو پگھلا کر سیال بنا دینا۔ خوفزدہ ہونا۔ اثر لینا۔

زندگی کھلے آئینہ کی طرح روشن ہونے کے باوجود ایک راز سربستہ ہے۔ کتابِ کائنات کے اوراق ہمارے مطالعہ کے لئے ہمیشہ کھلے ہیں۔ مگر پھر بھی کائنات ایک گتھی ہے جسے ہم نہیں سمجھا سکے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ میں رازِ حیات کا راز داں ہوں۔ میں حقیقتِ کائنات کا شناسا ہوں مگر یہ راز سینے میں ہی محفوظ رہے تو بہتر ہے اگر اسے فاش کیا جائے۔

تو نظامِ کائنات درہم برہم ہو جائے۔ اگر میں رازِ حیات کھول کر بیان کر دوں تو پھر اس کی تاب نہ لا سکیں گے۔ ان کے جگر پگھل کر بہہ نکلیں گے۔ پتھر کا پگھلنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ رازِ حیات ایک ایسی غیر معمولی بات ہے کہ اس کے افشا کرنے سے دنیا کا کوئی وجود اس صدمے کی تاب نہ لا سکے گا۔

۵۔ خلافِ تقدیر کر رہا ہوں پھر ایک تقصیر کر رہا ہوں۔ پھر ایک تدبیر کر رہا ہوں خدا اگر کامیاب کر دے پھر ایک تقصیر کر رہا ہوں۔ اس جملے میں "پھر" قابلِ غور ہے یعنی اس سے پہلے بھی کوئی خطا سرزد ہو چکی ہے۔ یہ ایک تلمیحی اشارہ ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے جنت میں شجرِ ممنوعہ کو ہاتھ لگا دیا تھا۔ اس کی پاداش میں جنت سے نکال دیئے گئے اور ارض کو ان کا مسکن بنا دیا گیا۔ اس وقت سے اب تک نسلِ آدم جنت سے محرومی میں زندگی بسر کر رہی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ایک غلطی کا خمیازہ ابھی پورا نہیں ہوا ہے کہ میں پھر ایک خطا کاری پر آمادۂ کار نظر آتا ہوں کہ میں تقدیر کے خلاف تدبیریں کر کے اس سے برتر آ رہا ہوں۔ یہ اشارہ موجودہ سائنسی ترقی کی طرف ہے۔ انسان موجودہ سائنسی ترقی کی رو میں بہہ کر اپنی حیثیت کو بھول گیا ہے۔ یہ بھی بھول گیا ہے کہ اصل تقدیر کا مالک خدا ہے موجودہ انسان اپنی تقدیر کا خود مالک بنتا جا رہا ہے۔ دیکھیے کامیاب ہوتا ہے یا اسے پھر سزا ملتی ہے۔

۶۔ ترے کرم کے معاملے کو ترے کرم پر چھوڑتا ہوں۔ مری خطائیں شمار کر لے مری سزا کا حساب کر لے

مشکلات:۔ کرم: بخشش۔

انسان فطری طور پر خطا کار ہے اور اللہ تعالیٰ خطا پوش ہو کر بخش دیتا ہے۔ شاعروں نے اس مضمون پر عجیب نکتے پیدا کئے ہیں مثلاً

بخش مجھے خالق نے فرشتوں سے یہ کہہ کر ۔۔۔ جرم اس نے کئے تھے مجھے غفار سمجھ کر

یا اے رحمتِ خدا مجھے اپنا نہیں خیال ۔۔۔ تیرے لئے گناہ کئے جا رہا ہوں میں

حفیظ بھی یہی بات کہہ رہے ہیں۔ انداز مختلف ہے۔ خدا سے استدعا کرتے ہیں۔ کہ میرا تعلق اُن خطاؤں سے ہے جو مجھ سے سرزد ہوئیں۔ اس لئے ان کا حساب کر کے میری سزا کا حساب کر دو۔ جہاں تک بخشش و کرم کا تعلق ہے۔ وہ تیرا معاملہ ہے اس میں تو جو چاہے کر۔ میرا اس میں کوئی دخل نہیں۔ کیا تجاہلانہ انداز ہے خدا کی بخشش مانگنے کا۔

میر انیس

(۱۸۰۱ء ـــــ ۱۸۷۴ء)

حالاتِ زندگی

نام : ببر علی۔ تخلص۔ انیس۔ ۱۸۰۱ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی زندگی فیض آباد میں ہی حاصل کی۔ فارسی عربی اپنے والد میر خلیق سے پڑھی۔ علوم مروجہ میں میر نجف علی سے مہارت بہم پہنچائی ـــــ اس زمانے کی عام روش کے مطابق انہیں فنِ سپہ گری اور گھوڑسواری کی تربیت دی گئی۔ میر انیس کی صحت بہت اچھی تھی اور انہیں ورزش کا شوق تھا۔

میر انیس کے والد بلکہ ان کا پورا گھرانہ شعر گو تھا۔ خاندانی اثرات اور ماحول و فضا کے زیر اثر وہ بچپن ہی میں شاعری کرنے لگے۔ ابتدا میں زمانے کے عام رجحان کے مطابق غزل کہنے لگے، پھر والد کی ہدایت پر مرثیے کی طرف متوجہ ہوئے والد کے ساتھ مشاعروں اور مجلسوں میں جانے لگے۔ کبھی کبھی لکھنؤ آتے اور مشاعروں میں شریک ہوتے تاہم ان کی شہرت فیض آباد تک محدود تھی ـــــ اس کے بعد وہ فیض آباد کو چھوڑ کر مستقلاً لکھنؤ میں سکونت پذیر ہو گئے۔ یہاں مجالس میں شریک ہو کر مرثیے پڑھنے لگے جس سے انہیں شہرت ملی۔ اس زمانے میں لکھنؤ میں مرزا دبیر کی بڑی دھوم تھی۔ میر انیس دیکھتے ہی دیکھتے ان کے حریف بن گئے۔ اور لکھنؤ میں "انیسیے" اور "دبیریے" کے نام سے دو مستقل گروہ بن گئے۔ میر انیس کا مرثیہ پڑھنے کا انداز منفرد تھا۔ ان کی آواز میں ایسا جادو تھا کہ ساری مجلس پر ایک کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ انہوں نے مرثیہ خوانی کو انتہائی بلندی تک پہنچا دیا۔

میر انیس خاموش طبع، خوش اخلاق اور خوددار انسان تھے۔ لکھنؤ آنے کے بعد بہت کم باہر گئے۔ ساری عمر وہیں گذاری۔ آخر کار ۱۸۷۴ء میں تقریباً ایک سال بیمار رہ کر اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔

نمودِ صبح

تعارف میر انیس اردو کے معروف شاعر ہیں، ان کی شہرت کا بڑا سبب مرثیہ نگاری ہے انہوں نے کربلا اور شہادت امام حسین رضی اللہ عنہ کے دلدوز واقعات کو بڑے مؤثر انداز میں شعری پیکر میں ڈھالا ہے۔

زیر مطالعہ نظم "نمودِ صبح" ان کے ایک طویل مرثیے کا ایک ٹکڑا ہے جس میں آمد صبح کے منظر کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ نظم مسدس شکل میں ہے۔ مسدس نظم وہ ہوتی ہے جس کا ہر بند چھ مصرعوں پر مشتمل ہو۔

مرکزی خیال طلوع صبح کا حسین منظر اپنی دلکشی، دلفریبی اور لطافت کے سبب اپنی مثال آپ ہے۔ انسان ہی نہیں، زمین و آسمان اور تمام عناصر کائنات اس خوش نما منظر کو دیکھ کر ذکر الٰہی میں مصروف ہیں۔

(۱) طے کر چکا جو منزلِ شب کاروانِ صبح
ہونے لگا افق سے ہویدا نشانِ صبح
گردوں سے کوچ کرنے لگے اخترانِ صبح
ہر سو ہوئی بلند صدائے اذانِ صبح
پنہاں نظر سے روئے شبِ تار ہو گیا
عالم تمام مطلعِ انوار ہو گیا!

مشکلات: کاروانِ صبح، صبح کا قافلہ سالار، وہ جگہ جہاں زمین و آسمان ملتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ہویدا، ظاہر، گردوں، آسمان، اخترانِ صبح، صبح کے ستارے۔ روئے شبِ تار، تاریک رات کا چہرہ، مطلعِ انوار، نور کے ظاہر و روشن ہونے کی جگہ۔

تشریح: رات ختم ہونے کو تھی، صبح کے قافلے نے رات کی ساری منازل طے کر لیں تو افق سے صبح کا نشان ظاہر ہونے لگا۔ یعنی صبح کی روشنی نمودار ہونا شروع ہوئی، صبح کے ستارے آسمان سے رخصت ہونے لگے اور فضا میں نماز فجر کے لیے اذان کی صدا بلند ہوئی روشنی بڑھتی گئی اور تاریکی کا چہرہ غائب ہوتا گیا۔ یعنی سورج طلوع ہونے والا تھا، صبح قریب تھی۔

(۲) یوں گلشنِ فلک سے ستارے ہوئے رواں
چن لے چمن سے پھولوں کو جس طرح باغباں
آئی بہار میں گلِ مہتاب پر خزاں

مرجھا کے گر گئے ثمرِ شاخِ کہکشاں
دکھلائے طور بادِ سحر نے سموم کے
پژمردہ ہو کے رہ گئے غنچے نجوم کے

مشکلات:۔ گل مہتاب۔ چاند کا پھول، مراد ہے چاند۔ کہکشاں، باریک تاروں کی ایک لمبی لکیر جو آسمان پر شمالاً جنوباً پھیلی ہوتی ہے۔ طور، طریقے۔ بادِ سحر، صبح کی ہوا۔ سموم، گرم ہوا پژمردہ، مرجھائے ہوئے۔

تشریح:۔ جوں جوں مشرق پر سورج کی روشنی بڑھتی گئی تارے ایک ایک کر کے آسمان سے رخصت ہونے لگے۔ یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے باغبان، پھولوں کو ایک ایک کر کے جمع کرتا جا رہا ہے۔ عین موسم بہار میں گل مہتاب پر خزاں چھا گئی۔ مراد ہے سورج کی روشنی میں چاند ماند پڑ گیا (غروب ہو گیا) کہکشاں کی شاخیں اور پھول بھی مرجھا گئے۔ یعنی چھوٹے تارے بھی نظروں سے غائب ہو گئے۔ صبح کی ہوا پودوں اور پھولوں کے لئے عام طور پر نئی زندگی کا پیغام لاتی ہے مگر تاروں کے غنچوں کے لئے یہ ہوا گرم ثابت ہوئی اور وہ مرجھا کر رہ گئے۔ یعنی غائب ہو گئے

(۳) چھٹنا وہ ماہتاب کا وہ نور کا ظہور
یادِ خدا میں زمزمہ پردازیِ طیور
وہ رونق وہ سرور ہوا وہ فضا وہ نور
خنکی ہو جس سے چشم کو اور قلب کو سرور
انسان زمین پر تھا، ملک آسمان پر
جاری تھا ذکر قدرتِ حق ہر زبان پر

مشکلات:۔ زمزمہ پردازیِ طیور، پرندوں کا گیت گانا۔ ملک، فرشتہ،

تشریح:۔ ادھر چاند غروب ہوا ادھر سورج طلوع ہو گیا اور چاروں طرف نور بکھر گیا۔ صبح کے وقت تمام پرندے اللہ تعالیٰ کی تعریف میں گیت گا رہے تھے۔ عجیب دلربا منظر تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی دل و نگاہ کو لطف و سرور حاصل ہو رہا تھا۔ خدا کے بندے زمین پر خدا کی تعریف یعنی نماز اور ذکر و تسبیح وغیرہ میں مصروف تھے اسی طرح آسمان پر فرشتے اس کی عبادت میں مصروف تھے کوئی زبان ایسی نہ تھی جو اللہ تعالیٰ کی تعریف و توصیف نہ کر رہی ہو۔

(۴) وہ سرخی شفق کی ادھر چرخ پر بہار
وہ بادو درخت، وہ صحرا وہ سبزہ زار
شبنم کے وہ گلوں پہ گہرہائے آبدار
پھولوں سے سب بھرا ہوا دامانِ کوہسار

ناقے کھلے ہوئے وہ گلوں کی شمیم کے
آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے

مشکلات: ناقہ، اونٹنی۔ پھل، پھل دار درخت۔ گہربائے آبدار، قیمتی موتی۔ نافے، مشک کی تھیلیاں جو دراصل تاتاری ہرن کی ناف کا جما ہوا خون ہوتا ہے۔ شمیم، خوشبو۔

تشریح: صبح کے خوبصورت منظر کا بیان جاری ہے۔ میر انیس کہتے ہیں شفق کی سرخی، آسمان کے نور، پھلوں کے لدے پھندے درخت، صحرا، سبزہ زار، پھولوں پر شبنم کے چمکتے ہوئے موتی، ان تمام چیزوں نے ایک مسحور کن کیفیت پیدا کر دی تھی۔ پہاڑ کا پورا دامن پھولوں کے پودوں سے اٹا ہوا تھا ہوا چلتی تو پھولوں کی خوشبو چاروں طرف پھیل جاتی۔ یہ خوشبو مشک نافہ سے کم نہ تھی جو خوشبوؤں میں بہترین ہوتی ہے۔

کربلا میں گرمی کی شدت

تعارف: یہ نظم بھی میر انیس کے ایک طویل مرثیے کا ٹکڑا ہے جس میں گرمی کی شدت کو بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کی ہیئت بھی مسدس ترکیب بند کی ہے۔

مرکزی خیال: گرمی اس قدر شدید تھی کہ انسان اس کا تصور ہی نہیں کر سکتا۔ انسان تو درکنار پرندے چوپائے اور درندے بھی شدتِ گرما کے ہاتھوں سخت نالاں تھے یہ ناقابلِ برداشت گرمی میدانِ حشر کا سماں پیش کر رہی تھی۔

تشریح

گرمی کا زور جنگ کی کیونکر کروں بیاں
ڈر ہے کہ مثلِ شمع نہ جلنے لگے زباں
وہ لو کہ الحذر وہ حرارت کہ الاماں
دن کی زمیں تو سرخ تھی لو رزد آسماں
آبِ خنک کو خلق ترستی تھی خاک پر
گویا ہوا سے آگ برستی تھی خاک پر

مشکلات: الحذر، خدا بچائے۔ الاماں، خدا امان دے۔ کسی چیز کی کثرت اور زیادتی کے اظہار کے لئے بولتے ہیں۔ رن، میدانِ جنگ۔

تشریح: کربلا کے میدان اور اس کے قرب و جوار میں درجہ حرارت اس قدر زیادہ تھا کہ الفاظ کے ذریعے اس کا پورا تصور نہیں دلایا جا سکتا۔ اگر ہمت کر کے بیان کرنا شروع کروں تو اس

کے ذکر و تصور سے ہی میری زبان شمع کی مانند جلنے لگے گی۔ ایسی شدید اور سخت لو اور تپش سے خدا ہی محفوظ رکھے۔ میدانِ جنگ کی زمین سرخ تھی اور آسمان پر زردی چھائی ہوئی تھی جو شدتِ گرما کی علامت ہے اگر کہیں سے ہوا کا کوئی جھونکا آتا تھا تو وہ بھی اس قدر گرم ہوتا گویا آگ برس رہی ہے لوگ ٹھنڈے پانی کی ایک ایک بوند کو ترس رہے تھے اس بند کا دوسرا مصرعہ فنی لحاظ سے بڑا خوبصورت ہے شاعر نے زبان کو شمع سے تشبیہ دی کیونکہ دونوں کی ظاہری شکل ایک جیسی ہوتی ہے۔ جلتی ہوئی زبان، سرخی، حرارت اور تپش میں بھی ہو بہو شمع معلوم ہوتی ہے۔

وہ لُو وہ آفتاب کی حدّت، وہ تاب و تب
کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثالِ شب
خود نہرِ علقمہ کے بھی سُوکھے ہوئے تھے لب
خیمے تھے جو جیالوں کے تپتے تھے سب کے سب
اڑتی تھی خاک، خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا

مشکلات: حدت، تپش، گرمی، تاب و تب، چلک اور گرمی، نہرِ علقمہ، دریائے فرات کا دوسرا نام، چشمہ حیات، زندگی کا چشمہ۔

تشریح: اس بند میں انیس نے گرمی کی شدت اور اس کے اثرات کو بیان کیا ہے کہتے ہیں سورج بڑی شدت سے چمک رہا تھا، لو چل رہی تھی اور آگ برس رہی تھی، دھوپ کی وجہ سے سفید چیزیں سیاہ ہو جاتی ہیں، دن میں دھوپ اتنی شدید پڑتی تھی کہ دن بھی رات کی طرح سیاہ پڑ گیا تھا یاد رہے کہ شدت حرارت کے سبب چیزوں کا مائل ہونا فطری امر ہے، اس کے بعد انیس کہتے ہیں انسان تو درکنار خود نہرِ علقمہ بھی شدید پیاسی تھی اس کے سوکھے ہونٹ دیکھ کر اس کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا پانی کے بلبلوں کو انیس نے خیموں سے تشبیہ دی ہے۔ کہتے ہیں پانی کے یہ خیمے بھی سخت تپے ہوئے تھے چاروں طرف خاک اڑتی پھرتی تھی، پانی بقائے زندگی کے لئے اہم ترین لازمہ ہے مگر وہ دستیاب نہ تھا اس لئے جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ دریائے فرات میں پانی تھا مگر وہ گرمی سے ابل رہا تھا، ابلتا ہوا پانی پینا آسان نہ تھا۔

آبِ رواں سے منہ نہ اٹھاتے تھے جانور
جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر ادھر ادھر
مردم تھے سات پردوں کے اندر عرق میں تر
خیمہ سے سر کی شرم سے نکلتی نہ تھی نظر
گر چشم سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھوں آبلے پائے نگاہ میں

مشکلات :۔ عرق، پسینہ۔ ٹھنڈا نہ مرہ، پلکوں کی ٹھنڈی جگہ۔ آبلے، چھالے۔ مردم، آدمی آنکھ کی پتلی۔

تشریح :۔ گرمی کی شدت سے پیاس بجھتی ہی نہ تھی چنانچہ جانور اگر ایک بار ندی کے چلتے ہوئے پانی میں منہ ڈال لیتے تھے تو لگاتار پانی پئے چلے جاتے تھے اور پانی سے منہ نہ ہٹاتے تھے پرندے گھنے جنگل کے اندر پتوں کے سائے میں چھپتے پھرتے تھے۔ اگر کوئی شخص دھوپ سے بچنے کے لئے سایہ دار جگہ میں بھی چھپتا تب بھی گرمی سے نجات نہ ملتی اور وہ پسینے میں تر بتر رہتا تھی کہ نظر بھی پلکوں کے اندر چھپی رہتی کیونکہ نمی کے باعث یہ نسبتاً ایک ٹھنڈی جگہ ہوتی ہے۔ اگر انسان کی نگاہ کسی وقت ادھر ادھر دیکھنے لگے تو سورج کی گرمی کی وجہ سے اس کے پاؤں میں چھالے پڑ جائیں۔ خیال رہے کہ دھوپ میں شدت اور تپش ہو تو نگاہ کو چبھتی ہے۔ دھوپ کا سیاہ چشمہ اسی تپش اور چبھن سے بچاؤ کے لئے لگایا جاتا ہے۔ میر انیس نے اس بات کو مبالغہ آمیز انداز میں بیان کیا ہے۔

کوسوں کسی شجر میں نہ گل تھے نہ برگ و بار
ایک ایک تھل جل رہا تھا صورتِ چنار
سنتا تھا کوئی گل نہ مہکتا تھا سبزہ زار
کانٹا ہوئی تھی سوکھ کے ہر شاخ باردار
گرمی یہ تھی کہ زیست سے دل سب کے سرد تھے
پتے مثلِ چہرہ مدقوق زرد تھے!

مشکلات :۔ کوسوں۔ کئی کوس، کئی میل، صورتِ چنار، چنار کی طرح۔ چنار کے پتے سرخ ہوتے ہیں اور دور سے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے درخت کو آگ لگی ہے۔ کانٹا ہوئی تھی۔ سوکھ کر بے حد نوکیلی ہو گئی تھی زیست۔ زندگی۔ چہرہ مدقوق، ایسے شخص کا چہرہ جو دق کا شکار ہو۔

تشریح :۔ انیس کہتے ہیں کہ دق زدہ مریض کی طرح دور دور تک کہیں کوئی درخت نظر آتا تھا نہ پھول اور پتے یا پھل۔ اگر کہیں کوئی درخت باقی بچا ہوا تھا بھی تو اس کی تمام شاخیں سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھیں حالانکہ یہ شاخیں کبھی پھلوں سے لدی ہوتی تھیں۔ اب ان شاخوں پر پھلوں کے موجود ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اسی طرح سبزے کا بھی کہیں وجود نہ تھا۔ غرض کیا انسان، کیا حیوانات اور کیا نباتات ہر شے زندگی سے بیزار تھی کیونکہ اس شدید گرمی میں جینا آسان نہ تھا۔ پتوں کا زرد چہرہ دیکھ کر ان پر کسی مدقوق شخص کے چہرے کا گمان گزرتا تھا۔

شیر اٹھتے تھے نہ دھوپ کے مارے کچھار سے
آہو نہ منہ نکالتے تھے سبزہ زار سے
آئینہ مہر کا تھا مکدر غبار سے

گردوں کو تپ چڑھی تھی زمین کے بخار سے
گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
جھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

مشکلات: ر کچھار، کسی درندے یا بندی کے کنارے جنگل میں واقع شیر کی آرام گاہ۔ آہو، ہرن کلدر، میلا، گرد آلود۔

تشریح: گرمی کے مارے چرندوں اور درندوں کا بھی یہی حال تھا، شیر سارا سارا دن اپنی کچھاروں میں پڑے رہتے تھے کیونکہ وہ نسبتاً ٹھنڈی جگہ تھی، اسی طرح ہرن بھی سبزے میں جا کر لیٹے رہتے تھے یہ تو خیر ذی روح جانور تھے، زمین اور سورج اور آسمان جیسی بے حس چیزیں بھی شدت گرمی کے ہاتھوں پریشان اور نڈھال تھیں، گرد و غبار نے سورج کے چہرے، آئینے کو میلا کر دیا تھا اور زمین کی شدت حرارت سے آسمان کو بخار چڑھ گیا تھا، زمین تپش اور حرارت کے ہاتھوں مضطرب اور بے چین تھی اور کیونکہ زمین کو گندم کا دانا زمین پر گرتے ہی بھن جاتا تھا، اس سے سطح زمین کی حرارت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ میر انیس کے خیال میں کائنات کی ہر شے، زمین پر ہو یا آسمان پر، گرمی کے عذاب میں مبتلا تھی۔

گرداب پر تھا شعلۂ جوالہ کا گمان
انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں
منہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں
تہ پر تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں
پانی تھا آگ، گرمیٔ روز حساب تھی
ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی

مشکلات: گرداب، بھنور، شعلۂ جوالہ، بھڑکتا ہوا شعلہ، شرر فشاں، چنگاری بکھیرنے والا، نہنگ مگرمچھ، لبوں پر جان، انتہائی تکلیف کا عالم جان نکلنے والی تھی، ماہی، مچھلی، سیخ، لوہے کی سلاخ جس پر کباب بھونتے ہیں۔

تشریح: گرمی کی شدت کے سبب خود پانی اور آبی مخلوق بے حد پریشان تھی دریا کا بھنور دیکھ کر گمان گزرتا تھا کہ شاید یہ آگ کا بھڑکتا ہوا شعلہ ہے پانی کے بلبلے انگارے نظر آتے تھے اور پانی آگ کی چنگاریاں چھوڑتا ہوا معلوم ہوتا تھا، حتیٰ کہ پانی کی موجوں کی زبان بھی منہ سے نکل پڑی تھی چونکہ اوپر کا پانی زیادہ گرم تھا اس لئے مگرمچھ دریا کی تہہ میں چلے گئے تھے مگر وہاں بھی سکون نہ تھا وہ ہانپ رہے تھے اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ ابھی گرمی کے مارے ان کی جان ہی نکل جائے گی، غرض پانی پانی نہ تھا بلکہ آگ بنا ہوا تھا اس کے اندر بھی جلانے کی خاصیت پیدا ہو چکی تھی، یوں سمجھئے کہ میدان حشر کی سی گرمی تھی دریا کی سطح اس گرم سلاخ کی مانند تپ رہی تھی جس پر کباب بھونے جاتے ہیں چنانچہ اگر کوئی مچھلی قسمت کی ماری پانی کے اوپر آنکلتی تھی تو شدت تپش سے جان دے دیتی تھی۔